تفسیر مظہری

جلد ششم

سورۂ ہود سے سورۂ نحل تک

پارہ ۱۲ تا پارہ ۱۴

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تسہیل ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبد الدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دار الاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ —— فون ۲۱۳۷۶۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

فہرست عنوانات

تفسیر مظہری (اردو)
جلد ششم

"سورۃ ھود"

اے اللہ!

تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں، ہم تیری ثنا کرتے ہیں ہر عیب سے تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتے ہیں، تیری مدد کے خواستگار ہیں، تجھ سے گناہوں کی معافی کے طلبگار ہیں، تیرے شکر گذار ہیں، تجھ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی درخواست کرتے ہیں ہم کو اپنے ان نیک بندوں میں شامل کر دے جن کو (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہوگا نہ غم ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہی ہمارا مالک ہے، آسمان و زمین کا مالک ہے اور زمین و آسمان کے اندر اور باہر جو مخلوق ہے اس کا مالک ہے بلاشبہ ہر چیز تیرے قابو میں ہے، ہم درود و رحمت و سلامتی کرتے ہیں اپنے آقا اور مولا محمد ﷺ کے لیے جو تیرے رسول ﷺ اور حبیب تھے اور ساری مخلوق کے سردار تھے اور آپ ﷺ کی آل و اصحاب کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو آل و اصحاب کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہوں روزِ قیامت تک۔ اے ارحم الراحمین اپنی رحمت سے ہماری دعا قبول فرما۔

اس سورت کی ۱۲۳ آیت ہیں سوائے آیت اقم الصلوۃ طرفی النہار الخ کے باقی پوری سورت مکی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝

الٓرٰ یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں دلائل سے محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ ساتھ) صاف صاف بیان بھی کی گئی ہیں یہ ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے۔

اُحْكِمَتْ یعنی اس کی آیات موتیوں کی طرح پروئی ہوئی ہیں ان کی ساخت پرداخت مضبوط ہے نہ اس کے الفاظ میں کوئی نقص ہے نہ معنی میں کوئی عیب۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کی آیات غیر منسوخ ہیں یہ مطلب اس وقت صحیح ہوگا جب آیات کتاب سے صرف اس سورت کی آیات مراد ہوں کیونکہ اس سورت کی کوئی آیت منسوخ نہیں (باقی قرآن میں بعض آیات منسوخ ہیں) یا مضبوط کرنے سے مراد ہے دلائل اور براہین سے ثابت کی ہوئی یا اُحْكِمَتْ کا مطلب ہے پُر حکمت بنائی ہوئی یعنی علمی اور عملی حکمتیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں حکم خبر کے ساتھ حکیم ہو گیا۔ فُصِّلَتْ یعنی جس طرح ہار کے درمیان قیمتی زبرجد پروئے جاتے ہیں اسی طرح اس کی آیات الگ کر دی گئی ہیں، کہیں اعتقادیات، کہیں عملی احکام، کہیں مواعظ، کہیں واقعات کی اطلاع۔ یا فصل کر دینے سے مراد ہے الگ الگ سورتیں مقرر کر دینا۔ تھوڑا تھوڑا (حسب ضرورت دنیا میں) بھیجنا مراد ہے یا یہ مطلب ہے کہ جن امور کی (اصلاح بشری کے لیے) ضرورت تھی ان کو بطور خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔

مِنْ لَّدُنْ اس کا تعلق و صفتی یا کتاب سے ہے یا دوسری خبر ہے یا اُحْكِمَتْ سے تعلق ہے یا فُصِّلَتْ سے مطلب یہ ہے کہ اللہ ظاہر و باطن سے واقف اور باخبر ہے اسی کی طرف سے ان آیات کا یا کتاب کا نزول ہے اور اسی نے اس کی آیات کو محکم بنایا ہے۔

أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ کہ اس کے سوا کسی کو مت پوجو میں اس کی طرف سے (ایمان نہ لانے والوں کو عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان دار نیکوکاروں کو نجات و ثواب کی) خوش خبری دینے والا ہوں۔

یعنی شرک کے عذاب سے ڈرانے والا اور توحید کے ثواب کی بشارت دینے والا ہوں۔

وَأَنِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ اور یہ بھی کہ تم (کفر و معصیت کی) اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف (ایمان و اطاعت کے ساتھ) لوٹو۔

یعنی پچھلے گناہوں کی اپنے رب سے معافی چاہو اور آئندہ طاعت کے ساتھ اس کے طرف رجوع کرو۔ فراء نے کہا ثم اس جگہ (ترتیب اور ترقی کے لئے نہیں ہے بلکہ) واؤ کے معنی میں ہے (یعنی مطلق عطف کے لیے ہے) اور استغفار کے معنی میں توبہ کرنا (معطوف اور معطوف علیہ میں اس جگہ مغایرت تسمیاتی ہے) یعنی ایک کا معنی دوسرے کے معنی کو لازم ہے (مطلب یہ کہ دونوں میں اتحاد التزامی ہے اگرچہ ذاتی افتراق ہے)۔

يُمَتِّعْكُم مَّتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وہ تم کو اچھی (خوشگوار مع امن، فراخ حال) زندگی عطا فرمائے گا مرتے دم تک۔

گناہوں سے مصائب اور بلائیں آتی ہیں اللہ نے فرمایا ہے وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ جو مصیبت تم پر آتی ہے اپنے کرتوت کی وجہ سے آتی ہے اور اللہ بہت سے جرائم سے تو درگذر فرما جاتا ہے (پھر بھی بعض گناہوں کی پاداش میں تم پر مصائب آہی جاتے ہیں) بعض علماء کا قول ہے متاع حسن سے مراد ہے قسمت خداوندی پر راضی رہنا اور تقدیر الٰہی پر صبر کرنا۔ چونکہ ہر شخص کی مدت زندگی مقرر ہے اور وقت موت معین ہے اس لئے اجل مسمی سے مراد ہے وقت موت۔

وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ اور وہ ہر فضیلت والے کو اس کی فضیلت کے مطابق جزا عطا فرمائے گا۔

یعنی دینی فضیلت کے مطابق جزا عطا فرمائے گا دنیا میں توفیق، اطمینان قلب، چین اور اللہ کی یاد کی لذت اور سعادت آخرت کی خوشخبری اور آخرت میں ثواب کی کثرت اور مراتب قرب کی بلندی عطا فرمائے گا۔

وَإِن تَوَلَّوْا فَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيرٍ اور اگر (اللہ کی عبادت اور توحید سے) روگرداں ہوگے تو مجھے تمہارے متعلق ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

بڑے دن سے مراد ہے قیامت کا دن جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہوگی بلکہ وہ (عذاب کا دن) غیر محدود ہوگا (یعنی کافروں کے لیے عذاب کبھی ختم نہ ہوگا اور مومنوں کیلئے ثواب لاانتہائی)

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ تمہارے تمام امور کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے۔ (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)

وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اور وہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔

یعنی دنیا اور آخرت میں ہر جگہ سزا جزا دینا اس کے اختیار میں ہے۔ یہ آیت سابق آیات کی تاکید اور تقریر ہے۔

أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کر دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ یعنی کچھ مسلمان خلوت میں بھی برہنہ ہوتے اور کھلی جگہ میں عورتوں سے مستی قربت کرنے سے شرماتے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے بھی بواسطہ محمد بن عباد بن جعفر حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ، ابن جریر اور ابن المنذر نے باسناد ابن ابی ملیکہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ

صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ پڑھ کر فرمایا کہ لوگ کپڑوں میں نیچے لپٹنے بغیر ضرورت اور عورتوں سے قربت کرتے تھے کہ فضا میں برہنہ ہونا ان کو پسند نہ تھا۔

بغوی نے عبداللہ بن شداد کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول بعض منافقوں کے حق میں ہوا تھا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جب ان کا گذر ہوتا تھا تو وہ سینہ اور پشت کو حضور ﷺ کی طرف سے موڑ کر سر جھکا کر منہ چھپا کر نکل جاتے تھے۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ ابن جریر وغیرہ نے بھی عبداللہ بن شداد بن ہاد کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔ مگر یہ روایت قابل پذیرائی نہیں کیونکہ آیت مکی ہے اور منافق مدینہ میں (ہجرت کے بعد) پیدا ہوئے (مکہ میں کوئی منافق نہیں تھا) بہر حال اس روایت کے بموجب منہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہوگی (اللہ کی طرف راجع نہیں ہوگی)۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی یہ شخص بڑا شیریں کلام اور خوش رو تھا رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتا تھا تو وہی بات کہتا تھا جو حضور ﷺ کو پسند ہوتی تھی مگر دل میں اس کے خلاف پوشیدہ رکھتا تھا۔ اس وقت يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ سے مراد یہ ہوگی کہ وہ سینوں کے غلاف کے اندر کفر کینہ اور رسول اللہ ﷺ کی دشمنی چھپائے رکھتے ہیں۔

قتادہ نے کہا وہ سینوں کو ٹیڑھا کرتے اور جھکا لیتے تھے تاکہ اللہ کی کتاب اور اللہ کا ذکر نہ سن پائیں۔

سدی نے کہا یثنون کا لفظ ثَنَيْتُ عِنَانِي کے محاورے سے بنایا گیا ہے (میں نے لگام موڑ لی) یعنی وہ اپنے دلوں سے اعراض کرتے ہیں (دلوں کا رخ موڑ لیتے ہیں) بعض روایات میں (ضعیف قول یہ بھی) آیا ہے کہ بعض لوگ اپنی کوٹھری میں گھس کر دروازہ کا پردہ چھوڑ کر سینہ کو جھکا کر اور چادر اپنے بدن پر لپیٹ کر کہتے تھے کہ کیا اللہ اب بھی میرے دل کی بات جان سکتا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ خوب سن لو وہ لوگ جب اپنے کپڑے اوڑھ لیتے ہیں یعنی سروں کو کپڑوں سے چھپا لیتے ہیں تب بھی اللہ ان امور سے واقف ہوتا ہے جن کو وہ (دلوں کے اندر یا کسی اور طریقہ سے) چھپاتے ہیں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہے جن کو وہ زبانوں سے) ظاہر کرتے ہیں۔

إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ یقیناً اللہ سینوں یا دلوں کے اندرونی رازوں کو خوب جانتا ہے۔ اور جب اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں تو اپنے رسول اور مومنوں کو جن باتوں سے واقف کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے اور آئندہ جس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کر دے گا۔

☆☆..........☆..........☆☆

﴿......بارھواں پارہ شروع﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

﴿......پارہ وما من دابۃ (ھود)﴾

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا　اور نہیں ہے زمین پر کوئی رینگنے والا جانور مگر اللہ ہی کے ذمہ ہے اس کی روزی۔ کیونکہ اللہ نے اپنی رحمت اور مہربانی سے ہر جاندار کی پرورش کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔[1]

عَلَى اللّٰهِ (بذمۂ خدا) کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اس امر کی طرف کہ رزق ضرور پہنچے گا۔ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ علی اللہ میں علی بمعنی من یعنی وہ مقرر روزق جو علم میں ہے اللہ کی طرف سے بندہ کو ملے گا اللہ اس کا ذمہ دار ہے کسی دوسرے کی طرف سے نہیں مل سکتا۔ مجاہد نے کہا رزق سے مراد وہ رزق ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہے بعض اوقات اللہ رزق نہیں دیتا اور آدمی بھوکا مر جاتا ہے۔

وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا　اور وہ ہر ایک کی (مستقل) قیام گاہ اور (عارضی) قرار گاہ کو جانتا ہے۔

بغوی نے ابن مقسم کا قول نقل کیا ہے اور یہی قول ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی آیا ہے کہ مستقر سے مراد ہے وہ جگہ جہاں رات دن جاندار رہتا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر پھر اسی جگہ آکر قرار پکڑتا ہے اور مستودع سے مراد ہے دفن ہونے کی جگہ۔ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد ماں کا پیٹ اور مستودع سے مراد باپ کی پشت ہے۔ سعید بن جبیر، علی بن طلحہ اور عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے بعض علماء کے نزدیک مستقر سے مراد جنت یا دوزخ اور مستودع سے مراد قبر ہے کیونکہ حسنت مستقرا جنت کے لیے اور ساءت مستقرا دوزخ کے لیے فرمایا ہے۔

كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ ہر ایک (جانور کا حال روزی وغیرہ) کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ کھلی کتاب یعنی لوح محفوظ یا اعمال لکھنے والے فرشتوں کے کتابچوں میں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ نے مخلوقات کی قسمتیں لکھ دی تھیں، حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ (اس وقت) اللہ کا تخت پانی پر تھا (رواہ مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ اللہ کے سچے رسول ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے (ہر) ایک کا مادۂ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز بصورت نطفہ جمع رہتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں بصورت علقہ (بستہ خون یا جونک) ہو جاتا ہے، پھر اتنی ہی مدت

---

(۱) دابۃ۔ رینگنے والا جانور، پیٹ رینگنا۔ محاورۂ عرف عام میں دابہ چوپایہ کو کہتے ہیں لیکن اس جگہ لغوی معنی مراد ہے یعنی ہر جاندار جو زمین پر چل سکتا ہے خواہ کوئی کیڑا ہو یا چوپایہ یا پرندہ یا آدمی۔

اہل سنت کا مسلک مشہور ہے کہ اللہ پر کوئی عمل واجب نہیں، لیکن اللہ اگر اپنی رحمت سے خود کسی بات کا وعدہ فرمالے تو تکمیل وعدہ واجب ہے جیسے نیکوں کا جنت میں داخلہ، مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے رحمت و مہربانی کا لفظ بڑھا کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

میں ہوتی (یہ جان ہو گیا) پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لیے مامور فرماتا ہے وہ فرشتہ اس کا عمل، اس کی مدت زندگی (یا وقت موت) اور اس کا رزق اور اس کا سعید یا شقی (نیک بخت مومن یا بد نصیب کافر) ہونا لکھ دیتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ہر بندے کی پانچ باتیں لکھنے سے فارغ ہو چکا ہے۔ مدت زندگی، اعمال، مقام موت، مقدار رزق اور اوا ثھر۔

گویا اس آیت میں اللہ کا عالم کل ہونا اور آئندہ آیت میں اللہ کا قادر مطلق ہونا توحید ثابت کرنے اور مضمون بالا وعدہ و وعید کو پختہ کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے (اس آیت سے اللہ کے علم کا بعد کیے ہونا اور اگلی آیت وھو الذی سے اللہ کی قدرت کا محیط کل ہونا ظاہر کیا جا رہا ہے تاکہ گذشتہ آیت میں جس توحید اور وعدہ و وعید کا ذکر کیا گیا تھا اس کا اثبات اور تقریر ہو جائے)۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ اور وہ اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو مع ان کی تمام موجودات کے چھ روز میں اندازہ کے مطابق پیدا کیا۔ آسمانوں سے مراد ہیں بالائی چیزیں اور زمین سے مراد نیچی چیزیں، یعنی کائنات بالا و پست۔ آسمانوں کو بصیغہ جمع اور زمین کو بصیغہ واحد ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کائنات علویہ میں سے ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات سے جدا ہے اور ہر ایک دوسرے سے اصل کے اعتبار سے مختلف ہے اور کائنات سفلیہ کی اصل و ذات ایک ہے۔[1]

وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اور (آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے) اس کا تخت پانی پر تھا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ پانی ہوا کی پشت پر تھا، کعب احبار کا قول ہے کہ اللہ نے ایک یاقوت سبز پیدا کیا، اس پر نظر جلال ڈالی تو وہ سب لرز کر پانی بن گیا، پھر اللہ نے ہوا کو پیدا کیا اور اس کی پشت پر پانی کو قائم کیا) پھر عرش کو پانی پر قائم کیا۔ ضمرہ نے کہا اللہ کا تخت پانی پر تھا، پھر اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور قلم کو پیدا کیا پھر اس سے وہ تمام چیزیں لکھ دیں جو ہونے والی تھیں اور جن کو وہ آئندہ پیدا کرنے والا تھا اور ہر مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہزار برس تک قلم نے اللہ کی تسبیح و تمجید کی تھی۔

حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے بخاری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور اس کا تخت پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور یادداشت (غالباً لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی (الحدیث)

عرش کے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان کا کچھ حصہ سورۂ بقرہ کی آیت الکرسی کی تفسیر کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل کرنے والا کون ہے۔

یعنی باوجود عالم کل ہونے کے پھر بھی جانچ کرنے والے ممتحن کی طرح تمہارے ساتھ معاملہ کرے تاکہ تمہارا استحقاق ثواب و عذاب ظاہر ہو جائے کیونکہ آسمان و زمین اور ان کی موجودات تمہاری ہستی اور معاش کے اسباب و ذرائع اور اصول ہیں ان سے تمہارے تمام احوال و اعمال وابستہ ہیں اس کا تقاضا ہے کہ تم اپنے رب کا شکر ادا کرو پھر یہ ساری کائنات وجود صانع کی دلیل اور (توحید صانع کی) خصوصی نشانی ہے اس سے تم معرفت الٰہیہ حاصل کر سکتے ہو۔

لِيَبْلُوَكُمْ کا تعلق خَلَقَ سے ہے گویا اس لفظ سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ سارے جہان اور موجودات جہان کی تخلیق بجائے خود مقصود نہیں بلکہ تخلیق انسان اور انسانوں میں بھی اہل ایمان کی تخلیق کی تمہید ہے اور مومنوں میں سے بھی ان لوگوں کی پیدائش کا تمہیدی مقدمہ ہے جن کے اعمال اچھے ہوں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ سے مشابہت رکھنے والے

---

[1] (۱) حضرت مفسر کی یہ تحریر فلاسفہ مشائیہ کے طبیعی مسلک پر مبنی ہے کہ ہر آسمان کا مادہ دوسرے آسمان کے مادہ سے جدا ہے ہر ایک کی صورت جسمیہ اور نوعیہ دونوں ہر حال الگ الگ ہی ہے اور تمام عناصر کا مادہ ایک ہے اور صورت جسمیہ بھی طبیعت نوعیہ ہے جس کا تحقق تمام عناصر میں برابر ہے۔ البتہ ہر عنصر کی صورت نوعیہ جدا جدا ہے۔ مگر یہ فلاسفہ کی خرافات ہے اسلامی تصریحات میں کسی جگہ اس کی تائید نہیں ملتی۔ واللہ اعلم۔ (مترجم)

صالحین۔

اَحْسَنُ عَمَلًا میں عمل کا لفظ عقیدہ اور افعال اعضاء جسمانی دونوں کو شامل ہے۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے کمزور سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اَحْسَنُ عَمَلًا (سے مراد ہے) سب سے اچھی سمجھ والا ممنوعات الٰہیہ سے سب سے زیادہ پرہیز رکھنے والا اور اوامر کی تعمیل میں تیزی کرنے والا۔ بلاشبہ سب سے اچھے اعمال دلوں کے اعمال (عقائد و معاملات) ہیں اور قلبی اعمال میں سے بھی سب سے اچھا عمل اللہ کی محبت اور اس کی یاد میں ڈوب جانا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کا مقصد ہی تخلیق اہل اللہ کا وجود ہے۔ لفظ احسن تعلیم دے رہا ہے اس بات کی کہ علم و عمل کے درجات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔

وَلَئِنْ قُلْتَ إِنَّكُمْ مَبْعُوثُونَ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ۝

اور اگر آپ ان (مشرکوں) سے کہیں کہ مرنے کے بعد تم کو یقیناً اٹھنا ہوگا تو منکر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلے ہوئے جادو کے سوا اور کچھ نہیں۔

ھٰذا یعنی مرنے کے بعد جی اٹھنا یا قیامت کا قول، یا یہ قرآن جس کے اندر قیامت کے آنے کا ذکر ہے، کھلا ہوا جادو ہے۔
ابن ابی حاتم نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا قیامت تو قریب آ گئی (اس کی نزدیکی کی وجہ سے) کچھ لوگوں نے برے کام چھوڑ دیے مگر کچھ ہی مدت بعد پھر بدکرداری میں مبتلا ہو گئے۔ اس پر آیت اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوئی۔ یہ سن کر کچھ لوگ کہنے لگے لو حکم خدا آ ہی پہنچا۔ یہ خیال کر کے انہوں نے گناہ چھوڑ دیے مگر کچھ مدت کے بعد پھر اسی بداعمالی کی طرف لوٹ گئے تو مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے بحوالہ ابن جریج بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔

وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِلٰى أُمَّةٍ مَعْدُودَةٍ لَيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ

اور اگر کچھ مدت ہم ان سے عذاب کو ملتوی رکھتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ عذاب کو کون چیز روک رہی ہے۔ صاحب قاموس نے لفظ اُمَّۃ کے معانی میں سے ایک معنی وقت بھی لکھا ہے۔ بغوی نے اس کا ترجمہ اجل کیا ہے (یعنی میعاد)۔ اصل میں امۃ جماعت کو کہتے ہیں یعنی ایک جماعت کے ختم ہونے اور دوسری جماعت کے پیدا ہونے تک۔ بیضاوی نے امۃ کا ترجمہ اوقات کا مجموعہ کیا ہے اور معدودۃ کا ترجمہ قلیل۔

أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ ع

یاد رکھو جس روز (مقررہ وقت پر) عذاب ان پر آ پڑے گا تو پھر کسی کے ہٹائے نہ ہٹے گا اور جس (عذاب) کا مذاق بناتے تھے وہ ان کو آ گھیرے گا۔

یعنی وہ عذاب جو اللہ کے علم میں مقرر ہے جیسے جنگ بدر کا عذاب ان پر جس دن آ جائے گا تو پھر اس کو نہیں لوٹایا جائے گا اور جس عذاب کا یہ مذاق بنایا کرتے تھے اور بطور استہزاء کہتے تھے کہ آیا کیوں نہیں، آنے سے کون مانع ہے فوراً آ جائے، وہ عذاب ان کو ہر طرف سے گھیر لے گا (پھر بچاؤ کا ہر راستہ بند ہو جائے گا) چونکہ آئندہ عذاب کا آنا یقینی تھا اس لیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گویا وہ آ چکا اس میں تحقق وقوع کے ثبوت کے ساتھ تہدید بھی ہے۔

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ ۚ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ۝

اور اگر ہم انسانوں کو (بلا استحقاق) اپنی طرف سے رحمت یعنی کسی نعمت (امن، صحت، دولت وغیرہ) کا مزہ چکھا دیتے ہیں پھر کچھ مدت کے بعد اس سے اپنی نعمت چھین لیتے ہیں تو وہ بالکل نا امید اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔

الانسان (میں الف لام جنسی ہے) یعنی عام انسان۔ یئوس بالکل نا امید یعنی نعمت کے زوال کے بعد چونکہ اس کو صبر

نہیں کر سکتا اور تبلیغ میں تقیہ رسول کی ذات سے ناممکن ہے۔ اسی لیے ترکیبِ تبلیغ کی توقع کا وقوع نہیں ہو سکتا۔ لفظ لعل کا جواب بیضاوی کی اس تقریر سے یہ شبہ دفع ہو گیا کہ اللہ کی طرف سے کسی چیز کی توقع کا اظہار ہو تو اس چیز کا وقوع لازم ہے (کیونکہ اللہ کے لیے کسی حالت کا انتظار نا ممکن اور دلیل عجز ہے اس کے لیے ہر منشاء کا وقوع بالفعل ضروری ہے۔)

وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (اگر یہ نبی ہیں تو) ان پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی کلام کرتا) کیوں نہیں آیا۔

یعنی آپ کو ان کے اس قول سے دل تنگی ہوتی ہے کہ محمد ﷺ پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا کہ بادشاہوں کی طرح لوگوں کو اپنا تابع اور فرماں بردار بنانے میں خرچ کرتا یا اس کے ساتھ کوئی (محسوس) فرشتہ کیوں نہیں آیا جو اس کی تصدیق کرتا۔ مطلب یہ کہ ان کے اس قول سے آپ کبیدہ خاطر اور ملول ہوتے ہیں۔ عبداللہ بن امیہ مخزومی نے یہ بات کہی تھی۔ آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ مشرک اللہ کی وحی کی کوئی قدر نہیں کرتے اس لیے آپ شاید وحی کے بعض حصوں کی تبلیغ ترک کر دیں مگر اللہ کے حکم کو ترک کرنے سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے۔ ترک امر الٰہی موجب دل تنگی ہے اور تعمیل حکم سبب انشراح صدر اور ترک تبلیغ کا باعث یہ ہو کہ یہ لوگ آپ کے قول کی ہنسی اڑاتے ہیں آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ یہ استہزاء کریں گے اور اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کو رد کر دیں گے اور ان کی اس بات سے آپ کو کبیدگی خاطر ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اترا جاتا اور تصدیق کرنے والا کوئی فرشتہ اس کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا۔ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، آیاتِ عذاب پیش کرنے والے ہیں وہ رد کر دیں نہ مانیں یا سوائے اس قرآن کے کسی دوسرے قرآن کے طلبگار ہوں آپ پر اس کا کوئی جرم عائد نہیں ہوتا پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کے استہزائیہ قول اور رد کر دینے کے خوف سے تبلیغ وحی ترک کر دیں یا ان کے اس قول سے کبیدہ خاطر ہوں۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ۞ اور اللہ ہر چیز کا نگران (اور وعدہ دار) ہے۔ اور ان کو ان کے قول کی سزا ضرور دے گا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ کیا کفار کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے قرآن خود اپنی طرف سے بنا لیا ہے آپ کہہ دیجئے (اگر یہ بات ہے) تو پھر تم بھی اس جیسی ہی دس سورتیں بنا کر پیش کرو۔

ایک شبہ

سورۂ یونس میں آیا ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ایک سورت اس جیسی پیش کرو۔ مگر غیر مسلم ایک سورت بھی قرآن جیسی نہیں پیش کر سکے اب یہاں دس سورتیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی اس کے کیا معنی۔ جو شخص سائل کو ایک روپیہ دینے سے قاصر رہا ہو اس سے کیا دس روپیہ طلب کیے جا سکتے ہیں کیا اس قسم کا کلام نامناسب بلکہ مہمل نہیں سمجھا جائے گا۔

ازالہ

سورۂ ہود کی یہ آیت جس میں دس سورتیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے پہلے نازل ہوئی پھر جب دس سورتیں نہیں پیش کی جا سکیں تو سورۂ یونس میں صرف ایک ہی سورت پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا سورۂ یونس کا نزول اس سورت کے بعد ہوا۔ مبرد نے اس جواب کو خلاف واقعہ قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ سورۂ یونس ہی پہلے نازل ہوئی پھر شبہ کا جواب کیا ہوگا۔ مبرد نے کہا دونوں سورتوں میں مثلیت کا مفہوم جدا جدا ہے۔ سورۂ یونس میں قرآن جیسی ایک سورت پیش کرنے کی دعوت دی یعنی غیبی اطلاعات، احکام، وعدۂ ثواب اور وعید عذاب میں گزشتہ آسمانی کتابوں کے طرز پر کوئی ایک سورت بنا لاؤ

مگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اب اس سورت میں دس سورتیں بنا کر پیش کرنے کی دعوت دی جو صرف بلاغت اور حسن طرز میں قرآن جیسی ہوں ـــــ میں کہتا ہوں جب وہ لوگ ایسا بھی نہ کر سکے تو پھر سورۂ بقرہ میں فرمایا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (یعنی ندرتِ اسلوب اور بلاغتِ کلام میں دس سورتیں قرآن جیسی پیش نہیں کر سکتے تو) صرف ایک ہی سورت صرف عبارت کی ساخت کے لحاظ سے اس کی طرح بنا لاؤ۔

مُفْتَرَيَاتٍ (دس سورتیں) خود ساختہ اپنی طرف سے بنائی ہوئی۔

آخر تم لوگ بھی میری طرح خالص عرب اور قادر الکلام ہو بلکہ بڑے مشاق ہو باہم سیکھتے سکھاتے اور کہتے بناتے ہو۔

وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ اور اللہ کو چھوڑ کر (اور جن کو چاہو) اور جن کو بلا سکتے ہو اپنی مدد کے لیے بلا لو اگر سچے ہو (تو ایسی کوشش کر دیکھو)

فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ پھر اگر کفار تم لوگوں کا چیلنج پورا نہ کر سکیں۔

لَكُمْ کی ضمیر خطاب یا تو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے تعظیمِ رسول کے لیے جمع کی ضمیر استعمال کی گئی ہے یا مسلمان مخاطب ہیں کیونکہ مسلمان بھی مشرکوں کو مقابلہ کی دعوت دیتے تھے اور جو حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا کہ کافروں کو دعوتِ مقابلہ دو وہ حکم ضمناً تمام مسلمانوں کو بھی تھا۔ کیونکہ سوائے بعض خاص خاص احکام کے باقی احکام کے مکلف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام مسلمان بھی ہیں۔ یا مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ دعوتِ مقابلہ سے مسلمانوں کے ایمان میں ثبات اور یقین میں مزید استحکام پیدا ہوگا اس لیے اس سے غفلت مسلمانوں کو نہ کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے آگے فرمایا۔

فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ پس جان لو کہ قرآن اللہ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے اللہ کے سوا کوئی اس (کی حقیقت) کو جانتا ہے نہ اس کو بنا سکتا ہے۔

وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ اور یہ بھی جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں ـــ کیونکہ اللہ ہی ایسے امور سے واقف اور ان چیزوں پر قادر ہے جن کا علم و قدرت اس کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ ان کے (باطل) معبود بالکل عاجز ہیں اور اس کلام کی سچائی اسی بات ہی سے ثابت ہو رہی ہے کہ کوئی ایسا کلام نہیں بنا سکتا۔ اس کلام میں تہدید بھی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ بھی کہ اللہ کے عذاب سے مشرکوں کے معبود نہیں بچا سکتے۔

فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ پس کیا تم اب بھی مسلمان ہوتے ہو (یا نہیں) یعنی کیا تم اسلام پر ثابت قدم، مستقیم اور مخلص اور راسخ ہو جاؤ گے جب کہ قرآن کا اعجاز تمہارے نزدیک محقق ہو گیا تو کیا اسلام پر تم جمے رہو گے (یعنی جمے رہو)

یہ بھی ممکن ہے کہ ذکر کردہ تمام خطابات کے مخاطب مشرک ہوں اور لَّمْ يَسْتَجِيبُوا کی ضمیر (فاعلی) مَنِ اسْتَطَعْتُمْ کی طرف راجع ہو مطلب اس طرح ہوگا کہ جب اے مشرکو! تمہارے مددگاروں نے دعوتِ مقابلہ قبول نہیں کی اور تم جان گئے کہ وہ سب اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں تو اب تم کو جان لینا چاہیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ ہی نے اپنی طرف سے اتارا ہے اور تم کو جو توحید کی دعوت دی جا رہی ہے وہ بھی سچی ہے پس کیا تم منطقی دلیل اور روشن حجت کو دیکھ کر تم اسلام میں داخل ہو جاؤ گے (یا اب بھی اپنی سرکشی پر قائم رہو گے)۔

کلام کا سوالیہ طرز ایک بلیغ اسلوب ہے، طلبِ فعل اور امر کا اور تنبیہ ہے اس بات پر کہ اب ہر شبہ کا عذر ختم ہو گیا اور تعمیلِ حکم کا موجب ثابت ہو چکا ہے۔

مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ جو شخص (اپنے نیک اعمال سے) محض دنیوی زندگی (کی منفعت) اور اس کی رونق حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہم ان لوگوں کے اعمال کا دنیا ہی میں پورا پورا بدلہ دے دیتے ہیں اور ان

اور دنیا کی طلب کی نیت ہوتی ہے تو فقر (احتیاج) کو اللہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیدا کر دیتا ہے (یعنی اس کی سامنے احتیاجات و ضروریات غیر محدود طور پر آجاتی ہیں) اور اللہ اس کو پریشان حال کر دیتا ہے اور دنیا اتنی ہی اس کو ملتی ہے جتنی اللہ نے اس کے لیے لکھ دی ہے۔ رواہ الترمذی یہ حدیث امام احمد اور دارمی نے بوساطت ابان حضرت زید بن ثابت کی روایت سے نقل کی ہے۔

ایک شبہ

آیت نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اور حدیث لَا يَأْتِيْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهٗ میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اعمال کا بدلہ پورا پورا دے دیا جاتا ہے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی ملتا ہے اس سے زائد نہیں ملتا۔

ازالہ :- دونوں میں کوئی تضاد نہیں، تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ ملنا بھی اللہ نے لکھ دیا ہے پس اعمال کا پورا بدلہ ملے گا یعنی وہی ملے گا جو لکھا ہوا ہے اس سے زائد نہیں ملے گا خواہ دنیا طلب تو ہی کتنی چیزوں کا طلب گار ہو (ایک حدیث کا مفہوم ہے اگر آدمی کے پاس دو وادیاں بھر سونا ہو تب بھی وہ تیسری وادی (زر) کا طالب ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کا حکم ریاکاروں کے متعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جو اعمال انہوں نے دکھاوٹ کے لیے کئے ہوں گے ان کا بدلہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہ ہوگا۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو اس قرآن پر قائم ہو جو اس کے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

بینہ دلیل جو حق اور صحیح کی رہنمائی کرتی ہے جس کی روشنی میں دولت پرستی چھوڑ کر خدا پرستی اختیار کرتا ہے اور دنیا کی (ناجائز) فانی لذتوں کو ترک کر کے آخرت کی دوامی راحت کو پسند کرتا ہے۔

اس جملے کی خبر محذوف ہے اور مَنْ كَانَ مبتدا ہے اور اَفَمَنْ میں فاء تعقیب کے لیے ہے اور استفہام انکاری ہے۔ تم علم کے .... بعد بھی جو لوگ کافروں اور ریاکاروں کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کی سزا بھی دوزخ ہے۔ دونوں باہم مشابہ ہیں۔

اصل کلام اس طرح تھا کہ جو شخص خدا کی نازل کردہ دلیل پر قائم ہو کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو محض دنیا کا طلب گار ہے۔ مَنْ كَانَ سے مخلص مؤمن مراد ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ مراد ہیں یعنی حضور ﷺ کی ذات مع متبعین کے۔ کیونکہ لفظ مَنْ عام ہے (خاص ذات مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں) پھر آگے آیت اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ میں مَنْ کی طرف جمع کی ضمیر بھی لوٹائی گئی ہے

بقول ابو الشیخ ابو العالیہ اور ابراہیم تیمی کے نزدیک مَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ سے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کی طرف بھی اس تفسیر کی نسبت کی ہے۔ ابو نعیم نے المعرفہ میں بھی اس قول کو نقل کیا ہے۔ بَيِّنَةٍ سے مراد قرآن مجید ہے۔

وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ اور اس بینہ (قرآن) کی اللہ کی طرف سے ایک شاہد (یعنی جبرئیل یا اللہ کا رسول) تلاوت کرتا ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اور اس کے (نزول سے) پہلے موسیٰ کی کتاب (یعنی توریت اللہ کی طرف سے شاہد ہے جو قرآن کی تصدیق کرتی ہے) اِمَامًا وَّرَحْمَةً

وہ (موسیٰ کی کتاب) ایسی ہے جو تعلیم احکام کے لحاظ سے امام اور رحمت ہے۔ شاہد سے مراد جبرئیل ہیں۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے مختلف سندوں سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں

ابن عدی نے الکامل میں اور عقیلی نے الضعفاء میں اور طبرانی و حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے، نیز ابن عدی اور حاکم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔ اس حدیث میں حکمت و علم سے علوم اولیاء کی طرف اشارہ ہے فقہاء کے علوم کی طرف اشارہ نہیں ہے علوم فقہیہ کا مدار تو صرف نقل پر ہی ہے۔ علم فقہ کے متعلق تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔

بعض کے نزدیک شاہد سے مراد انجیل ہے اور مِنْ قَبْلِهِ كِتٰبُ مُوْسٰٓى سے مراد توریت ہے بعض نے کہا بینہ عقلی برہان ہے اور شاہد قرآن ہے۔ حسین بن فضل نے کہا قرآن کا اسلوب بیان اور اعجاز شاہد ہے مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس اپنے مذہب کی کوئی دلیل عقلی اور برہان نقلی ہو اس کی طرح کیا وہ شخص ہو سکتا ہے جس کا قول و عمل دلائل کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی تائید اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب یعنی قرآن سے بھی ہو رہی ہے اور قرآن سے پہلے حضرت موسیٰ کی کتاب بھی برہان نقلی پر (اور قرآن کی تائید میں) شہادت دے رہی ہے۔ اس صورت میں مَنْ كَانَ سے مراد ہو گا سچا مؤمن مخلص۔

أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۔ یہی جماعت اس پر پکا ایمان رکھتی ہے۔

أُولٰٓئِكَ سے اشارہ مَنْ كَانَ کی طرف ہے کیونکہ بینہ پر قائم رہنے والی مسلمانوں کی جماعت ہے یعنی مسلمانوں کی جماعت ہی أُولٰٓئِكَ سے مراد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاہد کی جانب اشارہ ہو بشرطیکہ شاہد سے مراد حضرت علیؓ اور آپ کے پیرو ہوں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۔ اور جو شخص دوسرے فرقوں میں سے اس کا انکار کرے گا تو دوزخ اس کے وعدے کی جگہ ہے۔

الاحزاب (گروہ) سے مراد (مسلمانوں کے علاوہ) تمام مذاہب والے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت (دعوت) میں سے جو کوئی کافر و مشرک اور یہودی اور عیسائی ایسی حالت میں مرے گا کہ جس (ہدایت) کو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان نہ لایا ہو گا تو وہ ضرور دوزخیوں میں سے ہو گا۔ (رواہ مسلم)

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

سو (اے مخاطب!) تو قرآن کی طرف سے شک میں نہ پڑنا بلاشک و شبہ وہ سچی کتاب ہے تیرے رب کے پاس سے آئی ہے لیکن (باوجود ان دلائل کے) اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ یعنی فکر کی خرابی اور قوت غور کی کمزوری کی وجہ سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۔ اور ان لوگوں سے زیادہ ظالم (حق ناشناس) کون ہے جو اللہ پر اپنی طرف سے دروغ بندی کرتے ہیں۔ یعنی کسی کو اس کی اولاد و شریک قرار دیتے ہیں یا اس کی طرف ان احکام و تعلیم کی نسبت کرتے ہیں جو اس نے نازل نہیں کیے یا ان احکام کا انکار کرتے ہیں جو اس نے نازل کیے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہدایات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں یا کسی چیز کی تحریم کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ اس چیز کی تحریم اس کی طرف سے نہیں کی گئی یا کسی چیز کی تحلیل کو اس کی جانب منسوب کرتے ہیں حالانکہ اس چیز کو اس نے حرام کر دیا ہے۔

أُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ ۔ (قیامت کے دن) ان کو ان کے رب کے سامنے پیش کیا جائے گا ...... اور وہ ان سے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ ۔ اور گواہ کہیں گے یعنی اعمال لکھنے والے فرشتے کہیں گے۔

ابو الشیخ نے مجاہد کا یہی تفسیری قول نقل کیا ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اشہاد سے مراد انبیاء اور پیغمبر ہیں ضحاک کا بھی یہی قول ہے اس تفسیر کی تائید آیت فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا

جَرَمَ فعل ماضی ہے لازم بمعنی وَجَبَ اور بعد والا جملہ اس کا فاعل ہے یعنی آخرت میں سب سے بڑھ کر نامراد ہونا واجب ہو گیا ہے۔

بعض کے نزدیک لاَ جَرَمَ دو لفظوں سے مرکب ہے اور مرکب کا معنی ہے حقا اور بعد والا جملہ فاعل ہے یعنی ان کا سب سے زیادہ نامراد ہونا حق اور ثابت شدہ ہے۔ لاَ جَرَمَ کا معنی ہے لامحالہ۔ قاموس میں ہے لاَ جَرَمَ اور لاَ ذَا جَرَمَ اور لاَ اَنْ جَرَمَ اور لاَ اَنْ ذَا جَرَمَ اور لاَ جُرْمَ سب کا معنی ہے کوئی چارہ نہیں کہ، یا یقیناً، لامحالہ۔ یہ تو لفظ جرم کی لغوی وضعی تحقیق ہے لیکن استعمال میں کبھی اس کو بجائے قسم کے لے آتے ہیں اور اس وقت جواب میں لام تاکیدی استعمال کرتے ہیں، جیسے کہتے ہیں لاَ جَرَمَ لاَ تِیَنَّکَ

الْاَخْسَرُوْنَ اسم تفضیل کا صیغہ ہے یعنی سب سے زیادہ نقصان اور خسارہ یاب بات یہ ہے کہ دوسروں کی نامرادی تو کفر اور معاصی کی وجہ سے ہوگی اور یہ خود کافر ہونے کے علاوہ دوسروں کو بھی ایمان سے روکنے والے ہیں اس لیے ان کی نامرادی سب سے زیادہ ہوگی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور (دل سے) اپنے رب کی طرف جھکے وہی جنتی ہوں گے، وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اَخْبَتُوْا کا ترجمہ کیا ہے خَافُوْا (ڈرے، اللہ سے خوف کیا) قتادہ نے کہا رجوع کیا، اللہ کی طرف لوٹے، مجاہد نے کہا اطمینان حاصل کر لیا (یعنی ایمان کے بعد مرتبۂ اطمینان پر فائز ہو گئے) قاموس میں ہے اَخْبَتَ فروتنی کی، خشوع کیا خَبِيْتٌ حقیر چیز۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ دونوں فریقوں کی مثال (ایسی ہے) دونوں فریقوں سے مراد ہے مومنوں کا فریق اور کافروں کا فریق۔

كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ جیسے (ایک) اندھا بہرا ہو اور (دوسرا) بینا شنوا۔ کافروں کے پاس کوئی حق نشانی نہیں، وہ حق کی بات نہیں سنتے اور راہ حق نہیں دیکھتے، حق کا راستہ ان کو بجھائی نہیں دیتا اس لیے وہ اندھے بہرے کی طرح ہیں اور مومن پیام حق سنتے اور اس کو قبول کرتے ہیں اور راہ حق اپنی قلبی خدا داد روشنی سے دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں اس لیے ان کے حالت بینا اور شنوا کی طرح ہے۔

هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ کیا یہ دونوں فریق تمثیل میں یا صفت میں یا حالت میں برابر ہیں۔[1]

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ کیا اب بھی تم نصیحت اندوز نہیں ہو گے یعنی ان تمثیلات کے بیان اور ان پر غور کرنے کے بعد بھی نصیحت قبول نہیں کرو گے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اور یقیناً ہم نے نوح کو پیغمبر بنا کر ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اور نوح نے کہا تھا کہ) میں تم کو (اللہ کے عذاب سے) واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

مُبِيْنٌ کا یہ مطلب ہے کہ میں تم کو عذاب اور ثواب کے اسباب سے کھول کر اطلاع دے رہا ہوں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝ کھول کر بیان کر رہا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو۔ (اگر ایسا نہ کرو گے تو) مجھے دکھ والے دن کے عذاب کا تمہارے متعلق ڈر ہے اَلِيْمٌ یعنی المناک

[1] مثل اور مثیل اور مثل کے معنی ہم شبیہ ہم شکل اور نظیر کے بھی ہیں اور صفت کے بھی اور عظیم الشان حالت کے بھی اور قصہ کیفیت حالت کے بھی۔ اس جگہ یا تمثیل مراد ہے یا صفت یا حالت۔ حضرت مفسرؒ کی تشریح میں اسی طرف اشارہ ہے۔

کو اپنے پاس سے نکال دو گے اس درخواست کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں میں ان کو نکالنے والا نہیں (کیونکہ یہ لوگ یقیناً اپنے رب سے ملیں گے اور وہاں نکالنے والے سے جھگڑا کریں گے یا یہ مطلب کہ یہ لوگ رب کے قرب کو پہنچیں گے اور ضرور کامیاب ہو جائیں گے ایسے مقربان خداوندی کو میں اپنے پاس سے کیسے نکال سکتا ہوں۔

وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ لیکن واقعی میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ جہالت کر رہے ہو۔ یعنی اپنے رب کی ملاقات سے ناواقف ہو یا اپنے انجام سے ناواقف ہو یا ان مومنوں کے مرتبۂ قرب کو نہیں جانتے یا اس بات سے ناواقف ہو کہ تمہارا ان کو رذیل قرار دینا حماقت ہے یا ان کو نکال دینے کی درخواست نادانی سے کر رہے ہو۔

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ اور اے میری قوم (ایسے مرتبہ والوں کو) جب میں نکال دوں گا تو اللہ سے مجھے کون بچائے گا اور میرے اوپر سے اس کے عذاب کو کون دفع کرے گا۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ تو کیا اب بھی تم نصیحت پذیر نہ ہو گے اور اتنی بات بھی نہیں سمجھو گے کہ ان کو نکال دینا صحیح نہیں ہے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کے ذخیرے میرے پاس جمع ہیں یعنی مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں تم پر مالی فضیلت رکھتا ہوں اور میرے پاس خداداد مال کے خزانے ہیں۔

وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب سے واقف ہوں کہ تم کو میری اس بات پر تعجب ہو اور تم مجھے جھوٹا سمجھو یا یہ مطلب ہے کہ میں غیب داں نہیں کہ ان لوگوں کا بغیر غور و تامل کے محض سطحی طور پر ایمان لانا مجھے معلوم ہو جائے۔

وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں کہ تم انکار کر سکو اور تم کو یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ تو تو ہماری طرح آدمی ہے فرشتہ نہیں ہے۔

وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا اور جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقیر جانتی ہیں میں نہیں کہتا کہ اللہ ان کو بھلائی عطا نہیں فرمائے گا۔

یعنی جن لوگوں کو ان کی مفلسی کی وجہ سے تم حقیر سمجھتے ہو اور ان کو رذیل کہتے ہو چونکہ ظاہری ناداری اور مفلسی کو آنکھوں سے دیکھ کر وہ حقیر جانتے تھے ان کے کمالات اور فضائل باطنہ پر غور نہیں کرتے تھے اس لئے حقیر جاننے کی نسبت آنکھوں کی طرف کلام کو پُرزور بنانے کے لئے کر دی (ورنہ آنکھوں کا کام حقیر جاننا نہیں تحقیر ہو یا اعزاز اس کو جاننا انسان کے دماغ کا کام ہے) بلکہ دنیا میں اللہ نے ان کو ایمان و ہدایت کی جو توفیق عطا فرمادی اور آخرت میں جو بلندیٔ مرتبہ اور جنت عطا فرمائے گا وہ تمہارے اس دنیوی مال و جاہ سے بہتر ہے (پھر میں کیسے کہہ دوں کہ اللہ ان کو بھلائی نہیں عطا فرمائے گا)

اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ان کے دلوں میں (کیسی اللہ کی محبت ہے اور ان کے عقائد و خصائل کتنے صحیح اور اعلیٰ ہیں) جو کچھ بھی ہے اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔

اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ایسی حالت میں (اگر میں ان کو اپنے پاس سے نکال دوں اور کہہ دوں کہ اللہ ان کو کوئی بھلائی عطا نہیں فرمائے گا تو) میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ

قوم والوں نے کہا نوحؑ جھگڑا تو تم ہم سے بہت کر چکے (یہ باتیں سب بیکار ہیں ان کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا) اب تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس کی دھمکیاں تم ہم کو دیتے ہو اگر (نبوت کے دعوے میں اور عذاب کی وعید میں) تم سچے ہو۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ نوحؑ نے کہا (میرے اختیار میں نہ

عذاب لاتا ہے نہ تمہاری درخواست فوراً پوری کرتا) اگر اللہ ہی چاہے گا تو تم پر عذاب لے آئے گا اور تم اس کو بے بس کر دینے والے نہیں (کہ آنے والے عذاب کو ٹال سکو یا اس سے بھاگ سکو)

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ

اور اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اور میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں تو میری نصیحت تمہارے لئے کچھ سودمند نہ ہوگی۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ گمراہ کرنے کا تعلق بھی اللہ کی مشیت سے ہے اور مشیت الٰہیہ کے خلاف واقع ہونا ناممکن ہے (اگرچہ حکم خدا کے خلاف واقع ہونا ممکن ہے بلکہ بکثرت نافرمانیاں کی جاتی ہیں)۔ یُغْوِیَكُمْ کے معنی ہیں یُهْلِكَكُمْ یعنی اللہ اگر تم کو ہلاک کرنا ہی چاہتا ہے تو میری نصیحت تمہارے لئے مفید نہ ہوگی (اور تم ہلاکت سے نہ بچ سکو گے) اس وقت یہ لفظ غَوِیَ الْفَصِیْلُ سے ماخوذ ہوگا (غَوِیَ الْفَصِیْلُ اونٹ کا بچہ ہلاک ہو گیا)

هُوَ رَبُّكُمْ وہی تمہارا رب ہے یعنی خالق ہے اور جس طرح چاہے تصرف کرنے والا ہے۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر لے جایا جائے گا وہی تمہارے عمل کا بدلہ دے گا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے یہ قرآن خود بنا کر اللہ پر دروغ بندی کی ہے (مقاتل)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس جملہ کا اور اس کے بعد والے تینوں جملوں کا تعلق بھی حضرت نوحؑ کے قصے سے ہے (کیا نوح کی قوم والے کہتے تھے کہ نوح نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے۔

قُلْ (اے محمد یا اے نوح) آپ کہہ دیجئے۔

اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ اگر میں نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے تو میرے جرم کا وبال مجھ پر پڑے گا۔

اِجْرَام جرم کرنا، گناہ کرنا۔

وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝ اور میں تمہارے جرم سے پاک ہوں۔ یعنی تم جو کہہ رہے ہو کہ تو نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے یہ تم لوگوں کا جرم ہے میں اس سے بیزار ہوں۔

ع ۳

بغوی نے بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ نوحؑ کی قوم والے آپ کو اتنا مارتے تھے کہ آپ گر پڑتے تھے اور مردہ سمجھ کر لوگ لبادہ میں لپیٹ کر گھر ڈال جاتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ نوحؑ مر گئے لیکن دوسرے روز آپ پھر باہر نکل کر لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی لاٹھی کے سہارے سے چلتا ہوا آیا اس کا بیٹا ساتھ تھا بیٹے سے اس نے کہا بیٹے اس دیوانے بوڑھے کے دھوکے میں نہ آجانا۔ بیٹے نے کہا باپ مجھے لاٹھی دیجئے باپ نے لاٹھی دے دی بیٹے نے لاٹھی لے کر حضرت نوحؑ کے سر پر ماری اور آپ کو سخت زخمی کر دیا اس پر حضرت نوحؑ کے پاس اللہ کی طرف سے وحی آئی۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ اور نوحؑ کے پاس وحی بھیجی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے (لا چکے) ان کے سوا کوئی ایمان نہیں لائے گا

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ سو جو کچھ (تکذیب اور ایذا کا سلوک) یہ تمہارے ساتھ کرتے رہے ہیں اس سے رنجیدہ نہ ہو (عنقریب ان کو ہلاک کر دیا جائے گا)

اللہ نے نوحؑ کو آئندہ کسی کے مؤمن ہونے سے ناامید کر دیا تاکہ آپ ناحاصل تبلیغ کی تکلیف سے محفوظ رہیں اور آئندہ کسی کی ہدایت سے ناامید ہو کر ان کے لئے بد دعا کریں جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ اللہ ان کو ہلاک کرنے والا ہے تو دعا میں آپ نے کہا لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ قوم نوح والے حضرت نوحؑ کو پکڑ کر گلا گھونٹتے تھے کہ آپ بیہوش ہو جاتے تھے۔ جب آپ کو ہوش آتا تو دعا کرتے الٰہی میری قوم کو معاف کر دے وہ نادان ہیں جب قوم کی

نافرمانی بڑھتی چلی گئی اور قوم کے ہاتھوں سے دکھ اور اذیت میں اضافہ مسلسل ہوتا رہا تو آپ ناامید ہو گئے اور آئندہ نسل کا انتظار کرنے لگے کہ شاید ان کی اگلی نسل ہدایت یاب ہو جائے مگر جو بھی نسل ہوتی نسل چلی گئی اور ہر پچھلا اگلے سے زیادہ خبیث ہوتا رہا اور پچھلے لوگ کہنے لگے یہ دیوانہ تو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آتا ہے ان کی بات پر کوئی کان نہیں لگاتے تھے آخر حضرت نوحؑ نے اللہ سے استغاثہ کیا عرض کیا اور دعا کی رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا اسی کلام کے آخر میں عرض کیا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اس وقت وحی آئی۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا اور بنا کشتی ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق یعنی ہم نے جیسا تم کو بتایا ہے ویسی بنانا ہمارے حکم کے موافق بنا (اس صورت میں وحی کا معنی ہوگا حکم)

حضرت ابن عباسؓ نے اَعْیُن کا ترجمہ کیا ہے "نظر" اور مقاتل نے اعین سے مراد لی ہے "علم" بعض نے ترجمہ کیا ہے نگرانی، حفاظت۔ آنکھ کو نگرانی اور حفاظت میں دوسرے تمام حواس سے زیادہ دخل ہے اس لئے نگرانی کو اعین (چشم) کے لفظ سے تعبیر کیا۔

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ اور ان ظالموں کو (بچانے) کے سلسلہ میں مجھ سے کوئی خطاب (دعا) نہ کرنا کیونکہ بلاشبہ یہ غرق کئے جانے والے ہیں (ان کو ضرور غرق کیا جائے گا) مطلب یہ کہ ان کو ڈبونے کا ازل میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ بغوی نے اس قصہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت نوحؑ سے آکر کہا آپ کا رب آپ کو کشتی بنانے کا حکم دے رہا ہے۔ نوحؑ نے کہا میں تو نجار (بڑھئی) نہیں ہوں کیسے بناؤں۔ جبرئیلؑ نے کہا آپ کا رب فرماتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے ہے کشتی بنا (غلطی نہ ہوگی) نوحؑ بنانے لگے اور ٹھیک ٹھیک بنانے لگے یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے کشتی کا پیندا پرندے کے سینہ کی شکل کا (یعنی سینہ ابھری ہوئی) بنایا۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ اور نوحؑ کشتی بنا رہے تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ قوم کی طرف سے غافل ہو کر کشتی بنانے میں مشغول ہو گئے ادھر قوم نوحؑ کی ساری عورتیں بانجھ ہو گئیں سو برس تک ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا نوحؑ تختے چیرنے اور لوہا لگانے اور کشتی کے لئے ضروری سامان کی تیاری کرنے لگے مثلاً تارکول یا روغن قیر (ملنے لگے) لوگ ادھر سے گزرتے اور آپ کو مشغول دیکھ کر کہتے تھے۔

وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ اور جب سرداران قوم ادھر سے گزرتے تھے تو نوحؑ سے تمسخر کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ خشکی میں کشتی بنا رہے تھے قریب کہیں پانی بھی نہیں تھا اس لئے لوگ تمسخر کرتے اور کہتے تھے نوحؑ پہلے تم نبی تھے اب بڑھئی بن گئے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ لوگ پوچھتے نوحؑ کیا بنا رہے ہو حضرت نوحؑ جواب دیتے میں ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا لوگ آپ کی ہنسی بنانے لگے۔

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ نوحؑ نے کہا اگر (آج) تم ہم سے تمسخر کر رہے ہو تو (آئندہ) ہم بھی تم سے ایسا ہی تمسخر کریں گے جیسا تم کر رہے ہو۔ یعنی جس طرح کشتی بنتے دیکھ کر تم ہم سے تمسخر کر رہے ہو آئندہ ہم بھی تم کو طوفان میں ڈوبتے اور دوزخ میں جاتے دیکھ کر تمسخر کریں گے اس کا معنی تو یہ ہے کہ جس طرح تم اب ہم کو نادان اور جاہل قرار دے رہے ہو آئندہ ہم بھی تم کو جاہل قرار دیں گے یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت تم ہماری ہنسی بنا رہے ہو آئندہ تم کو اپنی اس مشغول ہنسی کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ اور آئندہ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کن عذاب آنے کا اور دائمی عذاب نازل ہوگا۔ چنانچہ طوفان میں غرق ہونے کا عذاب ان پر آیا اور سب ڈوب کر عالم برزخ میں پہنچ گئے جہاں قیامت تک ان پر عذاب ہوتا رہے گا پھر قیامت میں ان پر عذاب ہوگا اور دوزخ میں

ڈال دیا جائے گا۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تورات کا خیال ہے کہ اللہ نے نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ ساگوان یا ساکھو کی لکڑی کی کشتی بنائیں جس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا ہو اور کشتی کے اندر باہر ہر طرف روغن قار کا پالش کر دیں، کشتی کی لمبائی اسی ہاتھ، چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ ہو۔ ہاتھ سے مراد ہے انگلیوں کے پوروں سے مونڈھے تک پورا ہاتھ (یعنی آدھا گز مراد نہیں ہے) اور تین منزلیں بنائیں، نچلی، درمیانی اور بالائی اور بالائی منزل میں دریچے رکھیں۔ حضرت نوحؑ نے حکم کے مطابق کشتی بنائی۔ اسحاق بن بشر اور ابن عساکرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اللہ نے جب نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا تو نوحؑ نے عرض کیا میرے مالک تختے کہاں ہیں اللہ نے فرمایا ساگوان یا ساکھو کا درخت لگاؤ، نوحؑ نے ساکھو کا درخت بویا بیس برس تک وہ درخت پرورش پاتا رہا اس مدت میں نہ حضرت نوحؑ نے تبلیغ کی نہ قوم والوں نے کوئی استہزاء کیا، جب درخت بھرپور ہو گیا تو اللہ کے حکم سے نوحؑ نے اس کو کاٹ کر خشک کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں گھر (یعنی کشتی کی شکل) کیسے بناؤں۔ حکم ہوا اس کی تین شکلیں بناؤ، سر تو مرغ کے سر کی طرح ہو اور پچھلا حصہ بھی مرغ کی دم کی طرح اور سینہ پرندے کے سینہ کی طرح (آگے کو نکلا ہو) اور دونوں پہلوؤں پر دریچے ہوں اور لوہے کی کیلوں سے اس کو مضبوط کر دیا گیا ہو۔ اللہ نے جبرئیلؑ کے ذریعہ نوحؑ کو کشتی بنانا سکھا دی۔

ابن عساکر نے سعید بن مسیب کی وساطت سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اور حضرت کعبؓ کا بیان بھی یہی نقل کیا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نوحؑ نے دو سال میں کشتی تیار کی، کشتی کا طول تین سو ہاتھ اور عرض پچاس ہاتھ اور اوپر کو بلندی تیس ہاتھ تھی۔ کشتی کی ساخت ساکھو کے تختوں کی تھی اور تین درجے تھے، نچلے درجہ میں جنگلی جانور اور درندے اور چوپائے تھے، درمیانی منزل میں گھوڑے یا اونٹ (اور پالتو چوپائے) تھے اور بالائی منزل میں حضرت نوحؑ اور آپ کے ساتھی اور کھانے پینے کا ضروری سامان تھا۔

ابن مردویہ نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ کشتی کا طول تین سو ہاتھ، عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے جو روایت کی ہے اس میں عرض کا ذکر نہیں ہے۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابو الشیخ نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی میں درمیانی تیس ہاتھ تھی۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ عرض میں اس کا دروازہ تھا۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا کہ کشتی کے تین طبقے تھے۔ ایک طبقے میں جنگلی جانور چوپائے اور درندے تھے دوسرے طبقے میں پرندے تھے۔ شرح خلاصۃ السیر میں ہے کہ نچلے طبقے میں پرندے، چوپائے اور جنگلی جانور وغیرہ تھے اور درمیانی طبقے میں کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے تھے اور بالائی طبقہ آدمیوں کے لئے تھا۔

ثعالبی نے لکھا ہے کہ کشتی کا طول اسی ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ اور بلندی اوپر کو تیس ہاتھ اور ہاتھ سے مراد ہے (پنجہ سے مونڈھے تک)

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ کشتی کی لمبائی چھ سو ہاتھ تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ایک روایت میں حسن کا قول آیا ہے کہ کشتی کا طول بارہ سو ہاتھ اور عرض چھ سو ہاتھ تھا۔ مشہور اول روایت ہے کہ طول تین سو ہاتھ تھا۔

زید بن اسلم کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ سو برس تک درخت بوتے اور (لکڑی) کاٹتے رہے اور سو برس تک کشتی بناتے رہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ چالیس برس تک درخت بوئے اور چالیس برس تک (ان کی لکڑی کو) خشک کرتے رہے۔ کعب احبار کا قول آیا ہے کہ نوحؑ نے تیس برس میں کشتی بنائی۔ یہ بھی منقول ہے کہ کشتی کی تین منزلیں تھیں، نچلا درجہ چوپایوں اور جنگلی جانوروں کے لئے تھا، درمیانی منزل میں آدمی تھے اور بالائی طبقے میں پرندے، جب جانوروں کا گوبر زیادہ ہو گیا تو نوحؑ کے پاس

وحی آئی ہاتھی کی دم دبا دو، دم دبانے سے ہاتھی کے اندر سے ایک سور اور سورنی نکل پڑی اور دونوں نے گوبر (کھا کر) صاف کر دیا۔ چوہوں نے جب کشتی کو نقصان پہنچایا اور رسیاں کاٹنے لگے تو اللہ کی طرف سے نوحؑ کو حکم ہوا شیر کی دونوں آنکھوں کے درمیان ضرب لگاؤ، ضرب لگاتے ہی شیر کی ناک کے سوراخوں سے ایک بلی اور ایک بلا نکل پڑے دونوں چوہوں پر دوڑ پڑے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم) آپہنچا اور تنور ابل پڑا۔
ابو الشیخ نے عکرمہ اور زہری کا قول نقل کیا ہے کہ تنور کا معنی ہے روئے زمین۔ البغوی نے بھی یہی نقل کیا ہے۔ سعید بن منصور، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی کی ہے۔ صورت اس طرح ہوئی کہ حضرت نوحؑ سے کہا گیا جب تم روئے زمین پر پانی ابلتا دیکھو تو کشتی میں سوار ہو جانا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں تنور سے مراد ہے زمین کا اونچا بلند حصہ۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ آیت میں عین الوردہ مراد ہے۔ جو جزیرہ میں ایک چشمہ تھا۔

ایک روایت میں حضرت علیؓ کا قول آیا ہے کہ فار التنور کا مطلب یہ ہے کہ فجر نکل آئی اور صبح کی روشنی ہو گئی۔ حسن، مجاہد اور شعبی نے تنور سے مراد لیا ہے تنور نانبائی جس میں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ بروایت عطیہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا مطلب اس طرح فرمایا جب تم اپنے گھر کے تنور سے پانی نکلتا دیکھو تو سمجھ لو یہ تمہاری قوم کا پیام ہلاکت ہے۔ حسن نے کہا پتھروں سے بنا ہوا ایک تنور تھا جس میں حضرت حوا روٹی پکایا کرتی تھیں (وراثۃً) وہ حضرت نوحؑ کے پاس پہنچ گیا اور آپ کو حکم ہوا کہ جب تنور سے پانی ابلتا دیکھو تو تم اپنے ساتھیوں کو لے کر سوار ہو جانا۔

یہ تنور کہاں تھا مجاہد اور شعبی نے کہا کوفہ کے ایک کنارہ پر تھا۔ شعبی نے اللہ کی قسم کھا کر کہا تنور کوفہ کے کنارہ سے ہی جوش زن ہوا تھا۔ نوحؑ نے کوفہ کی مسجد کے اندر ہی کشتی تیار کی تھی اور باب کندہ کی جانب سے مسجد میں داخل ہونے والے کے دائیں جانب وہ تنور تھا اور تنور سے پانی کا ابلنا حضرت نوحؑ کے لئے (طوفان آنے کی) علامت تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مسجد کوفہ کے اندر باب کندہ کی جانب سے تنور ابلا تھا۔ ابو الشیخ نے بواسطہ شعبی، نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس نے دانہ کو چیرا اور جاندار کو پیدا کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی چار مسجدوں میں چوتھی مسجد ہے اور سوائے مسجد حرام (کعبہ) اور مسجد رسول اللہ ﷺ کے دوسری کسی مسجد میں دس رکعت نماز پڑھنے سے اس مسجد میں دو رکعت پڑھنا مجھے زیادہ عزیز ہے۔ اسی کے دائیں جانب قبلہ کی طرف تنور ابلا تھا۔

مقاتل نے کہا یہ حضرت آدمؑ والا تنور تھا اور شام میں اس جگہ واقع تھا جس کو عین وردہ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ یہ تنور ہند میں تھا (معلوم نہیں ہند سے مراد ہندوستان ہے یا وہ مقام جو عراق میں ہے) یہ قول ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی قرار دیا ہے۔

(فار ماضی کا صیغہ ہے اس کا مصدر فور اور فوران ہے) فوران کا معنی ہے جوش زن ہونا (ابلنا، اچھلنا)۔

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ہم نے کہا ہر ایک (قسم کے جانوروں) میں سے ایک ایک نر اور ایک مادہ یعنی دو عدد کشتی میں چڑھا لو۔

زوجین زوج نر و مادہ کا جوڑ ہوتا ہے اور مادہ نر کا جوڑ۔ نر یا مادہ کوئی بھی دوسرے سے بے نیاز نہیں ہوتا اس لئے ہر ایک کو جوڑ کہا جاتا ہے ہر ایک مفرد کو دوسرے مفرد کا اور ہر جوڑ کو دوسرے جوڑ کا زوج (جوڑ) کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حیوان کا ایک جوڑا نر و مادہ، کشتی میں سوار کر لو، لفظ اثنین، زوجین کی تاکید ہے اور زوجین مفعول ہے۔

غَنی نُوْحٍ فِی الْفُلْکِ یعنی چڑھا اس کو سانپ اور بچھو نے کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔
حسن کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی میں صرف ان جانوروں کو چڑھایا جو بچہ یا انڈا دیتے ہیں جو کیچڑ سے پیدا ہیں جیسے بچھو پسو وغیرہ ان کو کشتی میں سوار نہیں کیا تھا۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا اور نوحؑ نے کہا کشتی میں سوار ہو جاؤ چڑھتے ہوئے۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اللہ ہی کے نام کے ساتھ (یا سبب و مدد سے) ہے کشتی کا چلنا اور لنگر انداز ہونا (یعنی ٹھہرنا) مجریٰ اور مرسیٰ یا ظرف زمان ہے یعنی چلنے اور ٹھہرنے کا وقت یا ظرف مکان ہے یعنی چلنے اور ٹھہرنے کا مقام یا مصدر ہے یعنی چلنا اور ٹھہرنا۔

اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے یعنی اگر وہ تمہارے قصور معاف نہ کرتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم کو نجات نہ ملتی۔

بغوی نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے جب ارادہ کیا کہ کشتی رواں ہو جائے تو بسم اللہ کہا کشتی چل دی اور جب کشتی کو ٹھہرانا چاہا تو بسم اللہ کہا کشتی ٹھہر گئی۔

وَهِىَ تَجْرِىْ بِهِمْ فِىْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ اور کشتی ان کو لے کر پہاڑوں جیسی موجوں میں چلنے لگی۔ مَوْجٍ موجۃ کی جمع ہے لہریں۔

وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِىْ مَعْزِلٍ اور نوحؑ نے پکارا اپنے بیٹے کو اور بیٹا قوم سے یا دین نوحؑ سے الگ تھا۔

يّٰبُنَىَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اے میرے پیارے بیٹے! (ایمان لے آ اور) ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں کے ساتھ نہ رہ۔ (یعنی کافروں کے مذہب یا ہم سے الگ رہنے میں کافروں کے ساتھ شامل نہ ہو) اس بیٹے کا نام کنعان یعنی ابن عمیر یام تھا۔

قَالَ سَاٰوِىْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِىْ مِنَ الْمَآءِ بیٹے نے کہا میں (آپ کے ساتھ سوار نہیں ہوں گا بلکہ) پہاڑ کی پناہ پکڑ لوں گا وہ مجھے پانی سے بچا لے گا (یعنی پہاڑ پر چڑھ کر ڈوبنے سے محفوظ ہوں گا)۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ نوحؑ نے کہا آج اللہ کے عذاب سے (جس کا حکم ہو چکا ہے) بچانے والا کوئی نہیں سوائے اس کے جس پر وہ رحم کرے۔

مستثنیٰ یا متصل ہے اور مَنْ محل رفع میں ہے یعنی رحم کرنے والا اللہ ہی بچا سکتا ہے یا لفظ مکان محذوف ہے یعنی اسی شخص کا مقام بچا سکتا ہے جس پر اللہ رحم کر دے یعنی اہل ایمان کا مقام، مطلب یہ کہ پہاڑ وغیرہ کوئی چیز بچا نہیں سکتی ہاں کشتی جو اہل ایمان کا مقام ہے ڈوبنے سے بچا سکتی ہے۔

یا مَنْ محل نصب میں ہے یعنی آج کوئی بھی محفوظ نہ رہے گا سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے۔ یا استثناء منقطع ہے یعنی سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے اللہ اس کو بچالے گا۔

وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ اور دونوں کے درمیان یعنی نوحؑ اور ان کے بیٹے کے درمیان یا پسر نوح اور پہاڑ کے درمیان لہریں حائل ہو گئیں اور وہ غرق کردہ لوگوں میں سے ہو گیا۔ یعنی ڈوبنے والوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔ یا علم الٰہی میں پہلے ہی یہ بات تھی روایت میں آیا ہے کہ پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے چالیس ہاتھ یا پندرہ ہاتھ اوپر چڑھ گیا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے، بعض روایات میں آیا ہے جب گلی کوچوں میں پانی بہت بڑھ گیا تو ایک بچے کی ماں کو اپنے بچے کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہوا وہ بچے کو لے کر پہاڑ کی طرف بھاگی۔ پہاڑ کے ایک تہائی حصہ پر ہی چڑھی تھی کہ کچھ دیر میں وہاں تک پانی پہنچ گیا عورت اور اوپر چڑھ گئی اور دو تہائی پہاڑ تک پہنچ گئی پانی وہاں بھی پہنچ گیا تو عورت اور اوپر چڑھی اور چوٹی پر پہنچ گئی، مگر

پانی وہاں بھی پہنچ گیا اور عورت کے گلے تک آگیا اس نے بچے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا، آخر پانی عورت کو بہالے گیا۔ اگر (اس روز) اللہ کسی پر رحم کرنے والا ہوتا تو اس بچے کی ماں پر ضرور کرتا۔

میں کہتا ہوں یہ قصہ اس روایت کے خلاف ہے جس میں آیا ہے کہ طوفان آنے سے برسوں پہلے سے قوم نوح کی عورتیں بانجھ ہو گئی تھیں، طوفان آنے کے وقت کوئی بچہ نہ تھا۔

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ اور حکم دیا گیا (یعنی امر طوفان پورا ہونے کے بعد زمین کو حکم دیا گیا) اے زمین اپنا پانی پی لے (نگل لے، جذب کر لے) یعنی وہ پانی جو تیرے اندر سے پھوٹ کر نکلا ہے وہ جذب کر لے۔ زمین نے اپنے اندر سے نکلا ہوا پانی جذب کر لیا۔ آسمان سے برسا ہوا پانی باقی رہا اور دریاؤں اور نہروں کی شکل میں (سمٹ کر) بہنے لگا۔

وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي اور اے آسمان تھم جا، پانی برسانا ختم کر دے۔ آسمان سے بارش ہونی بند ہو گئی۔

وَغِيضَ الْمَاءُ اور پانی کم کر دیا گیا یعنی اللہ نے پانی کو کم کر دیا۔ یغیض فعل لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ اس جگہ متعدی ہے۔

وَقُضِيَ الْأَمْرُ اور کام تمام کر دیا گیا (کام پورا ہو گیا) یعنی اللہ نے کافروں کو ہلاک کرنے اور مومنوں کو بچانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا۔

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ اور کشتی جودی پر ٹھہر گئی۔ جودی جزیرہ میں موصل کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے یا ملک شام میں ایک پہاڑ ہے۔

وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ اور کہا گیا (یعنی اللہ نے فرمایا) دوری ہو ظالم قوم کو یا ظالم قوم اللہ کی رحمت سے دور ہو گئی اور سب ہلاک ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے زمین کی خبر لانے کے لئے کوے کو بھیجا، وہ کسی مردار پر جا پڑا اور لوٹ کر نہیں آیا تو آپ نے کبوتر کو بھیجا، کبوتر واپس آیا تو اس کی چونچ میں زیتون کا ایک پتہ تھا اور پاؤں کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت نوحؑ سمجھ گئے کہ پانی خشک ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے کوے کو بددعا دی کہ ہمیشہ ڈرتا رہے۔ اسی بددعا کا اثر ہے کہ کوا گھروں میں نہیں رہتا اور کبوتر کی گردن میں ایک سبز کنٹھا ڈال دیا اور اس کو امن کی دعا دی اسی لئے وہ گھروں میں رہنے کا عادی ہے۔

عبد بن حمید، ابن منذر اور ابوالشیخ نے بیان کیا قتادہ نے کہا ہم سے ذکر کیا گیا تھا کہ دس رجب کو کشتی سب کو لے کر اٹھی اور ایک سو پچاس روز پانی میں ساری پھرتی رہی پھر ایک ماہ تک جودی پر ٹھہری اور لوگ کشتی سے اترے۔ ابن عساکر نے خالد بن معدان کی روایت سے نقل کیا ہے کہ عاشورہ کے دن کشتی ٹھہری۔ حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھ والے جانوروں سے فرمایا آج روزہ رکھو۔

بغوی نے بھی لکھا ہے کہ نوحؑ دس رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور چھ مہینے تک کشتی چلتی رہی اور بیت اللہ کعبہ کی طرف سے گزری تو اس کے گرد سات چکر لگائے کیونکہ اللہ نے اوپر اٹھا دیا تھا اس کی جگہ ڈوبنے سے بچ رہ گئی تھی۔ دس محرم کو کشتی سے اترے حضرت نوحؑ نے شکرانہ کا روزہ خود بھی رکھا اور ساتھ والوں کو بھی حکم دیا۔

بعض اقوال میں آیا ہے کہ صرف ایک کافر یعنی عوج بن عنق ڈوبنے سے بچ گیا تھا طوفان کا پانی اس کی کمر تک آیا تھا، بچنے کی وجہ یہ تھی کہ کشتی کے لئے ساگوان کی لکڑیوں کی ضرورت تھی اور ان کو ڈھونا ممکن نہ تھا تو یہ ملک شام سے ڈھو کر حضرت نوحؑ کو لکڑیاں دے گیا تھا۔

میں کہتا ہوں عوج کی یہ داستان قرآن مجید کی ظاہری عبارت کے خلاف ہے اللہ نے تو فرمایا ہے قَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا دوسری آیت میں ہے وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ اس سے پہلے آیا ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ (ان تمام آیات سے معلوم ہو رہا ہے کہ کوئی کافر زندہ نہیں بچا تھا) مجموعہ آیات سے کسی کی

مطابق اطلاع دی جیسی گزشتہ آسمانی کتابوں میں تھی۔ گزشتہ آسمانی کتابوں کے بیان سے اس اطلاع کی مطابقت یقیناً معجزہ ہے۔

فَاصْبِرْ پس آپ نوح کی طرح تبلیغ رسالت پر اور تبلیغ کے راستہ میں کافروں کی طرف سے پہنچنے والے دکھوں پر صبر کیجئے۔ کیونکہ

إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ بلاشبہ (دنیا و آخرت میں) اچھا نتیجہ اور انجام انہیں لوگوں کے لئے ہے جو شرک و معاصی سے بچنے والے ہیں۔ اس جملہ میں صبر کرنے اور صبر اختیار کرنے کی علت کا اظہار ہے۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا اور عاد کے پاس (ہدایت کے لئے) ان کے نسبی بھائی ہود کو ہم نے بھیجا۔

قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۝

ہود نے کہا اے میری قوم (برادران نسب) تنہا اللہ کی پوجا کرو (عبادت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو) اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (تم جو اس کی عبادت میں بتوں کو بھی حصہ دار بنا لیتے ہو اور ان کو دربار الٰہی میں اپنا سفارشی قرار دیتے ہو یہ) محض افترا ہے تم محض دروغ بندی کرنے والے ہو (کہ خود ایک عقیدہ تم نے تراش رکھا ہے اور خدا کی طرف اس کی نسبت کر دی ہے (مترجم)

يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا اے قوم (ہود) میں اس نصیحت پر تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کہ تم پر مالی بوجھ پڑے اور بوجھ پڑنے کی وجہ سے تم میری نصیحت کو نہ مانو یا مال کا لالچ مجھے دروغ تراشی پر آمادہ کرے۔

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي میرا ثواب تو بس اسی کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا (یعنی ثواب کا ذمہ تو اسی نے لے رکھا ہے اس لئے مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں۔ مترجم

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی کیا اپنی عقل سے کام لے کر تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ایسے بے لالچ مخلص کا قول جھوٹ کے احتمال سے بھی پاک ہوتا ہے اور اس کی تصدیق کرنی تم پر لازم ہے۔

وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اور اے قوم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو۔ یعنی سابق شرک اور گناہ کرنے کی معافی مانگو۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان لے آؤ مسلم ہو جاؤ۔ حضرت عمرو بن عاص کی مرفوع روایت صحیح مسلم میں آئی ہے کہ اسلام گزشتہ (گناہوں) کو ڈھا دیتا ہے۔

ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ پھر (شرک کو چھوڑ کر اور خالص توحید کے ساتھ تعلق پیدا کر کے) اس کی طرف لوٹو۔

يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وہ خوب بارشیں تم پر برسائے گا اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید ترقی دے گا۔

سورۂ اعراف میں ہم نے بیان کر دیا ہے کہ قوم ہود قحط سالی میں مبتلا ہو گئی تھی، تین سال سے بارش نہیں ہوئی تھی اور عورتیں بھی بانجھ ہو گئی تھیں کسی کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ حضرت ہود نے فرمایا اللہ سے استغفار اور توبہ کرو وہ پانی برسائے گا جس سے تمہاری مالی ترقی ہو گی اور وہی عورتوں کا بانجھ پن دور کرے گا اور بچے پیدا ہونے لگیں گے۔ اس طرح تم کو مال و اولاد کی مزید طاقت حاصل ہو جائے گی۔ بعض نے قوت سے مراد لی ہے بدنی طاقت یعنی اللہ تمہاری جسمانی طاقت بڑھا دے گا۔

وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ۝ اور مجرم رہ کر رخ گردانی مت کرو۔ یعنی اپنے جرم پر قائم رہتے ہوئے میری دعوت سے منہ نہ پھیرو اور جس چیز کی طرف آنے کی میں تم کو دعوت دے رہا ہوں اس سے اعراض نہ کرو۔

قَالُوا يَا هُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ قوم نے کہا ہود تم نے کوئی کھلی دلیل پیش نہیں کی۔ یعنی ایسی دلیل پیش نہیں کی جس سے تمہارے دعوے کی صحت ثابت ہو سکے۔ حضرت ہود نے معجزات تو پیش کئے تھے (جو ثبوت رسالت کے لئے کافی تھے) مگر قوم والوں کے دلوں میں عناد تھا اس لئے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝ اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کی عبادت چھوڑنے والے نہیں۔ اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں یعنی تمہاری تصدیق نہیں کریں گے مطلب یہ کہ نہ تمہارے قول کا عملی اتباع کریں گے کہ اپنے معبودوں کی عبادت ترک کر دیں۔ نہ اعتقادی تصدیق کریں گے۔

إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم کو ہمارے کسی معبود کا جھپٹا لگ گیا ہے۔

اعتریٰ (باب افتعال) عری یعرو سے ماخوذ ہے۔ عری کا معنی ہے پہنچ گیا۔ سوء سے مراد ہے جنون بدحواسی یعنی تم جو ہمارے معبودوں کو برا کہتے ہو اور ان کی عبادت سے ہم کو روکتے ہو تو ہمارے کسی معبود نے اس کا انتقام تم سے لیا ہے اور تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے کہ ایسی خرافات بک رہے ہو۔

یا ماضی بمعنی مضارع ہے کہ تم جو معبودوں کو برا کہتے ہو ہمارا یقینی خیال ہے کہ کوئی معبود تم کو چپٹ کر دے گا یا ہلاک کر دے گا چونکہ ایسا ہو جانا قوم کے نزدیک ضروری اور یقینی تھا۔ اس لئے قطعی دھمکی دینے کے لئے مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ بولا۔ ہود کا جواب آگے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ توجیہ اس کے مناسب ہے۔

قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝ مِن دُونِهِ ہود نے کہا میں اللہ کو شاہد بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ تم جو اللہ کے سوا دوسرے (بتوں وغیرہ) کو اس کا شریک قرار دیتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔ میں نہ اللہ کے سوا بتوں کی پوجا کرتا ہوں نہ کسی بت سے ڈرتا ہوں۔

فَكِيدُونِي جَمِيعًا پس اب تم سب (باہم امداد و تعاون کے ساتھ) مجھے دکھ پہنچانے اور ہلاک کرنے کی تدبیریں کر دیکھو۔

ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ۝ پھر مجھے مہلت بھی نہ دو۔ حضرت ہود کے اس کلام میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تمہاری تدبیریں میری نظر میں حقیر ہیں۔ مجھے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔ تمہارے معبود عاجز ہیں پتھر ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ آپ کا یہ قول ایک معجزہ تھا جو پورا ہوا۔ قوم والے شہ زور تھے بڑے طاقتور اور جابر ظالم تھے۔ آپ کے خون کے پیاسے بھی تھے مگر کچھ نہ بگاڑ سکے۔

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ

مجھے بلاشک و شبہ اللہ پر اعتماد ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہر جاندار کو اللہ پیشانی کے بالوں سے پکڑے ہوئے ہے۔ یعنی ہر جاندار اس کے پورے قابو میں ہے اسی کی قدرت و قابو کے آگے عاجز و ذلیل ہے وہ جیسا چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ناصیہ کا لفظ خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اگر کسی چیز کی ذلت و بے بسی کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو عرب کہتے ہیں فلاں شخص کے پیشانی کے بال فلاں شخص کے ہاتھ میں ہیں (جس طرف کو چاہے موڑ دے) اردو میں پیشانی کے بالوں کی جگہ گردن کا لفظ بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص کی گردن فلاں شخص کے ہاتھ میں ہے مطلب دونوں محاوروں کا ایک ہی ہے۔ (مترجم)

ضحاک نے کہا ناصیہ ہاتھ میں ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ ہی زندگی دیتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ فراء نے کہا وہی مالک اور قادر ہے۔ قتیبی نے کہا وہی ہر جاندار کو مقہور (بے بس) کر دیتا ہے جس کی پیشانی کے بال تم پکڑ لو وہ بے بس (و مقہور) ہو جاتا ہے۔

إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ یقیناً میرا رب سیدھے راستے پر ہے یعنی حق اور عدل پر قائم ہے نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو بدی کی سزا دے گا جو اس کا دامن پکڑ لے کبھی نامراد نہیں رہے گا۔

بغوی نے کہا بُعد کے دو معنی ہیں (۱) دوری یعنی قرب کی ضد (۲) ہلاکت۔ وکذا فی القاموس۔ جملہ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ بددعائیہ ہے مراد یہ ہے کہ قوم عاد اپنے مذکورہ جرم کی وجہ سے اس عذاب کی مستحق تھی جو ان پر آیا (مقصد یہ کہ جملہ اگرچہ دعائیہ انشائیہ ہے مگر خبریہ کے معنی کو ادا کرتا ہے جس کو کسی چیز کی خواہش ہو اور وقت دعا تک وہ حاصل نہ ہوئی ہو اور ہونا ممکن ہو وہ کس طرح اور کس سے دعا کر سکتا ہے اس کے دعائیہ کلام کا مطلب محض خبر ہے اور اس جگہ تو خبر کے ساتھ ساتھ یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ قوم عاد عذاب کی مستحق تھی جو عذاب ان پر آیا غلط نہیں آیا۔ (مترجم)

قوم عاد کی ہمیشہ کے لئے تباہی ظاہر کرنے اور ان کی حالت کو سبق عبرت بنانے کے لئے حرف تنبیہ (اَلَا) کو مکرر ذکر کیا۔ قوم ہود کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اس بات کی طرف کہ قوم کو مستحق عذاب و لعنت صرف اس وجہ سے ہوا کہ ہود کی رسول نے مخالفت کی۔ ہود کے اور قوم کے درمیان جو القرابت ہونے انہوں نے قوم کو مستحق لعنت و عذاب بنا دیا۔ (یہ بھی ممکن ہے کہ قوم ہود کہنے کی وجہ یہ ہو کہ عاد نام کی دو قومیں گزری ہیں عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ یعنی قوم ثمود اور آیت میں عاد اولیٰ یعنی قوم ہود مراد ہے قوم ثمود کا ذکر کرنا اس جگہ مطلوب نہیں ہے)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا صالح نے کہا اے میری قوم اللہ کی پوجا کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں ہے کیونکہ

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ اسی نے تم کو زمین کے مادے سے پیدا کیا یعنی تم کو آدم (کی نسل) سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے۔

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا اور تم کو زمین میں آباد کیا۔

اِسْتَعْمَرَ کا مادہ عمر ہے اور عمر سے یہ لفظ بنا ہے۔ ضحاک نے ترجمہ کیا ہے تمہاری عمریں دراز کیں، ۳۰۰ سے ۱۰۰۰ برس تک قوم ثمود والوں کی عمریں ہوتی تھیں۔ قوم ہود کی بھی لمبی عمریں تھیں۔

اِسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے تم کو زمین میں آباد ہونے کی قدرت دی تم کو زمین کا آباد کرنے والا اور زمین کا باشندہ بنا دیا۔

مجاہد نے کہا اِسْتَعْمَرَكُمْ کا لفظ عُمْرٰی سے مشتق ہے (عُمْرٰی ہبہ کی ایک قسم ہے عمر بھر کے لئے اگر کوئی چیز کسی کو دے دی جائے اور موہوب لہ کے مرنے کے بعد وہ چیز واہب کی طرف لوٹ آئے تو ایسے ہبہ کو عُمْرٰی کہا جاتا ہے) یعنی اللہ نے یہ زمین تمہارے لئے بنا دی ہے جب تک تم زندہ ہو پھر تمہارے مرنے کے بعد اللہ اپنی ملک میں لے لیتا ہے (یعنی تمہارا عارضی قبضہ بھی ختم ہو جاتا ہے) یا یہ مطلب کہ زمین پر مکانوں میں تم کو عمر بھر رکھا جاتا ہے پھر تمہارے مرنے کے بعد تمہارے مکان دوسروں کو دے دیئے جاتے ہیں۔

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ پس تم اللہ سے استغفار کرو نادم و شرمسار ہوتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرو۔

اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝ بلاشبہ میرا رب اپنے بندوں کے قریب ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ یعنی اللہ کا بندوں سے قرب ذاتی ہے مگر کیفیت معلوم نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ بندوں سے قریب ہے کہ اس نے وجود عطا کیا ہے یا یہ مراد ہے کہ اللہ کی رحمت اپنے دوستوں سے قریب ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قوم ثمود نے کہا صالح تم تو ہم میں ہونہار معلوم ہوتے تھے یعنی ہمیں امید تھی کہ تم ہمارے سردار ہو گے یا یہ مطلب ہے کہ ہم امید کرتے تھے کہ تم ہمارے مذہب پر ہو گے یا یہ مطلب ہے کہ ہم امید کرتے تھے کہ تم ہمارے مذہب پر ہو گے اور ہمارے دین کی طرف رجوع کرو گے۔

قَبْلَ هٰذَآ اس سے پہلے یعنی نبوت کے دعوے اور ترک بت پرستی کی دعوت سے پہلے لیکن اب چونکہ ہم نے

تمہاری یہ باتیں سن لیں تو ہماری امید تم سے ٹوٹ گئی۔

أَتَنْهٰىنَآ أَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا کیا تم ہمیں ان معبودوں کی پوجا سے منع کیا کرتے تھے (حکایت حال ماضی یا منع کرتے ہو) جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔

وَإِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ إِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۞ اور جس (توحید کو ماننے اور بت پرستی کو ترک کرنے) کی طرف تم ہم کو دعوت دے رہے ہو ہم قطعی طور پر اس کی طرف سے تردد آفریں شک میں ہیں مُرِیب (اسم فاعل) اَرَابَ یعنی اَمْرٌ ذُوْ رَیْبٍ سے، تردد پیدا کرنے والا۔ اِرَابَۃ سے ماخوذ ہے بے چینی، اضطراب قلب اور بے اطمینانی پیدا کر دینے والا۔

قَالَ يٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ إِنْ عَصَيْتُهٗ

آپ نے فرمایا اے قوم کیا سمجھتے ہو اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلائل پر قائم ہوں اور خدا نے مجھ کو نبوت سے نوازا ہے تب اگر میں خدا کی نافرمانی کرنے لگوں تو خدا کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا۔ چونکہ کافروں کو حضرت صالحؑ کا صاحب بصیرت ہونا مسلّم نہ تھا اس لئے آپ نے بھی لفظ اِنْ شکیہ بولا ورنہ آپ کو اپنی جگہ یقین تھا کہ میں صداقت و بصیرت پر ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنْ (شرطیہ شکیہ نہ ہو بلکہ) مخففہ ہو۔ یعنی بلاشبہ میں اپنے رب کی طرف سے بیّنہ پر ہوں۔ رحمت سے مراد ہے نبوت اور حکمت۔ مِنَ اللّٰہِ سے مراد ہے من عذاب اللہ۔ نافرمانی سے مراد ہے تبلیغ احکام اور ممانعت شرک میں کوتاہی کرنا۔

فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۞ (یعنی اللہ نے جو نبوت و ہدایت مجھے عطا فرمائی ہے تم اس کی تکذیب کرتے ہو اور اللہ کے عذاب کے مستحق بنتے ہو اور اس میں سراسر نقصان ہے) پس تم لوگ میرے خسارے کو ہی بڑھا رہے ہو۔ حسین بن فضل نے کہا حضرت صالح تو کبھی بھی خسارے میں نہیں رہے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میرے لئے خسارہ بڑھا رہے ہو۔ بلکہ تخسیر کا معنی ہے کسی کی طرف خسارے کی نسبت کرنا، خسارہ یاب قرار دینا۔ جیسے تکفیر و تفسیق کا معنی ہے کسی کو کافر اور فاسق قرار دینا، کفر و فسق کی طرف منسوب کرنا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری تکذیب سے میرے لئے اس بات کا اضافہ ہو جاتا ہے کہ میں تم کو خاسر قرار دوں اور خسارہ یاب کہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے تخسیر کا ترجمہ کیا ہے خسارے کو دیکھنا یعنی تمہاری تکذیب سے مجھے یوں نظر آتا ہے کہ تم بہت نقصان اٹھاؤ گے، بڑے خسارے میں رہو گے یا بڑے خسارے اور نقصان میں ہو۔

قوم ثمود نے کہا اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے پتھر کی چٹان سے ایک اونٹنی جو دس ماہ کی گابھن ہو برآمد کر دو۔ حضرت نے دعا کی فوراً چٹان سے ایک اونٹنی برآمد ہو گئی جس کا بچہ بھی فوراً ہو گیا۔ اس وقت آپ نے فرمایا۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً اور اے میری قوم یہ (براہ راست بغیر ماں باپ کے پیدا کی گئی) اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے ایک معجزہ ہے۔

فَذَرُوْهَا تَأْكُلْ فِيْٓ أَرْضِ اللّٰهِ پس اس کو اللہ کی زمین میں کھاتی پھرتی رہنے دو کہ زمین کا سبزہ چرتی پھرے اور تم پر اس کی خوراک اور پانی کا کوئی بار نہیں۔

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۞ اور اس کو بری نیت سے ہاتھ مت لگانا ورنہ تم کو عذاب جلدی سے دبوچ لے گا۔

یعنی تین دن میں تم پر عذاب آ جائے گا۔

فَعَقَرُوْهَا پس ثمود نے اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ یعنی قوم ثمود کے مشورے اور حکم سے قدار بن سالف نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ أَيَّامٍ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۞ صالحؑ نے کہا تم

اپنے گھر (یعنی دنیا بستی) میں تین روز مزے اڑا لو (تین روز کے بعد ہلاک کر دیئے جاؤ گے) یہ جھوٹا وعدہ نہیں ہے۔ یعنی چہار شنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ، تین روز تم زندہ رہو گے پہلے روز صبح کو تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے، دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ، پھر سب مر جاؤ گے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ

پھر جب ہمارا (عذاب کا) حکم آ پہنچا تو ہم نے صالح کو اور ان کے ساتھ والے مومنوں کو اپنی رحمت کے سبب بچا لیا اور اس روز کی رسوائی (یعنی ہلاکت) سے محفوظ رکھا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ بلاشبہ تمہارا رب ہر شے پر قادر اور غالب ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ اور جن لوگوں نے ظلم یعنی کفر کیا تھا ان کو ایک چیخ نے پکڑ لیا۔

یعنی جبرئیل نے ایک چیخ ماری یا آسمان سے ایک کڑک دار چیخ آئی اور زمین سے بھی ایک کرخت دار چیخ نکلی جس کی وجہ سے ان کے دل پھٹ گئے۔

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ اور سب اپنے گھروں میں مردہ ہو گئے (یعنی صبح کو مرے کے مرے رہ گئے۔ مترجم)

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا گویا گھروں میں رہتے ہی نہ تھے۔

اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝ خوب سن لو (قوم) ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔ خوب سن لو قوم ثمود کو رحمت سے دوری ہوئی۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى اور یقیناً پہنچے ہمارے قاصد (ملائکہ) ابراہیم کے پاس (اسحاق اور یعقوب بن اسحاق کی پیدائش یا قوم لوط کی ہلاکت کی) خوشخبری لے کر۔ بقول حضرت ابن عباسؓ و عطاء یہ ملائکہ تین تھے، جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل۔ محمد بن کعب نے کہا جبرئیل اور ان کے ساتھ سات دوسرے ملائکہ تھے، ضحاک نے کہا نو تھے، مقاتل نے کہا بارہ تھے۔ سدی نے کہا گیارہ تھے، سب ملائکہ خوبصورت لڑکوں کی شکل میں پہنچے تھے۔

قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فرشتوں نے کہا (ہم آپ کو) سلام کرتے ہیں ابراہیم نے کہا تم پر بھی سلام ہو۔ فرشتوں نے جملہ فعلیہ استعمال کیا جو حدوث فعل اور زمانہ کو چاہتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے سلام کہہ کے جملہ اسمیہ کہا جو استمرار و دوام پر دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا جواب فرشتوں کے سلام سے بہتر تھا۔

بعض علماء کے نزدیک سَلٰمًا سے مراد ہے صلح و سلامتی، یعنی ہماری تم سے دشمنی اور جنگ نہیں ہے دوستی اور صلح ہے۔

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ حنیذ گرم پتھر پر بھنا ہوا۔ قاموس میں ہے حَنَذَ الشَّاةَ (ماضی) يَحْنِذُ (مضارع) حَنْذًا وَ تَحْنَاذًا دونوں مصدر بکری کا گوشت بھونا، گوشت پر گرم پتھر بھوننے کے لئے رکھ دے حنیذ (صفت مشبہ بمعنی اسم مفعول) بھونا ہوا۔

بعض نے کہا حنیذ کا ترجمہ ہے چربی ٹپکتا ہوا، حَنَذْتُ الْفَرَسَ میں نے گھوڑے پر جھول ڈال کر اس کے بدن سے پسینہ نکال دیا۔ قاموس میں ہے حَنَذْتُ الْفَرَسَ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کو ایک مخصوص حد تک دوڑایا۔ پھر اس پر دو تین جھول ڈال کر دھوپ میں کھڑا کر دیا تاکہ خوب پسینہ آ جائے۔

مؤخر الذکر ترجمہ پر بطور مجاز قریب پتھر اس لو ہو گا اور دوسری آیت میں جو بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ آیا ہے اس سے معنی مطابقت ہو جائے گی۔ قتادہ نے کہا حضرت ابراہیمؑ کا اکثر مال گائیں تھیں (یعنی آپ بطور ذخیرہ گائے پالتے تھے)

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ جب ابراہیم نے دیکھا کہ یہ کھانے کی طرف راغب نہیں

ہیں تو ان سے اجنبیت محسوس کی۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ نَکِرَ (ثلاثی مجرد باب سمع) اور اَنْکَرَ (ثلاثی مزید باب افعال) اور اِسْتَنْکَرَ (باب استفعال) ہم معنی ہے۔ قاموس میں ہے تَنَکَّرَ (باب تفعل) خوش گوار حالت سے بدل کر کسی کا ناگوار حالت پر پہنچ جانا۔

وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ اور محسوس کیا اپنے دل میں ان کی طرف سے خوف۔ قاموس میں ہے۔ اَوْجَسَ محسوس کیا اور دل میں چھپایا۔ مقاتل نے کہا اَوْجَسَ یعنی حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہو گیا۔ بغوی نے لکھا ہے وُجُوْس کا اصل (لغوی) معنی ہے داخل ہونا۔ یعنی خوف ابراہیمؑ کے دل میں داخل ہو گیا۔

یعنی مہمانوں کی طرف سے دل میں خوف محسوس کیا۔ قتادہ نے کہا اس زمانہ میں ان لوگوں کا دستور تھا کہ اگر مہمان میزبان کا کھانا نہیں کھاتے تھے تو میزبان خیال کرتا تھا کہ یہ لوگ برے ارادے سے آئے ہیں ان کی نیت بخیر نہیں ہے رات کو آنے والے مہمان کو کھانا پیش کیا جاتا، اگر وہ کھا لیتا تو گھر والے اس کی طرف سے بے خوف ہو جاتے اور نہ کھاتا تو ڈرنے لگتے کہیں یہ چور تو نہیں کہ لوٹنے آیا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی مہمانوں کی طرف سے برے ارادے کا اندیشہ ہوا۔ صحیح ظاہر مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ ملائکہ ہیں کیونکہ انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے (مگر آپ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں اللہ کو میری کوئی حرکت پسند نہ آئی ہو اور فرشتے کوئی مصیبت ڈالنے کے لئے بھیجے گئے ہوں یا ان کی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہوں۔

قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ ملائکہ نے کہا آپ (اپنے یا اپنی قوم کے متعلق ہم سے) کوئی خوف نہ کریں ہم کو تو قوم لوط کی طرف ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے) بھیجا گیا ہے۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ اور ابراہیمؑ کی بیوی (سارہ بنت ہاران بن ناخور جو حضرت ابراہیمؑ کے چچا کی بیٹی تھی) کھڑی ہوئی تھی۔ پردہ کے پیچھے سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹھے ہوئے تھے اور بیوی کھڑی مہمانوں کی خدمت کر رہی تھی۔

فَضَحِكَتْ پس حضرت سارہ بشارت سن کر ہنس پڑیں۔ مجاہد اور عکرمہ نے ترجمہ کیا ہے اس کو اسی وقت حیض ہو گیا۔ عرب بولتے ہیں ضَحِكَتِ الْاَرْنَبُ خرگوش کو حیض ہو گیا۔ قاموس میں بھی یہی ہے ضَحِكَتِ السَّمُرَةُ کیکر کے درخت سے گوند بہنے لگی۔ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک اس جگہ ضَحِكَتْ سے مراد ہنس دینا ہی ہے۔ ہنسنے کا سبب کیا تھا علماء نے اس کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔

(۱) خوشی کی وجہ سے ہنس پڑی تھیں۔ فرشتوں نے جب لَا تَخَفْ کہا تو حضرت ابراہیمؑ کا خوف بھی جاتا رہا اور بیوی کا بھی، اس سے خوشی ہوئی اور خوشی سے ہنسی۔

(۲) سدی نے کہا ہنسی کا سبب تعجب تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کھانا پیش کیا، مہمانوں نے نہیں کھایا۔ ابراہیمؑ کو ان کی طرف سے خوف ہوا، خیال کیا کہیں یہ چور نہ ہوں، پوچھا کیوں نہیں کھاتے۔ مہمانوں نے کہا ہم بغیر قیمت (ادا کئے) نہیں کھاتے۔ ابراہیمؑ نے کہا تو اس کی قیمت ہے۔ مہمانوں نے پوچھا قیمت کیا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کھانے سے پہلے بسم اللہ کہنا اور کھانے کے بعد الحمد للہ کہنا۔ یہ جواب سن کر جبرئیلؑ نے میکائیلؑ کی طرف دیکھا اور کہا اس شخص کو حق ہے کہ اللہ اس کو اپنا خلیل بنائے اس کے بعد بھی حضرت ابراہیمؑ اور سارہ نے مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہ دیکھے تو سارہ تعجب سے ہنس دیں۔ اور بطور تعجب کہا ہم ان مہمانوں کی خدمت کر رہے ہیں ان کے اعزاز میں کھانا پیش کر رہے ہیں، تعجب ہے کہ یہ نہیں کھاتے۔

(۳) قتادہ نے کہا اس بات پر ہنسیں کہ قوم لوط پر عذاب قریب آگیا اور وہ غفلت میں پڑی ہے۔

(۴) بیوی کو اس بات پر ہنسی آئی کہ میں نے ابراہیمؑ سے جو بات پہلے کہی تھی وہی آخر صحیح نکلی، بیوی نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا تھا لوط کو اپنے پاس بلا لیجئے، مجھے نظر آ رہا ہے کہ اس کی قوم پر عذاب آئے گا۔

(۵) مقاتل اور کلبی نے کہا بیوی کو اس بات پر ہنسی آئی کہ یہ تو تین شخص ہیں جن سے ابراہیم ڈر رہے ہیں اور ابراہیم کے ساتھ تمام نوکر چاکر خدمت گار موجود ہیں پھر ڈرنے کے کیا معنی۔

(۶) بیٹے اور پوتے کی بشارت اور قوم لوط کے ہلاک ہونے کی خبر سن کر خوشی سے ہنس پڑیں۔

(۷) حضرت ابن عباسؓ اور وہب کا قول ہے کہ اس بات پر ان کو تعجب ہوا کہ میرا شوہر بوڑھا اور میں بوڑھی ایسی حالت میں اولاد ہونا عجیب بات ہے۔ اور عبارت میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے۔ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ کے بعد ہے۔

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ پس ہم نے عورت کو اسحٰق کے پیدا ہونے کی اور اسحٰق کے پیچھے (اسحٰق کے بیٹے) یعقوبؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی۔ اس کے بعد ہے فَضَحِكَتْ یعنی یہ بشارت سن کر وہ ہنس پڑیں۔

عورت کو خصوصیت کے ساتھ بشارت دینے کی تین وجوہ تھیں۔

(۱) یہ جتانا مقصود تھا کہ اسحٰق و یعقوبؑ تیری نسل سے ہوں گے کسی دوسری صورت سے ابراہیمؑ کی یہ نسل نہ ہوگی۔

(۲) اولاد ہونے کی خوشی مردوں سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے۔

(۳) بیوی بانجھ تھی اور اولاد سے ناامید۔ اس لئے اس کو بشارت دی گئی کہ تیرے لڑکا ہوگا اور پوتا بھی تیرے سامنے ہی ہو جائے گا۔ تو پوتے کو بھی دیکھ لے گی۔ جب بیوی کو اولاد کی بشارت دی گئی تو اس نے منہ پیٹ لیا اور کہا۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝

کہنے لگیں کیا خوب بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے بچے ہوں گے یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے۔

يٰوَيْلَتٰى کلمۂ تعجب ہے۔ اصل لغت میں یہ کلمۂ نوحہ ہے۔ (جو کسی کے مرنے پر کہا جاتا ہے) پھر ہر مصیبت اور قابل تعجب چیز میں اس کا استعمال کیا جانے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۹۰ سال اور بقول مجاہد ۹۹ سال تھی۔

بَعْلِ شوہر۔ اصل میں کسی کام کے منتظم کو بعل کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۱۲۰ برس اور بقول مجاہد ۱۰۰ سال تھی۔ اور بشارت سے ایک سال بعد بچہ پیدا ہو گیا تھا۔

قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کے حکم پر تجھے تعجب ہو رہا ہے۔ حکم سے مراد ہے اللہ کی قدرت اور قضاء یعنی اللہ کی قدرت پر تجھے تعجب نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اللہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

ایک شبہ

تعجب نام ہے اس حالت کا جو کسی انوکھے اور غیر معمولی امر کو دیکھنے کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اور اولاد کی بشارت تھی بھی انوکھی، غیر معمولی چیز۔ لیکن کسی امر کے غیر معمولی اور انوکھے ہونے سے یہ بات تو نہیں کہی جا سکتی کہ وہ اللہ کی قدرت سے باہر ہے۔ ہر نادر امر اللہ کی قدرت میں داخل ہے اور اس پر تعجب کرنا نامناسب (اور خلاف فطرت۔ مترجم) بھی نہیں ہے۔ پھر فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے تعجب کا انکار کیوں کیا اور اس کو نادرست کیوں قرار دیا۔ مترجم۔

ازالہ

کاشانۂ نبوت اور مہبط وحی و معجزات میں رہنے والوں کے خصوصی مرتبہ کا تقاضا تھا کہ (روزمرہ ہونے والے غیر معمولی واقعات اور خارق عادت حوادث ان کے لئے غیر معمولی اور کوئی اچنبھے کی چیز نہ ہوں۔ نہ ان کو ان پر کوئی تعجب کرنا چاہئے کوئی

اور تم جیسے (مومن) کا ایسے بار بار واقعات پر (روز مرہ دیکھنے کے وجہ سے) تعجب نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی تو ساری عمر ایسے نشانہائے قدرت دیکھنے ہی میں بیتی تھی ان کا تعجب کرنا تو سب سے زیادہ تعجب آفریں تھا۔

رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۔ اے اہل خانہ تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی نازل کردہ برکتیں ہیں یا ہوں

بعض علماء نے کہا یہ جملہ دعائیہ ہے بعض نے کہا خبریہ ہے (ہم نے دونوں ترجمے کردیے ہیں۔ مترجم) رحمت سے مراد ہے نعمت یا محبت اور برکت سے مراد ہے ہر خیر کی ترقی اور بڑھوتری۔ بعض علماء کے نزدیک رحمت سے مراد ہے نبوت اور برکات سے مراد ہیں بنی اسرائیل کے (بارہ) خاندان۔ کیونکہ تمام انبیاء بنی اسرائیل حضرت سارہ کی نسل سے ہوئے ہیں۔

رحمت اللہ مستقل جملہ ہے اور رفع تعجب کی علت ہے۔ مطلب یہ کہ اے اہل خانہ تم کو بشارت دی اور یہ تعجب نہ کرنا چاہئے۔ اللہ کی یہی رحمتیں اور برکتیں تو تمہارے لئے بکثرت موجود ہیں اَهْلَ الْبَيْتِ میں لام کا زبر فعل مدح کے محذوف ہونے کی وجہ سے ہے یا ندا کی وجہ سے ہے یا فعل تخصیص مقدر ہونے کی وجہ سے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہراتؓ اہل بیت میں شامل نہ تھیں یہ آیت میں شیعہ کے اس قول کی تردید ہے (حضرت سارہ کو اہلبیت کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے) لغت کے لحاظ سے اہل خانہ تو بیویاں ہی حقیقت میں ہوتی ہیں دوسرے لوگوں کو تو تبعاً اہل بیت کہا جاتا ہے۔

اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۔ وہ نہایت قابل ستائش بڑی ہی شان والا ہے۔

حَمِيْدٌ یعنی مستحق ستائش کام کرنے والا۔ مجد کے معنی جوہری نے صحاح میں لکھے ہیں (ذاتی) بزرگی اور (افادی) کرم کی وسعت۔ کریم اللہ کی صفت بھی ہے اور انسان کی بھی۔ اللہ کے کرم کا معنی ہے احسان اور تمیم عطائے نعمت اور انسان کے کریم ہونے کا معنی ہے اس کے اخلاق و افعال کا قابل ستائش ہونا جب تک اخلاق حمیدہ کا ظہور انسان سے نہ ہوگا اس کو کریم نہیں کہا جاسکتا۔

بغوی نے لکھا ہے (لغت میں) مجد کا اصل معنی ہے بلندیٔ شان۔ بیضاوی نے مجید کا ترجمہ کیا ہے کثیر الخیر والاحسان۔ قاموس میں ہے مجید بلند شان والا۔ کریم، شرف والا، فعال۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ ۔ پھر جب ابراہیمؑ (کے دل) سے خوف جاتا رہا اور گھبراہٹ دور ہوگئی۔

وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى ۔ اور اس کے پاس (اسحٰق و یعقوب کی) بشارت آگئی۔ یعنی خوف کی جگہ بشارت نے لے لی۔

يُجَادِلُنَا ۔ تو ہم سے جھگڑنے لگا۔ یعنی ہم سے کلام کرنے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنے رب سے جھگڑا کرنا تو ممکن ہی نہ تھا اس لئے جھگڑنے سے مراد ہے سوال اور دعا کرنا۔

عام اہل تفسیر نے (مضاف کو محذوف مانا ہے اور) مطلب بیان کیا ہے ہمارے قاصدوں سے جھگڑنے لگا۔

فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۔ قوم لوط کے بارے میں۔ حضرت ابراہیمؑ نے ملائکہ سے فرمایا اگر لوط کی بستیوں میں پچاس مومن ہوں گے تو کیا تم ان کو ہلاک کردو گے۔ فرشتوں نے جواب دیا نہیں فرمایا اگر چالیس ہوں۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ (ہلاک کریں گے) فرمایا اگر تیس ہوں۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ اسی طرح آپ پانچ تک پہنچے اور فرشتے نہیں کہتے رہے۔ آخر آپ نے فرمایا اگر وہاں ایک مسلمان ہوگا تو کیا تم اس کو ہلاک کردو گے۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ حضرت نے فرمایا تو وہاں لوط موجود ہے (اس لئے تم ان بستیوں کو ہلاک نہ کرو) فرشتوں نے کہا ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون (کون مومن) ہے۔ ہم لوط کو اور ان کی بیوی کے علاوہ دوسرے گھر والوں کو بچالیں گے۔ ان کی بیوی پیچھے رہ جانے اور ہلاک ہوجانے والے لوگوں میں شامل ہوگی۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۔ واقعی ابراہیمؑ بڑے حلیم الطبع رحیم المزاج رقیق القلب تھے۔

حَلِیْمٌ سے مراد ہے مجرم سے انتقام لینے میں جلدی نہ کرنے والا (بُردبار، متحمل مزاج) اَوَّاهٌ گناہوں پر بہت زیادہ آہ آہ کرنے والا اور لوگوں کی حالت پر بڑا افسوس کرنے والا۔ مُّنِیْبٌ اللہ کی طرف رجوع کرنے والا۔ القاموس میں ہے اَوَّاهٌ یقین کرنے والا، یا بہت دعا کرنے والا، یا مہربان، نرم دل، یا دانش مند۔ حبشی زبان میں اَوَّاهٌ کا معنی ہے مؤمن۔

حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوط کو ہلاک نہ کرنے کے متعلق جو ملائکہ سے جھگڑا کیا اس کی وجہ آپ کے یہ تین اوصاف تھے۔ آپ کا دل نرم تھا، آپ کے دل میں بڑا جذبۂ رحم تھا، آپ مجرم سے انتقام لینے میں عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں فرشتوں نے کہا۔

یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ ابراہیمؑ اس جھگڑے کو چھوڑو (قضاء ازلی کے موافق قوم لوط پر عذاب نازل ہونے کا) تمہارے رب کا حکم ہو چکا۔

وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾ اور ان پر عذاب ضرور آنے کا جو لوٹایا نہیں جا سکتا نہ جھگڑے سے نہ دعا سے نہ کسی اور طرح سے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا اور جب ہمارے قاصد (یعنی وہی ملائکہ) لوط کے پاس پہنچے تو خوبصورت بے ڈاڑھی مونچھ کے لڑکوں کی شکل میں تھے۔

سِیْٓءَ بِهِمْ تو لوط کو ان کا آنا ناگوار ہوا۔ حضرت لوطؑ ان کو آدمی سمجھے اس لئے (قوم کی طرف سے خطرے کے زیر اثر) آپ کو فکر ہو گئی کہ کہیں قوم والے کچھ ناشائستہ حرکت کریں اور میں ان کو دفع کرنے پر قادر نہ ہوں گا۔

وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا ان قاصدوں کی وجہ سے لوط دل تنگ ہوئے۔

بغوی نے ذَرْعًا کا ترجمہ کیا ہے دل۔ بیضاوی نے لکھا ہے ان کی موجودگی سے لوط کا سینہ تنگ ہو گیا یعنی آنے والی مصیبت کو دفع کرنے کی قوت نہ تھی اور کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔ اسی لئے آپ کے دل میں کوفت پیدا ہو گئی کہ اب کیا کروں۔ میں کہتا ہوں ذَرْع کا لغت میں معنی ہے بانہہ یا کلائی، مجازاً قوت مراد ہوتی ہے۔ بَدَن سے بھی بطور مجاز قوت مراد ہوتی ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ ان کی قوت مدافعت سے عاجز ہو گئی کذا فی القاموس۔

وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ﴿۷۷﴾ اور کہا یہ بڑا سخت دن ہے۔

قتادہ اور سدی کا بیان ہے کہ ابراہیمؑ کے پاس سے نکل کر فرشتے لوطؑ کے پاس ان کی بستی میں دوپہر کے وقت پہنچے، لوطؑ دیہات میں کچھ کام کر رہے تھے یا لکڑیاں جمع کرنے جنگل کو گئے تھے اور اللہ نے حکم دے دیا تھا کہ جب تک چار مرتبہ لوطؑ اپنی قوم کے خلاف شہادت نہ دے دے تم ان کو ہلاک نہ کرنا۔ فرشتوں نے لوطؑ کے پاس بطور مہمان ٹھہرنا چاہا لوطؑ ان کو لے کر چل دیے، تھوڑی دور پہنچے تھے کہ آپ نے مہمانوں سے پوچھا کیا تم کو اس بستی کی حالت بھی معلوم ہے۔ فرشتوں نے پوچھا ان کی کیا حالت ہے۔ آپ نے فرمایا اس زمین پر سب سے زیادہ بد یہی بستی ہے۔ حضرت نے یہ الفاظ چار مرتبہ کہے غرض ملائکہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر آ گئے۔ یہ بھی منقول ہے کہ آپ لکڑیاں اٹھائے آ رہے تھے اور فرشتے پیچھے پیچھے تھے، قوم کی ایک جماعت کی طرف سے گزر ہوا تو لوگوں نے آپس میں آنکھ ماری، حضرت لوطؑ نے فرمایا اللہ کی مخلوق میں میری قوم سب سے زیادہ بُری ہے۔ اسی طرح دوسری جماعت کی طرف سے گزر ہوا تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا اور حضرت نے بھی فرمایا۔ غرض چار جماعتوں کا قصہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت لوطؑ جب بھی مذکورہ الفاظ زبان سے ادا کرتے تھے حضرت جبرئیلؑ فرشتوں سے کہتے تھے گواہ رہو۔ آخر حضرت لوطؑ اپنے گھر پہنچ گئے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ فرشتے حضرت لوطؑ کے گھر پوشیدہ طور سے آئے تھے اور گھر والوں کے سوا کسی کو ان کا آنا معلوم نہ تھا مگر لوطؑ کی بیوی نے جا کر اپنی قوم کو اطلاع دی کہ لوطؑ کے گھر ایسے لوگ آئے ہیں کہ ان سے زیادہ خوبصورت میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ۭ اور لوطؑ کے پاس ان کی قوم والے لپکتے ہوئے آئے۔ حضرت ابن عباسؓ اور

قتادہ نے ترجمہ کیا ہے تیز تیز آئے۔ مجاہد نے کہا لپکتے آئے۔ شمر بن عطیہ نے کہا تیز چال اور لپکنے کے درمیان چال سے آئے۔ حسن نے کہا دونوں چالوں کے درمیانی رفتار سے آئے۔ صاحب قاموس نے اہراع کا ترجمہ کیا ہے، ایسی چال جس میں جھجک اور تیزی ہو۔

یُھْرَعُوْنَ (فعل مجہول) انتہائی سرعت و اضطراب پر دلالت کر رہا ہے، گویا کوئی (اندرونی یا بیرونی قوت) ان کو تیز تیز لئے جا رہی تھی۔

وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ اور اس سے پہلے بھی وہ بری حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ مردوں سے لواطت کرتے تھے اور طرح طرح کی فحش حرکتوں کے عادی تھے بے حیا ہو گئے تھے اسی لئے ایسے برے ارادے سے علی الاعلان لپکتے جھپکتے آئے تھے۔

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ لوط نے کہا اے میری قوم یہ میری لڑکیاں ہیں۔ تم ان سے نکاح کر لو۔ پہلے حضرت کی لڑکیوں سے نکاح کرنے کی درخواست قوم والوں نے کی تھی مگر ان کی بدکاریوں کو دیکھ کر آپ نے انکار کر دیا تھا۔ درخواست کو رد کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کافر تھے کافروں سے نکاح کی حرمت تو شریعت اسلامیہ میں بعد کو ہوئی ہے، پہلے تو دونوں رشتہ کافر و مومن کا جائز تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دونوں صاحبزادیوں کا رشتہ عتبہ بن ابی لہب اور ابوالعاص بن ربیع سے نزول ممانعت سے پہلے کیا تھا۔ حسین بن فضل نے کہا حضرت لوط نے اپنی لڑکیوں سے نکاح کی پیش کش ان کے مسلمان ہو جانے کی شرط پر کی تھی۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا بَنَاتِيْ سے قوم کی ساری عورتیں مراد ہیں، ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں آیت اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ کے آخر میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی آیا ہے اس قول مذکور کی تائید ہوتی ہے۔ اس قول کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت لوط کی لڑکیاں دو تھیں اور لڑکوں کی طلب گار پوری جماعت تھی، دو لڑکیوں کا ایک جماعت سے نکاح کیسے ممکن تھا جو لوگ بنات سے مراد حضرت لوط کی لڑکیاں لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قوم لوط کے دو سردار تھے، سب لوگ ان کا حکم مانتے تھے انہی دونوں سے آپ نے اپنی لڑکیوں کا نکاح کرنا چاہا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت لوط نے جو هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ فرمایا اس سے نکاح کی حقیقۃً پیشکش مقصود نہ تھی بلکہ مقصد تھا قوم والوں کی بدترین خباثت کا اظہار اور دفاع۔

هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ وہ زیادہ پاک ہیں تمہارے لئے (اس کا یہ مطلب نہیں کہ لواطت پاک ہے اور امرد پرستی سے لڑکیوں سے نکاح زیادہ پاک ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لئے اس فعل میں زیادہ نظافت ہے یا اس میں بے حیائی کم ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے چھینے ہوئے مال سے تو مردار زیادہ پاک اور زیادہ حلال ہے (ظاہر ہے کہ حلال نہ مردار ہے نہ مال مغصوب مگر مال مغصوب کی زیادہ برائی ظاہر کرنے کے لئے ایسا جملہ بولا جاتا ہے)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ پس اللہ سے ڈرو۔ یعنی ان بے حیائی کے کاموں کو ترک کرو۔

وَلَا تُخْزُوْنِ اور مجھے رسوا نہ کرو۔ یہ لفظ یا خزی سے بنا ہے خزی کا معنی ہے رسوائی (اسی کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے) یا خزایۃ سے بنا ہے خزایۃ کا معنی ہے حیا۔ یعنی مجھے شرمندہ نہ کرو۔

فِيْ ضَيْفِيْ ؕ میرے مہمان کے معاملہ میں۔ مہمان کو ذلیل کرنے کا معنی ہے میزبان کو ذلیل کرنا۔

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ کیا تم میں کوئی بھی ہدایت یافتہ نہیں جو حق پر چلے اور بری حرکتوں سے پرہیز کرے۔

ابن اسحٰق نے رشید کا ترجمہ کیا ہے بھلائی کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ قوم والوں نے کہا (لوط) تم جانتے ہو کہ تمہاری لڑکیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ یعنی وہ ہماری بیویاں نہیں ہیں ان سے ہمارا نکاح نہیں ہوا کہ ہم ان کے حقدار بن جائیں۔

بعض علماء نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ تمہاری لڑکیوں کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں۔

وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝ اور جو ہمارا ارادہ ہے اس کو تم یقیناً جانتے ہو یعنی ہم لڑکوں کو چاہتے ہیں۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً لوطؑ نے (ان سے) کہا کاش میرے بدن کے اندر تم کو دفع کرنے کی طاقت ہوتی۔

یعنی میرے اندر قوت ہوتی تو تم کو دفع کر دیتا۔

اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ یا میں کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑ سکتا۔ یعنی یا میرا خاندان طاقتور ہوتا اور مجھے برادری کی طاقت حاصل ہوتی تو میں برادری کی قوت پر تم سے اپنی حفاظت کر لیتا۔ رُكْنٍ شَدِيْدٍ (مضبوط ستون) سے قوت و استحکام میں اپنے خاندان کو تشبیہ دی۔ اس سے مراد ہے قوی پہلو۔ صاحب قاموس نے رکن کے معنی لکھے ہیں قوی ترین پہلو قوت کے تمام اسباب جیسے حکومت، فوج، عزت، غلبہ، اللہ ارشاد ہے۔ ۔۔۔ کہتے ہیں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ میرے بھائی لوطؑ پر رحم فرمائے وہ رکن شدید کی پناہ لینے کے خواستگار ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں رحم فرمانے کی جگہ معاف فرمانے کا لفظ آیا ہے۔

ابن عساکر اور ابن اسحٰق نے بسند جویبر از مقاتل بروایت ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے اور بغوی نے بھی بیان کیا ہے کہ حضرت لوطؑ نے دروازہ بند کر لیا تھا اندر گھر میں تھے اور دروازہ کے اندر سے ہی آپ قوم والوں سے جھگڑ رہے تھے اور ان کو قسمیں دے رہے تھے وہ لوگ سب دروازے کے باہر تھے آخر وہ لوگ دیوار پھاند کر اندر جانے کی تدبیر کرنے لگے جب ملائکہ نے لوطؑ کی یہ حالت دیکھی تو

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ انھوں نے کہا لوطؑ ہم آپ کے رب کے فرشتے ہیں ان لوگوں کی دسترس آپ تک ہرگز نہیں ہو سکے گی دروازہ کھول دیجئے اور ہم کو ان سے نمٹنے دیجئے حضرت لوطؑ نے دروازہ کھول دیا وہ لوگ اندر گھس آئے جبرئیلؑ نے اپنے رب سے عذاب نازل کرنے کی اجازت طلب کی اجازت مل گئی تو انھوں نے اپنی اصلی صورت اختیار کر لی جو ان کی ہوتی اور معمولاً ہوتی ہے پر پھیلا دیے جو موتیوں سے جڑے ہوئے تھے اور دانت چمکتی پیشانی سر کے بال گھونگر والے برف کی طرح سفید اور دونوں پاؤں سبز (یہ شکل تھی حضرت جبرئیلؑ کی) پھر جبرئیلؑ نے اپنا ایک پر ان لوگوں کے منہ پر مارا جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں بیٹھ گئیں اور وہ اندھے ہو گئے ان کو گھروں کا راستہ بھی نہیں سوجھتا تھا فوراً یہ کہتے ہوئے پلٹ پڑے بھاگو بھاگو لوطؑ کے گھر میں دنیا بھر کے سب سے بڑے جادوگر آ گئے ہیں جنھوں نے ہم پر جادو کر دیا پھر حضرت لوطؑ سے کہنے لگے ذرا ٹھہرو صبح ہونے دو کل صبح ہم تم سے سمجھیں گے صبح کو تم کو پتہ چل جائے گا۔ لوطؑ نے فرشتوں سے قوم والوں کے ہلاک ہونے کی میعاد دریافت کی فرشتوں نے کہا صبح کو ۔۔۔۔ لوطؑ نے کہا میں اس سے بھی جلد چاہتا ہوں۔ ابھی ان کو ہلاک کر دو تو بہتر ہے۔ فرشتوں نے کہا کیا صبح قریب نہیں ہے۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ آپ اپنے گھر والوں کو لے کر کچھ رات سے ہی نکل جائیے۔ حضرت ابن عباسؓ نے قطع کا ترجمہ کیا ہے ایک ٹکڑا۔ ضحاک نے کہا بقیہ شب۔ قتادہ نے کہا اول رات گزر جانے کے بعد۔ بعض نے کہا پچھلا پہر (تہائی شب)

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اور تم میں سے کوئی پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھے۔ یعنی کوئی تمہارے ساتھ سے مڑ کر پیچھے نہ رہ جائے۔

قاموس میں ہے لَفَتَهٗ اس کو موڑ دیا اس کے رخ سے پھیر دیا۔ الْتَفَتَ (افتعال) اور تَلَفَّتَ (تفعّل) اسی سے بنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ثلاثی مجرد لفت متعدی ہے اور ثلاثی مزید (افتعال اور تفعّل) لازم۔ بعض نے لا یلتفت کا ترجمہ کیا ہے کوئی پیچھے کو نہ دیکھے۔ رات سے سب کو لے کر نکلنے کا حکم تو لوطؑ کو دیا گیا اور مڑ کر پیچھے نہ دیکھنے یا مڑ کر پیچھے نہ رہ جانے کا حکم لوطؑ کے ساتھ والوں کو دیا گیا۔

اِلَّا امْرَاَتَکَ مگر اپنی عورت کو ساتھ لے کر نہ نکلو یا سوائے تمہاری عورت کے اور کوئی مڑ کر پیچھے کو نہ دیکھے۔

بغوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اِلَّا امْرَاَتَکَ کا استثناء فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ سے ہے۔ یعنی بیوی کو ساتھ نہ لو۔ قوم کے ساتھ چھوڑ دو۔ اس کا میلان قوم کی طرف ہے اس مطلب کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں آیت اس طرح ہے فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ زوجہ لوط کو ساتھ لے کر نکلنے کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک روایت میں ساتھ لے کر نکلنا مذکور ہے اس وقت ساتھ والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ کوئی مڑ کر پیچھے نہ دیکھے یا پیچھے نہ رہ جائے۔ مگر عورت نے منہ پھیر کر اپنی قوم کی طرف دیکھا اور ان کو ہلاک ہوتے دیکھ کر کہا ہائے میری قوم والے تباہ ہو گئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ عورت کو کافروں کے ساتھ چھوڑ کر جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ عورت کا دلی جھکاؤ قوم کی طرف تھا۔ اسی اختلاف روایت کی وجہ سے اِلَّا امْرَاَتَكَ کے اعراب میں اختلاف منقول ہے ایک میں اِلَّا امْرَاَتَكَ آیا ہے اور دوسری روایت میں اِلَّا امْرَاَتُكَ۔ کذا قول صاحب المدارک۔

اور چونکہ دونوں روایتوں کی بناپر مفہوم حکم میں تضاد ہو جاتا ہے اور اس تضاد کو دور نہیں کیا جا سکتا اس لئے ایک روایت یقیناً غلط ہے یہی وجہ ہے کہ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ کوئی قرأت بھی مانی جائے بہر حال اِلَّا امْرَاَتَكَ استثناء لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ سے قرار دیا اولیٰ ہے۔ یعنی التفات کی ممانعت سے عورت مستثنیٰ تھی یعنی اس کو ممانعت نہ تھی۔ لیکن کیا اس کو التفات کی اجازت تھی یہ بات آیت میں مذکور نہیں ہے۔

اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ جو عذاب قوم والوں پر آئے گا وہ اس عورت پر بھی یقیناً آئے گا۔ بیضاوی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعودؓ کی قرأت کی بنا تو ان کی تفسیر پر ہے۔ جب کہ اکثر اہل تفسیر کا خیال ہے کہ استثناء اہل سے ہے یعنی قرأت ابن مسعودؓ روایت پر مبنی نہیں بلکہ ابن مسعودؓ نے چونکہ استثناء اہل سے قرار دیا ہے اور آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے اس لئے آپ نے اس جگہ اعراب بھی وہی پڑھا جو تفسیر کے مناسب تھا۔ میں کہتا ہوں اِمْرَاَتَكَ کی تاء پر اگر زبر پڑھا جائے تو استثناء منقطع بھی ہو سکتا ہے کیونکہ حضرت لوطؑ کی بیوی مومن صالحہ نہ تھی اس لئے حضرت لوطؑ کے اہل میں داخل ہی نہیں تھی۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے کو عدم صلاح کی بناء پر اہل نوحؑ میں شمار نہیں کیا گیا اور جب وہ اہل لوطؑ میں داخل نہ تھی تو لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ سے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا وہ ان سے خارج تھی۔ ہاں اگر اِمْرَاَتُكَ کی تاء پر پیش پڑھا جائے تو ضرور اہل لوطؑ میں داخل رہے گی مگر اس وقت اہل کی وجہ صلاحیت اعمال و ایمان نہیں بلکہ محض رشتہ زوجیت تھا زوجیت کی وجہ سے عورت لوطؑ کی اہل تھی اور صالح الاعمال نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی اہل نہیں بھی تھی دونوں اعتبارات مختلف ہیں۔

میں کہتا ہوں دونوں قرأتوں کا اختلاف اس وجہ سے نہیں ہے کہ ایک روایت میں عورت کا نکلنا مذکور ہے اور دوسری روایت میں نہ نکلنا۔ بلکہ زبر کی قرأت اس بناء پر ہو سکتی ہے کہ امْرَاَتَكَ کا اہل سے استثناء ہے اور پیش کی قرأت پر احد سے استثناء ہے اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ اپنے اہل کے ساتھ نکل جاؤ۔ بیوی کو ساتھ نہ لو۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ جن کو ساتھ لے کر جانے کا حکم دیا گیا وہ ساتھ گئے بھی تھے یا نہیں گئے تھے اس صورت میں فرمان بیوی کا ساتھ جانا ضروری نہیں۔ جیسے ساتھ لے جانے کا اہل کو حکم بھی نہیں دیا گیا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساتھ نہیں گئی۔ اور اگر احد سے استثناء ہو تو حضرت لوطؑ کے ساتھ والوں کو منہ پھیر کر دیکھنے کی ممانعت ہو جائے گی۔ بیوی کو ممانعت نہیں ہو گی اس صورت میں بھی بیوی کا ساتھ جانا معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں باتوں کی طرف سے آیت میں سکوت ہے ممکن ہے وہ گئی ہو اور منہ پھیر کر دیکھا ہو اور ممکن ہے ساتھ نہ گئی ہو خواہ لوطؑ نے اس کو بھی حکم دیا ہو۔ کیونکہ بہر حال وہ سرکش اور نافرمان تھی ماننے والی نہ تھی۔

شاید بیضاوی نے جو لفظ اولیٰ استعمال کیا ہے اور واجب کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کی مصلحت یہی ہو۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ان پر عذاب آنے کا وقت وعدہ یقیناً صبح ہے۔ یہ سابق حکم کی گویا علت ہے۔ یعنی تم اپنے ساتھیوں کو لے کر رات ہی سے نکل جاؤ اس لئے کہ ان لوگوں کی ہلاکت کا وقت صبح مقرر کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب حضرت لوطؑ نے درخواست کی کہ جلد عذاب آجائے تو فرمایا۔

اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝ کیا صبح قریب نہیں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا پھر جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم یا عذاب) آگیا۔ اول مفہوم کی تائید اگلی آیت سے ہو رہی ہے۔

جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا تو ہم نے ان بستیوں کو الٹ کر زیر و زبر کر دیا۔ یعنی الٹ دیا اوپر کا تختہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا اگرچہ یہ فعل ملائکہ کا تھا ملائکہ نے الٹا تھا لیکن چونکہ بحکم الٰہی تھا اس لئے الٹنے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی اس سے اپنے امر کی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔ بغوی نے لکھا ہے قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں حضرت جبرئیلؑ نے بستیوں کے نیچے اپنا ایک بازو ڈال کر اتنا اٹھایا کہ اوپر والوں نے مرغ کی بانگ کی اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی اور کسی کا کوئی برتن بھی نہ گرا نہ کوئی سویا ہوا شخص بیدار ہوا پھر بالکل الٹ دیا۔ سب زیر و زبر ہو گئے۔ ان پانچوں شہروں کی آبادی چار لاکھ یا چار کروڑ تھی۔ ان بستیوں کو مؤتفکات الٹی ہوئی بستیاں کہا جاتا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؓ کی روایت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھر برسائے یعنی ان کو الٹنے کے بعد اوپر سے سنگ باری کی۔ یا یہ مطلب کہ جو اِدھر اُدھر بچے کچھے مقامات میں راہگیر رہ گئے تھے۔ ان پر کنکروں کی بارش کی اور اس طرح ان کو ہلاک کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؓ کا قول ہے کہ سجیل سنگ گِل کا معرب ہے قتادہ اور عکرمہ کا قول ہے کہ سجیل سے مراد ہے کیچڑ۔ کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے۔ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِينٍ مجاہد نے کہا شروع میں پتھر اور آخر میں خشک کیچڑ کی بارش کی۔ حسن نے کہا وہ پتھر اصل میں کیچڑ ہی کے تھے کیچڑ خشک ہو کر پتھر ہو گئی تھی۔ ضحاک نے کہا سجیل سے مراد ہیں پختہ اینٹیں۔

بعض علماء نے کہا کہ سجیل کا لفظ سجل سے بنا ہے اسجال کا معنی ہے روان کر دینا دے دینا گویا ہر پتھر بھیجا ہوا اور دیا ہوا تھا یا سجل سے ماخوذ ہے سجل لکھا ہوا۔ یعنی اللہ نے پتھروں پر لکھ دیا تھا کہ قوم لوط کو ان سے عذاب دیا جائے گا۔ بعض نے کہا سجیل اصل میں سجین دوزخ کا ایک طبقہ تھا نون کو لام سے بدل دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیوی آسمان کا نام سجیل ہے۔ بعض نے کہا کہ سجیل آسمان میں پہاڑ ہیں اللہ نے فرمایا ہے وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ

مَّنْضُودٍ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا ہے پے در پے۔ منضود کا معنی ہے ایک چیز پر دوسری چیز جمانا۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ جو نشان زدہ تھے تمہارے رب کے پاس۔ ابن جریج نے کہا ان پتھروں پر ایک نا مٹنے علامت تھی وہ زمین کے پتھروں کے ہم شکل نہ تھے۔

قتادہ اور عکرمہ نے ان پر سرخ دھاریاں بتائی ہیں۔ حسن اور سدی نے کہا وہ مہر زدہ تھے مہر کی طرح ان پر نشان تھا۔ ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس پر وہ گرنے والا تھا۔

وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِينَ بِبَعِيدٍ ۝ اور وہ (اجاڑ بستیاں) ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ اَلظّٰلِمِينَ سے مراد ہے مشرکین مکہ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور عکرمہ کے نزدیک اَلظّٰلِمِينَ سے مراد ہیں اس امت کے ظالم ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے بھی قتادہ کی طرف اسی قول کی نسبت کی ہے۔ یعنی اس امت کے ظالم بھی اس امر کے مستحق ہیں کہ ان پر سنگباری کی جائے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا اللہ نے کسی ظالم کو ان پتھروں سے محفوظ نہیں رکھا بغوی نے لکھا ہے کہ بعض آثار میں آیا ہے کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو۔ ہر ظالم پر ہر وقت پتھر گر سکتا ہے۔ بیضاوی میں ہے کہ

رسول اللہ ﷺ کے دریافت کرنے کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے کہا: آپ کی امت کے ظالم مراد ہیں، کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو، ہر وقت پتھر اس پر گر سکتا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے: ثعلبی نے اس کو بغیر سند کے نقل کیا ہے اور مجھے اس کی سند معلوم نہیں۔ تفسیر مظہری میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے آیت مذکورہ کے ذیل میں ربیع کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ظالم کی سیدھ میں ایک پتھر موجود ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کب اس کو ظالم پر گرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ہی ضمیر ان بستیوں کی طرف راجع ہے جو شام کو جاتے ہوئے کفار مکہ کے راستہ میں ادھر ادھر پڑتی تھیں۔

بعید کو بصیغہ مذکر لانا (باوجودیکہ ضمیر ہی مؤنث ہے) اس وجہ سے ہے کہ ہی سے مراد پتھر یا مقام ہے (یعنی لفظ مؤنث کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ معنی کے لحاظ سے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا)۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ اور ہم نے قوم مدین کے نسبی بھائی شعیبؑ کو اہل مدین کی طرف (ہدایت کے لئے) بھیجا۔

حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا، اسی کے نام پر حضرت شعیبؑ کی بستی کا نام بھی مدین رکھ دیا گیا تھا، قوم میں مراد اہل مدین (مدین کے باشندے) یا مدین کی نسل ہے۔

قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ شعیبؑ نے کہا: اے میری قوم! صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود واقع میں نہیں ہے اور ناپ تول میں (خریداروں کے ساتھ یا آپس میں) کمی نہ کرو۔ توحید پر ہی تمام احکام کا مدار ہے اس لئے اول توحید کی تبلیغ کی، پھر ناپ تول کی کمی سے روکا۔ قوم شعیب والے ناپ تول میں بے ایمانی کے خوگر تھے اور بے ایمانی عدل کے خلاف ہے، بے عدل تبادلہ اشیاء کی حکمت کے بھی منافی ہے۔

إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں۔ یعنی میں تم کو مالدار پاتا ہوں، آرام اور چین سے ہو، لوگوں کے حق مارنے اور ناپ تول میں کمی کرنے کی تم کو ضرورت نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم کو نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہیں جن کا تقاضا ہے کہ تم اللہ کا شکر کرو اور لوگوں پر مہربانی کرو۔ کسی کا حق مارنے کا تو کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ مجاہد نے کہا حضرت شعیبؑ نے ان کو ڈرایا کہ اگر توبہ نہ کرو گے تو یہ نعمت تم سے چھین لی جائے گی، ہر چیز کا نرخ گراں ہو جائے گا اور اللہ کا عذاب آ جائے گا۔

وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُحِيطٍ ﴿٨٤﴾ اور مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہے اس دن کے عذاب کا جو طرح طرح کی تکلیفوں کو اپنے گھیرے میں لینے والا ہوگا۔ یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر اس روز کا عذاب آ جائے گا جو تم کو گھیر لے گا اور سب کو ہلاک کر دے گا، کوئی بھی نہیں بچے گا۔ بعض لوگوں نے محیط کا ترجمہ کیا ہے ہلاک کرنے والا۔ اُحِیطَ بِثَمَرِهٖ اور اس کے پھل تباہ کر دیے گئے۔ عذاب یوم محیط سے مراد ہے روز قیامت کا عذاب یا سب کی جڑ بنیاد اکھاڑ پھینکنے اور سب کو تباہ کر دینے کا عذاب۔

وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ اور اے میری قوم! ناپ تول پوری پوری کیا کرو۔ پہلے ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت تھی (جس سے پورا پورا ناپنے تولنے کا حکم معلوم ہو گیا) پھر زور دینے کے لئے اس جملہ میں صراحۃً پورا ناپنے تولنے کا حکم دیا۔ اس صریح حکم سے اس امر پر بھی تنبیہ ہو گئی کہ قصداً ناپ تول میں کمی سے اجتناب کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پورا پورا دینے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے، اگرچہ کچھ زیادہ ہی دینا پڑے، جس کے بغیر پورا پورا ادا کرنا متصور ہو۔ اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی پیمانہ کی یا وزنی چیز کسی نے ناپ تول کر خریدی ہو اور بائع نے ناپ تول کر دی ہو تو

جب تک خریدار خود دوبارہ اس کی ناپ تول نہ کر لے نہ خود اس کو استعمال کر سکتا ہے نہ فروخت کر سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے (خریدے ہوئے) غلہ کو فروخت کرنے سے اس وقت تک روکا ہے جب تک دوبارہ ایک بار بائع نے اور ایک بار مشتری نے اپنے اپنے پیمانوں سے اس کی ناپ تول نہ کر لی ہو۔ رسول اللہ کے زمانہ میں غلہ پیمانوں سے ناپ کر فروخت کیا جاتا تھا صاع یا فرق یا وسق وغیرہ غلہ ناپنے کے پیمانے تھے تول کر نہیں بیچا جاتا تھا یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے ابن ماجہ اور اسحٰق بن ابی شیبہ نے نقل کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ ہے جس کی وجہ سے محدثین نے اس روایت کو معلل قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث منقول ہے لیکن

یہ روایت بھی ضعیف ہے ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بہت سندوں سے آئی ہے اور ائمہ نے اس کو قبول کیا ہے اس لئے قابل استدلال ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔

یہ بھی رسول اللہ نے فرمایا تھا وزن کرو اور جھکتا ہوا دو۔ کیونکہ ہم گروہ انبیاء اسی طرح تولتے ہیں۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والحاکم وابن حبان من حدیث سوید بن قیس۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

بِالْقِسْطِ انصاف کے ساتھ۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ پہلے صرف ناپ تول میں کمی نہ کرنے کی ہدایت تھی اس آیت میں عمومی حکم ممانعت ہے کہ ناپ سے بکنے والی چیز ہو یا تول سے مقداری ہو یا زمین کی کسی ہی چیز ہو اور جس کسی کے حق کی ہو اس میں کمی نہ کرو۔

وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ﴿۸۵﴾ اور زمین میں فساد کرتے ہوئے توحید و عدل سے باہر مت نکلو۔

عثو (مصدر) ہر طرح کے فساد کو شامل ہے خواہ ادائے حقوق کی کمی کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ بعض علماء نے کہا کہ بخس جس کی پہلے ممانعت کی گئی ہے مراد ہے ٹیکس اور معاملات میں دوسری حق تلفیاں اور عثو (جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے) سے مراد ہے چوری، ڈاکہ، رہزنی۔

لَا تَعْثَوْا کا معنی جب لَا تُفْسِدُوْا ہے تو پھر مفسدین کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ایک سوال کیا جا سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مفسدین کہنے سے وہ صورتیں نکل گئیں جو واقع میں صحیح ہوتی ہیں لیکن بظاہر فساد نظر آتی ہیں جیسے حضرت خضر کا قتل (بچہ کو قتل کرنا، کشتی کا توڑ پھوڑ دینا) یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفسدین (کا مفعول محذوف ہے اس لفظ کو بڑھانے) سے مراد یہ ہے کہ اپنے دینی امور اور دنیوی مصالح کو بگاڑ کر فساد کرتے نہ پھرو۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ حال مؤکدہ ہے کیونکہ نہی کا معنی خود ہی ادا ہو گیا ہے (یعنی جب مقصد کا ہم معنی ہے تو مفسدین سے تاکید ہو گئی دوسرا کوئی معنی مراد نہیں ہے۔

بَقِیَّتُ اللّٰهِ خَیْرٌ لَّكُمْ اللہ کا دیا ہوا جو کچھ (حلال مال) بچ جائے وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ صحیح ناپ تول کر دینے کے بعد جو مال بچ رہ جاتا ہے وہ بہتر ہے اس حرام مقدار سے جو ناپ تول میں کمی کر کے تم حاصل کرتے ہو۔

مجاہد نے کہا بَقِیَّتُ اللّٰهِ سے مراد ہے اللہ کی اطاعت جیسے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خیر۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ اگر تم مومن ہو۔ یعنی بَقِیَّتُ اللّٰهِ کا تمہارے لئے بہتر ہونا ایمان کے ساتھ مشروط ہے مومن کو ہی نیکی کا اجر ملے گا۔ کافر کی بھلائیاں تو اکارت جائیں گی۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اگر تم میرے قول کو سچا جانتے ہو تو میں نے جو صحیح ناپنے تولنے کا تم کو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو۔

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۞ اور میں تمہارا پہرہ دینے والا نہیں ہوں کہ برائیوں سے تم کو بچالوں یا تمہارے
اعمال کی نگہداشت کروں اور پھر ان کا بدلہ دوں۔ میں تو صرف ناصح اور مبلغ ہوں میرا فرض تو حکم پہنچانے کے بعد پورا ہو جاتا
ہے (تم مانو یا نہ مانو) یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم اپنی بد اعمالی نہ چھوڑو تب بھی میں اللہ کی نعمت تم پر قائم رکھوں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ
انہوں نے کہا شعیب کیا تمہاری نماز تم کو حکم دیتی ہے کہ جن بتوں کی
پوجا ہمارے بڑے کرتے چلے آئے ہیں ہم ان کو چھوڑ دیں یا اپنے مال میں اپنی منشاء کے مطابق جو ہم تصرف کرتے ہیں اس کو
ترک کر دیں۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا حضرت شعیب نماز بہت پڑھتے تھے اسی لئے کافروں نے آپ کی نماز کا تذکرہ کیا۔ اعمش کے
نزدیک نماز سے مراد ہے نماز پڑھنا۔ حضرت شعیب نے قوم کو توحید کی دعوت دی اس کے جواب میں انہوں نے آپ سے
استہزاء میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اس قسم کی دعوت تم سے یہ نماز کی پابندی اور مداومت کرا رہی ہے اس نے تمہارے
دماغ میں خلل پیدا کر دیا ہے ورنہ صحیح ہوش و خرد کا تو یہ تقاضا نہیں ہے۔

اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۞ واقعی آپ ہیں بڑے عقلمند دین دار۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا
انہوں نے حضرت شعیب کو حلیم و رشید بطور طنز کہا تھا حقیقت میں ان کا مقصد تھا یہ کہنا کہ تم سادہ لوح گمراہ ہو۔ عرب لوگ ایک
مفہوم کی تعبیر اس کی ضد سے کر لیتے ہیں جیسا نیک شگون یا دعا کے طور پر اس شخص کو جس کو بچھو ڈس لے سلیم کہتے ہیں اور خطرناک
بیابان کو مفازہ کامیابی کی جگہ۔ بعض علماء نے کہا انہوں نے حلیم و رشید بطور استہزاء کہا تھا، مقصد تھا حضرت شعیب کے اندر
سفاہت و ضلالت ثابت کرنا۔ حضرت ابن عباس کے قول پر استعمال مجازی ہوگا اور مؤخر الذکر قول پر حقیقی کنائی (یعنی بطور کنایہ
مذمت مراد ہوگی) بعض نے کہا کلام مبنی بر حقیقت ہے اور کنایۃً مذمت کرنا بھی غرض نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے
خیال میں تو تم بڑے سنجیدہ اور صاحب رشد ہو۔ ہم تو گمان بھی نہیں کرتے تھے کہ ایسی بات کہو گے حضرت صالح کی قوم نے
بھی حضرت صالح سے ایسا ہی کلام کیا تھا اور کہا تھا قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ
بعض علماء نے کہا اِنَّكَ کا لفظ محذوف ہے اور کلام حقیقی ہے یعنی (تم تو اپنے خیال میں حلیم و رشید ہو پھر ایسی بات تم
نے کیوں کی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ
شعیب نے کہا اے میری قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے
اپنی طرف سے اچھا رزق عطا فرمایا ہے (تو کیسے اس کا حکم نہ مانوں)۔

بَيِّنَةٍ بصیرت اور واضح بیان۔ مِّنْ رَّبِّيْ اپنے رب کی طرف سے یعنی وحی اور نبوت کے ذریعے سے۔ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ یعنی
بغیر مشقت اٹھائے بغیر اللہ نے حلال رزق عطا فرمایا۔ رِزْقًا حَسَنًا سے مراد ہے حلال رزق۔ کہا گیا ہے کہ حضرت شعیب[1]
بڑے مالدار تھے۔

---

[1] اس فقیر کی نظر میں حضرت شعیب کے مالدار ہونے نہ ہونے کو آیت کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ آپ نے قوم کو
ایسے بلیغ طرز سے ہدایت کی کہ کسی کو برا ماننے کا موقع نہ ملے۔ آپ کا مقصد تو یہ تھا کہ جب اللہ نے اپنی رحمت سے تم کو وحی کے ذریعے
سے بصیرت عطا فرمادی اور واضح طور پر بیان کر دیا اور کثیر حلال رزق عطا فرمادیا تو پھر شرک کرنا اور حرام رزق حاصل کرنے کی تدبیریں اور
طریقے اختیار کرنا حماقت ہے۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے عبارت کو متکلم کے سانچے میں ڈھال لیا اور فرمایا کہ اگر مجھ پر اللہ کا یہ کرم
ہو گیا تو پھر اس کے احکام کی مخالفت کیسے جائز ہو سکتی ہے۔ اسلوب کلام بدلنے اور خطاب سے متکلم کی طرف کلام کا رخ موڑنے سے ہدایت
بخش۔ مطلوب ہو گئی اور مخاطب کی ناگواری کا احتمال بھی نہیں رہا۔ مترجم

دیار یا یہ مراد ہے کہ قوم لوط کی اجڑی ہوئی بستیاں تم سے دور نہیں ہیں تمہارے ملک کے متصل ہیں یا یہ مراد ہے کہ شرک و معاصی کی وجہ سے مستحق عذاب ہونے میں قوم لوط تم سے بعید نہیں تھی (تم دونوں میں زیادہ تفاوت نہیں) لفظ قریب و بعید اور قلیل و کثیر میں مذکر و مؤنث برابر ہیں دونوں کے لئے ان کا استعمال ہوتا ہے اس لئے بعید کو بصیغہ مفرد لانے میں کوئی خرابی نہیں۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اور اپنے رب سے گزشتہ شرک و معاصی کی معافی طلب کرو۔ یعنی ایمان لے آؤ اور گزشتہ گناہوں پر پشیمانی کا اظہار کرو اور معافی مانگو۔

ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ آئندہ اس کے احکام کی تعمیل کرو اور ممنوعات سے باز رہو۔

اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝ بلاشبہ میرا رب توبہ کرنے والے مومنوں پر بڑا مہربان اور ان سے بڑی محبت کرنے والا ہے۔ وَدُوْد بروزن فعول اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسم مفعول کے معنی میں بھی۔ اللہ مؤمنوں سے محبت کرنے والا ہے اور مؤمن اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ پس وہ محب بھی ہے اور محبوب بھی۔

ان آیات میں حضرت شعیبؑ نے کفر و معصیت پر جمے رہنے کی صورت میں عذاب الٰہی سے ڈرایا پھر توبہ کر لینے کی صورت میں مغفرت کا امیدوار بنایا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ کہنے لگے شعیب ہماری سمجھ میں تو تیری بہت سی باتیں آتی نہیں۔ یعنی توحید سمجھ میں آتی ہے نہ عبادت کی ممانعت نہ ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت نہ تیری بیان کی ہوئی دلیلیں۔ چونکہ ان کی قوت فہم کمزور تھی اور سوچنے سمجھنے سے وہ عاری تھے اس لئے ایسی بات کہی یا یہ وجہ تھی کہ حضرت شعیبؑ کے کلام کو وہ حقیر و ناقابل التفات سمجھتے تھے یا یہ وجہ تھی کہ ان کو حضرت کے پیام سے انتہائی نفرت تھی اس لئے اس کو سمجھنے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے۔ میرے نزدیک حقیقت یہ تھی کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی تھی انسانوں کے دل اللہ کی چٹکی میں ہیں وہ جس طرف کو چاہتا ہے دلوں کو موڑ دیتا ہے۔

وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تم کو اپنے گروہ کے اندر کمزور دیکھتے ہیں اگر ہم تم کو کچھ دکھ پہنچائیں تو تمہارے اندر دفاع کی طاقت نہیں۔ یا ضعیفًا سے مراد ہے ذلیل یعنی ہم اپنے گروہ میں تم کو ذلیل پاتے ہیں ہم میں تمہاری کوئی عزت نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے ضعیف سے مراد ہے ضعیف البصر حضرت شعیبؑ نابینا تھے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حمیری محاورہ میں ضعیف اعمیٰ کو ہی کہا جاتا ہے۔ مگر فینا کا لفظ بتا رہا ہے کہ ضعیف سے نابینا مراد نہیں ہے (اس تفسیر کے نزدیک یہ بات ممکن ہے کہ بے بصر کہہ کر قوم کی مراد بے بصیرت ہو یعنی ہمارے گروہ میں تم بے بصیرت ہو بے وقوف ہو جو ایسی باتیں کہتے ہو۔ مترجم)

فائدہ

بعض علماء معتزلہ نے نبوت کو قضا اور شہادت پر قیاس کیا ہے ان حضرات کے نزدیک جس طرح نابینا شاہد اور قاضی نہیں ہو سکتا اسی طرح نبی بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ قیاس غلط ہے (قضا و شہادت کا تعلق معاینہ سے ہے اور نبوت کا مدار مشاہدہ پر نہیں یہ واقعات کا اظہار اور فیصلہ الگ چیز ہے اور ہدایت و رسالت جداحیثیت رکھتی ہے۔ مترجم)

حضرت یعقوبؑ کا نابینا اور پھر بینا ہو جانا عبارت قرآنی سے ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ۔ پھر فرمایا فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۔

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ اور اگر تمہارے قبیلے کی پاسداری نہ ہوتی تو ہم پتھراؤ کر کے تم کو ہلاک کر

دیتے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم طاقت ور تھی اور آپ ان کی حفاظت میں تھے۔ بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہاری قوم چونکہ ہماری ہم مذہب ہے اس لئے ان کی عزت ہماری نظر میں ہے اگر تمہاری قوم کی عزت ہماری نظر میں نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ حضرت شعیبؑ کے قبیلے کی طاقت کا خوف مراد نہیں ہے کیونکہ تین سے دس تک یا سات تک جس جماعت کے افراد ہوں اس کو رہط کہا جاتا ہے (اور ظاہر ہے کہ دس پانچ آدمیوں کی طاقت پوری بستی کے مقابل کیا ہو سکتی ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ اول قول کی تائید آیت تِسْعَةُ رَهْطٍ سے ہوتی ہے۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ دس سے کم کی جماعت کو رہط کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا چالیس تک رہط کا اطلاق ہوتا ہے۔ جزری نے نہایہ میں لکھا ہے کہ رہط دس سے کم مردوں کی جماعت کو کہتے ہیں جن میں کوئی عورت نہ ہو۔ بعض نے چالیس سے کم کو رہط کہا ہے۔ قاموس میں ہے رہط کسی شخص کی قوم اور اس کا قبیلہ یا تین سے سات تک یا دس تک یا دس سے چالیس تک (یعنی نو) تک کی جماعت جبکہ ان میں کوئی عورت نہ ہو۔ لفظ رہط کا کوئی مفرد اس لفظ سے نہیں (یعنی کوئی ایسا مفرد لفظ نہیں ہے جس کی جمع رہط ہو) بغوی کے کلام میں بھی صاحب قاموس کے بیان کے اول معنی کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝ اور تم ہمارے لئے کوئی عزت والے نہیں ہو کہ تمہاری عزت تم کو سنگساری سے محفوظ رکھے۔ جو احمق، جاہل دلائل بازی کا جواب نہیں دے سکتے وہ گالیاں اور دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں۔ ما (حرف نفی) کے بعد اَنْتَ کا لفظ ذکر کرنا اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ کافروں کا کلام حضرت شعیبؑ کی ذات سے متعلق تھا۔ آپ کی عزت سے متعلق نہ تھا۔ عزت تو خاندان شعیب کی حضرت شعیبؑ کو ایذا دینے سے روک رہی تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا

شعیبؑ نے کہا اے میری قوم کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک اللہ سے بھی زیادہ عزت والا ہے اور تم نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یعنی میرے خاندان کی رعایت سے تم نے مجھے قتل نہیں کیا اور اللہ کی طرف سے تو مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے اس قدر و رسالت کا تم نے کوئی لحاظ نہیں کیا اور اللہ کو بالکل فراموش کر دیا۔ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہوئے تم کو کوئی اندیشہ ہوا نہ اس کے رسول کی توہین کرنے سے کوئی باک۔

اَرَهْطِيْٓ میں ہمزہ استفہام انکاری کا بھی ہو سکتا ہے اور زجر و تہدید کے لئے بھی۔ ظِهْرِيًّا، ظہر (پشت) سے بنایا گیا ہے۔ یائے نسبت کی وجہ سے دوسرے تغیرات لفظی کے ساتھ ظا کو زیر بھی دے دیا گیا۔

اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ جو کچھ تم کر رہے ہو بلاشک و شبہ خدا اس کو اپنے علمی دائرے میں گھیرے ہوئے ہے یعنی تمہارا کوئی عمل اس سے چھپا ہوا نہیں ہے وہ یقیناً تمام اعمال کا بدلہ دے گا۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ

اور اے میری قوم تم اپنی حالت میں عمل کرتے رہو۔ میں بھی اپنے طور پر عمل کر رہا ہوں اب جلدی ہی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور وہ کون شخص ہے جو جھوٹا ہے۔ مَكَانَة سے مراد ہے عداوت پر قائم رہنا۔ مَنْ يَّاْتِيْهِ میں مَنْ استفہامیہ ہے (کس پر عذاب آئے گا تم پر یا مجھ پر) یا موصولہ ہے (جس پر عذاب آئے گا) سورۂ انعام میں بھی ایسی آیت گزر چکی ہے۔ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ کا عطف مَنْ يَّاْتِيْهِ پر ہے یعنی عنقریب تم جان لو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے تم پر یا مجھ پر اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا ہے تم یا میں۔

وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝ اور تم انجام کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ رقیب

پیروی کی اور فرعون کا طریقہ و معاملہ سراسر گمراہی و کجروی تھا۔ نام کو بھی اس میں صلاح و رشد نہیں تھا۔ ہر پسندیدہ قابل ستائش امر کو رشد اور ہر برے امر کو غی کہا جاتا ہے۔

آیت میں فرعون کے گروہ کی جہالت و حماقت کا اظہار ہے کہ فرعون الوہیت کا مدعی تھا باوجودیکہ اپنے مصاحبین کی طرح معمولی انسان تھا علی الاعلان کفر و شرک اور ظلم کرتا تھا اور موسیٰ ہادی برحق تھے۔ آپ کا قول حق برحق تھا، عقل و نقل کی شہادت اور معجزات کی تائید آپ کے قول کو ثابت کر رہی تھی مگر پھر بھی فرعون کے ساتھی ایسے کوردل تھے کہ موسیٰ جیسے ہادی برحق کے اتباع سے روگرداں اور فرعون جیسے باطل پرست کے پیرو تھے۔

يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ قیامت کے دن دوزخ کی جانب وہ اپنی قوم کا پیشوا ہوگا اور دوزخ میں سب کو اتار دے گا۔ جس طرح دنیا میں گمراہی کی جانب بڑھنے میں سب کا امام تھا۔ قیامت کے دن چونکہ ایسا ہونا اتنا یقینی ہے کہ گویا ایسا ہو گیا اس لئے بجائے مستقبل کے ماضی کا صیغہ استعمال کیا اور اَوْرَدَهُمْ فرمایا۔ وِرْد کا معنی ہے چشمہ وغیرہ میں اترنا۔ دوزخ کو پانی فرض کر کے اس میں داخل ہونے کو وُرُود قرار دیا (گویا دوزخ ایک چشمہ یا تالاب ہوگا جس میں فرعون آگے آگے اور اس کے اتباع جو جانوروں کی طرح جاہل نابکار تھے پیچھے پیچھے اس میں اتریں گے)۔

وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ اور وہ دوزخ بہت ہی بری جگہ ہے اترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جائیں گے۔ پانی میں اترنا، پیاس بجھانے اور خنکی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور دوزخ میں اترنے سے پیاس اور سوزش میں مزید اضافہ ہوگا اس لئے فرمایا کہ برا چشمہ ہوگا۔

آیت وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ایک دعویٰ تھا اور يَقْدُمُ قَوْمَهُ الخ اس کی دلیل ہے کیونکہ جس کی رہنمائی دوزخ میں لے جائے وہ یقیناً غلط رو ہوگا اور اس کی رہبری تباہ کن ہوگی یا یوں کہا جائے کہ رشید وہ ہے جس کا انجام اچھا ہو اور فرعون کی پیشوائی کا انجام تباہ کن ہوگا۔ گویا دوسری آیت پہلی آیت کی تشریح ہے۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی وہ ملعون ہوں گے یعنی اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے انبیاء اور مومنوں کی زبانی ان پر لعنت کی گئی اور قیامت کے دن بھی ان پر لعنت کی جائے گی۔

بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝ برا انعام ہے جو ان کو دیا گیا۔

رِفْد کا معنی ہے مدد۔ مَرْفُوْد اسم مفعول کا صیغہ ہے یا رِفْد کا معنی ہے عطیہ اور مَرْفُوْد کا معنی ہے عطا کیا ہوا۔ قاموس میں ہے اِرْفَاد مدد کرنا اور عطا کرنا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الْقُرٰى یہ (جو ہم نے بیان کیا) چند (تباہ شدہ) بستیوں کی کچھ اطلاعات ہیں۔

نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ ہم آپ کو ان کی خبریں سناتے ہیں یعنی ان کی خبریں آپ کو بتائی گئی ہیں۔

مِنْهَا قَاۗىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ۝ ان بستیوں میں سے کچھ تو کھڑی ہیں۔ یعنی ان کے نشانات باقی ہیں اور کچھ کٹی کھیتی کی طرح بے نشان ہو گئی ہیں۔ مقاتل نے کہا قائم سے مراد ہیں جن کے نشان دکھائی دے رہے ہیں اور حصید سے مراد وہ ہیں جن کی نمود بھی نہیں دکھائی دیتی۔

بعض علماء نے قائم کا ترجمہ آباد اور حصید کا ترجمہ ویران کیا ہے۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اور ہم نے ان کو ہلاک کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔ کفر و معصیت کر کے اپنی جانوں کو تباہی کا مستحق بنا دیا۔ ظَلَمْنٰهُمْ کی ضمیر بستیوں والوں کی طرف راجع ہے۔

فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَاۗءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝

اور جب آپ کے رب کی طرف سے ہلاکت کا حکم آ گیا تو ان کے معبود جن کو وہ پوجتے تھے اور اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے کچھ بھی کام نہ آئے (اور عذاب کو دفع نہ کر سکے) اور ہلاکت آفرینی و بربادی کے سوا ان کچھ ان کے لئے نہ بڑھا سکے تتبیب سے مراد ہے عذاب تتبیب، بربادی، ہلاکت اور نقصان۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ اور مذکورہ اقوام کی گرفت کی طرح آپ کے رب کی طرف سے پکڑ دوسری بستیوں والوں کی بھی ہوتی ہے جبکہ وہ ظالم تھے۔ یعنی وہ ظالم ہونے کی وجہ سے مستحق عذاب تھے۔ اس لئے اللہ نے ان کی بھی گرفت کی۔

اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ بے شک اللہ کی پکڑ سخت دکھ پہنچانے والی ہے جس سے رہائی ناممکن ہے
حضرت ابو موسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے آخر جب اس کی گرفت کرتا ہے تو ایسی کرتا ہے کہ پھر وہ چھوٹ نہیں سکتا۔ یہ فرمانے کے بعد حضورؐ نے آیت وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ تلاوت فرمائی رواہ الشیخان فی الصحیحین والترمذی (فی السنن) وابن ماجہ۔

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ بے شک اس میں (یعنی کافر و ظالم بستیوں کو ہلاک کرنے اور ان کے مذکورہ واقعات میں) بڑی عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے عذاب آخرت کی عظمت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ مجرموں پر دنیا میں جو عذاب آیا وہ عذاب آخرت کا ایک نمونہ تھا۔ یہ مطلب ہے کہ ان واقعات کے بیان کو سن کر وہ اللہ کی نافرمانیوں کو ترک کر دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عذاب اس اللہ مختار کی طرف سے آیا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق جس کو چاہے عذاب دے اور جس پر رحم کرنا چاہے رحم کرے رہے منکرین آخرت تو وہ جانوروں کی طرح ہیں نہ ان میں فہم ہے نہ بصیرت بلکہ وہ اس قسم کے عذاب کو محض اتفاق اور سلسلۂ اسباب مصیبت کی پوشیدہ کڑی قرار دیتے ہیں۔

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ یہ (یوم قیامت جس میں عذاب ہوگا) ایسا دن ہوگا کہ سب لوگ اس روز جمع کئے جائیں گے۔ یعنی اس روز سب کی حساب فہمی ہوگی۔ جزا و سزا ہوگی اس کے لئے سب کو جمع کیا جائے گا۔

وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ اور یہی ایسا دن ہوگا کہ جس میں شہادت دینے والے لوگوں پر شہادت دیں گے یا یہ مطلب ہے کہ سب کو حاضر کیا جائے گا کوئی غائب نہیں ہوگا۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ اور ہم اس دن کو صرف اس لئے پیچھے رکھ رہے ہیں کہ وہ مدت (زندگی) جو اللہ کے نزدیک مقرر ہے پوری ہو جائے۔ اَجَل سے پہلے لفظ انتہا محذوف ہے اَجَل سے پوری مدت زندگی مراد ہے۔ ختم زندگی کا وقت مراد نہیں ہے۔ کیونکہ ساعت اختتام میں تعدد نہیں اس کو معدود نہیں کہا جا سکتا۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ جب وہ دن آ جائے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا۔ یعنی شفاعت نہ کر سکے گا۔ یا ایسی کوئی بات نہ کہہ سکے گا جو اس کو فائدہ پہنچا سکے۔ دوسری آیت میں آیا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ

يَوْمَ يَاْتِ میں يَاْتِ کا فاعل یا اجل ہے یعنی جس روز اجل آ جائے گی یا يَوْم سے مراد ہے وقت اور يَاْتِ کا فاعل ہے يَوْم یعنی جب اور جس وقت وہ دن آ جائے گا یا اللہ فاعل ہے یعنی جس روز اللہ آ جائے گا اللہ کے ظہور کو دوسری آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے فرمایا ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ، وَجَآءَ رَبُّكَ۔

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ پس کچھ ان اہل حشر میں بدبخت ہوں گے اور کچھ خوش نصیب۔ جس کے لئے بدبختی لکھ دی گئی ہے وہ بدبخت ہوگا اور جس کے لئے خوش نصیبی لکھ دی گئی وہ سعید ہوگا۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا ہم ایک جنازہ کے ساتھ بقیع میں پہنچے تو رسول اللہ ﷺ بھی (چھڑی) ہاتھ میں

لئے سامنے سے آ گئے) نظر آئے آپ تشریف لا کر بیٹھ گئے تھوڑی دیر چھڑی سے زمین کریدتے رہے۔ پھر فرمایا کوئی جان کسی بدن میں پھونکی ہوئی ایسی نہیں کہ جنت یا دوزخ میں اس کی جگہ پہلے سے لکھ دی گئی ہو یا اس کا شقی یا سعید ہونا لکھ دیا گیا ہو یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ تو پھر اپنے مقدر میں لکھے پر بھروسہ کیوں نہ کر لیں اور عمل کو ترک کیوں نہ کر دیں۔ فرمایا نہیں عمل کئے جاؤ ہر ایک کو تقدیر میں لکھے ہوئے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ شقاوت والوں کو اہل شقاوت کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور اہل سعادت کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے آیت فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی الخ تلاوت فرمائی۔ رواہ البغوی و بخاری۔ مسلم میں بھی اسی طرح کی حدیث آئی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ — سو جو لوگ شقی ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے۔ دوزخ میں ان کی چیخ پکار ہوگی۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا زفیر سخت آواز اور شہیق پست آواز۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا گدھے کی آواز کی ابتدائی حالت کو زفیر کہتے ہیں اور آواز کی آخری حالت جب آواز ٹوٹ کر گدھے کے پیٹ میں گھومتی ہے شہیق کہلاتی ہے۔ قاموس میں بھی یہی ہے۔ ابو العالیہ نے کہا حلق میں ہونے کی حالت میں آواز کو زفیر اور سینے میں اترنے کی حالت میں آواز کو شہیق کہا جاتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے سانس کا باہر نکالنا زفیر ہے اور سانس کا لوٹا کر اندر لے جانا شہیق ہے۔ لیکن زفیر کا استعمال گدھے کی ابتدائی آواز کے لئے اور شہیق کا استعمال گدھے کی آخری آواز کے لئے ہوتا ہے۔ قاموس میں آیا ہے زَفَرَ یَزْفِرُ زَفْرًا وَّ زَفِیْرًا کھینچ کر سانس کو باہر نکالا (یعنی زفیر آہ بھرنے کو کہتے ہیں)۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ — ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں۔

ضحاک نے کہا آسمان و زمین سے جنت و دوزخ کے آسمان و زمین مراد ہیں جو چیز سر کے اوپر کی جانب ہو وہ سماء ہے اور جس پر قدم لگے ہوئے ہوں وہ ارض ہے۔ یہ بات تو قطعی ظاہر ہے کہ حشر میں سب لوگوں کا اجتماع ہوگا تو کسی جگہ ہوگا قدموں کے نیچے بھی کوئی چیز ہوگی اور سر کے اوپر کی جانب بھی کچھ ہوگا۔ اہل معنی کہتے ہیں کہ عرب لوگ جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کو آسمان و زمین کے وجود کے ساتھ مشروط کرتے ہیں تو ان کی مراد اس فعل یا عدم فعل کا دوام ہوتا ہے۔ اس قول کی روشنی میں مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ کی مراد ہوگی۔ دوامی ہمیشہ۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ — ہاں اگر آپ کے رب ہی کو نکالنا منظور ہو تو دوسری بات ہے۔ یہ جملہ بظاہر دلالت کر رہا ہے کہ دوزخ کے اندر دوزخی ایک خاص وقت تک رہیں گے پھر مدت سکونت دوزخ ختم ہو جائے گی۔

ایک روایت میں حضرت ابن مسعودؓ و حضرت ابوہریرہؓ کے جو اقوال آئے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ جہنم پر ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ حالت اس وقت ہوگی جب ان کو اس میں احقاب (صدیوں) تک رہتے ہوئے ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ کا ایک بیان بھی اسی طرح آیا ہے صوفیاء میں سے شیخ محی الدین ابن عربی کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن یہ قول اجماع کے اور صریحی آیات و احادیث کے خلاف ہے اللہ نے فرمایا ہے فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ عذاب میں ہی وہ ہمیشہ رہیں گے۔ طبرانی، ابو نعیم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دوزخیوں سے کہہ دیا جائے کہ تم کو دوزخ میں اتنی مدت رہنا ہے جتنی سنگریزوں کی تعداد ہے تو وہ اس کو سن کر خوش ہو جائیں گے اور اگر اہل جنت سے کہہ دیا جائے کہ تم جنت میں اتنی مدت رہو گے جتنی سنگریزوں کی گنتی ہے تو ان کو یہ سن کر غم پیدا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوگا بلکہ ان سب دوزخیوں اور جنتیوں کے لئے وہاں دوام

موت مقرر کر دیا ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں اور حاکم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا۔ حضرت معاذ وہاں پہنچے تو ایک تقریر میں فرمایا لوگو! میں اللہ کے رسول ﷺ کا قاصد ہو کر تمہارے پاس یہ اطلاع دینے کے لئے بھیجا گیا ہے کہ لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف پھر وہاں دوامی قیام ہو گا وہاں زندگی ہو گی بغیر موت کے اور قیام ہو گا بغیر کوچ کے (یعنی کبھی وہاں سے کوچ نہیں کیا جائے گا) اور ایسے جسموں کے اندر ہو گا جو کبھی نہیں مریں گے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے پھر ایک منادی (دونوں فریق کے درمیان) ندا کرے گا اے دوزخ والو! (آئندہ) موت نہیں اور اے جنت والو (آئندہ) موت نہیں۔ ہر شخص جس حالت میں ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہا جائے گا اے اہل جنت (جنت میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے اور اے اہل نار (دوزخ میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے۔

ایک اور حدیث جس میں موت کو ذبح کر دینے کا ذکر ہے اس میں یہ بھی آیا ہے کہ ندا دی جائے گی اے اہل جنت موت نہیں ہے اور اے دوزخ والو آئندہ موت نہیں ہے۔ یہ حدیث شیخینؒ نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے کہ قول اگر صحیح روایت سے ثابت ہو جائے تو اس قول کا یہ مطلب ہے کہ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا جب اس کے اندر کوئی اہل ایمان میں سے نہیں رہے گا (سب کافر ہی رہ جائیں گے) اور کافر تو اس میں ہمیشہ بھرے رہیں گے۔

میں نے آیت لٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ یہ آیت بدعتی مسلمانوں کے حق میں نازل ہوئی۔ لیکن بکثرت اہل تفسیر کے نزدیک احقاب سے مراد غیر متناہی صدیاں ہیں۔ جب علماء کا یہ خیال ہے کہ کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے تو اب اس آیت کا اور آیت کے اندر جو دو استثناء کئے گئے ہیں ان کا مطلب کیا ہو گا۔ اس کی توضیح علماء نے مختلف طور پر کی ہے۔ میرے نزدیک سب سے اچھا مطلب یہ ہے کہ کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مگر جب ان کو بھڑکتی آگ سے نکال کر کھولتے ہوئے پانی میں لے جا کر ڈالا جائے گا تو جہنم سے کھینچ کر حمیم میں ڈال دیا جائے گا اور اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

بغوی نے آیت یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ حمیم و جحیم کے درمیان چکر لگاتے رہیں گے۔ آگ کی شدت کی وجہ سے جب وہ فریاد کریں گے تو گرم ابلتا پانی جو پگھلے ہوئے تانبے یا تیل کی طرح ہو گا ان کو پلایا جائے گا۔

اللہ نے فرمایا وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یا آگ اور زمہریر (سخت ترین سردی) کے عذاب میں چکر لگاتے رہیں گے۔ شیخین نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ دوزخ نے اپنے رب سے شکایت کی اور عرض کیا اے میرے رب میرے ایک حصے کو شدت گرمی کی وجہ سے دوسرا حصہ کھائے جاتا ہے۔ اللہ نے اس کو سال میں دو سانس لینے کی اجازت دے دی ایک سردی کے موسم میں اور ایک گرمی کے موسم میں (موسم گرما میں) جو لوگ سخت ترین گرمی محسوس کرتے ہیں وہ دوزخ کی سانس کی وجہ سے ہوتا ہے اور سخت ترین سردی جو محسوس کرتے ہیں وہ بھی دوزخ کے سانس کے سبب سے ہوتا ہے۔ بزار نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور حضرت ابو سعیدؓ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ آیت فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا میں استثناء کا رجوع (گناہ گار) مومنوں کی طرف ہے جو گنہگار مومنوں کو گناہوں کی سزا میں اللہ دوزخ میں ڈال دے گا پھر ایک مدت کے بعد وہاں سے رہا کر دے گا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگوں کو گناہوں کی سزا میں دوزخ کی لپٹ لگے گی پھر اللہ اپنی رحمت سے ان کو جنت میں داخل فرما

دے گا اور ان کو اہل جنت کی طرف سے جہنمی کہا جائے گا۔ رواہ البخاری۔

حضرت عمران بن حصینؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے دوزخ سے نکال لئے جائیں گے پھر ان کو جنت میں داخل کر لیا جائے گا لوگ ان کو جہنم والے کہیں گے۔ رواہ البخاری۔ طبرانی نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت سے بھی ایسی حدیث نقل کی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے۔ کہ وہ لوگ اللہ سے دعا کریں گے کہ جہنمی کا نام اللہ ان سے مٹا دے اللہ ان کی دعا پر اللہ یہ نام ان سے مٹا دے گا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور جتنی مدت اللہ چاہے گا وہ دوزخ میں رہیں گے۔ دوزخ میں مشرک ان کو عار دلائیں گے کہ تم کو تمہارے ایمان نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا (ہماری طرح تم بھی دوزخ میں ہو) اس پر اللہ ہر موحد کو دوزخ سے نکال لے گا کوئی موحد وہاں باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ایک طویل حدیث کے ذیل میں طبرانی اور بیہقی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور طبرانی نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ گناہگار مومنوں کا دوزخ میں جانا پھر وہاں سے نکلنا آتی احادیث میں آیا ہے جو حد تواتر تک پہنچ چکی ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے بدکار مومن دوزخ سے نکالے جائیں گے اور صحت استثناء کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ مجموعے سے کسی حکم کے منتفی ہونے کے لئے بعض افراد سے حکم کا زوال کافی ہے۔ اور استثناء دو وہم سے ہیں (گناہگار مومن پھر لوٹیں) عذاب کے زمانے میں باوجود مومن ہونے کے یہ لوگ جنت سے دور ہوں گے۔ دوامی ابدی حکم کی نفی دونوں طور پر ہوتی ہے انتہائی جانب منقطع ہونا اور ابتداء کی جانب غلط آغاز ہونا۔ پس یہ لوگ نہ دوامی سعید ہوں گے نہ ابدی شقی بلکہ گناہوں کی وجہ سے شقی اور ایمان و یقین کی وجہ سے سعید۔

ایک شبہ

اس صورت میں تو فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيدٌ کہنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ جب تیسری قسم نکل آئی جو سعید بھی ہے اور شقی بھی جنہوں نے اعتبار سے سعید اور ایمان کی وجہ سے شقی تو شقی اور سعید کو دو قسمیں قرار دینا درست نہ ہوگا دونوں تو باہم متقابل اور حریف سمجھے غلط ہوگا

ازالہ

تقابل دو چیزوں کے درمیان تین صورتوں میں ہوتا ہے۔

(۱) دونوں چیزیں ایک وقت میں ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں اور یہ ممکن ہو کہ دونوں نہ ہوں بلکہ ایک کا وجود دوسری کا نہ ہونا ضروری ہے جیسے وجود و عدم یا اثبات و نفی۔

(۲) دونوں چیزوں کا ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہ ہو لیکن یہ ممکن ہو کہ دونوں چیزیں نہ ہوں تیسری کوئی چیز ہو جیسے سیاہی اور سفیدی کہ ایک چیز سیاہ بھی نہ ہو اور سفید بھی نہ ہو بلکہ سرخ یا زرد ہو۔

(۳) یہ ممکن نہ ہو کہ دونوں چیزیں نہ ہوں لیکن دونوں کا جمع ہونا ممکن ہو جیسے یہ ممکن نہیں کہ قیامت کے دن حشر کے بعد کوئی شخص سعید بھی نہ ہو اور شقی بھی نہ ہو البتہ یہ ممکن ہے کہ سعید بھی ہو اور شقی بھی۔ عارضی مدت کے لئے دوزخ

میں چلا جائے یہ اس کی شقاوت ہو پھر رہائی پاکر جنت میں داخل ہو جائے یہ اس کی سعادت ہو۔ (مترجم)

آیت میں یہی تیسری قسم مراد ہے۔ یعنی کچھ لوگ خالص سعید ہوں گے کچھ خالص شقی اور کچھ سعید و شقی کا مجموعہ ایسا کوئی نہ ہوگا کہ سعید بھی نہ ہو اور شقی بھی نہ ہو۔

بعض علماء نے کہا اِلَّا مَا شَآءَ سے مراد ہے تین شقاوت اور تین شقاوت سے مراد ہیں گنہگار مؤمن۔

بعض اہل تفسیر نے کہا۔ مطلب یہ ہے کہ میدان حشر میں کھڑے ہونے کا وقت یا دنیا میں عالم برزخ میں رہنے کا وقت مستثنیٰ ہے۔ اہل سعادت کو دوامی جنتی ہونا اور اہل شقاوت کا دوامی دوزخی ہونا حساب و کتاب کے بعد ہوگا اللہ نے حساب کا پورا وقت یا دنیا میں رہنے کا وقت یا برزخ میں رہنے کا وقت، سکونت جنت و دوزخ کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ ان اوقات میں آدمی نہ جنت میں ہوگا نہ دوزخ میں۔ اس تفسیر پر ممکن ہے بلکہ احتمال ہے کہ حسب قول بیضاوی خلود سے استثناء ہو یعنی ان اوقات کے علاوہ جنتی کا جنت میں اور دوزخی کا دوزخ میں خلود و دوام ہوگا۔

بعض علماء نے کہا استثناء کا رجوع لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ کی طرف ہے یعنی جتنی مدت اور جن اوقات میں اللہ کو منظور ہوگا ان اوقات میں زفیر و شہیق نہ ہوگا۔

سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ اِلَّا کو سِوَىٰ کے معنی میں قرار دیا جائے۔ استثناء کے لئے نہ قرار دیا جائے یعنی اِلَّا کے معنی اس جگہ علاوہ اور سوا کے ہیں جیسے عربی میں بولا جاتا ہے لَكَ عَلَيَّ اَلْفٌ دِرْهَمٍ اِلَّا الْاَلْفَانِ الَّذِيْنَ قَبَضْتَهُمَا تیرے مجھ پر ہزار درہم ہیں علاوہ سابق کے دو ہزار کے۔ یعنی کل تین ہزار ہیں آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ وہ وہاں اتنی مدت رہیں گے جتنی مدت دنیا کے آسمان و زمین باقی تھے علاوہ اس زیادہ غیر متناہی مدت کے جتنا اللہ ان کو وہاں رکھنا چاہے گا مرادیہ ہے کہ ہمیشہ وہاں رہیں گے لیکن اس پیرایہ میں مطلب ادا کرنے کی صورت کا ذکر کیا ہے اور بیچ میں مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے وقت نظر کی ضرورت ہے جیسے طویل مدت کو ذہن نشین کرنے کے لئے مدت بتانے کے سلسلہ میں اس مدت کو ذکر کیا جس سے لوگ واقف تھے پھر اس کے بعد غیر متناہی اور ان گنت مدت کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ غیر متناہی مدت کا طول سمجھ میں آجائے۔

بعض علماء نے کہا اِلَّا بمعنی واو (اور) ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا تاکہ تمہارے خلاف لوگوں کو کوئی دلیل نہ ملے اور نہ ظالموں کو تم پر کوئی حجت حاصل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم رہیں گے اور جب تک اللہ چاہے گا یعنی ہمیشہ رہیں گے۔ فراء نے کہا یہ استثناء تو ہے مگر ایسا استثناء ہے کہ اس کا فعلی ظہور کبھی نہیں ہوگا اگر تمہارا ارادہ قطعی طور پر کسی کو مارنے کا ہو مگر تم اس طرح کہو خدا کی قسم میں تجھے ضرور ماروں گا مگر اس وقت جب کہ نہ مارنا میری نظر میں بہتر ہو (تو نہیں ماروں گا) اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ وہ وہاں اس وقت تک رہیں گے جب تک اللہ چاہے گا جب اللہ اس کے خلاف چاہے گا تو وہ نکال لئے جائیں گے یعنی اگر اللہ چاہے گا تو ان کو رہائی دے دے گا۔ لیکن وہ ایسا کبھی نہیں چاہے گا۔

قتادہ نے کہا (ہمیں نہیں معلوم) اللہ ہی اس استثناء کے مطلب سے واقف ہے[1]

---

[1] اس فقیر کی نظر میں آیت کے مطلب میں کوئی ابہام نہیں بلکہ اس طرز بیان میں خاص قدرت ہے اور کوتاہ نظر لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہونے والے شبہ کا جواب بھی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ آیت میں بعض احوال آخرت کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ مؤمنوں کے لئے دوامی جنت اور کافروں کے لئے دوامی دوزخ کی صراحت کی ہے اور یہی قرینہ ہے اس بات کا کہ سماوات و ارض سے مراد جنت و دوزخ کے آسمان و زمین ہیں اور چونکہ یہ اخروی آسمان و زمین لازوال ہیں اور جنت و دوزخ کے اندر سکونت کو بقائے سماوارض کے ساتھ مقید کیا ہے اس لئے جنت و دوزخ کی سکونت بھی دوامی (بقیہ اگلے صفحے پر)

إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴿١٠٧﴾ بے شک آپ کا رب جو کچھ چاہے پورے طور پر اس کو کر سکتا ہے۔ (یعنی اس کا اختیار کلی اور ہمہ گیر ارادہ اور مشیت کلی آزاد ہے وہ مجبور نہیں ہے کہ اہل جنت کو جنت اور اہل نار کو دوزخ کی سکونت دوامی دینے کے بعد بے اختیار ہو گیا ہو کہ کسی کو اس کے مسکن سے باہر نہ نکال سکے لیکن نکالے گا نہیں۔ بقول فراء یہ استثناء صحیح ہے لیکن اس کا فعلی ظہور کبھی نہیں ہوگا۔

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ

اور لیکن جو خوش نصیب ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں گے مگر جب آپ کے رب کی مشیت ہو گی (تو نکل سکیں گے اگرچہ کبھی نہیں نکلیں گے) استثناء کے متعلق علماء کے مختلف اقوال اس آیت میں بھی وہی ہیں جو گزشتہ آیت کی تفسیر میں بیان کر دیئے گئے۔

میرے نزدیک اس جگہ پسندیدہ قول یہ ہے کہ بعض اوقات میں اہل جنت کو اس درجہ پر فائز کر دیا جائے گا جو جنت سے بھی اعلیٰ ہوگا یعنی اللہ کے دیدار میں استغراق اور بارگاہ قدس سے تو علی بیان الاتصال۔ فرمایا تفسیر نے آیت وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کی تشریح میں لکھا ہے کہ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں إِلَىٰ رَبِّهَا کو نَاظِرَةٌ سے پہلے ذکر کرنا مفید حصر ہے (اپنے رب ہی کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) یعنی اللہ کے دیدار میں اتنا غرق ہوں گے کہ کسی دوسری چیز کی طرف نگاہ بھی نہیں اٹھائیں گے۔ حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت اپنے عیش میں ہوں گے کہ اچانک اوپر سے ایک نور ان پر نمودار ہوگا وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اوپر سے ان کو جھانکتا دکھائی دے گا اور خطاب فرمائے گا اے اہل جنت تم پر سلام ہو۔ آیت سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ کا یہی مطلب ہے غرض اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف۔ اللہ کی جانب دیکھنے کے وقت وہ کسی اور نعمت کی طرف التفات بھی نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ اللہ حجاب کر لے گا اور اس کی چمک برکت اہل جنت کی گردن میں رہ جائے گی رواہ ابن ماجہ و ابن ابی الدنیا و الدار قطنی۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات جلد سوم میں یعقوب کی یوسف کے ساتھ والہانہ محبت کی حقیقت کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے کہ اللہ کے اسماء میں سے جو اسم جس شخص کا مبدء تعین (مرکز ظہور) ہوتا ہے اسی اسم کا ظہور (کسی جسم کے اندر) اس شخص کی جنت ہوتا ہے اور اس اسم کا ظہور تجلی درختوں، نہروں، حوروں اور محلات اور حور و غلمان کی شکل میں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے اور پانی شیریں ہے اور وہاں میدان ہیں اور اس کے پودے یہ ہیں یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ جنت کے پودے ہیں۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا کبھی یہ درخت اور نہریں چکنے اور روشن زجاجی اجسام (جیسے عینک کے آئینے) کی شکل اختیار کر لیں گے اور اللہ کے بے کیف دیدار کے حصول کا ذریعہ ہو جائیں گے انہیں کے ذریعے سے اللہ کا دیدار حاصل ہو جائے گا مگر یہ رویت ہر کیفیت سے پاک ہو گی پھر اپنی اصلی (شجری یا نہری) شکل کی طرف لوٹ آئیں گے اور مومن پھر انہیں سے (اسی شجری یا نہری شکل میں) تفریح کرے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے گا ہم نے اس مقام کی مزید توضیح سورۂ قیامۃ کی آیت رؤیت کی تفسیر کے ذیل میں کی ہے۔

عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴿١٠٨﴾ وہ غیر منقطع عطیہ ہوگا۔ یعنی اللہ کا وصال اور دیدار ایک ایسا عطیہ خداوندی ہو گا

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) ہو گی۔ نہیں اس صراحت کے بعد کیا خدا مجبور ہو گیا وہ مشیت سے معطل ہو گیا۔ کیا اس کو کوئی اختیار نہیں رہا یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس کو زائل کرنے کے لئے مشیت کا استثناء کر لیا جس کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ نے جنتیوں کے جنت اور دوزخیوں کے لئے دوزخ کو دوامی کر دیا لیکن وہ مجبور نہیں ہو گیا اس کی مشیت اس کے خلاف بھی کار فرما ہو سکتی ہے یعنی یہ دوامی حکم اس نے اپنی مشیت سے جاری کیا ہے اور اس حکم کے اجراء کے بعد اس کی مشیت و اختیار کی صفت سلب نہیں ہو گئی وہ جب چاہے مذکورہ صراحت کے خلاف بھی اپنے اختیار کو استعمال کر سکتا ہے مگر چونکہ اس نے وعدہ کر لیا ہے اور سزا و جزا دوامی ہونے کی صراحت کر دی ہے اس لئے باوجود اختیار کامل اور مشیت عامہ کے اس حکم کو منسوخ نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم (مترجم)

جس کا سلسلہ بھی منقطع نہ ہوگا۔ یوں تو جنت کی ہر نعمت غیر منقطع اور لازوال ہوگی لیکن اللہ کا دیدار اصلی اور حقیقی ہے اور دوسری چیزوں کا وجود ظلی ہے اللہ کے وجود سے وابستہ (بلکہ اسی کا پرتو۔ مترجم) بذات خود اور خود بخود موجود صرف اللہ ہے۔ ہر چیز کا مالک اور معبود وہی اصل ہے جیسے مانگے کپڑے اپنے نہیں ہوتے مالک کے ہوتے ہیں۔ پس اللہ جو اہل جنت کو اپنی بے کیف وصل عنایت کرے گا اور بے حجاب دیدار دکھائے گا وہی اصلی، حقیقی اور غیر منقطع عطا ہوگی، باقی دوسری نعمتیں واصلی ذات کے مقابلہ میں مجازی ظلی اور گویا معدوم ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

ابن زید نے کہا اہل جنت کے لئے تو اللہ نے اپنی غیر منقطع عطا کا ذکر کر دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ دوزخیوں کے لئے کیا چاہے گا کیا کبھی ان کا عذاب منقطع کرنا چاہے گا یا ان کا عذاب بھی لازوال ہوگا بلکہ دوزخیوں کے حق میں فرمایا اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝ ع ۹

سو (اے مخاطب) جس چیز کی یہ پرستش کرتے ہیں اس کے بارے میں ذرا شبہ نہ کرنا یہ لوگ بھی اسی طرح (بلا دلیل) غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں جس طرح ان کے بزرگ ان سے پہلے عبادت کرتے تھے۔ یعنی تمام لوگوں کی سرگزشت کی جو تفصیل ہم نے بیان کر دی اس کے بعد آپ شک میں نہ رہیے کہ مشرک جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں وہ سراسر گمراہی ہے اور اسی عذاب کا مستحق بنا دینے والی ہے جس عذاب کے مستحق ان کے اسلاف اپنی مشرکانہ عبادت کی وجہ سے ہوئے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے بیان کے بعد آپ کو شک نہ کرنا چاہئے کہ ان مشرکوں کے معبود نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر۔ ان کے معبود بھی ویسے ہی ہیں جیسے ان کے مشرک اسلاف کے۔ (اول مطلب پر مِمَّا يَعْبُدُ میں ما مصدریہ ہوگا اور دوسرے مطلب پر موصولہ۔ مترجم)۔

اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ الخ یہ ممانعت شک کی علت ہے یعنی ان کی عبادت بھی ویسی ہی مشرکانہ ہے جیسی ان کے اسلاف کی تھی (ما مصدریہ) یا یہ بھی انہیں کی پوجا کرتے ہیں جن کی ان کے اسلاف کرتے تھے (ما موصولہ) اور یہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا کہ ان کے اسلاف کا نتیجہ کیا ہوا۔ پس جو نتیجہ ان کا ہوا وہی ان کا ہوگا اسباب ایک جیسے ہیں تو نتائج بھی ایک ہی طرح کے ہوں گے۔

نَصِيْبَهُمْ نصیب سے مراد ہے حصۂ عذاب یعنی ان کا عذاب کا حصہ بھی اپنے اسلاف کی طرح پورا پورا ہوگا یا حصۂ رزق مراد ہے اس مطلب پر تاخیر عذاب کی وجہ کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے جو ان کے عذاب کو موخر کر دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے رزق کا حصہ پورا کر رہے ہیں۔ لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ کا مصدر توفیہ (باب تفعیل) ہے جس کا معنی ہے ادا کرنا خوب پورا پورا ادا کرنا کمی کے ساتھ۔

وَفَّيْتُهٗ حَقَّهٗ میں نے اس کا حق دے دیا اگر کچھ حصہ حق کا بھی رہ گیا ہو تب بھی یہ جملہ بولا جاتا ہے اور یہاں مراد ہے پورا پورا حق دینا اس لئے تاکید کے لئے غیر منقوص فرمایا کہ ان کے حصے کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی (یعنی توریت) پھر اس میں اختلاف کیا گیا کسی نے اس کو مانا تصدیق کی کسی نے نہ مانا تکذیب کی۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی کا پیام ہے کہ قرآن کی تصدیق و تکذیب کوئی نئی بات نہیں، موسیٰ کو جو توریت دی گئی تھی اس کو ماننے نہ ماننے میں ایسے ہی اختلاف ہو گیا تھا۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ اور اگر ایک بات آپ کے رب کی طرف سے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کا قطعی فیصلہ دنیا میں ہی ہو چکا ہوتا یعنی اگر قیامت تک مہلت دینے کا اللہ کا (ازلی) حکم نہ ہو گیا ہوتا تو حق

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ اور اللہ کے مقابلہ میں تمہارا کوئی مدد گار نہ ہوگا۔ پھر تمہاری مدد (کہیں سے بھی) نہیں کی جائے گی۔

اولیاء یعنی مددگار۔ جو عذاب کو دفع کر سکیں۔ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ یعنی پھر اللہ تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ تم کو عذاب دینے کا حکم ازلی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ثُمَّ استبعاد کے لئے ہے۔ یعنی اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہونی بہت بعید نا ممکن ہے یا کسی طرف سے بھی تمہاری مدد ممکن نہیں جس کو اللہ عذاب دینا طے کرے اس کی مدد کون کر سکتا ہے ترمذی اور نسائی نے بیان کیا کہ حضرت ابوالیسر (بقول بغوی ان کا نام عمرو بن غزیہ انصاری تھا) نے فرمایا ایک عورت کچھ چھوارے خریدنے میرے پاس آئی۔ میں نے کہا گھر کے اندر اس سے بڑھیا چھوارے ہیں (تم میرے ساتھ چل کر دیکھ لو) وہ میرے ساتھ اندر چلی گئی اندر پہنچ کر میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کا بوسہ لے لیا (کرنے کو تو ایسا کر گزرا) پھر مجھے اپنے کئے پر پچھتاوا ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آکر واقعہ عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا توبہ کرو اور اس کو ظاہر نہ کرو لیکن حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا اور ان سے تذکرہ کیا انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ توبہ کرو اور ظاہر نہ کرو مگر مجھ سے صبر نہ ہو سکا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے گیا ہوا ہے تو نے اس کی غیبت میں اس کی بیوی کے ساتھ ایسی حرکت کی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ حضورؐ نے میرے دوزخی ہونے کا خیال کر لیا پھر آپ نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور آیت نازل ہوئی۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر۔ اور رات کے کچھ حصوں میں۔ جو دن کے قریب ہوں۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ آیت کیا آپ کے لئے مخصوص ہے یا سب لوگوں کے لئے ہے فرمایا سب لوگوں کے لئے ہے۔ صاحب لباب النقول نے لکھا ہے حضرت ابوالیسرؓ کی روایت کی طرح حضرت ابوامامہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت بریدہؓ وغیرہم کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے۔

دن کے دونوں کناروں سے مراد ہے صبح اور شام۔ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ رات کا ایک ٹکڑا یا چند ساعات جو دن سے متصل ہوں (یعنی پچھلا پہر رات یا شروع رات)۔ زُلَف زُلْفَة کی جمع ہے۔ ازلفہ اس کو قریب کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک دن کے دونوں کناروں سے فجر اور مغرب کی نمازیں اور زُلَفًا سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ حسنؒ نے کہا دن کے دونوں کناروں سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں اور زُلَف سے مراد مغرب و عشاء ہیں۔ حسن بصری کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر و عصر کی اور مغرب و عشاء کی نمازیں بوقت ضرورت ایک ہی شمار کی جاتی ہیں۔ اسی بنا پر امام مالکؒ، امام شافعیؒ و امام احمدؒ کا قول ہے کہ اگر عصر کے آخر وقت میں کوئی کافر مسلمان ہو جائے یا حائضہ پاک ہو جائے یا لڑکا بالغ ہو جائے تو اس پر ظہر و عصر دونوں نمازیں واجب ہو جائیں گی اور عشاء کے آخر وقت میں صورت مذکورہ اگر پیدا ہو جائے تو مغرب اور عشاء دونوں کا وجوب ہو گا امام ابو حنیفہؒ کا قول جمہور ائمہ کے قول کے خلاف ہے آپ کے نزدیک صرف عصر اور عشاء کی نماز واجب ہو گی آیت اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کی تشریح میں سورۂ نساء میں ہم نے امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید میں مختلف احادیث نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز کا وقت دوسری نماز کے وقت سے جدا ہے اس لئے امام صاحبؒ کے نزدیک سفر یا بیماری یا بارش کے عذر کی وجہ سے بھی ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو ملا کر ایک وقت میں پڑھنا درست نہیں اور بغیر عذر کے تو دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

امام مالکؒ و امام احمدؒ کے نزدیک سفر کی حالت میں دو نمازوں کو جمع کرنا درست ہے امام مالک اور امام احمد بارش کی وجہ سے صرف مغرب و عشاء کو ایک وقت میں ادا کرنا جائز کہتے ہیں اور امام شافعیؒ بارش کی وجہ سے صرف ظہر و عصر کو ملا کر پڑھنا درست

قرار دیتے ہیں اور امام احمد کے نزدیک بیماری کی وجہ سے بھی دو نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔

جمہور نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت حمنہ بنت جحشؓ کا واقعہ پیش کیا ہے، حمنہ استحاضہ کی مریضہ تھیں (استحاضہ یعنی ایسا مرض جس میں ہر وقت خون جاری رہتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے ان کو دو نمازوں کو جمع کرنے کا حکم دے دیا تھا اور فرمایا تھا ظہر میں تاخیر اور عصر میں عجلت (یعنی اول وقت ادا) کر لیا کرو۔ پھر غسل کر کے دونوں نمازیں (ترتیب کے ساتھ) جمع کر لیا کرو۔ رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سفر کی حالت میں ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء سے ملا کر پڑھا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں ملا کر پڑھا کرتے۔ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب زوال سے پہلے سفر کرتے تھے تو ظہر (کی نماز) عصر تک مؤخر کر دیا کرتے تھے پھر اتر کر دونوں کو ملا کر پڑھا کرتے تھے اور زوال کے بعد سفر کرتے تھے تو ظہر پڑھ کر سوار ہوتے تھے۔

مسلم میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک میں ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء سے ملا کر پڑھا تھا۔ میں نے عرض کیا حضور ﷺ نے ایسا کیوں کیا فرمایا تاکہ امت کو دشواری نہ رہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ان تمام احادیث کے جواب میں فرمایا کہ ان احادیث میں ملا کر پڑھنے سے مراد ہے جمع صوری یعنی ظہر کو آخر وقت میں پڑھنا اور عصر کو شروع وقت میں، مغرب کو دیر کر کے آخر وقت میں پڑھنا اور عشاء کو جلدی کر کے آغاز وقت میں ادا کرنا اس طرح حضور ﷺ نے ہر نماز اسی کے وقت میں ادا کی لیکن ایک میں تاخیر اور دوسری میں عجلت کرنے کی وجہ سے دونوں نمازیں ملی ہوئی بظاہر ایک وقت نظر آنے لگیں اور حقیقت میں ہر نماز اپنے وقت میں ہوئی۔ حضرت حمنہ والی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور اسی معنی پر وہ حدیث محمول ہے جو صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آئی ہے کہ مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر سفر کے رسول اللہ ﷺ نے دو نمازیں جمع کر کے پڑھیں (یعنی ایک میں تاخیر کی اور دوسری میں عجلت) مسلم کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا اس سے حضور ﷺ کی غرض کیا تھی فرمایا امت کو دشواری میں نہ رکھنا۔ طبرانی کی روایت ہے بغیر کسی وجہ کے مدینے میں دو نمازوں کو جمع کیا تھا۔ دریافت کیا گیا اس سے حضور ﷺ کا مقصد کیا تھا فرمایا امت کے لئے سہولت پیدا کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جمع صوری (یعنی اول نماز کو آخر وقت میں اور دوسری کو اول وقت میں پڑھنا) ہی مراد ہے کیونکہ دونوں نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں پڑھنا تو بالاجماع درست نہیں۔ صحیح بخاری میں عمرو بن دینار کی روایت سے تو صریحی یہی مضمون آیا ہے، الفاظ اس طرح ہیں میں نے کہا ابو الشعثاء میرا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے ظہر کے وقت میں تاخیر اور عصر کی نماز میں عجلت کی ہوگی اور مغرب کو آخر وقت میں اور عشاء کو شروع وقت میں ادا کیا ہوگا۔ ابو الشعثاء نے جواب دیا میرا بھی یہی خیال ہے۔

ایک سوال

جمع تاخیر کو تو جمع صوری قرار دیا جا سکتا ہے (یعنی ظہر کو اتنا مؤخر کرنا کہ عصر سے مل جائے اور مغرب کو اتنا مؤخر کرنا کہ عشاء سے متصل ہو جائے) لیکن بعض روایات میں تو جمع تقدیم کی شکل آئی ہے جس کو جمع صوری قرار ہی نہیں دیا جا سکتا (یعنی عصر کو وقت سے پہلے ظہر کے وقت میں ادا کیا اور عشاء کو اس کا وقت آنے سے پہلے مغرب کے وقت میں پڑھا) چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس کو امام احمد اور بیہقی اور دار قطنی نے حسین بن عبید اللہ بن عبداللہ بن عباس اور عکرمہ اور کریب از ابن عباسؓ کے سلسلے سے نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا فرودگاہ پر زوال آفتاب ہو جاتا تو سوار ہونے سے پہلے حضور ﷺ ظہر و عصر کو جمع کر لیا کرتے اور فرودگاہ پر (قیام کی حالت میں) زوال نہ ہوتا تو (بغیر ظہر پڑھے) روانہ

نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔

إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ　　نیکیاں لے جاتی ہیں برائیوں کو بے شک

یعنی نیکیوں کی وجہ سے برائیاں ساقط کر دی جاتی ہیں۔ طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے نیکی برائی بدی کا جس طرح خوبی کے ساتھ پیچھا کرتی اور تیزی کے ساتھ اس کو پہنچ جاتی ہے ایسی پہنچنے والی اور کوئی چیز میں نے نہیں دیکھی۔ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔

امام احمد ناقل ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے، فرمایا جب تو کوئی گناہ کرے تو اس کے پیچھے نیکی بھی ضرور کرنا۔ نیکی بدی کو مٹا دے گی، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا نیکیوں میں سے لا الٰہ الا اللہ (کا قرار) بھی ہے۔ فرمایا وہ سب نیکیوں سے افضل ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ کسی شخص نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لے لیا پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کر دیا، اس پر اللہ نے آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ نازل فرمائی۔ اس شخص نے عرض کیا، کیا یہ تنہا میرے لئے ہے، فرمایا میری تمام امت کے لئے۔ دوسری روایت میں ہے میری امت میں سے جو بھی اس پر عمل کرے اس کے لئے (یہی حکم) ہے رواہ البخاری و مسلم۔

مسلم کی روایت میں اس کے بعد اتنا اور بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس شخص سے فرمایا اللہ تیری پردہ پوشی کر جاتا اگر تو اپنا جرم چھپا لیتا۔ حاکم و بیہقی نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں اور جمعہ کی نماز جمعہ تک اور رمضان کے روزے رمضان تک درمیانی گناہوں کو ساقط کر دینے والے ہیں۔ جبکہ کبیرہ گناہوں سے پرہیز ہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر دریا ہو اور وہ اس میں روز پانچ بار غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ بھی میل رہ جائے گا صحابہؓ نے عرض کیا کچھ نہیں رہے گا، یہی حالت پانچ نمازوں کی ہے اللہ ان سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور دل گناہوں کی کثافت سے پاک ہو جاتا ہے رواہ البخاری و مسلم فی صحیحیہما۔

ذٰلِكَ　　یہ۔ یعنی استقم اور اس سے بعد والا حکم یا قرآن

ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ　　نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے۔

وَاصْبِرْ　　اور اے محمدؐ آپ طاعت پر قائم رہیں یا جو دکھ آپ کو پہنچے اس پر آپ صبر کریں۔ بعض نے کہا نماز پر پابند رہیں، جیسا دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ　　بلاشبہ نیکی کرنے والوں کا ثواب اللہ ضائع نہیں کرے گا۔ ضمیر (یعنی اجرہم) کی جگہ اسم ظاہر (یعنی المحسنین) لانے کا فائدہ یہ حاصل ہو گیا کہ چونکہ وہ نیکوکار ہیں اس لئے اللہ ان کے ثواب کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس آیت میں اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ صلوٰۃ اور صبر نیکو کاری ہیں اور اخلاص نیت نہ ہو تو دونوں ناقابل اعتبار ہیں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ

جو امتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں ان میں ایسے سمجھدار لوگ کیوں نہ ہوئے جو دوسروں کو ملک میں بگاڑ پیدا کرنے (یعنی شرک و کفر) سے منع کرتے۔ بقیہ (وہ شے جس کو باقی رکھا جائے، وہ شے جو باقی رہے) سے مراد ہے عقل و خرد اور فضیلت۔ جو چیز آدمی باقی رکھتا ہے یا جو باقی رہنا چاہیے ان میں عقل و دانش ہی سب سے اعلیٰ چیز ہے (جسمانی طاقت و صحت اور مال وغیرہ کا درجہ دانش و عقل سے کم ہے) اگر کسی میں کوئی اچھی بات اور بھلائی ہو تو اس کو بقیہ کہا جاتا ہے اور اگر کوئی برگزیدہ اور اعلیٰ طبقے میں سے ہو تو کہا جاتا ہے هُوَ مِنْ بَقِيَّةِ الْقَوْمِ ایک اور کہاوت ہے فِي الزَّوَايَا خَبَايَا وَفِي الرِّجَالِ بَقَايَا یعنی گوشوں میں کچھ چھپی چیزیں ہوتی ہیں اور آدمیوں میں کچھ اعلیٰ اشخاص رہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک بقیہ سے طاعت مراد ہے آیت بَقِيَّةُ

[illegible]

انتہائی شکلیں یا طرح طرح ... جبری انسان کو پتھر کی طرح غیر مختار ہے۔ قدریہ انسان کو اپنے افعال کا خالق و مختار جانتا ہے اور اختیار کامل کا حامل قرار دیتا ہے۔

إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ — سوائے ان کے جن پر آپ کا رب رحم کرے یعنی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ اپنی مہربانی سے راہ مستقیم کی ہدایت کر دے یہ لوگ توحید عقائد اور اصول دین کی تکمیل پر متفق رہیں گے باقی فروعی امور میں اختلاف کرتے ہی رہیں گے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر دائیں بائیں کچھ خطوط کھینچے اور فرمایا یہ مختلف راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا اپنی طرف بلا رہا ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ رواہ احمد والنسائی والدارمی۔

وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ — اور اسی کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ یعنی رحمت کے لئے ہی ان کی پیدائش کی ہے۔ اس مطلب پر ذٰلِکَ سے اشارہ رحمت کی طرف ہوگا اور ھُمْ ضمیر مَن رَّحِمَ کی طرف راجع ہوگی۔ حسن اور عطاء نے کہا ذٰلِکَ سے اشارہ اختلاف کی طرف ہے اور ھُمْ ضمیر اختلاف کرنے والوں کی طرف راجع ہے۔ یعنی اختلاف ہی کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اشہب نے امام مالک سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا تو امام نے فرمایا اللہ نے ان کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق جہنم میں چلا جائے۔ ابو عبیدہ نے کہا میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے کہ اللہ نے ایک فریق کو رحمت کے لئے اور دوسرے فریق کو عذاب کے لئے پیدا کیا ہے۔ فراء نے کہا اللہ نے اہل رحمت کو رحمت کے لئے اور اہل اختلاف کو اختلاف کے لئے پیدا کیا۔ فراء کے نزدیک ذٰلِکَ سے اشارہ رحمت اور اختلاف دونوں کی طرف ہے اور ضمیر کا مرجع اہل رحمت و اہل اختلاف دونوں ہیں۔ گویا ضمیر کا مرجع ناس ہے اسی کی تائید آئندہ آیت سے ہو رہی ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ — اور آپ کے رب کی بات پوری ہو گئی۔ کلمہ سے مراد ہے حکم یا وہ قول جو فرشتوں سے فرمایا تھا۔

لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ — کہ میں جہنم کو (نافرمان) جنات اور انسانوں سے سب سے ضرور بھر دوں گا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ — اور ہم پیغمبروں کے قصے میں سے یہ سارے مذکورہ قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں۔

وَكُلًّا اور ہر خبر۔ أَنبَاءِ الرُّسُلِ پیغمبروں کی اور ان کی امتوں کی خبریں۔ مَا نُثَبِّتُ، كُلًّا کا بیان ہے یا بدل ہے۔ یعنی انبیاء اور اقوام سابقہ کے احوال بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے یقین میں استحکام اور ادائے رسالت کے لئے دل میں قوت اور ایذائے کفار کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا ہو۔

وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ — اور اس دنیا میں آپ کے پاس حق آگیا (حسن و قتادہ)۔ دوسرے اہل تفسیر نے کہا هٰذِهِ سے مراد ہے سورت۔ ظاہر یہ ہے کہ أَنبَاءُ الرُّسُلِ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بیان کردہ قصص و اخبار میں جو بات حق تھی وہ آپ کے پاس آگئی۔

وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ — اور وہ چیز آگئی جو اہل ایمان کے لئے نصیحت اور یاد داشت ہے۔ یہ رسل و اقوام کے احوال کے بیان کے فوائد کا اظہار ہے۔

وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ۝

اور جو لوگ نہیں مانتے ان سے آپ کہہ دیجئے کہ آپ لوگ اپنی جگہ جو چاہو کئے جاؤ ہم اپنی جگہ اپنی قدرت کے موافق کر رہے

ہے۔ مَکَانَت سے مراد ہے حالت، قدرت اور وہ رخ جس پر وہ چل رہے ہیں اس کلام میں تہدید اور تنبیہ بدی کا فروں کے لئے دھمکی ہے۔

وَانْتَظِرُوْا ۚ اور (ہم پر مصائب آنے کا) تم انتظار کرتے رہو۔

اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ہم بھی (تم پر اس عذاب کے آنے کے) منتظر ہیں۔ (جو تم جیسے لوگوں پر گزشتہ زمانوں میں آچکا ہے)۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں کا اور زمین کا وہ علم جو بندوں کے علم میں نہیں ہے۔ اس سے کوئی مخفی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے اس لئے وہی تمہارے اعمال سے بھی واقف ہے۔

وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ اور (بندوں کے) تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے آپ کے امور کا بھی اور ان کے امور کا بھی وہی آپ کا ان سے انتقام لے گا وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسی اس کی مرضی ہوتی ہے حکم دیتا ہے۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ پس تم اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ عبادت کا حکم توکل کے حکم سے پہلے دینے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ توکل کی افادیت اسی وقت ہے جب عبادت کے ساتھ ہو (تنہا عبادت بغیر توکل کے مغرور بنا سکتی ہے۔ اور تنہا توکل بغیر عبادت کے اندھا توکل ہے جو انسان کو غیر مکلف قرار دے دیتا ہے۔ مترجم)

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو آپ کا رب اس سے غافل نہیں ہے۔

بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ توریت کا خاتمہ جس آیت پر ہوا ہے اسی پر سورۂ ہود کا خاتمہ ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر بڑھاپا آگیا فرمایا مجھے سورۂ ہود اور الواقعہ اور المرسلات اور عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔ رواہ الترمذی والحاکم، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ بغوی نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔ اس حدیث کو حاکم نے حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت سعیدؓ کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کر دیا۔

ابو یعلیٰ نے ضعیف سند سے حضرت انسؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت عمرانؓ کی روایت سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والی متقابلات نے بوڑھا کر دیا۔[1]

ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے مجھے سورۂ ہود نے اور اس کی ساتھ والیوں نے یعنی الواقعہ اور القارعہ اور الحاقہ اور اذا الشمس کورت اور سأل سائل نے بوڑھا کر دیا۔

طبرانی نے التفسیر میں حضرت عقبہ بن عامرؓ اور حضرت ابو جحیفہؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے۔ مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے بوڑھا کر دیا۔ طبرانی ہی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت سے اتنا زائد آیا ہے الواقعہ الحاقہ اور اذا الشمس کورت نے۔ ابن عساکر نے بروایت محمد بن علی مرسلاً نقل کیا ہے مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے اور ان واقعات نے جو مجھ سے پہلے دوسری امتوں کو پیش آئے بوڑھا کر دیا۔

[1] حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر بڑھاپا جلد آگیا۔ فرمایا مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والی الواقعہ اور عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا۔ (کنز العمال)

بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ اس قرآن کو (وحی کے ذریعے سے آپ کے پاس بھیجنے کے سبب سے۔ ما مصدریہ ہے یعنی وحی کرنا بمعنی مصدری ہے اور قرآن سے مراد سورت یوسف ہے

وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ اگرچہ آپ اس سے پہلے ناواقف تھے یعنی وحی کرنے سے پہلے آپ اس قصہ سے یا ان تمام قصص یا احکام و شرائع سے ناواقف تھے جن کی اطلاع آپ کو وحی کے ذریعے سے دی گئی ہے۔

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ جبکہ یوسف نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ اگر اَحْسَنَ الْقَصَصِ کو مفعول بہ قرار دیا جائے تو اِذْ قَالَ يُوْسُفُ اس سے بدل اشتمال ہوگا یا یوں کہا جائے۔ اُذْكُرْ فعل محذوف ہے اور اِذْ قَالَ اس کا مفعول فیہ ہے۔ (اس وقت کو یاد کرو جب یوسف نے کہا تھا) یوسف عبرانی لفظ ہے اسی لئے یہ لفظ غیر منصرف ہے آپ کے باپ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم تھے اور یہ سب بزرگ پیغمبر تھے۔ امام احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کریم بن کریم بن کریم بن کریم، یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم تھے۔

يٰاَبَتِ اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ابا میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور چاند سورج دیکھے۔

رَاَيْتُ (اس جگہ) رؤیا (خواب) سے مشتق ہے۔ رؤیت (دیکھنا) سے ماخوذ نہیں ہے کیونکہ آگے آیت میں لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ اور هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ فرمایا گیا ہے۔

سعید بن منصور نے سنن میں اور بزار و ابو یعلیٰ نے اپنی اپنی مسندوں میں اور ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابو الشیخ و ابن مردویہ نے اپنی تفسیروں میں اور عقیلی و ابن حبان نے ضعفاء میں اور حاکم نے مستدرک میں اور ابو نعیم و بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو بشرط مسلم صحیح بھی قرار دیا ہے کہ ایک یہودی نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا (بیہقی نے اس یہودی کا نام بستانہ لکھا ہے) محمد ﷺ ان ستاروں کے متعلق وضاحت کر دو جو یوسفؑ نے خواب میں دیکھے تھے۔ حضور ﷺ خاموش رہے اور جبرائیل نے نازل ہو کر آپ کو اطلاع دی تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں تجھے بتا دوں گا تو کیا تو مان لے گا، یہودی نے جواب دیا جی ہاں فرمایا (گیارہ ستارے) جریان، الطارق، الذیال، قابس، عمودان، الفلیق، المصبح، الفروح، الفرغ، وثاب اور ذوالکتفین تھے ان کو اور سورج چاند کو یوسفؑ نے دیکھا تھا کہ اوپر سے اتر کر ان

(گزشتہ سے پیوستہ) الرحیم، الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ اور یہ مرتبہ تلاوت کی۔ بار بار اس شخص نے عرض کیا امیر المؤمنین میرا قصور کیا ہے۔ فرمایا تجھے دانیال (پیغمبر) کی کتاب پہنچ رہی ہے۔ اس شخص نے کہا پھر آپ مجھے جو حکم دیں میں اس کی تعمیل کروں گا۔ فرمایا جا کر گرم پانی اور سفید اون کے ٹکڑے سے رگڑ کر اس کو مٹا دے آئندہ پھر اس کو نہ خود پڑھنا نہ کسی کو پڑھانا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اہل کتاب سے ان کی کتاب کی ایک نقل لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا حضور ﷺ نے فرمایا تیرے ہاتھ میں کیا ہے میں نے عرض کیا یہ کتاب کی نقل ہے ہم نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لئے اس کو حاصل کیا ہے یہ سنتے ہی حضور ﷺ کے دونوں رخسار (غصہ سے) سرخ ہو گئے پھر اعلان کیا گیا الصلوٰۃ جامعۃ انصار کہنے لگے رسول اللہ ﷺ کو غصہ آ گیا (کوئی خاص بات ہے) مسلح ہو جاؤ۔ پھر انصار نے رسول اللہ ﷺ کے منبر کو (حفاظت کے لئے) چاروں طرف سے گھیر لیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگو مجھے کلمات جامعہ و خاتمہ عطا کر دیئے گئے ہیں میرے لئے سب کا خلاصہ کر دیا گیا (یعنی تمام گزشتہ آسمانی کتابوں کا یہ مختصر خلاصہ جامعہ ہے) میں تمہارے پاس ان کلمات کو روشن صاف ستھری شکل میں لے آیا تم تردد نہ کرو اور حیرانی میں پڑنے والے لوگوں کے تردد سے فریب نہ کھاؤ میں نے یہ سن کر کھڑے ہو کر عرض کیا میں دل سے پسند کرتا ہوں اللہ کے رب ہونے کو اور اسلام کے دین ہونے کو اور آپ کے رسول ہونے کو پھر حضور ﷺ منبر سے اتر آئے۔ ابراہیم نخعی نے اسی طرح روایت کی ہے (ازالۃ الخفاء)

سب نے یوسف کو سجدہ کیا۔ سجود کی ہوا اے بے شک خدا کی قسم ان کے یہی نام تھے۔

رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ میں نے ان کو دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ سجدہ کرنا ذوی العقول کی خصوصیت ہے اس لئے ستاروں کے بے عقل ہونے کے باوجود ان کو صاحب عقل قرار دے کر بصیغہ ذوی العقول ان کی تعبیر کی اور ذوی العقول ہی کی ضمیر ان کی طرف راجع ہے۔ تعبیر کے لحاظ سے گیارہ ستاروں سے گیارہ بھائی مراد تھے ستاروں کی طرح وہ بھی سر چشمہ انوار تھے اور سورج سے اشارہ باپ کی طرف اور چاند سے اشارہ ماں کی طرف تھا۔

سدی نے کہا حضرت یوسف کی ماں راحیل کا تو انتقال ہو چکا تھا اس لئے چاند سے اشارہ آپ کی خالہ کی طرف تھا۔ ابن جریج نے کہا شمس مؤنث (مستعمل) ہے اور قمر مذکر ہے اس لئے شمس سے ماں کی طرف اور قمر سے باپ کی طرف اشارہ تھا۔ مگر یہ قول غلط ہے شمس کی تانیث اور قمر کی تذکیر تو عربی لغت میں ہے (واقعہ میں نہ سورج مؤنث ہے اور نہ چاند مذکر) سورج چاند سے زیادہ روشن ہے اس لئے سورج سے باپ اور چاند سے اشارہ ماں کی طرف تھا۔ حضرت یوسف نے یہ خواب جمعہ کی رات میں جو شب قدر بھی تھی دیکھا تھا یہ قول بعض علماء کا ہے (جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ مترجم)

قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ باپ نے کہا بیٹا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ بیان کرو۔

بُنَيَّ تصغیر کا صیغہ ہے کم عمر ہونے کی وجہ سے یا بوجہ انتہائی پیار کے تصغیر کا صیغہ استعمال کیا۔ بغوی نے لکھا ہے۔ یوسف اس وقت بارہ سال کے تھے۔

رؤیا نیند میں یا نیند جیسی کسی استغراق کی حالت میں کچھ دیکھنا۔ معمولی دیکھنے کو رؤیت تا کے ساتھ کہتے ہیں اور نیند (وغیرہ) میں دیکھنے کو رؤیا بالف مقصورہ کہا جاتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے قوت خیالیہ سے اتر کر اگر کوئی صورت حس مشترک میں چھپ جاتی ہے تو اس کو رؤیا کہا جاتا ہے۔ نفس ناطقہ اور عالم ملکوت میں (تجرد ذاتی کی) مناسبت ہے اس لئے نفس کو جب تھوڑا سا (نیند وغیرہ میں) کچھ فرصت ملتی ہے تو اس کا رخ عالم ملکوت کی طرف ہو جاتا ہے (اور چونکہ عالم ملکوت میں تمام غیر مادی حقائق و معانی کی غیر مادی صورتیں موجود ہیں اس لئے نفس وہاں سے کچھ غیر مادی معانی کو غیر مادی صورتوں میں حاصل کرتا ہے (اور وہیں لوٹ کر قوت خیالیہ کے سامنے رکھتا ہے) پھر قوت خیالیہ ان کو مناسب مادی شکلیں پہنا کر حس مشترک کے سامنے لاتی ہے اس طرح غیر محسوس حقائق محسوس ہو جاتے ہیں اور یہ سچا خواب ہوتا ہے۔ اب اگر غیر مادی اور مادی صورتوں میں گہری مناسبت ہوتی ہے کہ دونوں میں سوائے کلی اور جزئی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں ہوتا (غیر مادی صورت کلی اور مادی شکل جزئی) تو تعبیر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور گہری مناسبت نہیں ہوتی تو تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں قوت متخیلہ سے جو صورتیں اتر کر حس مشترک میں پہنچتی ہیں نفس ان کا مطالعہ اسی وقت کرتا ہے جب نیند یا استغراق کی حالت میں اس کو مطالعہ محسوسات (اور بیرونی انتقالات) سے فرصت ملتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں دو غلط اور ایک صحیح اور صحیح بھی کبھی مختلف عوارض کی وجہ سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ غلطی بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے اور کبھی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔

(۱) بیداری میں دیکھی ہوئی صورتیں خواب میں دکھائی دیتی ہیں یا قوت خیالیہ از خود ان کو اختراع کر لیتی ہے واقع میں ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اس خواب کو حدیث نفس کہتے ہیں۔

(۲) انسان کے بدن کے اندر شیطان ان تمام مقامات میں تیر جاتا ہے جہاں جہاں خون دوڑتا ہے اس لئے بعض وقت قوت خیالیہ میں کوئی ہیبت ناک یا برا دکھائی شکل یا تفریح آگیں صورت ڈال دیتا ہے ایسے خواب کو بد خواب یا حلم یا تخویف الشیطان کہا جاتا ہے۔

(۳) اللہ کی طرف سے خزائن غیب میں سے کسی امر کا یا اپنی پوشیدہ صفات میں سے کسی خاص صفت کا یا مدارج قرب ذات میں سے کسی درجہ خاص کا اعلام اور انکشاف ہوتا ہے (یعنی قلبی فیضان یا روحانی تحریر) یہی الہام بندے کے لئے بشارت (غیبی) بن جاتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا خواب ایک کلام ہوتا ہے کہ بندے سے اس کا رب کلام کرتا ہے رواہ الطبرانی بسند صحیح۔ یہ خواب سچا ہوتا ہے

صوفیاء کے نزدیک خواب کی حقیقت یہ ہے کہ عالم کبیر تو بمنزلہ انسان ہے اور عالم صغیر انسان ہے۔ عالم کبیر ایک شخص معین کا نام ہے جس کا نفس بھی ہے روح بھی ہے اور مختلف قوتیں بھی ہیں اس کی شکل انسانی شکل کی طرح ہے اسی لئے اس کو انسان کبیر کہا جاتا ہے۔ گویا جس طرح انسان عالم صغیر ہے اسی طرح یہ سارا جہان انسان کبیر ہے دونوں میں گہری اور کامل مشابہت ہے جس طرح انسان میں قوت متخیلہ (اور اس کی کارفرمائی) ہے اسی طرح عالم کبیر کی بھی قوت متخیلہ ہے جس کے اندر تمام محسوسات اور غیر محسوسات اعراض، جواہر، مجردات اور معانی (حقائق غیر مادیہ) موجود ہیں تمام کائنات خواہ مادی ہو یا مادے سے خالی۔ یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی جن کی خارجی کوئی صورت نہیں مثلاً موت، زندگی، دن، سال، بیماری بلکہ اللہ کی ذاتی صفات کی صورتیں بھی اللہ نے عالم کبیر کی قوت متخیلہ میں پیدا کر دی ہیں اور ہر چیز مصور ہو کر اس میں موجود ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے بخار کو سیاہ فام عورت کی شکل میں دیکھا تھا اور حضرت یوسفؑ نے گائے اور گیہوں کی بالیوں کی تعبیر میں کہا تھا کہ یہ ارزانی اور قحط کے سال ہیں اب یہ ضروری نہیں کہ جو شکل عالم کبیر کی متخیلہ میں کسی چیز کی ہو وہ اسی طرح ہو جس طرح ہمارے ذہنوں میں اس کی آتی ہے یعنی خواب کی شکل کا ٹھیک عالم (عالم کبیر کی متخیلہ والی شکل) کے مطابق اور اس کی جنس سے ہونا ضروری نہیں بلکہ دونوں میں قدرے مناسبت کافی ہے یہ مناسبت ظاہر ہو یا مخفی بہرحال اس مناسبت کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ میں اس چیز کی صورت آجاتی ہے اسی مناسبت کی وجہ سے حضرت یوسفؑ نے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو چاند سورج اور ستاروں کی صورت میں دیکھا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب میں اگر عورت کو خواب میں دیکھا جائے تو اس سے مراد بھلائی ہے۔ اور اونٹ سے مراد لڑائی ہے اور دودھ سے مراد فطرت ہے اور سبزی سے مراد جنت ہے اور کشتی سے مراد نجات ہے اور چھوارے سے مراد رزق ہے یہ روایت ابو یعلیٰ نے معجم میں ضعیف سند سے بیان کی ہے۔

عالم کبیر کی متخیلہ کو صوفیاء کی اصطلاح میں عالم مثال کہتے ہیں (امام غزالیؒ اور امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے اسی کو عالم برزخ کہا ہے۔ مترجم) جب نفس انسانی محسوسات کے مطالعے سے کسی قدر فرصت پاتا ہے تو عالم کبیر متخیلہ میں آجاتی ہیں یہی سچا خواب ہوتا ہے انبیاء علیہم السلام چونکہ تصرفات شیطان کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہیں ان کی قوت خیالیہ وہم کی دخل اندازیوں سے مامون ہوتی ہے، ان کی صرف آنکھیں سوتی ہیں دل بیدار رہتے ہیں اس لئے خیال کی خود تراشیدہ تصویروں اور ذہنی تعلق میں ان کو کامل امتیاز ہوتا ہے ان کے خوابوں میں غلطی پیدا کرنے والے فاسد عوامل مفقود ہوتے ہیں اسی وجہ سے ان کے خواب ہمیشہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور قطعی وحی کا حکم رکھتے ہیں جب حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں اور بیٹے سے فرمایا اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی تو بیٹے نے جواب دیا یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (دیکھو حضرت اسمٰعیلؑ نے نبوت کے خواب کو اغواء شیطانی اور وہم کی کار فرمائی نہیں قرار دیا بلکہ امر خداوندی سمجھا۔ مترجم)

کثرت ریاضت کی وجہ سے اولیاء کے نفوس قدسیہ پاک صاف ہو گئے ہیں، خاکی کدورتیں زائل ہو جاتی ہیں، گناہوں کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور ذنوب و معاصی کی سیاہی سے ان کا آئینہ دل صاف ہو جاتا ہے اور انوار نبوت کی پرتو اندازی سے ان کے دل روشن ہوتے ہیں اس لئے ان کے خواب بھی اکثر سچے اور مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں ہاں اگر کبھی وہ کوئی مشتبہ مشکوک چیز کھا لیں یا ضرورت حاجت سے زیادہ کھا لیں تو کچھ باطنی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے خواب کی سچائی میں بھی فرق

آجاتا ہے۔ یعنی جوانی صحبت کا اثر توان کے اندرونی احوال پر پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے کچھ اندرونی کثافت پیدا ہو جاتی ہے یعنی کسی گناہ کا کوئی کچھ کانٹا لگ جاتا ہے، کیونکہ فطرتاً وہ انبیاء کی طرح معصوم نہیں ہوتے ان وجوہ سے بھی ان کے خوابوں میں اتفاقی طور پر فساد پیدا ہو جاتا ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مؤمن کے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں جزء قرار دیا اور فرمایا مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے حضرت انسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے اور امام احمد، ترمذی اور ابوداؤدؒ نے صرف حضرت عبادہؓ کی روایت سے اور صرف بخاری نے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے اور مسلم نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور امام احمد و ابن ماجہ نے حضرت ابورزینؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ بجز اول الذکر روایت کے علاوہ باقی روایات میں مومن کے خواب کی بجائے رویائے صالحہ کا لفظ آیا ہے۔ ابن ماجہ اور امام احمد نے صحیح سند سے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نیک مسلمان کا خواب نبوت کے ستر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ ترمذی نے حضرت ابورزینؓ کی روایت سے بیان کیا کہ مومن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ طبرانی نے حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کی روایت سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں نیک مومن کا خواب اللہ کی طرف سے بشارت اور نبوت کے پچاس اجزاء میں سے ایک جزء ہوتا ہے۔ ابن النجار کی روایت میں حضرت ابن عمرؓ کی بیان کردہ حدیث میں نبوت کے چھبیس اجزاء میں سے ایک جزء فرمایا ہے۔

ایک سوال

خواب کا جزء نبوت ہونا کیا حقیقت رکھتا ہے اور تعداد اجزاء کے اختلاف کو دور کرنے کی کیا صورت ہے

جواب

کل مدت وحی (و نبوت) ۲۳ سال ہوئی جس میں سے ابتدائی چھ ماہ تک سچے خواب دکھائی دیتے تھے جو خواب بھی نظر آتا تو فجر کے تڑکے کی طرح جیسے سامنے آجاتا تھا اس لئے نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے خواب ایک جزء ہو گیا (کیونکہ ۲۳ سال کی ششماہیاں چھیالیس ہوتی ہیں اور ابتدائی ششماہی نبوت بصورت خواب کی تھی اس طرح سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہو گیا) باقی چالیس اور پچاس والی روایتیں تخمینی ہیں تحقیقی نہیں کسر کو اس میں بالکل ساقط کر دیا گیا ہے یا پورا جوڑ لیا گیا ہے۔ رہی وہ روایت جس میں ستر کی تعداد آئی ہے تو وہاں ستر سے عدد مخصوص مراد نہیں ہے بلکہ عدد کثیر مراد ہے جیسے آیت اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً میں عدد کثیر مراد ہے عرب ستر کا لفظ بول کر عدد کثیر مراد لے لیتے ہیں۔ اس روایت پر حدیث کا یہ مطلب ہو گا کہ خواب نبوت کے کثیر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ باقی چھبیس والی روایت شاذ ہے۔

عوام کے خواب بھی اگرچہ عالم مثال سے ہی ماخوذ اور حاصل ہوتے ہیں لیکن اکثر غلط اور جھوٹے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے خیالات میں نفسانی اور طبعی کثافتوں اور کدورتوں کی آمیزش ہوتی ہے اور کدورتوں کی پیدائش کا سرچشمہ گناہ ہوتے ہیں۔

اگر تصویر خیالی اور عالم مثال کی صورت میں مشابہت اور تعلق واضح نہ ہو تو اس کی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔ صحت تعبیر یا تو اللہ کی طرف سے الہامی ہوتی ہے جیسے وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ میں مراد ہے کہ اللہ خواب کی تعبیر بھی تم کو الہام کرتا ہے۔ الہامی تعبیر تو زیادہ تر انہی لوگوں کو میسر آتی ہے جو صاف اور اہل الہام ہوں یا صحت تعبیر عقل سلیم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ترمذی نے صحیح سند سے حضرت ابورزینؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا خواب نبوت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور خواب جب تک بیان نہ کیا جائے پرندے کی ٹانگ پر معلق رہتا ہے جب بیان کر دیا جاتا ہے تو گر پڑتا ہے۔ بہتر ہے کہ دانشمند یا حبیب کے سوا کسی سے اپنا خواب نہ بیان کرو۔ بعض روایات میں حبیب کی جگہ دوست

تحبّ کا لفظ آیا ہے (یعنی جس سے تم محبت کرتے ہو جو تمہارا دوست ہو) ابوداؤد اور ابن ماجہ نے صحیح سند سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ خواب پرندہ کی ٹانگ پر رہتا ہے جب تک اس کی تعبیر نہ دے دی جائے جب تم اس کی تعبیر دے دو تو وہ گر پڑتا ہے اور خواب دوست یا صاحب رائے (و عقل و فہم) کے سوا اور کسی سے نہ بیان کرو۔

میرے نزدیک اس حدیث میں طائر سے مراد ہے قضاء و قدر یعنی جو آدمی کے لئے مقدر کیا جا چکا ہے آیت مبارکہ ہے وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ یعنی ہر انسان کے گلے سے اس کا مقدر (عمل وغیرہ) ہم نے باندھ دیا ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ مومن کا خواب اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے فیصلے اور تقدیر پر مبنی ہوتا ہے جب تک اس کو بیان کر کے تعبیر نہ لے لی جائے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا مقدر کیا گیا ہے۔ جب تعبیر دینے والا الہام کے زیر اثر یا عقل، قوت، فہم اور وہبی ملکۂ استنباط کی وجہ سے تعبیر دے دیتا ہے تو خواب گر پڑتا ہے یعنی ظاہر ہو جاتا ہے اور خواب کا مقتضی واقع ہو جاتا ہے اور خواب سوائے دانشمند یا حبیب اور صاحب مودت کے اور کسی سے نہ بیان کرو۔ حبیب اور صاحب مودت سے مراد ہے مرد صالح جو اللہ سے اور مومنوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کے صالح ہونے کی وجہ سے اللہ کو اور مومنوں کو بھی اس سے محبت و مودت ہوتی ہے۔ من تحبّ کے لفظ کا بھی یہی مطلب ہے کہ جس سے تم کو محبت ہو یعنی دو مرد صالح ہو کیونکہ مومن کو مرد صالح سے ہی محبت ہوتی ہے حاصل یہ کہ دانش مند تو دانش و عقل کی روشنی میں صحیح تعبیر دے گا اور حبیب (یعنی اللہ اور مومنوں کا محب و محبوب) الہام کے زیر اثر درست تعبیر دے گا ان دونوں کی تعبیر میں غلطی واقع نہیں ہوگی۔

خواب کے اقسام مذکورہ احادیث سے مستفاد ہیں ابن ماجہ نے صحیح سند سے حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین (قسم کے) ہوتے ہیں۔

(۱) آدمی کو رنجیدہ کرنے کے لئے شیطان کی طرف سے تخویف۔

(۲) بیداری میں آدمی بعض باتیں کرتا یا ان کا ارادہ کرتا ہے پھر خواب میں انہی کو دیکھ لیتا ہے (یعنی حدیث نفس ہے)

(۳) نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے صحیح سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین ہیں، اللہ کی طرف سے بشارت اگر کوئی خوش کن خواب دیکھے اور بیان کرنے کو دل چاہے تو بیان کر دے اور اگر ناپسندیدہ خواب دیکھے تو کسی سے بیان نہ کرے بلکہ اٹھ کر نماز پڑھنے لگے۔ میں (خواب میں) طوق دیکھنے کو برا سمجھتا ہوں (یہ مصائب اور دنیوی مشاغل میں پھنسانا ہے) (مترجم) اور بیڑی کو (خواب میں دیکھنا) پسند کرتا ہوں بیڑی (کی تعبیر) دین کی پابندی ہے)

مسلم نے حضرت ابوقتادہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے جو شخص برا ناگوار خواب دیکھے وہ بائیں جانب تھوک دے اور شیطان سے اللہ کی پناہ کا خواستگار ہو اور کسی سے بیان نہ کرے خواب سے اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا اور اگر اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور سوائے اس کے جس سے اس کو محبت ہو اور کسی سے بیان نہ کرے۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ابوداؤد نے سنن میں اور ترمذی نے جامع میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے اگر کوئی شخص کوئی برا خواب دیکھے تو بیدار ہونے کے بعد بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور اللہ کی پناہ مانگے خواب سے اس کو ضرر نہ ہوگا۔

بات یہ ہے کہ خواب اگر شیطان کی طرف سے تخویف اور وسوسہ ہو تو اللہ کی پناہ مانگنے سے اس کا اثر زائل ہو جائے اور اگر عالم مثال کی مثالی اور صورت کشی ہو تو یہ صورت کشی کبھی قضاء معلق کی ہوتی ہے (کہ اگر اس کا شرعی تدارک و تلافی نہ ہو تو اس کا وقوع ہو جائے گا اور تدارک ہو جائے تو وقوع نہ ہوگا) اللہ کی پناہ گیری قضاء معلق کو بھی رد کر دیتی ہے (کیونکہ دعا اور تعوذ سے اس کا تدارک ہو جاتا ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے برے خواب بیان کرنے کی ممانعت اور اٹھ کر نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی

ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعبیر سے خواہ مخواہ رنج ہوگا۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ نماز کی طرف رجوع کرے اور نحوست اس کو دفع کرنے کی دعا کرے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت سلمان کی روایت سے اور ابن حبان و حاکم نے حضرت ثوبانؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضاء (معلق) کو سوائے دعا کے اور کوئی چیز رد نہیں کرتی۔ برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت نہ تحریمی ہے نہ تنزیہی (بلکہ رہنمائی اور غم سے بچانے کے لئے ہے) رسول اللہ ﷺ نے خود احد کی جنگ سے پہلے ان کے متعلق فرمایا تھا میں نے خواب میں اپنی شمشیر ذوالفقار کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی اور یہ مصیبت ہے اور میں نے گائے کو ذبح ہوتے دیکھا یہ بھی مصیبت ہے۔ آیت وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کردی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے خواب میں اپنے منبر پر بنی امیہ کو چڑھتے دیکھا اور حضور کو یہ امر ناگوار گزرا، مگر آپ نے یہ خواب بیان کر دیا سورۂ قدر کی تفسیر میں ہم نے یہ حدیث ذکر کردی ہے۔

جس روز امام حسینؓ کو شہید کیا گیا اسی روز حضرت ابن عباسؓ نے آپ کو شہید ہوتے خواب میں دیکھ لیا اور آپ نے اس خواب کو بیان بھی کر دیا۔ اس موضوع کی احادیث بکثرت آئی ہیں۔

میں کہتا ہوں برے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت ممکن ہے اس وجہ سے بھی ہو کہ دشمن اس کو سن کر خوش نہ ہوں اور اچھے خواب کو سوائے دانشمند یا حبیب کے اور کسی سے بیان کرنے کی ممانعت کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ دشمن اس کو سن کر حسد کرنے لگیں اسی لئے حضرت یعقوب نے حضرت یوسف کو بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرمادیا تھا۔

فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ پس وہ تیرے خلاف بڑی سازش کریں گے۔ یعنی حسد کی وجہ سے وہ تجھے ہلاک کرنے کی کوئی سازش کریں گے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ کوئی شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے سازش کو انسان کی نظر میں پسندیدہ بنا کر فریب پر آمادہ کردیتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ اور تیرا رب (جس نے یہ خواب دکھایا جس سے تیری بزرگی اور برتری ظاہر ہو رہی ہے اسی طرح) تجھے (نبوت، حکومت اور دوسرے بڑے کاموں کے لئے) منتخب کرے گا۔

اجتباء (باب افتعال) جَبَيْتُ الشَّيْءَ (میں نے اس چیز کو اپنے لئے منتخب کرلیا (چھانٹ لیا)) سے ماخوذ ہے جَبَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ میں نے حوض میں پانی جمع کرلیا۔

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ اور تجھے خوابوں کی تعبیر سکھا دے گا۔ خواب اگر سچا ہو تو حدیث ملک (الہام ملکوتی) ہوتا ہے اور جھوٹا ہو تو حدیث شیطان (تخویف شیطانی) ہوتا ہے۔ تعبیر حقیقی خواب ہوتی ہے اور تعبیر کا رجوع خواب کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس کو تاویل کہتے ہیں (اٰل یؤول سے تاویل ماخوذ ہے) یا یہ محاورہ (یعنی تعبیر کو تاویل کہنا) تاویل کلام اللہ اور تاویل اقوال انبیاء سے ماخوذ ہے یعنی اللہ اور انبیاء کے کلام کی باریکیاں اور اسرار بیان کرنا اور ان کی تفسیر کرنا۔

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰۤى اٰلِ يَعْقُوْبَ اور تجھ پر اور آل یعقوب پر پورا پورا احسان کرے گا۔

نعمت سے مراد ہے نبوت اور آل یعقوب سے مراد ہے اسرائیلی انبیاء۔ بعض کے نزدیک حضرت یعقوب کے نسلی بیٹے مراد ہیں کیونکہ آپ کے سب بیٹے پیغمبر ہوئے تھے (یہ قول ضعیف ہے) حضرت یعقوب یہ بات ستاروں کے لفظ سے سمجھ گئے۔ ستارے بھی روشن ہوتے ہیں۔ ستاروں کی روشنی سے آپ نے نبوت کی روشنی پر استدلال کیا۔

كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ جیسے اس سے پہلے اس نے تیرے دونوں دادا اور ابراہیم و اسحٰق کو اپنی بھرپور نعمت عطا کی تھی (یعنی نبوت عطا کی تھی) اَبَوَيْكَ (دو باپ) سے مراد ہے دادا اور پردادا۔

اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ یقیناً تیرا رب خوب واقف ہے کہ کون انتخاب اور فضیلت کا مستحق ہے
حَكِيْمٌ ۝ بڑی حکمت والا ہے جیسا ہونا چاہئے ویسا ہی کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ پوچھنے والوں کے لئے یوسف اور ان کے (علاتی) بھائیوں کے قصے میں توحید کی بکثرت نشانیاں اللہ کی قدرت و حکمت کی دلیلیں ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے ماموں کی بیٹی لیا بنت لیان کے بطن سے آپ کے چھ بیٹے اور دینہ نام کی ایک بیٹی تھی سب سے بڑا روبیل تھا، دوسرا شمعون، تیسرا لاوی، چوتھا یہودا پانچواں ریالون، چھٹا یشجر اور چار بیٹے زلفہ اور بلہہ دو باندیوں کے بطن سے تھے دان، نفتالی، جاد، آشر کذا قال البغوی۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ لیا کے مرنے کے بعد حضرت یعقوبؑ نے اس کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا تھا جس کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔ اس طرح کل بارہ بیٹے ہوگئے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ شریعت اسرائیلی میں ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح درست تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے نکاح میں ایک ہی زمانے میں دو بہنیں (لیا اور راحیل) تھیں۔

اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ کی تشریح میں بغوی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسف کا قصہ دریافت کیا تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کنعان سے مصر کو آل یعقوب کے منتقل ہونے کی وجہ دریافت کی تھی حضور ﷺ نے یہ قصہ بیان فرما دیا، تو یہودیوں نے اس بیان کو توریت کے بیان کے موافق پایا۔ بعض کے نزدیک سائلین سے مراد (صرف) یہودی ہی نہیں بلکہ جو بھی سوال کرے اس کے لئے اس قصہ میں توحید و نبوت کی نشانیاں ہیں۔ بعض کے نزدیک آیات سے مراد ہیں نصیحتیں اور عبرتیں اور سائلین سے مراد ہیں عبرت حاصل کرنے والے اس قصہ میں برادران یوسف کے حسد اور حسد کے مآل بد اور ان کی ذلت کا بیان ہے، حضرت یوسفؑ کے خواب اور اس کی تعبیر کے ظہور کی تفصیل ہے، حضرت یوسفؑ کی عفت اور صبر عن الشہوت کا اظہار ہے، غلامی پر اور قید خانہ کے مصائب پر صبر رکھنے اور کامل حکومت و اقتدار حاصل ہونے کی توضیح ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے غم واندوہ اور بالآخر حصول مسرت اور شادمانی کی تصریح ہے (یہ سب اللہ کی قدرت و حکمت کی نشانیاں اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں)

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا جب یوسفؑ کے بھائیوں نے (یعنی ایک دوسرے سے کہا کہ بس میں شک نہیں یوسفؑ اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔ اَخُوْهُ سے مراد ہے حضرت یوسفؑ کا حقیقی بھائی۔

وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ۭ باوجودیکہ ہماری دس کی جماعت ہے۔ فراء نے کہا عصبہ دس اور دس سے اوپر کی جماعت کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ایک سے دس تک عصبہ ہے۔ بعض نے تین سے دس تک کی جماعت کو عصبہ کہا ہے، بعض نے دس سے چالیس تک اور مجاہد نے دس سے پندرہ تک کی جماعت کو عصبہ قرار دیا ہے۔ قاموس میں ہے عصبہ مردوں اور گھوڑوں اور پرندوں کی دس سے چالیس تک کی جماعت۔ عصابہ بھی اسی طرح ہے جزری نے نہایہ میں لکھا ہے کہ عصابہ دس سے چالیس تک کی انسانوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ عصابۃ کی طرح عصبۃ کی جمع عُصَب ہے (گویا عصابۃ اور عصبۃ اسم جمع ہے) اس کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا جیسے نفر اور رہط (اسم جمع ہے اور اس کا مفرد نہیں آتا) بعض نے کہا عصبۃ اس جماعت کو کہتے ہیں جو باہم متفق اور آپس میں تعاون کرنے والی ہو۔ اس صورت میں نَحْنُ عُصْبَةٌ کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری جماعت متفق الرائے اور آپس میں تعاون کرنے والی ہے۔ (پھر بھی باپ کو محبت یوسفؑ اور اس کے بھائی سے زیادہ ہے)۔

اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ واقعی ہمارے باپ کھلی ہوئی غلطی میں پڑے ہیں۔ ضلال سے مراد دینی گمراہی نہیں ہے ورنہ ایسا لفظ کہنے سے سب کافر ہو جاتے بلکہ مراد یہ ہے کہ باپ کا یہ عمل عقل کے خلاف ہے ان کی یہ رائے غلط

بعض اہل علم نے کہا برادران یوسف نے قتل کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کو جرم قتل سے محفوظ رکھا اگر وہ ایسا کر گزرتے تو سب ہلاک ہو جاتے۔

یہ تمام واقعات اس زمانے کے ہیں جب ان حضرات میں سے کوئی نبوت سے سرفراز نہیں ہوا تھا ابو عمرو بن علاء کا یہی قول ہے جو لوگ اسباط یعقوب (یعنی برادران یوسف) کے پیغمبر ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک نبوت سے پہلے انبیاء سے صدور معصیت ناممکن نہیں ہے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ برادران یوسف پیغمبر نہیں تھے اور قرآن مجید میں انبیاء کے ذیل میں اسباط یعقوب کا ذکر آیا ہے ان سے مراد اسرائیلی انبیاء ہیں جو حضرت یعقوبؑ کی نسل سے پیدا ہوئے (بیٹے مراد نہیں) غرض سازش کر کے جب انہوں نے یوسف کو باپ سے جدا کر دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ کہا ابا آپ یوسف پر ہمارا اعتماد کیوں نہیں کرتے۔ یعنی یوسف کے واسطے میں آپ کو ہم سے اندیشہ کیوں ہے۔

وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ۝ اور بلاشک و شبہ ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں۔ حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کو یوسف سے حسد کرتے پایا تو بدگمان ہو گئے اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے بیٹوں نے یہ بات کہی اور یوسف کی خیر خواہی کا اظہار کیا۔ مقاتل نے کہا کلام کی ترتیب میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل ترتیب اس طرح ہے۔ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ الخ باپ نے اس کے جواب میں کہا اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ الخ اس پر بیٹوں نے کہا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا۔

نُصح کا معنی ہے خیر خواہی یا بھلائی کرنا اور شفقت کرنا۔ یعنی ہم تو اس کے بہی خواہ ہیں اس کی حفاظت کریں گے اور حفاظت کے ساتھ واپس لے آئیں گے۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ کل اس کو ہمارے ساتھ (جنگل کو) بھیج دیجئے وہ تفریح کرے گا یرتع (از باب فتح) مرتعی (یعنی چراگاہ) مراد یہ ہے کہ جنگل میں جا کر وہ خوب پھل کھائے تفریح کرے، جیسے دوڑ لگائے، شغل کرے، تیر اندازی کرے۔

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝ اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے اس کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ یعقوبؑ نے کہا تم اس کو لے کر چلے جاؤ گے مجھے اس سے رنج ہو گا (یعنی اس کی جدائی سے میرے دل کو دکھ ہو گا اور مجھے صبر نہ آئے گا) حُزن سے اس جگہ مراد ہے وہ قلبی دکھ جو محبوب کے فراق سے پیدا ہوتا ہے۔

وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ۝ اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم تو اس کی طرف سے غافل ہو جاؤ گے اور بھیڑیا اس کو کھا جائے گا.... اس جنگل میں بھیڑیے بہت ہوتے تھے، اس لئے حضرت یعقوبؑ نے یہ اندیشہ ظاہر فرمایا اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ فرمانے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے تمہاری کسی سازش کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ تم تو کھانے کھیلنے اور سیر و تفریح میں مشغول ہو گے یوسف کی حفاظت نہ کر سکو گے کوئی بھیڑیا آ کر اس کو کھا جائے گا۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت یعقوبؑ نے خواب میں دیکھا تھا کہ کسی بھیڑیے نے یوسف پر حملہ کیا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد آپ کو یوسفؑ کے معاملہ میں اندیشہ رہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ روایت غلط ہے، انبیاء کے خواب کا متحقق ہونا لازم ہے اگر حضرت یعقوبؑ نے ایسا خواب دیکھا ہوتا تو ایسا واقع ہو جانا ضروری تھا کوئی احتیاط اس کو نہیں روک سکتی تھی (اس فقیر کی نظر میں حضرت مفسر کا دلیل مذکورہ سے خواب دیکھنے کی روایت کو غلط قرار دینا صحیح نہیں۔ ممکن ہے خواب دیکھا ہو لیکن تعبیر میں غلطی کی ہو۔ بھیڑیے کے حملے کی تعبیر یہ ہے کہ کوئی دشمن یوسف پر حملہ کرے گا چنانچہ ایسا ہو گیا بھائیوں نے بھیڑیے کا کام کیا۔ مترجم)

الذئب میں الف لام جنسی ہے کوئی بھیڑیا۔

قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۝

بیٹوں نے کہا (ہماری دس کی جماعت ہے سب یوسف سے غافل ہو جائیں یہ ممکن نہیں) ہماری دس کی جماعت ہوتے ہوئے کوئی بھیڑیا یوسف کو کھا جائے تو ہم بالکل ہی گئے گزرے ہوئے۔

ان کی مراد یہ تھی کہ اگر ہم دس ہونے کے باوجود اپنے آدمی کی حفاظت نہ کر سکیں تو پھر ہمارے جانوروں کی جس کو ہم جنگل میں چراتے ہیں کیسے حفاظت ہو سکتی ہے۔ ہم بدنصیب ہوں گے اگر حفاظت نہ کر سکیں یا لَخٰسِرُوْنَ کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہماری جماعت بھی نگرانی نہ کر سکی تو ہم مستحق ہیں کہ نامراد رہنے کی ہم کو بددعا دی جائے۔

حضرت یوسف کو بھائیوں کے ساتھ نہ چھوڑنے کی دو وجہیں حضرت یعقوب نے بیان فرمائی تھیں جدائی کا غم اور اندیشۂ ہلاکت۔ بیٹوں نے دوسری وجہ کو دور کرنے کے لئے تو حفاظت کی یقین دہانی کرو دی اور غم دوری ان کے اختیار میں نہ تھا بلکہ یوسف سے یعقوب کی اتنی محبت کہ ایک دن کی جدائی بھی گوارا نہ ہو بیٹوں کے حسد کا سبب تھی اس لئے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ پھر جب وہ یوسف کو لے گئے اور کنوئیں کے گہرے گڑھے میں ڈالنے کا انہوں نے پختہ ارادہ کرلیا۔ (تو پھر جو چاہا کیا کنوئیں میں ڈال دیا) شرط کا جواب محذوف ہے جس کی تصریح مترجم نے بین القوسین کر دی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے اس شرط کی جزا اگلی آیت وَاَوْحَيْنَآ الخ ہے وَاَوْحَيْنَآ میں واؤ زائد ہے، جیسے آیت فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ میں وَنَادَيْنٰهُ جزا ہے اور اس میں واؤ زائد ہے۔

بغوی نے وہب وغیرہ کے بیان سے اخذ کرکے لکھا ہے کہ باپ کے سامنے بھائیوں نے یوسف کو نہایت عزت کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر لیا اپنے اوپر سوار کر لیا لیکن آبادی سے باہر نکل کر ان کو پھینک دیا اور مارپیٹ کرنے لگے۔ ایک مارتا تھا تو یوسف دوسرے سے فریاد کرتے تھے مگر وہ بھی مارتا تھا تو تیسرے کی پناہ ڈھونڈتے تھے پر کوئی پناہ نہ دیتا تھا۔ سبھوں نے مار مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ حضرت یوسف چیخ رہے تھے اور باپ کو پکار رہے تھے اور فرما رہے تھے ابا! دیکھئے ان باندی بچوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ آخر یہودا نے دیکھا کہ یہ لوگ یوسف کو قتل ہی کر ڈالیں گے تو بولا قتل نہ کرنے کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس لئے قتل نہیں کر سکتے غرض اس طرح ایک کنوئیں پر غیر معروف راستے سے لے گئے کنوئیں کا منہ تنگ تھا مگر اندر بہت وسیع تھا حضرت یعقوب کے مکان سے بقول مقاتل یہ کنواں تین فرسخ دور تھا۔ کعب نے کہا مدین اور مصر کے درمیان تھا۔ قتادہ نے کہا بیت المقدس کا کنواں تھا۔ حضرت یوسف کی عمر اس وقت بارہ یا اٹھارہ برس کی تھی جب کنوئیں میں آپ کو لٹکانے لگے تو آپ نے کنوئیں کا کنارہ پکڑ لیا مگر انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیئے اور کرتا اتار لیا حضرت یوسف نے کہا بھائیو کرتا تو دے دو میں کنوئیں کے اندر اس کو پہن کر سردی وغیرہ سے بچاؤ کرلوں گا۔ بھائیوں نے کہا سورج اور چاند ستاروں کو پکارو وہی تیرا دل بہلائیں گے، آپ نے فرمایا میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آخر آپ کو کنوئیں میں ڈال ہی دیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنوئیں میں لٹکا دیا جب ڈول آدھے کنوئیں تک پہنچا تو رسی چھوڑ دی تاکہ یوسف گر کر مر جائیں لیکن کنوئیں میں پانی تھا آپ پانی میں گر پڑے وہاں ایک پتھر ابھر آیا آپ اس پر کھڑے ہو گئے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یوسف کو روتا ہوا کنوئیں میں ڈال دیا گیا پھر اوپر سے آواز دی یوسف سمجھے کہ بھائیوں کے دل میں کچھ رحم آگیا۔ اس لئے آپ نے آواز دی، بھائیوں نے اوپر سے پتھر برسانا چاہا تاکہ پتھر مار کر ہلاک کر دیں۔ مگر یہودا نے روک دیا۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے ایک طویل بیان کے ذیل میں لکھا ہے کہ خاندان یعقوب کی سکونت شام میں تھی، حضرت یعقوب کی نظر میں ہر وقت یوسف اور بنیامین سامنے رہتے تھے اس پر دوسرے بھائیوں کو جلن پیدا ہوئی وہ یوسف کو آبادی سے باہر صحرا میں لے گئے۔ اس روایت میں ہے کہ یوسف کو ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنوئیں میں لٹکا دیا یوسف

کنویں تک ڈول پہنچا تو رسی ہاتھ سے چھوڑ دی۔ تاکہ یوسف گر کر مر جائیں۔ کنویں میں پانی تھا یوسف پانی میں گر گئے پھر ایک پتھر پر کھڑے ہو گئے اور روتے رہے پھر جبرئیل نے آکر تسلی دی جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اور ہم نے یوسف کے پاس وحی بھیجی (تاکہ اس کو اطمینان ہو جائے) بظاہر یہ وحی نبوت نہ تھی۔ بلکہ اس کی صورت اس وحی کی سی تھی جیسی حضرت موسیٰ کی والدہ کے پاس بھیجی گئی تھی (یعنی الہام) وحی رسالت و تبلیغ تو بعد کو آئی تھی جس کا بیان آیت وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا میں کیا گیا ہے۔ لیکن ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے مجاہد کا قول بیان کیا کہ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ میں وحی نبوت مراد ہے۔ جب آپ کنویں میں تھے تو وحی نبوت آئی تھی

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا کہ تو ان کو ان کی اس حرکت پر (آئندہ) آگاہ کرے گا (اور وہ پشیمان اور خجل ہوں گے۔ مترجم)

وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اور وہ جانتے بھی نہ تھے کہ ہم نے یوسف کے پاس وحی بھیجی ہے اور اس کو اطلاع دے دی ہے اور اس کے دل کو اطمینان دے دیا ہے۔

بعض علماء کے نزدیک (یہ جملہ وحی کا جزء ہے) مطلب یہ ہے کہ جس روز تو ان کو ان کی اس حرکت پر آگاہ کرے گا تو اس وقت ان کے خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ تو ہی یوسف ہے۔ یوسف کے مرتبہ کی رفعت زمانہ کا طول اور جسمانی تغیرات ان کو پہچاننے بھی نہ دیں گے چنانچہ آیت میں آیا ہے فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ جب برادران یوسف، یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف نے ان کو پہچان لیا مگر وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہودا یوسف کو کھانا پہنچاتا تھا۔ آپ تین روز وہاں رہے اور یہ پیام (جو آیت میں مذکور ہے) وحی کے ذریعے سے ان کے پاس پہنچا۔ اللہ نے ان کا دل بہلانے اور کنویں سے نکلنے کی بشارت دینے کے لئے جبرئیل کو ان کے پاس بھیج دیا۔

امام احمد نے الزہد میں اور ابن عبد الحکم نے فتوح مصر میں اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے حسن بصری کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی یعنی جوان ہونے کے قریب تھے آپ کے پاس جوانی سے پہلے وحی آئی تھی جیسے حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ کے پاس آئی تھی۔

قصہ یوسف کی بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم کو جب آگ میں ڈالا گیا تھا تو آپ کے کپڑے اتار لئے گئے تھے۔ حضرت جبرئیل نے جنت سے لاکر ایک ریشمی کرتہ آپ کو پہنایا تھا۔ حضرت ابراہیم سے وہ کرتہ حضرت اسحاق کو پہنچا تھا اور حضرت اسحاق سے حضرت یعقوب کو۔ حضرت یعقوب نے اس کا تعویذ بنا کر حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ حضرت جبرئیل نے وہی کرتہ کھول کر حضرت یوسف کو پہنا دیا۔

بغوی نے حضرت ابن عباس کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کے بعد برادران یوسف نے ایک بکری کا بچہ ذبح کر کے یوسف کے کرتے کو اس کے خون سے رنگین کر لیا۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ اور شام کو اندھیرے اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔ سدی نے لکھا ہے کہ اندھیرے میں عشاء کے وقت آنے کی مصلحت یہ تھی کہ جھوٹ بولنے کو جرأت آفریں موقع ہاتھ آجائے چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب نے ان کی چیخ پکار سنی تو باہر نکل آئے اور فرمایا کیا ہوا کیا بکریوں پر کوئی افتاد پڑ گئی۔ کہنے لگے نہیں۔ حضرت یعقوب نے پوچھا یوسف کہاں ہے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

بولے ابا! ہم آپس میں دوڑ لگانے گئے تھے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تھے (ہمارے پیچھے) بھیڑیئے نے اس کو کھالیا، آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا، خواہ ہم سچ کہہ رہے ہوں (کیونکہ آپ کو یوسف سے انتہائی محبت ہے اور ہم لوگوں سے بدگمانی ہے، یوسف کی محبت ہی آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں ہونے دے گی۔ مزید یہ کہ آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اس لئے ہم اس بیان میں سچے بھی ہوں تب بھی آپ یقین کرنے والے نہیں)۔

بعض نے کہا وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اس لئے آپ یقین کرنے والے نہیں یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے پاس اپنی سچائی کی کوئی دلیل نہیں اس لئے آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا اگرچہ ہم عنداللہ سچے ہیں۔

نَسْتَبِقُ (جمع متکلم باب افتعال) باب تفاعل کے معنی میں ہے یعنی باہم دوڑ میں ہم مقابلہ کرنے گئے تھے۔ بعض نے کہا تیر اندازی میں مقابلہ کرنا مراد ہے۔ باب افتعال اور تفاعل مشارکت کے لئے آتا ہے جیسے انتضال و تناضل تیر اندازی میں مقابلہ کرنا۔ مقابلے سے مراد ہیں کپڑے۔

وَجَآءُوْ عَلٰی قَمِیْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ اور یوسف کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لائے۔

کَذِب کا معنی ہے جھوٹ موٹ کا یا جھوٹا، کذب مصدر بھی ہو سکتا، جھوٹ، خون کو جھوٹ مبالغۃً قرار دیا۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے حسن بصریؒ کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت یعقوب، یوسف کی خبر سن کر چیخ پڑے اور یوسف کا قمیص جب پیش کیا گیا تو الٹ پلٹ کر اس کو دیکھنے لگے مگر قمیص میں شگاف کہیں نظر نہ آیا، یہ دیکھ کر فرمایا لڑکو واللہ بھیڑیا بھی کیسا ہوشیار تھا، میرے بیٹے کو تو کھا گیا اور کرتے کو سالم چھوڑ دیا۔ حضرت یعقوب جب بیٹوں کا جھوٹ سمجھ گئے تھے تو

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا کہا (بھیڑیے نے یوسف کو نہیں کھایا) بلکہ تم نے اپنے لئے اپنے دل میں ایک بات بنالی ہے۔ سَوَّلَتْ لَكُمْ یعنی تمہارے نفسوں نے ایک بہت بڑے امر کو تمہاری نظر میں آسان اور حقیر بنا کر دکھایا ہے (مطلب یہ کہ یوسف کی گمشدگی یا قتل کو تم نے اتنا آسان قرار دے لیا کہ اس کے لئے اتنی غلط عذر تراشی کرلی)

سَوَّلَتْ، التسول سے ماخوذ ہے سول کا معنی ہے نرم پڑ جانا، ڈھیلا ہو جانا۔ قاموس میں ہے اسول وہ شخص جس کے زیریں جسم میں ڈھیلا پن ہو اور سولۂ پیٹ وغیرہ کے لٹک آنے کو کہتے ہیں۔ بعض کا قول ہے اس جگہ سَوَّلَتْ کا معنی ہے سجا کر دکھایا (یعنی برے کام کو اچھا کام بنا کر پیش کیا) کذا فی القاموس۔ سول له الشیطان شیطان نے اس کو بہکا دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سول کا معنی ہے حاجت اور غرض جس کو حاصل کرنے کی نفس کو حرص ہوتی ہے اور تسویل کا معنی ہے کسی کو حرص کی شکل میں پیش کرنا۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ سو اب میں صبر ہی کروں گا، جس میں کسی شکایت کی آمیزش نہ ہوگی۔ بغوی نے لکھا ہے صبر جمیل (اچھا صبر) یعنی ایسا صبر جس میں مخلوق سے کوئی شکوہ نہ ہو گا اور جزع فزع نہ ہوگی۔ ابن جریر نے حبان بن ابی جبلہ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے کہ صبر جمیل وہ ہے جس میں کوئی شکوہ نہ ہو۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ ۝ یعنی یوسف کے مرنے کی جو خبر تم بیان کر رہے ہو میں اس مصیبت پر صبر کرنے اور اس کا دکھ اٹھانے میں اللہ ہی سے مدد کا خواستگار ہوں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قصۂ یوسف کے ذیل میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ برادران یوسف ایک بھیڑیے کو پکڑ لائے اور کہنے لگے اس نے یوسف کو کھایا ہے۔ حضرت یعقوب نے اس سے پوچھا کیا تو نے میرے جگر پارے کو کھایا ہے۔ بھیڑیے کو اللہ نے گویائی عطا فرمادی، اس نے جواب دیا خدا کی قسم میں نے تو آپ کے بیٹے کو دیکھا بھی نہیں۔ حضرت یعقوب نے پوچھا پھر کنعان کی اس سرزمین میں تو کیسے آیا۔ بھیڑیے نے کہا میں اپنی بھائی بندوں سے ملنے آیا تھا کہ یہ پکڑ لائے۔ بعض نے یہ کہا یوسف

تین روز کنویں میں رہے کہ

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ ایک قافلہ ادھر آ نکلا، یہ لوگ مدین سے مصر کو جا رہے تھے غلط راستے پر پڑ گئے تھے، تو کنویں کے قریب اتر پڑے، کنواں چرواہوں اور راہگیروں کے لئے آبادی سے دور تھا اس کا پانی شور تھا جب حضرت یوسف کو اس میں ڈالا گیا تو اس کا پانی میٹھا ہو گیا۔

فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ (جب کنویں کے پاس اترے) تو ایک ہر اول کو (کنویں سے پانی لینے کے لئے) بھیجا۔ یہ شخص مدین کا باشندہ تھا جس کا نام مالک بن دعر تھا۔ وارد اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ کے آگے پانی کی تلاش میں بطور ہر اول جاتا ہے۔

فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ اس نے جا کر اپنا ڈول کنویں میں لٹکایا۔

ادلی الدلو کنویں میں ڈول ڈالا۔ ادلیت الدلو میں نے کنویں میں ڈول ڈالا۔ دلوت الدلو میں نے کنویں سے ڈول نکالا۔ حضرت یوسف رسی پکڑ کر لٹک گئے اور اوپر آ گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ نیک حسین ترین لڑکا برآمد ہوا تعجب میں پڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوسف کو سارے انسانوں کے حسن کا آدھا حصہ دیا گیا تھا۔ رواہ ابن ابی شیبہ واحمد وابو یعلی والحاکم عن انس۔

بغوی نے لکھا ہے یوسف علیہ السلام حسن میں اپنی دادی حضرت سارہ کے مشابہ ہو کر آئے تھے۔ حضرت سارہ کو کل حسن کا چھٹا حصہ اللہ کی طرف سے ملا تھا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یوسف اور ان کی والدہ کے حصے میں دو تہائی حسن آیا تھا۔ مالک بن دعر نے جب یوسف کو دیکھا تو

قَالَ يَا بُشْرَىٰ بولا اے لوگو تم کو بشارت ہو یا فرط مسرت میں اس نے بشارت کو پکارا۔ بعض علماء نے کہا بشریٰ اس کے ساتھی کا نام تھا دعوت کرنے کے لئے مالک نے بشریٰ کو پکارا تھا۔

هَٰذَا غُلَامٌ یہ لڑکا ہے۔ مجاہد نے اپنے باپ کا قول بیان کیا کہ جب یوسف کو کنویں سے نکال لئے گئے تو کوئی اور دے گئے۔

وَأَسَرُّوهُ اور انہوں نے یوسف کو چھپائے رکھا۔ یعنی مالک اور اس کے ساتھیوں نے دوسرے قافلے والوں سے یوسف کو چھپا لیا تاکہ وہ شرکت کے دعویدار نہ بن جائیں۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یوسف کے معاملے کو ان لوگوں نے چھپایا اور دوسرے لوگوں سے کہا کنویں پر رہنے والوں نے ہم کو یہ لڑکا دیا ہے تاکہ ان کی طرف سے مصر میں لے جا کر اس کو فروخت کر دیں۔ بعض علماء نے کہا کہ برادران یوسف نے یوسف کی بات قافلہ والوں سے پوشیدہ رکھی (اور یوسف کو بھائی نہیں بتایا) بات یہ ہوئی کہ یہودا روز یوسف کا کھانا لاتا تھا ایک روز جو کھانا لایا اور یوسف کو کنویں میں نہ پایا تو بھائیوں کو جا کر اطلاع دی بھائی وہاں ڈھونڈنے نکلے تلاش کرتے کرتے مالک کے پاس یوسف دستیاب ہوئے انہوں نے قافلے والوں سے اصل بات چھپائی اور یوسف کو اپنا بھائی ظاہر کرنے کے بجائے کہنے لگے یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے۔ کہا جاتا ہے بھائیوں نے حضرت یوسف کو بھی ڈرا دھمکا دیا تھا۔ بھائیوں کے ڈر سے یوسف بھی کچھ نہ بولے خاموش رہے۔

بِضَاعَةً یعنی یوسف کو بطور مال تجارت چھپائے رکھا۔ بضاعت بضع سے مشتق ہے۔ بضع تجارتی مال کو کہتے ہیں۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ اور وہ جو کچھ کر رہے تھے اللہ اس سے بخوبی واقف تھا۔ اس سے ان کی کوئی پوشیدہ بات بھی مخفی نہیں تھی یا برادران یوسف اپنے باپ اور بھائی سے جو سلوک کر رہے تھے اللہ اس سے واقف تھا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ انہوں نے یعنی برادران یوسف نے یوسف کو حقیر قیمت یعنی گنتی کے چند درہموں میں بیچ ڈالا۔ بعض اہل علم نے شروہ کا ترجمہ اشتروہ کیا ہے، یعنی قافلے والوں نے یوسف کو

بہت کم قیمت یعنی چند درہموں میں خرید لیا۔ ضحاک، مقاتل اور سدی نے بَخْسٍ کا ترجمہ کیا ہے حرام کیونکہ آزاد انسان کی قیمت حرام ہے بَخْس کا لغوی معنی ہے کم کرنا، گھٹانا۔ مال حرام کی برکت گھٹ جاتی ہے اس لئے حرام کو بَخْس کہا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے بَخْسٍ کا ترجمہ کیا کھوٹے۔ عکرمہ اور شعبی نے ترجمہ کیا قلیل تھوڑے۔ کیونکہ اگر اوقیہ کے برابر درہم ہوتے تو وزن سے بکتے اور خریدے جاتے تھے اور اوقیہ سے کم کا تبادلہ گنتی سے ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن مسعودؓ اور قتادہؓ نے فرمایا بیس درہم کو فروخت کر دیا۔ ہر بھائی کے حصے میں دو دو درہم آئے۔ عکرمہ نے کہا چالیس درہم کو بیچا۔ اور مجاہد نے بائیس درہم کی صراحت کی۔

وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ۝ اور وہ (برادران یوسف یا خریدار) یوسفؑ کی طرف سے بے رغبت تھے۔ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ یوسفؑ کا مرتبہ اللہ کے نزدیک کتنا بڑا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے فیہ کی ضمیر کو ثمن کی طرف لوٹایا ہے، یعنی یوسفؑ کی قیمت کی ان کو رغبت نہ تھی۔ ان کا مقصد حصول قیمت نہ تھا بلکہ یوسفؑ کو دور پھینک دینا تھا۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ کَانُوا کی ضمیر اگر قافلے والوں کی طرف راجع کی جائے تو دو صورتیں ہیں قافلہ والوں نے سیٹھ رضیٰ سے خرید اتھا یوسفؑ کی طرف راغب نہ تھے کیونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بھاگا ہوا غلام ہے اور اگر قافلہ والوں کو بائع قرار دیا جائے (کیونکہ مصر میں لے جا کر انہوں نے حضرت کو فروخت کر دیا تھا) تو یہ مطلب ہوگا کہ چونکہ انہوں نے مفت میں یوسفؑ کو پایا تھا ان کو آپ کی قدر نہ تھی اور اندیشہ تھا کہ کوئی دعویدار نہ پیدا ہو جائے اس لئے جلدی فروخت کرنا چاہتے تھے۔

اس کے بعد مالک اور اس کے ساتھی حضرت یوسفؑ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ بھائیوں نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا پیچھے ہو لئے اور خریداروں سے کہنے لگے مضبوطی کے ساتھ اس کی حفاظت کرنا کہیں بھاگ نہ جائے۔ مالک آپ کو لے کر مصر پہنچا اور فروخت کے لئے پیش کیا قطفیر نے آپ کو خرید لیا یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا نام اطفیر بتایا ہے یہ بادشاہ کا چنب اور شاہی خزانہ کا سب سے بڑا افسر تھا اس کا خطاب عزیز تھا اس زمانہ میں مصر اور اطراف مصر کا بادشاہ ریان بن ولید بن ثروان عملیقی تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے یہ بادشاہ اپنی موت سے پہلے حضرت یوسفؑ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا اور مذہب یوسفی کا پابند بن گیا تھا اور آپ کی زندگی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب یوسفؑ مصر میں داخل ہوئے تو قطفیر نے مالک بن دعر سے مل کر حضرت یوسفؑ کو بیس دینار ایک جوڑے جوتے اور دو سفید کپڑوں کے عوض خرید لیا۔ وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ قافلہ یوسفؑ کو لے کر مصر کے بازار میں پہنچا اور فروخت کے لئے آپ کو پیش کیا تو لوگوں نے بڑھ چڑھ کر قیمت لگائی یہاں تک کہ آپ کے وزن کے برابر سونا اور اتنی ہی چاندی اور اتنے وزن کا ریشمی کپڑا اور اتنا ہی مشک آپ کی قیمت قرار پائی آپ کی عمر ۱۳ سال تھی اور وزن چار سو رطل تھا آخر اس قیمت پر قطفیر نے آپ کو مالک سے خرید لیا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِصْرَ لِامْرَأَتِهِ اور مصر کے جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا اس نے اپنی بیوی راعیل یا زلیخا سے کہا۔

أَكْرِمِي مَثْوَاهُ اس کو خاطر سے رکھنا۔ مثوی مصدر ہے لیکن یہاں اس جگہ مراد مرتبہ ہے۔ قتادہؓ کا یہی قول ہے۔ ابن جریجؒ نے بھی یہی تعبیر کی ہے۔ بعض نے کہا مثوی سے مراد غذا، لباس اور مکان۔

عَسَى أَنْ يَنْفَعَنَا امید ہے یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یعنی اگر ہم اس کو فروخت کریں تو نفع مل جائے اگر نہ فروخت کریں تو ہمارے مال جائیداد اور دوسرے کاموں کا انتظام کرے۔

أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا یا (بیٹا بنانا ہو تو) ہم اس کو بیٹا بنالیں گے (کیونکہ اس کے اندر ہم کو ہوشیاری کی علامات دکھائی دے رہی ہیں) عزیز مصر لاولد اور نامرد تھا۔

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ اور (جس طرح ہم نے یوسفؑ کو قتل سے بچایا کنویں سے نکالا اور عزیز کو اس پر مہربان بنایا) اسی طرح ہم نے اس کو ملک مصر میں جما دیا (اور مصر کی ساری پیداوار کا اس کو حاکم اعلیٰ بنا دیا۔

وَلِنُعَلِّمَهُ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ (تاکہ وہ وہاں انصاف کے ساتھ حکومت کرے) اور تاکہ ہم اس کو خوابوں کی تعبیر سکھائیں، یعنی یوسف کو بچانے اور حکومت عطا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرے اور عدل کے ساتھ انتظام خلق کرے اور اللہ کی کتابوں کی صحیح تعلیم دے اور اللہ کے احکام جاری کرے (اس مطلب پر تاویل احادیث سے مراد ہوگی، کتب قدیمہ کی تعلیم اور اللہ کے احکام کا اجراء) یا اس سے خوابوں کی تعبیر مراد ہے اس صورت میں مطلب ہوگا کہ یوسف کو ان خوابوں کی تعبیر سکھائیں جو آئندہ ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے یوسف ان کے لئے تیار ہو جائیں اور پہلے سے انتظام کر لیں (جیسے قحط کے سات سال بادشاہ نے خواب میں سات دبلی گایوں کی شکل میں دیکھے تھے اور حضرت یوسف کو اللہ نے ان کی تعبیر بتادی تھی پھر آپ نے کال پڑنے سے برسوں پہلے غذا کا اندوختہ کرنا شروع کر دیا تھا اور جب کال پڑا تو اندوختہ غلہ ملک میں تقسیم کیا اور اس طرح قحط پر قابو پایا)

بعض علماء کے نزدیک وَلِنُعَلِّمَهُ کا عطف فعل محذوف پر نہیں ہے بلکہ واؤ زائد ہے۔

وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔ اَمْرِہٖ کی ضمیر لفظ اللہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا یا یوسف کی طرف ضمیر لوٹ رہی ہے یعنی یوسف کے بھائی یوسف کے متعلق کچھ اور چاہتے تھے اور اللہ کچھ اور چاہتا تھا اور ہوا وہی جو اللہ چاہتا تھا۔

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ لیکن اکثر لوگ اللہ کی حکمت کی باریکیوں کو نہیں جانتے اور اس کی مخفی مہربانیوں سے واقف نہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ جو کچھ چاہتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا اور جب یوسف اپنی بھرپور جوانی اور قوت کو پہنچ گئے تو ہم نے ان کو حکم اور علم عطا کیا۔

اَشُدّ انتہائی جوانی اور قوت۔ مجاہد نے کہا ۳۳ سال کی عمر سدی نے کہا ۳۰ سال کی عمر کیا گیا ہے تو قف ہے۔ ضحاک نے کہا ۲۰ سال، کلبی نے کہا اشد کی عمر ۱۸ سے ۳۰ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ امام مالک نے اشد کا ترجمہ پختگی فہم اور دانش۔ حکم سے مراد ہے نبوت۔ بعض نے کہا درست قول۔ علم سے مراد ہے دینی سمجھ یا خواب کی تعبیر کا علم۔ بعض اہل علم نے کہا حکیم اور عالم کے درمیان فرق یہ ہے کہ عالم تو جاننے والے کو کہتے ہیں اور حکیم وہ ہوتا ہے جو علم کے تقاضے کے مطابق عمل کرے۔

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝ اور اسی طرح نیکوکاروں کو ہم بدلہ دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول میں مُحْسِنِين کا ترجمہ مؤمنین آیا ہے دوسرے قول میں آیا ہے کہ محسنین سے مراد ہیں ہدایت یافتہ لوگ۔ ضحاک نے کہا مصائب پر صبر کرنے والے۔ بیضاوی نے لکھا ہے آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ نے یوسف کو یہ جزا ان کے حسن عمل اور عنفوان جوانی میں متقی رہنے کی دی تھی۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ

اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھے اس عورت نے اپنا مطلب ان سے حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلایا اور دروازے بند کر دیئے۔

رَاوَدَتْ کا مصدر مُرَاوَدَتْ ہے اور اس کا مجرد رَادَ یَرُودُ آتا ہے رَوْد مادہ ہے رَوْد کا معنی ہے کسی چیز کی طلب میں آنا جانا اسی سے رائد بنا ہے (قافلہ یا لشکر سے پہلے پانی اور گھاس کی تلاش میں جانے والا اہراول) بعض نے کہا آہستگی کے ساتھ کسی چیز کے طلب کرنے کو رود کہتے ہیں اور یُرِید (کچھ وصول دو) کا باب سے بنا ہے یہاں مراد یہ ہے کہ زلیخا نے تدبیر اور بہانے سے یوسف سے اپنے مطلب کی درخواست کی۔ زلیخا عزیز کی بیوی تھی۔ دروازے سات تھے تغلیق خوب مضبوطی یا بکثرت دروازے بند کر دینے باب تفعیل تکثیر یا مبالغہ کے لئے آیا ہے۔

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ اور کہا آجاؤ تمہیں سے کہتی ہوں۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ہَیْتَ لَکَ ہی پڑھایا تھا۔ کسائی نے کہا یہ اہل حوران کا محاورہ تھا جو حجاز میں مستعمل ہو گیا تھا۔ کسائی کا یہ قول ابو عبیدہ نے نقل کیا ہے اس کا معنی ہے۔ "آ"۔ عکرمہؒ نے بھی کہا کہ حورانی محاورہ میں اس کا معنی "آ" ہے۔ مجاہد نے کہا یہ عربی لفظ ہے کسی چیز کی ترغیب دینے کے لئے بولا جاتا ہے گویا یہ اسم بمعنی فعل ہے اور اَیْنَ کی طرح مبنی بر فتح ہے اس کا نہ تثنیہ آتا ہے نہ جمع کذا قال ابو عبیدہ۔

قاموس میں ہے هَيْتَ هَيْتِ هَيْتُ تینوں حرکات کے ساتھ آتا ہے اس کا معنی ہے "آ" کبھی ہا کو مکسور بھی بولا جاتا ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یوسف نے (اس وقت زلیخا سے) کہا میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں (ایسی بری حرکت سے)۔

إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ بلا شبہ وہ میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔ إِنَّهُ میں ضمیر شان ہے۔ یعنی بات یہ ہے کہ میرے آقا قطفیر نے میری خاطر مدارات اور برداشت اچھی طرح کی اس نے تجھ سے بھی کہا تھا کہ اس کی خاطر اچھی طرح کرنا اس کے حسن کا بدلہ یہ تو نہیں کہ میں اس کی خیانت کروں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ إِنَّهُ کی ضمیر قطفیر کی طرف راجع ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کی طرف ضمیر راجع ہے۔ یعنی اللہ بلاشبہ میرا مالک ہے اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا قطفیر کے دل کو مجھ پر مہربان کر دیا۔ میں اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔

إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۳﴾ حقیقت یہ ہے کہ ظالم فلاح یاب نہیں ہوتے۔ بھلائی کا بدلہ برائی سے دینے والے ظالم ہیں۔ بعض نے کہا الظَّالِمُونَ سے مراد ہیں زنا کرنے والے۔ زنا کرنے والے اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور اس شخص پر بھی ظلم کرتے ہیں جس کی بیوی سے زنا کرتے ہیں۔

سدی اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ عزیز کی بیوی نے یوسفؑ کو جب پھسلانا چاہا تو اس کی تدبیر یہ کی کہ یوسفؑ کے حسن کی تعریف کرنی شروع کر دی۔ کہنے لگی یوسفؑ تمہارے بال کیسے حسین ہیں۔ آپ نے جواب دیا (مرنے کے بعد) سب سے پہلے یہی میرے بدن سے منتشر ہوں گے۔ زلیخا نے آپ کی آنکھوں کی تعریف کی تو فرمایا چہرے پر بہہ کر یہ سب سے پہلے آئیں گی۔ چہرے کی تعریف سن کر فرمایا اس کو مٹی کھا لے گی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ زلیخا نے کہا ریشمین بستر بچھا ہوا ہے اٹھو اور میرا مقصد پورا کرو۔ آپ نے فرمایا اگر میں نیا کروں گا تو جنت کے اندر میرا کوئی حصہ نہیں رہے گا۔ غرض اسی طرح زلیخا آپ کو راغب کرتی رہی آپ بھی جوان تھے۔ دوسرے جوانوں کی طرح جوانی کے تقاضے رکھتے تھے، خوب صورت عورت کو دیکھ کر آپ کو بھی طبعی میلان ہو گیا اسی طبعی میلان کو اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا عورت نے تو پختہ قصد بنایا تھا یوسفؑ کو اور یوسفؑ بھی اس کا ارادہ کرتے تھے۔ یعنی زلیخا کی وجہ سے یوسفؑ کے دل میں فطری اور طبعی میلان پیدا ہو گیا مگر آپ نے اس کو پختہ عزم سے روکا اور برداشت کی عزم اور ارادے کے ساتھ طبعی میلان کو روکتے رہے۔ لفظ مَعَاذَ اللّٰهِ دلالت کر رہا ہے۔ مراد یہ ہے کہ آپ کا ارادہ اختیاری نہ تھا میلان طبعی تھا جس کا پیدا ہونا انسان کے اختیار سے خارج ہے اور اس پر آدمی مکلف بھی نہیں ہے بلکہ میلان طبعی کو عزم کے ساتھ روکنا ان کی تحقیق ہے فرشتوں پر انسان کی برتری صرف اسی وجہ سے ہے کہ فرشتے فطری میلان گناہ سے خالی ہیں اور آدمی طبعی میلان اور نفس کو عزم سے روکتا ہے۔

شیخ ابو منصور ماتریدیؒ نے فرمایا ارادہ یوسف در حقیقت ایک خود آمدہ خیال تھا جو بے اختیار دل میں آ گیا تھا اور یہ قابل گرفت نہیں خود رو خیال اور غیر ارادی فطری میلان قابل مؤاخذہ نہیں اگر آپ کا ارادہ ہمارے ارادے کی طرح ہوتا تو اللہ آپ کی تعریف نہ کرتا اور آپ کی متعلق إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ نہ فرماتا۔

بعض اہل تحقیق نے کہا ارادہ دو قسم کا ہوتا ہے (۱) ارادہ مُقیم یعنی عزم راسخ اور غیر متزلزل دل پسندی۔ عزیز کی بیوی کا

ارادہ اسی طرح کا تھا یہ ارادہ قابل مواخذہ ہے (۲) محض نفسی ارادہ اور دل میں خیال کا گزر جانا اور غیر اختیاری تصور۔ اس قسم کا ارادہ حضرت یوسفؑ کا تھا اور یہ ناقابل مواخذہ ہے اور ظہور قول و فعل سے پہلے اس کی پکڑ نہ ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ نے فرمایا ہے کہ جب میرا بندہ کوئی نیکی کرنے کی بات اپنے دل میں کر لیتا ہے تو کئے بغیر میں اس کی نیکی لکھ لیتا ہوں اور جب وہ نیکی کر بھی لیتا ہے تو اس جیسی دس نیکیاں اس کے لئے لکھ دیتا ہوں اگر میرا بندہ کوئی بدی کرنے کی بات دل میں کرتا ہے تو جب تک اس کا عملی اظہار نہ کرے میں معاف کر دیتا ہوں اور جب عملاً وہ کر ہی لیتا ہے تو میں اتنی ہی بدی (اس کے نامۂ اعمال میں) لکھ دیتا ہوں۔ رواہ البغوی من حدیث ابوہریرہ۔ شیخین اور جامع ترمذی میں حدیث مذکور کے یہ الفاظ ہیں، جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کر لیتا ہے اور کرتا نہیں تو میں اس کے لئے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں پھر اگر وہ عملاً نیکی کر بھی لیتا ہے تو میں اس کے لئے دس سے سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہوں اور اگر کسی بدی کا ارادہ کرتا ہے اور بدی عملاً نہیں کرتا تو میں اس کے لئے کچھ نہیں لکھتا اور اگر وہ بدی کر گزرتا ہے تو اس کا ایک گناہ لکھ دیتا ہوں۔ بعض لوگوں نے کہا (اور اس قول کی نسبت سعید بن جبیرؒ جیسے متقدمین کی طرف کی) کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا کمربند کھول لیا تھا اور بیٹھ گئے تھے جیسے مرد (وقت حاجت) بیٹھتے ہیں یا اپنا پائجامہ کھول لیا تھا اور کپڑے سمیٹ رہے تھے، ہَمَّ بِهَا کا یہی معنی ہے۔ اس قسم کی غلط توجیہات کلام الٰہی کی مراد کے خلاف ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ ظاہر ہے کہ سُوْٓء سے مراد صغیرہ گناہ ہے جس سے دور رکھنے کی اللہ نے صراحت فرمائی ہے اور تو کل مذکورہ تفصیل کی رو سے گناہ صغیرہ کا مرتکب ہو جانا ثابت ہوتا ہے اگر حضرت یوسفؑ سے صغیرہ گناہ کا صدور ہوتا تو اللہ ان کی توبہ و استغفار کا تذکرہ فرماتا، جیسے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت یونسؑ کی توبہ و استغفار کا ذکر فرمایا ہے حالانکہ ان بزرگوں سے غیر ارادی خطا ہوئی ہے (گناہ کا قصد و ارادہ نہ تھا اجتہادی غلطی تھی) اور یوسفؑ کی توبہ و استغفار کا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ حضرت یوسفؑ نے اپنی بے گناہی کی صراحت فرمائی اور فرمایا هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ اور فرمایا ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ اور فرمایا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اور اللہ نے بھی آپ کے متعلق فرمایا اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۔ اگر نہ دیکھ لیتے وہ اپنے رب کی دلیل کو۔ شرط کا جواب محذوف ہے یعنی اگر نہ دیکھ لیتے برہان رب کو تو جماع کر لیتے۔ بعض کے نزدیک لَوْلَا کا جواب مقدم ہے اور شرط مؤخر ہے۔ اس وقت مطلب اس طرح ہوگا کہ یوسفؑ زلیخا کا ارادہ کر ہی چکے تھے اگر برہان رب کو نہ دیکھ لیتے یعنی ارادہ کیا قریب تھا کہ ارادہ کر لیتے۔ مگر لَوْلَا کا جواب پہلے آ جانا قانون نحو کے خلاف ہے لَوْلَا حروف شرط میں سے ہے اس لئے حرف شرط پر جواب کا تقدم ناجائز ہے بلکہ یہ ممکن ہے کہ لَوْلَا کا جواب شرط کے بعد محذوف ہو اور جواب اسی مضمون کا ہو جو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے یہ مفہوم یہاں فرما دیا تھا اس لئے لَوْلَا کے بعد دوبارہ جواب ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح کا محاورہ عرب استعمال کرتے ہیں کہا جاتا ہے قَتَلْتُهٗ لَوْلَآ اَنْ خِفْتُ اللّٰهَ میں اس کو قتل ہی کر چکا تھا اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا۔

برہان کیا تھی اور یوسفؑ نے کیا دیکھ پایا تھا اس سلسلے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت جعفر صادقؒ نے فرمایا برہان وہ نبوت تھی جو اللہ نے یوسفؑ کے سینے میں ودیعت کر دی تھی یہ نور نبوت اس فعل سے مانع ہو گیا جو اللہ کی ناراضگی کا موجب تھا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ قتادہ اور اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی صورت دکھائی دی، حضرت یعقوبؑ فرما رہے تھے۔ یوسفؑ، نادانوں کا جیسا عمل کر رہا ہے۔ تیرا نام تو جماعت انبیاء میں لکھا ہوا ہے۔ حسن اور سعید بن جبیرؒ اور مجاہد اور عکرمہ اور ضحاک نے کہا آپ نے چھت میں ایک شگاف دیکھا جس کے اندر حضرت یعقوبؑ (افسوس کے ساتھ) اپنی انگلی دانت سے کاٹتے نظر آئے۔

سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ مجسم ہو کر سامنے آ گئے اور اپنا ہاتھ یوسفؑ کے سینہ پر مارا جس سے یوسفؑ کا جوش شہوت جاتا رہا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے محمد بن سیرین کا قول نقل کیا ہے کہ

وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ اور دروازہ کے بعد دونوں نے عورت کے شوہر کو پالیا (جو آرہا تھا) بغوی نے لکھا ہے کہ زلیخا کے چچا کے بیٹے کے ساتھ قطفیر کو پالیا۔ بعض نے کہا آتا پایا جو اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ زلیخا یہ دیکھ کر ڈر گئی۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

شوہر کی نظر میں اپنے کو پاک دامن ظاہر کرنے اور جذبہ انتقام کے زیر اثر یوسفؑ کے خلاف اس کو بھڑکانے کے لئے عورت نے کہا جس شخص نے آپ کی بیوی سے برے کام کا ارادہ کیا ہو آپ کی بیوی پر بری نیت کی ہو اس کی سزا اس کے سوا نہیں کہ اس کو قید میں ڈال دیا جائے یا دکھ کا عذاب دیا جائے یعنی کوڑے مارے جائیں۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ یوسف نے کہا اس نے مجھے پھسلایا تھا۔ یعنی یہی مجھ سے بدکاری کی طلب گار تھی۔ چونکہ عورت نے جھوٹ باندھا تھا اور شوہر کو ترغیب دی تھی کہ یوسفؑ کو سزائے تعزیزدی جائے یا قید میں ڈال دیا جائے۔ اس لئے بطور دافعت حضرت نے یہ راز فاش کیا۔ اگر زلیخا ایسا نہ کرتی تو آپ بھی پردہ دری نہ کرتے۔

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے شہادت دی۔ بعض نے کہا یہ زلیخا کا چچا کا بیٹا تھا۔ بعض نے کہا ماموں کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیرؒ اور ضحاک نے کہا شیر خوار بچہ تھا جس کو اللہ نے گویا کر دیا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان بھی آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا چار بچے بچپن میں بولے (۱) بنت فرعون کے بال بنانے والی خادمہ کا بچہ (۲) شاہد یوسفؑ (۳) جریج والا بچہ (۴) عیسیٰ بن مریمؑ۔ محمد بن محمد معاف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں اور ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔ حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے اور شرط شیخین کے موافق قرار دیا ہے۔ لیکن بیہقی کو اس حدیث کی صحت کی اطلاع نہیں ملی۔ انہوں نے اس کی تردید میں وہ حدیث پیش کی ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا پالنے کے اندر تین بچوں کے علاوہ کسی نے بات نہیں کی عیسیٰ بن مریمؑ اور جریج والا بچہ اور ایک بچہ جس کو اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی ایک خوبصورت سوار ادھر سے گزرا عورت نے کہا اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی طرح کر دے۔ بچہ بولا مجھے اس کی طرح نہ کرنا۔ اگر اس مؤخر الذکر بچے کو بھی مذکورہ الصدر چار بچوں کے ساتھ ملا دیا جائے تو پالنے میں بولنے والے پانچ بچے ہو جائیں گے۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی کی حالت میں بولنے والے اس سے زیادہ بچے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ اصحاب الاخدود (یوسف ذونواس شاہ یمن اور اس کے ساتھی جنہوں نے ایک بڑا گڑھا کھدوا کر آگ سے بھروا کر اہل ایمان کو اس میں ڈلوایا تھا) اور شیر خوار بچے کو جب اس کی مؤمنہ ماں کی گود سے چھین کر آگ میں ڈالا تو ماں بے تاب ہو گئی اور قریب تھا کہ کلمہ کفر زبان پر لے آئے کہ بچے نے ماں کو آگ کے اندر سے آواز دی اماں یہ پھولوں کا باغ ہے تو بھی چلی آ (مترجم) کے قصے میں بھی آتا ہے کہ ایک شیر خوار بچہ بولا تھا۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی میں بولنے والے گیارہ بچے ہوئے جن کو میں نے ان اشعار میں جمع کر دیا ہے۔

تکلم فی المهد النبیُّ محمدٌ	ویحییٰ وعیسیٰ و الخلیل و مریم
ومبری جریج ثم شاهد یوسف	وطفل لذی الاخدود یرویه مسلم
وطفل علیه مر بالامة التی	یقال لها تزنی ولا تتکلم
وماشطة فی عهد فرعون طفلها	وفی زمن الهادی المبارک یختم

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

اگر یوسفؑ کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے تو زلیخا سچی ہے اور یوسف جھوٹا ہے۔ کرتہ کا آگے سے پھٹنا اس بات کی دلیل ہے کہ یوسفؑ

نے دست درازی کی تھی اور زلیخا نے آگے سے اس کا کرتہ اس کو منع کرنے کے لئے پکڑا جس سے کرتہ چر گیا۔ یا یہ کہ زلیخا کے پیچھے یوسف دوڑا اور تیز دوڑنے کی وجہ سے کرتے کے دامن میں الجھ کر گرا، اور کرتا کا گریبان پھٹ گیا۔

وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۝

اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت نے جھوٹ کہا اور یوسف سچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت یوسف کے پیچھے اس کو پکڑنے دوڑی اور کرتہ پکڑ کر کھینچ لیا جس کی وجہ سے کرتہ پھٹ گیا۔

حقیقت میں یہ شہادت نہ تھی (بلکہ سچ جھوٹ معلوم کرنے کی ایک تدبیر تھی) مگر مفہوم شہادت کو چونکہ یہ قول ادا کر رہا تھا اس لئے اس کو شہادت قرار دیا۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۚ پس جب اس نے یوسف کا کرتہ پیچھے سے پھٹا دیکھا (تو سمجھ گیا کہ یوسف پاک دامن اور سچا ہے اور بیوی مکار قصور وار ہے) بولا یا شبہ (بدی یا یہ کام یا تیرا یہ قول مَا جَزَاءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ الخ) تم عورتوں کی مکاری کی وجہ سے ہے۔ خطاب بصیغہ جمع زلیخا اور اس جیسی عورتوں کو ہے یا تمام عورتوں کو۔

إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ۝ یقیناً تم عورتوں کا مکر بڑا ہے۔ عورتوں کا ظاہر تو کمزور نظر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچی ہیں (بھولی بھالی صورت پر کون جھوٹا ہونے کا احتمال کر سکتا ہے) لیکن ان کا باطن بڑا اور گندا ہے ان کی تخلیق آدم کی (ٹیڑھی) پسلی سے ہوئی ہے ان کی عقلوں میں کمزوری اور دینداری میں نقصان ہے ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو مکر کا جال لے کر مردوں کے سامنے سے آتا ہے اور شیطان تو پھر چھپ کر چوری سے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں شیطان کا جال ہیں۔ یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا تم عورتوں میں سے کسی ایک سے بھی زیادہ کوئی ناقص العقل والدین عقل و دانش مند مرد کی عقل و دانش کو زائل کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ بعض علماء کا قول ہے شیطان سے زیادہ مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ نے شیطان کے مکر کو تو ضعیف فرمایا ہے ارشاد فرمایا ہے إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا اور عورتوں کے متعلق فرمایا ہے إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ تمہارا مکر بڑا ہے۔

يُوْسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۔ اے یوسف اس قصہ سے درگزر کرو، کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ کہیں یہ واقعہ پھیل نہ جائے۔

وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِينَ۝ اور (اے زلیخا) تو اپنے گناہ کی معافی طلب کر یقیناً تو ہی قصور وار ہے۔ یعنی قصور وار لوگوں میں سے ہے۔ الخاطئین خطأ سے اسم فاعل جمع مذکر ہے۔ خطا کا معنی ہے قصداً غلطی کرنا۔ الخاطئین مذکر کا صیغہ ہے بظاہر مؤنث کا صیغہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ زلیخا عورتوں میں سے تھی مگر یہاں صرف خطاوار عورتوں کی جماعت مراد نہیں ہے بلکہ مرد خطاوار ہو یا عورت سب کی جماعت مراد ہے اور مذکر کو مؤنث پر تغلیب دے کر مذکر کا صیغہ استعمال کیا ہے، جیسے دوسری آیت ہے وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ اور اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۔ عزیز بردبار آدمی تھا غیرت کم تھی اسی لئے زبانی سرزنش پر اکتفا کی۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ اور شہر میں عورتوں نے کہا نِسْوَۃٌ اسم جمع ہے۔ یعنی جب زلیخا کی سازش اور مکاری کا قصہ شہر میں پھیلا اور یوسف کے واقعہ کی عورتوں کو اطلاع ہوئی تو عورتوں نے کہا۔ مقاتل نے کہا کہنے والی پانچ عورتیں تھیں۔ کیدبان کی بیوی، منصرم آبدارخانہ کی بیوی، مہتمم باورچیخانہ کی بیوی، جیلر کی بیوی اور منصرم اصطبل کی بیوی۔

امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عزیز کی بیوی اپنے (زرخرید) غلام کو پھسلانے اور بہکانے لگی۔

عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ اس کے نفس کی طرف سے۔ یعنی اس سے وصال کی طلب گار ہوگئی۔

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۗ اس غلام کا عشق اس کے دل میں گھر کر گیا ہے۔ یعنی یوسف عزیز کی بیوی کے دل کے

غلاف کو پھاڑ کر اس کے دل کے اندر گھس گیا۔ مطلب یہ کہ یوسفؑ کی محبت زلیخا کے دل میں رچ گئی۔ سدی نے کہا شغاف دل کے اوپر کی باریک جھلی۔

کلبی نے شَغَفَ کا ترجمہ کیا حَجَبَ یعنی زلیخا کے دل پر یوسفؑ کی محبت چھائی، محبت نے عقل پر پردہ ڈال دیا کہ سوائے یوسفؑ کے اور کسی بات کو سمجھنے کا اس کو ہوش نہیں رہا۔

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ ہم اس کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ سیدھے اور صحیح راستے سے بھٹک گئی ہے پاک دامنی کو چھوڑ دیا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ جب زلیخا نے ان کے غیبت کرنے کی خبر سنی تو ان کے پاس (دعوت کا پیام دے کر) کسی کو بھیجا۔ مکر سے مراد ہے خفیہ بات، مکر بھی مکار چھپاتا ہے اور غیبت بھی پس پشت چھپا کر کی جاتی ہے۔

ابن اسحاق نے کہا مکر سے مکری مراد ہے عورتوں نے زلیخا کے متعلق یہ بات اس لئے کہی تھی کہ زلیخا ان کو بلا کر یوسفؑ کا نظارہ کرا دے کیونکہ یوسفؑ کے حسن و جمال کا تذکرہ زلیخا ان سے کرتی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ زلیخا نے اپنا راز ان سے کہہ دیا تھا اور ان سے چھپانے کی تاکید کر دی تھی مگر وعدہ اخفاء کرنے کے بعد انہوں نے راز فاش کر دیا اس لئے اس کو مکر کہا۔ اَرْسَلَتْ کا مفعول محذوف ہے یعنی اَرْسَلَتْ رَسُوْلًا ایک قاصد بھیجا۔

وہب نے کہا زلیخا نے کھانے پر چالیس عورتوں کو بلایا تھا جن میں یہ غیبت کرنے والی عورتیں بھی تھیں، جنہوں نے زلیخا کو غلام سے محبت کرنے کی عار دلائی تھی۔

وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً اور ان کے واسطے مسند (تکیہ) لگا دیئے۔ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ، قتادہ اور مجاہد نے مُتَّكَاً کا ترجمہ طعام کیا ہے کیونکہ کھانے والے کھانے بیٹھتے ہیں تو تکیہ مسند لگاتے ہیں اس لئے مجازاً مُتَّكَاً کا ترجمہ ہو گیا طعام۔ اِتَّكَأْنَا عِنْدَ فُلَانٍ ہم نے فلاں شخص کے پاس کھانا کھایا۔ تکیہ لگا کر کھانے کی عادت چونکہ عیش پسندوں کی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اُلٹے ہاتھ سے کھانے اور تکیہ لگا کر کھانے کی ممانعت فرما دی۔ رواہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف عن جابر۔

بعض لوگوں نے کہا مُتَّكَاً وہ کھانا ہے جو کاٹ کر کھایا جائے گویا کاٹنے والا چھری سے اس پر دباؤ ڈالتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کا قول ہے کہ وہ ترنج تھا۔ بعض علماء نے کہا حبشی زبان میں مُتْكًا ترنج کو کہتے ہیں۔ عکرمہ اور ابو زید انصاری نے کہا جو چیز چھری سے کاٹی جائے عرب اس کو متک کہتے ہیں متک اور بتک کا لغوی معنی ہے کاٹنا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ عزیز کی بیوی نے ایک گھر میں طرح طرح کے پھل اور کھانے سجا کر رکھوا دیئے اور تکیے بھی لگا دیئے اور عورتوں کو بلوا لیا۔

وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا اور ان میں سے ہر عورت کو ایک چھری (کاٹنے کے لئے) دے دی۔ ان عورتوں کا قاعدہ تھا کہ گوشت چھری سے کاٹ کر کھاتی تھیں۔

وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ اور (یوسفؑ سے) کہا ان عورتوں کے سامنے سے نکلو۔

زلیخا نے یوسفؑ کو ایک اور جگہ بٹھا دیا تھا وہاں سے آپ عورتوں کے سامنے برآمد ہوئے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حسن میں یوسفؑ کی دوسرے لوگوں پر برتری ایسی تھی جیسی ستاروں پر چودھویں رات کے چاند کی۔ ابن جریر، حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا (یعنی شب معراج میں) میں نے دیکھا کہ یوسفؑ چودھویں کے چاند کی طرح تھے۔

ابو الشیخ نے اپنی تفسیر میں اسحاق بن عبداللہ ابی فروہ کا قول بیان کیا ہے یوسفؑ مصر کے گلی کوچوں سے گزرتے تو دیواریں آپ کے چہرے کی چمک سے جگمگا جاتی تھیں جیسے سورج کی دھوپ جب دیواروں پر پڑتی ہو تو اس کے عکس سے پانی جگمگا جاتا ہے۔

فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ ابو العالیہ نے کہا عورتیں آپ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں مبہوت ہو گئیں۔ بعض

علماء نے اَكْبَرْنَهٗ کا ترجمہ کیا ان کو (ہیجانی کیفیت کی وجہ سے) حیض چھوٹ گیا، عرب کہتے ہیں اَكْبَرَتِ الْمَرْأَةُ عورت بڑی ہو گئی، یعنی حائضہ ہو گئی۔ اس صورت میں ضمیر مصدری ہو گی یعنی یوسف کی وجہ سے۔

وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ اور (چھریوں سے) اپنے ہاتھ کاٹ لئے کاٹنا چاہتی تھیں پھل، اور یوسف کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئے تو کاٹ لئے ہاتھ اور تکلیف کا بھی احساس نہیں ہوا، مجاہد نے کہا ان کو خون بہنے کا بھی احساس نہ ہوا۔ قتادہ نے کہا ہاتھ کاٹ کر الگ کر دیئے، صحیح یہ ہے کہ ہاتھ تو کاٹ لئے مگر الگ کر کے نہیں پھینکے۔ وہب نے کہا ان میں سے کچھ عورتیں مر گئیں۔

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ یعنی اللہ ضعف قدرت سے پاک ہے اللہ کی قدرت پر انہوں نے تعجب کیا حَاشَ اصل میں حَاشَا تھا حَاشَا کلمہ استثناء ہے تخفیف الف کے بعد تنزیہ کے مقام میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

مَا هٰذَا بَشَرًا یہ آدمی نہیں ہے۔ مَا اور لَيْسَ دونوں نفی حال کے لئے مستعمل ہیں اس لئے اہل حجاز کے استعمال میں مَا کی خبر بھی لَيْسَ کی خبر کی طرح منصوب ہوتی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے اصل میں یہ خبر مجرور تھی یعنی مَا هٰذَا بِبَشَرٍ تھا حرف جر کو حذف کرنے کے بعد خبر کو منصوب کر دیا۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ۝ یہ تو بس معزز فرشتہ ہے یعنی اللہ کی نظر میں بڑی عزت والا فرشتہ ہے۔ انسانوں میں تو ایسا حسن ہوتا نہیں اور انسانوں سے اونچا حسن فرشتوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ یا اس وجہ سے انہوں نے یوسف کو فرشتہ کہا کہ ایسا جمال ایسا کمال اور ایسی پاکدامنی تو فرشتوں میں ہی ہو سکتی ہے انسان تو ان سب کا مجموعہ ہو نہیں سکتے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ زلیخا نے کہا کہ یہ وہ (کنعانی غلام) ہے (جس کی صورت تم نے اپنے ذہنوں میں تیار کی تھی اور) جس کی محبت کے بارے میں تم نے مجھے برا کہا تھا یعنی تم نے اس کے جمال کی صحیح تصویر کشی اپنے خیال میں کی ہی نہ تھی اس کے حسن کا اندازہ کیا ہی نہ تھا ورنہ مجھے اس کے عشق میں معذور سمجھتیں۔

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ اور میں نے ہی اس کو (اپنی طرف مائل کرنے کے لئے) پھسلایا تھا مگر یہ بچا اس نے اپنی عصمت کو بچانے کے لئے میری درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔
زلیخا نے ان عورتوں کے سامنے اس وقت اپنی حرکت کا اقرار کیا جب اس کو معلوم ہو گیا کہ میری مجبوری ان کی نظر میں ثابت ہو گئی اور آئندہ یوسف کے دل کو نرم کرنے میں یہ میری مدد کریں گی چنانچہ عورتوں نے یوسف سے سفارش کی کہ جیسا تمہاری مالکہ چاہتی ہے ویسا کرو اس کا کہا مانو۔

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ اور اگر اس نے میرے کہنے کے مطابق نہیں کیا تو اس کو یقیناً قید کر دیا جائے گا اور یہ ضرور ذلیل و خوار ہو گا۔
لَيَكُوْنًا اصل میں لَيَكُوْنَنْ بنون خفیفہ تھا حالت وقف میں نون کو تنوین سے مشابہت رکھنے کی وجہ سے بشکل الف لکھ دیا گیا جیسے لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ۔ اَلصّٰغِرِيْنَ ذلیل لوگ۔ یہ باب کَرُمَ سے ہے اس کا مصدر صِغَر اور صِغَار ہے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ یوسف نے کہا اے میرے رب جس چیز کی طرف وہ مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے۔ یعنی زنا سے تو جیل اچھی۔ دعوت گناہ صراحۃً اگرچہ صرف زلیخا نے دی تھی لیکن اشارۃً دوسری عورتوں کی طرف سے بھی تھی کہ یوسف مان لیں اس لئے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کر دی یا اس وجہ سے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کی کہ نافرمانی کے نتیجہ بد سے ان عورتوں نے یوسف کو ڈرایا تھا اور فرمانبرداری ہی کو یوسف کے حق میں بہتر قرار دیا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ہر عورت نے یوسف کو اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔

بعض علماء نے کہا اگر یوسف قید خانہ کو پسند نہ کرتے اور اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ نہ کہتے تو قید خانہ کی مصیبت میں مبتلا نہ

ہوتے، آدمی کو چاہئے کہ عافیت کا طلبگار ہو اور اللہ سے عافیت ہی کی دعا کرے۔ ترمذی نے حضرت معاذؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا الٰہی میں تجھ سے صبر کی درخواست کرتا ہوں (کہ مجھے مصائب پر صبر عطا کر) فرمایا تو مصیبت کا طلبگار ہو عافیت کی دعا کر طبرانی نے حضرت عباسؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت عباسؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کی دعا میں اللہ سے کروں فرمایا اپنے رب سے عافیت کی دعا کرو۔ کچھ مدت کے بعد میں پھر خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیے جو میں اللہ سے مانگوں، فرمایا چچا اللہ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی طلب کرو۔

وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ اور اگر تو ان کی مکاری کا رخ میری طرف سے نہیں پھیر دے گا (اور مجھے عصمت پر ثابت قدم نہیں رکھے گا) تو میں ان کی (خواہش کو قبول کرنے کی) طرف جھک جاؤں گا اور (ارتکاب گناہ کی وجہ سے) نادانوں میں سے ہو جاؤں گا۔ یعنی طبعی میلان مجھ پر غالب آجائے گا، ضبو ط خواہش نفس کی طرف جھکاؤ بے حیائی کا کام کرنا نادانوں کا کام ہے دانش مند برا کام نہیں کرتا یا جاہلوں سے مراد ہیں وہ جاننے والے جو جاننے کے باوجود علم کے مطابق عمل نہیں کرتے ایسے لوگ جاہلوں کے حکم میں ہیں بغوی نے کہا اس فقرہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مؤمن اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو محض جہالت اور نادانی کی وجہ سے کرتا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ پس اللہ نے یوسفؑ کی دعا قبول کر لی۔ یوسفؑ نے کہا تھا وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ یہ لفظ در پردہ دعا کو متضمن تھا۔

فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ پس اس کی طرف سے ان عورتوں کے مکر کو پلٹ دیا (عصمت پر یوسفؑ کو ثابت قدم رکھا کہ انہوں نے لذت آگیں گناہ پر قید خانہ کو ترجیح دی) بلاشبہ وہ اہل التجا کی دعاؤں کو سننے والا اور (ان کے احوال و مصالح کو) بخوبی جاننے والا ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ پھر مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی یہی رائے ہوئی کہ یوسفؑ کو ایک مدت کے لئے قید میں رکھیں۔

لَهُم یعنی عزیز اور اس کے ساتھیوں کی پھر یہ رائے ہوئی۔ مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ یعنی یوسفؑ کی پاک دامنی اور براءت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد۔ بچہ کا کلام اور قمیص کا پیچھے سے پھٹنا اور عورتوں کا ہاتھ کو کاٹنا اور یوسفؑ کا ان سے با عصمت رہنا جب انہوں نے دیکھ لیا تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ مدت کے لئے یوسفؑ کو قید کر دیا جائے۔ زلیخا کا شوہر زن مرید تھا شوہر کی لگام زلیخا کے ہاتھ میں تھی وہ جس طرف چاہتی موڑ دیتی، اس نے شوہر کو بازیچہ بنا رکھا تھا اس کو خیال تھا کہ یوسفؑ قید کی سختی سے تنگ ہو کر میرا ہو جائے گا۔ پھر راز فاش ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگوں سے شرمندہ بھی ہوگی اور بدنامی کا دھبہ دھونا چاہتی ہوگی اس لئے اس نے یوسفؑ کو قید کر دینا ہی مناسب سمجھا جب دیدار اور وصال سے وہ محروم ہوگی تو ہنگامۂ احوال برپا اس کو ملامت کرنی پڑی مجبوراً اس نے شوہر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے لوگوں میں رسوا کر دیا دنیا سے کہتا پھرتا ہے کہ میں نے اس کو ورغلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا اب یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں گھر سے نکلوں اور لوگوں سے جا کر اپنی بے گناہی ظاہر کروں یا اس کو آپ قید کر دیں کہ لوگوں میں یہ چرچے ختم ہو جائیں اور لوگ اسی کو مجرم قرار دے دیں۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ یوسفؑ سے تین لغزشیں ہوئیں جن کی پاداش ان کو اٹھانی پڑی۔

(۱) انہوں نے اس عورت (کی طرف بڑھنے) کا ارادہ کیا تو قید بھگتنی پڑی۔

(۲) انہوں نے اللہ کے سوا اپنے ساتھی سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو چند سال (مزید) قید میں رہنا پڑا۔

(۳) انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ تم بلاشبہ چور ہو تو بھائیوں نے کہا اگر اس نے (بنیامین نے) چوری کی تو تعجب نہیں کیونکہ اس کے بھائی یوسفؑ نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ اور یوسفؑ کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور بھی داخل ہوئے تھے ان کو بھی قید کر دیا گیا تھا یہ دونوں ریان بن ولید بن ثروان شاہ مصر کے غلام تھے ایک باورچی یعنی منصرم باورچی خانہ تھا اور دوسرا ساقی یعنی منصرم آبدار خانہ۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر ان کو بھی قید کر دیا تھا اور اتفاقاً ان کی قید بھی یوسفؑ ہی کے ساتھ ہوئی تھی مَعَ کے لفظ سے یہی معلوم ہو رہا ہے

بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے بادشاہ کو ہلاک کرنے کی سازش کی اور بادشاہ کو زہر دینے کے لئے شاہی باورچی کو مالی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اقرار کے بعد ساقی نے تو سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور باورچی نے رشوت لے کر کھانے میں زہر ملا دیا کھانا بادشاہ کے سامنے آیا تو ساقی نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ یہ کھانا زہر آمیز ہے اس کو نہ کھائیے باورچی نے (خدمت میں آکر) کہا حضور پانی میں زہر ملا ہوا ہے اس کو نہ پیجئے۔ بادشاہ نے ساقی کو حکم دیا یہ پانی تجھے پینا ہوگا ساقی نے پی لیا اس کو کوئی ضرر نہ پہنچا اور باورچی کو حکم دیا یہ کھانا تجھے کھانا پڑے گا۔ اس کو کھانا اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے کھانا کسی جانور کے سامنے ڈلوایا جانور نے کھایا تو وہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو جیل خانہ بھیج دینے کا حکم دے دیا (باورچی کو زہر دینے کی کوشش کی وجہ سے اور ساقی کو راز دار ہونے کی وجہ سے) یوسفؑ جیل خانے میں پہنچے تو ان کے علم کی شہرت ہو گئی۔ آپ نے خود بھی اعلان کر دیا کہ میں خواب کی تعبیر دینا جانتا ہوں۔ غرض ساتھ داخل ہونے والے دونوں قیدیوں نے مشورہ کیا ہم اس عبرانی غلام کے دعوے کی جانچ کرنا چاہتے ہیں چلو تجربہ کریں خواب تو انہوں نے کوئی دیکھا نہ تھا جھوٹ موٹ خواب بنا کر تجربہ کرنا چاہا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے یہی فرمایا بعض علماء نے کہا انہوں نے واقعی خواب دیکھے تھے۔ حضرت یوسفؑ نے ان کو غمگین پا کر وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا ہم دونوں بادشاہ کے مصاحب تھے ہم نے خواب دیکھے ہیں جن کی وجہ سے پریشان ہیں یوسفؑ نے کہا جو کچھ دیکھا ہے بیان کرو تو

قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ ایک نے یعنی ساقی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں (انگور) نچوڑ رہا ہوں اور ان کو (نچوڑ کر شراب بنا رہا ہوں، انگور سے شراب بنتی ہے انگور مآل کار شراب ہو جاتے ہیں اس لئے انگور کی جگہ لفظ خمر ذکر کیا۔ خمر سے مراد انگور ہیں۔ فلاں شخص کھانا پکاتا ہے یعنی وہ چیز پکاتا ہے جو پک کر کھانا بن جاتی ہے۔ بعض نے کہا اہل عمان کے محاورہ میں خمر انگوروں کو کہتے ہیں۔ تفصیل خواب اس نے اس طرح بیان کیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں درخت انگور کی جڑ کے پاس ہوں اور درخت میں تین خوشے لگے ہیں۔ میرے ہاتھ میں بادشاہ کا پیالہ ہے میں نے وہ انگور نچوڑ کر پیالے میں عرق بھر کر بادشاہ کو پلایا۔ بادشاہ نے اس کو پی لیا۔

وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ

اور دوسرے نے یعنی باورچی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے (اوپر سے جھپٹ کر) ان میں سے کھا رہے ہیں۔ اس نے خواب کی تفصیل اس طرح بیان کی تھی کہ میں نے دیکھا میرے سر پر تین ٹوکریاں ہیں جن میں روٹیاں اور طرح طرح کے کھانے ہیں اور شکاری پرندے ان کو نوچ کر لئے جا رہے ہیں۔

نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ آپ ہم کو ہر ایک کے خواب کی تعبیر بتا دیجئے۔ ہمارے خیال میں آپ صحیح تعبیر دینے والوں میں سے ہیں یا آپ نیکو کاروں میں سے ہیں۔ اس صورت میں احسان سے مراد علم اور دل کا ترجمہ یہ محسن سے مراد ہوگا اچھی تعبیر دینے والا۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ہم پر بھی احسان کیجئے اور صحیح تعبیر بتا دیجئے۔

ضحاک بن مزاحم سے پوچھا گیا کہ آیت اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ میں کس احسان کا اظہار ہے یوسفؑ کیا بھلائی کرتے تھے۔ ضحاک نے جواب دیا کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو آپ اس کی عیادت اور نگہداشت کرتے تھے۔ اگر کسی قیدی کی جگہ تنگ ہوتی تو آپ اس کو کشادہ جگہ دے دیتے اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ چیز فراہم کر دیتے اور ان تمام باتوں کے باوجود

گھروں سے مقررہ کھانا آنے سے پہلے بتا دیا کرتا اور یہ تعبیر الہام اور وحی کے ذریعے سے اللہ نے مجھے بتا دی ہے ان کا تعلق نجوم سے ہے اور نہ کہانت سے۔

بیضاوی نے لکھا ہے دونوں قیدیوں کے سوال کا جواب دینے سے پہلے حضرت یوسفؑ نے ان کو توحید کی صراط مستقیم اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہی۔ انبیاء اور اولیاء کے جو لوگوں کی ہدایت اور دعوت کا طریقہ ہی یہ ہے۔ آپ نے پہلے کچھ غیبی اطلاع بطور معجزہ دی تاکہ دعوت توحید اور تعبیر خواب کی سچائی ان کے دلوں میں جم جائے۔

إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝

جو لوگ اللہ کو واحد نہیں مانتے اور آخرت کا انکار خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں ان کا دین تو میں نے قطعاً اختیار ہی نہیں کیا ہے۔ یہ مذکورہ جملہ کی علت ہے یعنی میرے رب نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے کیونکہ میں نے کافروں کا دین اختیار ہی نہیں کیا ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۔۔۔ اور اپنے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے دین کی پیروی اختیار کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ إِنِّي تَرَكْتُ سے الگ مستقل کلام ہو۔ جو دعوت کی تمہید اور خاندان نبوت سے اپنے کو ظاہر کرنے کے لئے آپ نے فرمایا ہو تاکہ وہ دونوں قیدی رغبت سے سنیں اور آپ کے بیان کا اعتبار کریں۔ اسی جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی جگہ کسی عالم کے مرتبے سے لوگ ناواقف ہوں اور وہ اپنی دعوت پھیلانی چاہے تو اگر وہ اپنے اوصاف کسی قدر بیان کر دے تاکہ اس کی بات کی وقعت پیدا ہو جائے تو ناجائز نہیں اس تدبیر سے لوگوں کو اس کے علم سے فائدہ اندوز ہونے کا موقع مل جائے گا۔ یہ بات خودستائی کے ذیل میں نہیں آتی۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے انبیاء کو تو تحدیث نعمت کا حکم دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔

جن اولیاء نے اپنے مراتب قرب اور مدارج فوز کا کسی قدر ذکر کیا ہے مثلاً حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی یا حضرت شیخ عالم سید الاولیاء محی الدین عبد القادر جیلانی افسوس بعض لوگ نادانی یا حسد کی وجہ سے ان پر طعن کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بات خودستائی میں داخل نہیں (بلکہ تحدیث نعمت ہے)۔

مَا كَانَ لَنَا أَن نُّشْرِكَ بِاللَّهِ مِن شَيْءٍ ۔۔۔ ہمارے (گروہ انبیاء) کے لئے جائز اور ممکن نہیں کہ اللہ کے ساتھ (اس کی ذات و صفات میں) کسی چیز کو شریک کریں۔ کیونکہ توحید ہماری فطرت ہے اور اللہ نے شرک سے ہماری حفاظت کی ہے۔

ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ اللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝

یہ (نعمت توحید و علم) ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے۔ (ہم پر براہ راست وحی کے ذریعے سے اور دوسرے لوگوں پر ہماری بعثت و رسالت کے ذریعے سے اور توحیدی تعلیمات ادا کرنے کے سبب سے) لیکن اکثر لوگ (یعنی امت دعوت) اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے اور متوجہ نہیں ہوتے مڑ جاتے ہیں۔

یا یہ مطلب ہے کہ یہ (توحید و علم) اللہ کے فضل کی وجہ سے جو ہم پر بھی ہے اور دوسرے لوگوں پر بھی۔ کہ اس نے روشن دلائل اور عقلی نشانیاں قائم کر دیں مگر اکثر لوگ ان آیات قدرت کو نظر غائر سے نہیں دیکھتے وہ اللہ کی قائم کردہ نشانیوں سے استدلال نہیں کرتے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس نعمت کی کوئی قدر ہی نہیں اور وہ کافر نعمت ہیں شکر گزار نہیں ہیں۔ آئندہ آیت میں حضرت نے جیل خانہ والوں کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝

اے جیل کے ساتھیو! کیا متعدد و متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ مُتَفَرِّقُونَ کثیر، متعدد جو عاجز اور ممکن ہونے میں ایک جیسے ہیں (سب عاجز اور سب ممکن، متعدد المادہ اصل مادے میں) خواہ سونے چاندی لوہے پتھر وغیرہ کی مورتیاں

ہو یا ملائکہ، جن انسان ہو یا غیرہ وہ لا بد۔ الْوَاحِدُ اپنی ذات و صفات میں اکیلا ہے یعنی بے مثل نہ اس کی ذات و صفات میں کوئی اس جیسا ہے نہ افعال میں۔ الْقَهَّارُ سب پر غالب جس کا کوئی مقابل اور مقاوم نہیں۔

مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ

تم لوگ خدا کو چھوڑ کر بجز بے حقیقت ناموں کی ہی پوجا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔

اَسْمَآءً سے مراد ہے وہ چیز جو الوہیت کے معنی سے خالی ہیں۔ سَمَّیْتُمْ کا دوسرا مفعول محذوف ہے یعنی جن کا نام تم نے اور تمہارے باپ دادا نے الٰہ اور رب رکھ چھوڑا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ایسے اسماء کی پوجا کرتے ہو جن کا کوئی واقعی وجود نہیں۔ تم خیال کرتے ہو کہ وہ بتوں میں حلول کئے ہوئے ہیں یا مجرد اور (دوری نیز سے) الگ ہیں۔

مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی یعنی ان کے وجود یا ان کے مستحق الوہیت ہونے کی کوئی دلیل کہیں موجود نہیں۔ جب کہ اللہ کی ہستی اور اس کے استحقاق الوہیت کے بکثرت دلائل و براہین موجود ہیں اور اللہ نے اپنے انبیاء اور پیغمبروں پر آیات توحید و معبودیت نازل کر دی ہیں۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ اور حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو، یعنی عبادت کرنے کا حکم تو صرف اللہ کے لئے ہے وہ واجب الوجود بالذات ہے ہر چیز کا خالق اور موجد (عدم سے وجود میں لانے والا) ہے وہی منعم، مالک، ہر چیز پر غالب اور نفع و ضرر پہنچانے والا ہے اس کے سوا نہ کوئی مالک اور قاہر ہے نہ کسی کے ہاتھ میں حقیقۃً کسی کا نفع و ضرر ہے لہٰذا وہی بالذات مستحق عبادت ہے اگر کسی دوسرے کی پوجا جائز ہوتی تو اسی کے حکم سے اس کا جواز ہو سکتا تھا مگر اس نے پیغمبروں کی زبانی حکم دے دیا ہے کہ اس کی ذات کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۝ یہی (توحید کا) سیدھا (ثابت شدہ) طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی یہی ثابت شدہ دین ہے دلائل اور براہین اسی کو ثابت کر رہے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتے اور جہالت میں بھٹکے پھرتے ہیں۔

بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ کا یہ بیان ترتیبی دعوت توحید اور تدریجی الحام ثبوت ہے اول آپ نے قیدیوں کو مخاطب کر کے توحید اللہ کی تحقیق فرمائی پھر برتری ظاہر فرمائی پھر دلیل کے ساتھ بیان کیا کہ جن کو تم الٰہ سمجھتے ہو اور جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ معبود ہونے کے مستحق نہیں کیونکہ استحقاق عبادت یا ذاتی ہوگا یا بغیر اللہ کے سوا کسی اور کو نہ معبودیت کا استحقاق بالذات ہے نہ خدا کا عطا کردہ اس کی آپ نے پھر واضح صراحت کر دی کہ دین مستقیم اور واقعی حق بات یہی ہے یہی تقاضۂ عقل و علم ہے اس کے سوا ہر بات فہم و دانش کے خلاف ہے۔ اس سے آگے آپ نے خواب کی تعبیر دی اور فرمایا

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَیَسْقِیْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَیُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ

اے جیل خانہ کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک (یعنی ساقی) تو اپنے آقا (یعنی بادشاہ) کو شراب پلائے گا اور دوسرے (یعنی باورچی) کو صلیب دی جائے گی اور پرندے اس کے سر کو (نوچ نوچ کر) کھائیں گے۔ انگور کے تین خوشوں سے تین روز کی طرف اشارہ ہے یعنی جیل خانہ کے اندر تین روز رہے گا، تین روز کے بعد بادشاہ اس کو طلب کرے گا اور سابق عہدہ پر دوبارہ مقرر کر دے گا اور تین ٹوکریوں سے بھی تین دن کی طرف اشارہ ہے یعنی باورچی جیل خانہ میں تین روز رہے گا۔ تین روز کے بعد جیل خانہ سے نکلوا کر اس کو صلیب پر چڑھا دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں اس تعبیر کا قرینہ شاید یہ ہو کہ باورچی نے کھانے میں واقعی زہر ملا دیا تھا اور ساقی بے قصور تھا (اس لئے بادشاہ کا صحیح فیصلہ یہی ہو سکتا تھا کہ باورچی کو صلیب دے دے اور ساقی کو رہا کر کے سابق عہدے پر فائز کر دے)۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا حضرت یوسفؑ کا بیان سن کر دونوں قیدی کہنے لگے ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا

تھا: محض دل لگی کر رہے تھے اس پر حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔

قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ ۝ جس بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقرر ہو چکا۔

یعنی جس بات کو تم دریافت کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہو چکا تم نے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔ قضائے خداوندی ویسی ہی ہو چکی ہے جیسا میں نے بیان کر دیا تم دونوں کا انجام یہی ہوتا ہے۔

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ ۝ اور جس شخص کے رہا ہو جانے کا یوسفؑ کو یقین تھا اس سے یوسفؑ نے کہا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کر دینا۔ اور کہہ دینا کہ جیل خانہ کے اندر ایک غلام قیدی ہے جس کو بلا قصور ظلم سے قید کر دیا گیا ہے اور اس کے احوال اس طرح ہیں۔

ظَنَّ کا فاعل اگر یوسفؑ کو قرار دیا جائے تو ظن کا معنی یقین ہوگا کیونکہ ساقی کے رہا ہونے کا آپ کو یقین تھا آپ کا قول قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ اس پر دلالت کر رہا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظن کی ضمیر ساقی کی طرف لوٹ رہی ہے اس وقت ظن کا معنی ہوگا غالب گمان یعنی یوسفؑ نے اس شخص سے جس کو اپنی رہائی کا غالب گمان ہو گیا تھا کہا

فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ پھر اس کو شیطان نے اپنے آقا کا ذکر یعنی آقا کے سامنے یوسفؑ کا تذکرہ کرنا بھلا دیا۔ رب سے مراد ہے بادشاہ۔ حضرت ابن عباسؓ اور اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے (انساہ میں ہ ضمیر یوسفؑ کی طرف راجع ہے یعنی) یوسفؑ کو شیطان نے اللہ کی یاد بھلا دی کہ انہوں نے مخلوق سے مدد کی خواہش کی اللہ کو چھوڑ کر دوسرے کی مصیبت دور کرنے کی درخواست کی ورنہ یوسفؑ کی یہ غفلت شیطان کی اثر اندازی سے پیدا ہوئی (ان کے مقام کا تقاضہ تھا کہ وہ کسی شخص سے سفارش کی بھی تمنا نہ کرتے مقام نبوت و معرفت غیر اللہ سے ظاہری اور مجازی مدد لینے سے بھی انکار کرتا ہے۔ مترجم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم کرے اگر وہ ایک انسان سے اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ نہ کہتے تو جیل کے اندر اتنی طویل مدت نہ رہتے۔ رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم و ابن مردویہ

فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ۝ پس وہ جیل خانہ میں چند سال رہے قتادہ نے کہا بضع کا اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے۔ بضعۃ کا معنی ہے کاٹنا۔ مجاہد نے تین سے سات تک کی مدت بیان کیا ہے اکثر مفسرین کا قول ہے یوسفؑ قید خانہ میں سات سال رہے۔ کلبی نے کہا پانچ برس پہلے رہ چکے تھے اور مزید سات برس اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ کہنے کے بعد رہے، کل بارہ سال رہے۔

میں کہتا ہوں آیت وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ بتا رہی ہے کہ ساقی اور باورچی آپ کے ساتھ ہی قید ہوئے تھے اور جب وہ دونوں قید خانہ میں تین روز رہے تو یوسفؑ کا ان سے پہلے قید خانہ میں پانچ سال رہنا کیسے ہو سکتا ہے (شاید حضرت مفسر قدس سرہٗ نے غور نہیں فرمایا کہ باورچی اور ساقی کی کل مدت قید تین روز نہیں ہوئی بلکہ عرض خواب اور تعبیر کے بعد تین روز رہے ممکن ہے کہ عرض خواب سے پہلے پانچ سال قید میں گزر گئے ہوں اور جیل خانہ میں داخل ہوتے ہی تو [illegible] اور تبلیغ، بیان اور عام قیدیوں سے مواسات اور ہر ایک کی خدمت اور اخلاق کریمہ کا اظہار ممکن نہیں جیسا کہ حضرت مفسرؒ نے سابق روایات کی روشنی میں بیان کیا ہے نہ داخل ہوتے ہی عرض خواب کا امکان ہے اس لئے کلبی کا قول ضعیف روایت کی بنا پر خواہ ضعیف ہو مگر درایت کے خلاف نہیں۔ مترجم)

مالک بن دینار نے کہا جب یوسفؑ نے ساقی سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو (اللہ کی طرف سے) کہا گیا یوسف مجھے چھوڑ کر تو نے دوسرے کو اپنا وکیل (وسیلہ) بنایا اب میں ضرور تیری قید طویل کر دوں گا، حضرت یوسفؑ رونے لگے اور عرض کیا میرے رب! مصائب کی کثرت نے میرے دل پر فراموشی طاری کر دی اور میں نے یہ ایک بات کہہ دی آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

حسن بصریؒ نے کہا حضرت جبرئیلؑ قید خانہ کے اندر حضرت یوسفؑ کے پاس آئے آپ نے ان کو پہچان لیا اور فرمایا کہ

الْمُخْلَصِيْنَ (اللہ کے عذاب سے ہلاک ہو جانے سے ڈرانے والوں کے سردار) آپ کو آج ان گناہ گاروں میں کیسے دیکھ رہا ہوں، حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اے پاک باپ دادا کے پاک بیٹے اللہ رب العالمین نے تم کو سلام فرمایا ہے اور فرمایا ہے کیا تم کو شرم نہیں آئی کہ (میرے ہوتے) تم نے آدمیوں سے سفارش کی خواستگاری کی، قسم ہے اپنی عزت کی میں تم کو مزید چند سال جیل خانہ میں رکھوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کیا اللہ اس حالت میں مجھ سے راضی بھی ہوگا حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا ہاں، حضرت یوسفؑ نے فرمایا تو پھر مجھے قید میں رہنے کی پروا نہیں۔

کعب کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یوسفؑ سے کہا اللہ فرماتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا حضرت نے جواب دیا اللہ نے، جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے تجھے کنویں کی تکلیف سے کس نے نجات دی یوسفؑ نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے تجھے خواب کی تعبیر کس نے سکھائی۔ یوسفؑ نے کہا اللہ نے، جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے چھوٹے بڑے گناہ کا رخ کس نے تیری طرف سے پھیر دیا، یوسفؑ نے کہا اللہ نے جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے پھر تو نے اپنے جیسے آدمی سے کیسے سفارش کی درخواست کی۔

آئندہ وہ حدیث آرہی ہے جو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ایک بات یوسفؑ سے نہ ہو جاتی کہ اللہ کے سوا دوسرے سے انہوں نے ازالہ مصیبت کی درخواست کی تو قید خانہ میں مزید رہنا نہ پڑتا۔

غرض جب سات سال گزرے اور حضرت یوسفؑ کی کشائش کا وقت قریب آ گیا تو مصر کے شاہ اعظم یعنی ریان بن ولید نے ایک عجیب خواب دیکھا جس سے وہ وحشت زدہ ہو گیا اس نے دیکھا کہ سات موٹی گائیں دریا سے برآمد ہوئیں اور ان کے پیچھے سات گائیں اور دریا سے نکلیں جو نہایت دبلی تھیں، پھر دبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل گئیں اور موٹی گائیں دبلی گایوں کے پیٹ میں گھس گئیں ان کا کوئی نشان بھی نہیں رہا۔ پھر غلہ کی سات سبز بالیاں دیکھیں جن میں دانہ پڑ چکا تھا اور سات خشک بالیاں دیکھیں جو کاٹنے کے قابل ہو گئی تھیں خشک بالیاں سبز بالیوں سے لپٹیں اور ان پر غالب آ گئیں یہاں تک کہ ان کی سبزی بالکل جاتی رہی۔ بادشاہ نے جادوگروں کو، کاہنوں کو اور اہل دانش و فہم کو اور خواب کی تعبیر دینے والوں کو جمع کیا اور ان سے اپنا خواب بیان کیا، یہی تذکرہ آیات ذیل میں اللہ نے فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۭ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝

اور بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور خشک بالیں ہیں اے درباری سردارو اگر تم خواب کی تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں مجھ کو فتویٰ دو۔

عِجَافٌ عَجْفَاء کی جمع نہیں ہے عَجْفَاء کی جمع عُجُف آتی ہے لیکن سِمَان کی لفظی اور معنوی مناسبت کی وجہ سے عِجَاف ذکر کیا۔

تعبیر کا معنی ہے مثالی صورتوں سے ان معانی کی طرف انتقال جن کی عالم مثال (عالم اشباح) اشکال بنی ہوتی ہیں۔ تعبیر عبور سے بنا ہے جس کا معنی ہے گزر جانا عبرت الرؤیا عبارۃ عبرت الرؤیا تعبیر سے زیادہ ثابت ہے۔

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝ وہ کہنے لگے کہ یہ تو

پریشان خیالات ہیں اور ایسے خوابوں کی تعبیر سے واقف نہیں۔ اضغاث احلام یعنی جھوٹے خواب۔ اضغاث ضغث کی جمع ہے۔ ضغث کا معنی ہے گھاس وغیرہ کا گٹھا مجازاً جھوٹا خواب مراد لیا گیا ہے۔ حلم خواب۔ اس کا حقیقی تعبیر سے آتا ہے۔ چونکہ خواب میں مختلف چیزیں جمع تھیں اس لئے اضغاث کو بصیغہ جمع ذکر کیا۔ بتاویل الاحلام میں احلام سے

مراد ہیں جو بے اصل خواب۔ یعنی ان خوابوں کی ہمارے پاس کوئی تعبیر نہیں کیونکہ تعبیر تو سچے خوابوں کی ہوتی ہے۔ تعبیر نہ جاننے کا صراحۃً عذر انہوں نے پیش کیا (بلکہ عذر اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کا لفظ کہہ کر انہوں نے پیش کیا)

وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ أَنَا أُنَبِّئُكُمْ بِتَأْوِيلِهِ فَأَرْسِلُونِ ﴿٤٥﴾ دونوں قیدیوں میں سے جس شخص نے (قید اور قتل سے) رہائی پائی تھی اور ایک مدت کے بعد یوسفؑ کی یاد اس کو ہوئی اس نے کہا میں اس کی تعبیر تم کو بتاؤں گا مجھے جیل خانہ میں یوسفؑ کے پاس بھیج دو۔ یعنی ساقی نے کہا جس کو یوسفؑ کی اور آپ کے قول اذکرنی عند ربک کی یاد مدت کے بعد ہوئی۔ امت کا معنی جماعت اس جگہ مراد مجموعہ ایام یعنی ایک طویل مدت سات برس کا زمانہ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ساقی نے بادشاہ کے سامنے دو زانو ہو کر کہا جیل خانہ میں ایک آدمی ہے جو خواب کی تعبیر دیا کرتا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دے دیجئے۔ بادشاہ نے اس کو یوسفؑ کے پاس بھیج دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قید خانہ شہر کے اندر نہیں تھا۔ جب ساقی یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ اے یوسف! اے بڑے سچے (آدمی) ساقی نے یوسفؑ اس لئے کہا کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھی کے بارے میں آپ کی سچی تعبیر کا تجربہ کر چکا تھا اور آپ کی صداقت کو جان چکا تھا۔

أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ آپ ہم لوگوں کو اس خواب کا (جواب) یعنی تعبیر دیجئے کہ سات گائیں موٹی ہیں ان کو سات دبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات بالیں خشک ہیں اور خشک بالوں نے لپٹ کر ہری بالوں کو بھی خشک کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خواب بادشاہ نے دیکھا ہے اور آپ کے پاس بھیجا ہے اس کی تعبیر دیجئے۔

لَعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾ تاکہ میں ان لوگوں کے (یعنی بادشاہ اور اہل دربار کے) پاس لوٹ کر جاؤں (اور خواب کی تعبیر بتادوں) تاکہ ان کو علم ہو جائے۔

اس شخص نے لعلی یعنی شاید کلمہ شک کا استعمال کیا اور قطعی یقین کا لفظ نہیں کہا کیونکہ خواب ہی ایسا تھا کہ لوگ اس کی تعبیر سے عاجز ہو گئے تھے اور بادشاہ دہشت زدہ ہو گیا تھا گویا بڑا خوفناک خواب تھا نتیجہ پر پہنچنے کا یقین نہ تھا لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ کا مطلب یہ ہے کہ خواب کی تعبیر سن کر شاید لوگوں کو آپ کا مرتبہ معلوم ہو جائے اور وہ آپ کے کمال علمی کے معترف ہو جائیں۔ اس جگہ بھی لعل کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اس کو اس بات میں تردد تھا کہ لوگ سمجھ سکتے بھی ہیں یا نہیں۔ اہل فضل کے فضائل کو دیکھ کر بھی متنبہ ہوتے ہیں یا نہیں۔ حضرت یوسفؑ کے کمالات اور طہارت و عفت کو دیکھ کر بھی عزیز مصر نے آپ کی فضیلت کا اعتراف نہیں کیا اور جیل میں ڈال دیا۔

قَالَ یوسفؑ نے کہا سات موٹی گائیں اور سبز بالیں تو فراوانی اور کثرت پیداوار کے سات سال ہیں اور سات دبلی گائیں اور خشک بالیں قحط کے سات برس ہیں۔

تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا تم سات سال متواتر غلہ بونا۔ دَأَبًا معمول، عادت۔ بعض علماء کے نزدیک دأب سے مراد ہے انتہائی محنت اور کوشش۔ بعض اہل تفسیر نے کہا یہ جملہ اگرچہ خبریہ ہے مگر مقصود حکم دینا ہے (امر بصورت خبر بھی کبھی آتا ہے)۔

فَمَا حَصَدْتُمْ فَذَرُوهُ فِي سُنْبُلِهِ پھر جو (فصل) کاٹو اس کو بالیوں ہی میں رہنے دینا تاکہ گھن نہ لگ جائے۔

إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾ مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آئے (اس کو بالیوں سے نکال لینا) یعنی پیداوار کے سات سالوں میں جتنا غلہ کھانے میں صرف ہو وہ نکال لینا۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ

پھر اس کے بعد سات برس بہت سخت آئیں گے کہ جو تم نے ان کے لئے پہلے سے جمع کر رکھا ہو گا اس کو کھا جائیں گے یعنی ان سالوں میں لوگ پچھلا اندوختہ کھا جائیں گے خواب کے ساتھ تعبیر کو مطابق بنانے کے لئے کھانے کی نسبت قحط کے سالوں کی طرف کی ورنہ کھانے والے لوگ ہوتے ہیں سال نہیں کھایا کرتے۔

إِلَّا قَلِيلًا مِمَّا تُحْصِنُونَ ۝ مگر تھوڑا سا حصہ (کھانے سے محفوظ رکھا) جو بیج کے لئے تو بچا رکھو گے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيهِ يَعْصِرُونَ ۝ پھر اس کال کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہو گی اس میں لوگ پھلوں کے عرق نچوڑیں گے اور شرابیں بنائیں گے۔

یُغَاثُ غیث سے مشتق ہے غیث کا معنی بارش ہو گی یا غوث سے مشتق ہے غوث فریاد رسی یعنی لوگوں کی واویلا اور فریاد قبول کی جائے گی اور اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔ مترجم (یَعْصِرُوْنَ وہ نچوڑیں گے یعنی انگور زیتون طرح طرح کے پھل اور تِل (سرسوں اور دوسرے روغن دانے) نچوڑیں گے مطلب یہ کہ سرسبزی پیداوار اور آسائش کا سال ہو گا۔

ابو عبیدہ نے تُعْصَرُوْنَ بصیغۂ خطاب مجہول صیغہ پڑھا ہے اس کا مصدر عصر ہے جس کا معنی ہے نجات پانا یعنی تم تکلیف اور کال سے نجات پالو گے۔

حضرت یوسفؑ نے اول سات موٹی اور دبلی گایوں اور سات سبز اور سات خشک بالیوں کی مراد بیان کی اور دبلی گایوں کے موٹی گایوں کو کھا جانے اور خشک بالیوں کے سبز بالوں سے لپٹ کر ان کو بھی خشک کر دینے کا تعبیری مطلب بیان کیا پھر کال کے ختم ہونے اور فراخی کا سال آنے کی بشارت دی (بشارت کا تعلق اگرچہ خواب کی تعبیر سے نہ تھا مگر آپ نے بشارت اس لئے دی) کہ قحط کے سالوں کی تعداد پیداوار کے سالوں سے نہ بڑھ جائے۔ (اور اس طرح تعبیر میں غلطی نہ ہو جائے کیونکہ دبلی گایوں اور خشک بالوں کی تعداد بھی سات ہی تھی اگر پندرھواں سال بھی قحط کا ہوتا تو سات سے ایک عدد بڑھ جاتا) بیضاوی نے لکھا ہے شاید آپ کو پیداوار اور فراخی کا سال آنے کی اطلاع وحی سے ہو گئی ہو یا اپنی فراست ایمانی سے سمجھ لیا ہو کہ اللہ کی دستور اور ضابطہ یہی ہے کہ تنگی کے بعد فراخی عطا فرماتا ہے اور اس لئے کال کے بعد پیداوار کا سال ضرور آئے گا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ اور بادشاہ نے کہا میرے پاس اس کو لاؤ یعنی ساقی خواب کی تعبیر لے کر جب بادشاہ کے پاس پہنچا اور وہ سمجھ گیا کہ تعبیر یقیناً صحیح ہے اور ایسا ضرور ہو گا اور اس بات سے اس نے یوسفؑ کی بزرگی کا اندازہ کر لیا تو آپ کو بلوایا۔

فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ پس جب بادشاہ کا قاصد یوسفؑ کے پاس پہنچا اور اس نے کہا بادشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے تو حضرت نے اس وقت تک اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا جب تک آپ پر سے بدچلنی کی تہمت دور نہ ہو جائے اور سب لوگ آپ کی پاک دامنی کا اقرار نہ کر لیں۔

قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے ان کا کیا حال ہے یعنی تم کو بھی پتہ ہے کیا قصہ ہوا تھا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو اپنے اوپر سے تہمت کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ خصوصاً اگر پیشوا اور مقتدا ہو (تو اس کے لئے تو بہت ہی ضروری ہے کہ لوگوں کی تہمت سے اپنی براءت ثابت کرے۔ آپ نے عزیز کی بیوی کا نام لے کر ذکر نہیں کیا ایسا محض ادب اور احترام کے پیش نظر کیا ورنہ اصل مجرم تو وہی تھی۔

اسحاق بن راہویہ نے مسند میں اور طبرانی نے معجم میں نیز ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے اپنے بھائی یوسف کے صبر اور کرم پر تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس خواب کی تعبیر لینے کوئی پہنچا (اور انہوں نے تعبیر دے دی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک جیل خانے سے باہر نہ آجاتا تعبیر نہ دیتا اور ان کے صبر اور کرم پر مجھے (اس لئے بھی) تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس رہائی کا حکم لے کر کوئی پہنچا اور انہوں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور اپنا عذر بیان کر دیا اگر (میں ان کی جگہ) ہوتا تو فوراً دروازے کی طرف دوڑ پڑتا اگر ایک بات یوسف کے منہ سے نہ نکل جاتی تو وہ قید خانہ میں مزید سالوں کے لئے نہ رہتے انہوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں سے مصیبت دور کرنے کی خواہش کی۔

عبدالرزاق اور ابن جریر نے اپنی تفسیروں میں عکرمہ کی روایت سے مرسلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یوسف اور ان کے کرم و صبر پر تعجب ہے اللہ ان کو بخشے، جب ان سے موٹی اور دبلی گایوں کی تعبیر پوچھی گئی (تو انہوں نے بغیر شرط پیش کئے تعبیر دے دی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک قید سے باہر نکلنے کی شرط نہ کر لیتا تعبیر نہ بتاتا اور مجھے تعجب ہے کہ جب قاصد بادشاہ کا پیام طلب لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ مگر میں ان کی جگہ ہوتا اور اتنی مدت مجھے جیل خانے کے اندر رہنا پڑتا جتنی مدت وہ رہے تو میں فوراً طلب کو قبول کر لیتا اور آگے آگے دروازے پر پہنچ جاتا اور عذر معذرت کا طلب گار نہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ صاحب حلم اور بڑے بردبار تھے اصل حدیث۔ صحیحین میں مختصر آئی ہے۔

فائدہ :۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسف کے حال پر تعجب کیا اور فرمایا میں فوراً طلب کو قبول کر لیتا۔ حقیقت میں یہ قول آپ کے کمال نزول پر دلالت کر رہا ہے۔ (بہت سے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے کمال عروج تو حاصل تھا مگر کمال نزول کے مرتبے پر فائز تم ہی پیغمبر ہوئے ہیں جن میں سے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت رسول اللہ ﷺ کی ذوات گرامی کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ مترجم) کمال نزول پر ہی دین کی عمومی اشاعت و قبول اور تاثیر و تکمیل (اور متبعین کی کثرت) موقوف ہے۔ حضرت مجدد قدس سرہ نے اس بحث کی پوری تشریح اپنے مکتوبات میں کی ہے یہ انتہائی باریک نکتہ ہے کہ اکثر کاملین کی رسائی فہم سے بھی خارج ہے بالقصوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝ بلاشبہ میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہے جب کہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی مالکہ کا کہنا مان لو یا مجھے اپنی طرف بہکا کر مائل کرنا چاہا تھا۔ اس جملہ میں ان عورتوں کے مکر کی برائی کا اظہار کیا ہے اور علم الٰہی کو بطور شہادت پیش کیا ہے اور عورتوں کی تہمت سے اپنی پاک دامنی کا اظہار کیا ہے اور عورتوں کو ان کی مکاری پر انجام بد کی دھمکی بھی دی ہے۔ یہ سارا مضمون اس ایک فقرہ سے مترشح ہو رہا ہے یوسف کے پاس سے جواب لے کر قاصد بادشاہ کے پاس پہنچا اور بادشاہ نے ان عورتوں کو اور عزیز کی بیوی کو بلوایا اور

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ کہا تمہارا کیا واقعہ ہے جواب دو۔ خطب اس امر کو کہتے ہیں جس کا خطاب کیا جا سکے۔ یعنی صاحب واقعہ سے پوچھا جا سکے۔ بادشاہ نے سب عورتوں سے خطاب کیا، اس سے مراد یا تو صرف عزیز کی بیوی سے خطاب کرنا تھا یا سب عورتیں مخاطب تھیں کیونکہ سب نے یوسف کو مکر کے ساتھ اپنی طرف مائل کرنا چاہا سب نے زلیخا کا کہا ماننے کا مشورہ دیا تھا۔

اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ جب کہ یوسف کو تم نے پھسلایا تھا یعنی تم میں سے کسی نے یوسف کو اپنی طرف مائل ہونے پر یا جب کہ تم نے ان کو بہکانے کی سازش کی تھی۔

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ انہوں نے کہا پاکی ہے اللہ کے لئے اور تعجب ہے کہ اللہ نے یوسف کو کیسا پاک دامن پیدا کیا ہے۔

مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْۗءٍ ۭ ہم کو ان میں ذرا بھی تو برائی کی بات نہیں معلوم ہوئی۔ سوء سے مراد ہے گناہ اور خیانت۔ کہا گیا ہے کہ ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو سخت سست کہا یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ عزیز کی بیوی کو جب اندیشہ ہوا کہ یہ عورتیں میرے خلاف شہادت دیں گی تو اس نے خود اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

عزیز کی بیوی نے کہا اب تو حق بات سب پر ظاہر ہو گئی میں نے ہی اپنے مطلب کے لئے ان کو پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہی سچے ہیں۔ حَصْحَصَ ظاہر ہو گیا حصحص الشعر بال گر گئے اور جلد ظاہر ہو گئی۔ یا حصحص کا معنی ہے ثابت ہو گیا ٹھہر گیا حصحص البعیر اونٹ اپنی جگہ جم کر بیٹھ گیا۔ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ یعنی وہ اس بات میں سچے ہیں کہ میں نے ان کو پھسلایا تھا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝

یہ تھی۔ یعنی قاصد کو جواب دے دینا اس کے ساتھ نہ جانا میں نے اس لئے کیا کہ اس کو یعنی عزیز کو یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پس پشت اس کی غیر موجودگی میں اس کی آبرو میں کوئی خیانت نہیں کی اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

بالغیب پس پشت جب کہ میں اس کے اور وہ میرے سامنے موجود نہ تھا۔ یا غیب سے مراد ہے پوشیدہ مقام یعنی پردوں کے اندر۔ لَا يَهْدِيْ نافذ نہیں کرتا درست نہیں ہونے دیتا بلکہ حق کو ظاہر کر دیتا ہے خواہ کچھ مدت کے بعد ہی ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ خیانت کرنے والوں کو ان کے مکر کے سبب ہدایت نہیں کرتا۔ الخائنین اصل میں لَا يَهْدِيْ کا مفعول تھا مگر اس کی جگہ کید کو مفعول قرار دینے سے کلام میں زور پیدا ہو گیا۔ اس میں زلیخا کی خیانت کاری پر طنز اور اپنی امانت کی قوت کے ساتھ اظہار ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا۔

متعلق پوچھا گیا میں نے سچی بات تو کہہ دی اور میں خیانت سے اپنے نفس کو بالکل پاک نہیں کہتی کیونکہ اتنی خیانت میں نے ضرور کی کہ اس کو تہم کیا اور عزیز سے کہا مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ پھر میں نے ہی اس کو قید بھی کرا دیا۔ گویا اس قول سے اس نے اپنی پچھلی حرکت کا عذر پیش کرنا چاہا اور کہا نفس تو برائی کا راستہ بتانے والا ہے سوائے ان لوگوں کے جن پر میرا رب رحم کرے جیسے یوسف اور اس کی طرح دوسرے لوگ کہ اللہ نے اپنی رحمت سے اس کو گناہ سے بچا لیا۔

اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝　　بے شک میرا رب بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ نفس کے ارادے اور تصورات کے بخشنے والا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے گناہ سے محفوظ رکھتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جو گناہگار اس سے معافی طلب کرے اس کو معاف کر دیتا ہے اور طالب رحم و مغفرت پر رحم کرتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ　　اور بادشاہ نے اہل دربار سے کہا ان کو میرے پاس لے آؤ میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا۔

جب یوسف کی بے گناہی بادشاہ پر ظاہر ہو گئی اور آپ کے علم و امانت کا مرتبہ بھی اس کو معلوم ہو گیا تو اس نے یوسف کو طلب کیا اور کہا میں براہ راست اپنے لئے ان کو رکھنا چاہتا ہوں (یعنی عزیز مصر یا کسی اور کی ماتحتی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ مترجم) حسب الحکم قاصد آپ کے پاس پہنچا اور کہا چلئے بادشاہ نے طلب کیا۔ عبدالحکم نے فتوح مصر میں بطریق کلبی بوساطت ابوصالح حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قاصد نے یوسف کے پاس پہنچ کر گزارش کی اب قید خانہ کے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیجئے اور بادشاہ کے پاس چلئے۔ ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے فرید ثمی کی روایت سے بیان کیا کہ یوسف نے جب عزیز مصر کو دیکھا تو دعا کی الٰہی میں تجھ سے اس کی خیر کے بجائے تیری خیر کا طلب گار ہوں۔ اور اس کے شر سے تیرے غلبہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ بغوی کا بیان ہے آپ کھڑے ہو گئے اور قیدیوں کے لئے دعا کی اے اللہ نیکوں کے دلوں کو ان پر مہربان کر دے اور (شہر و ملک کی) خبریں ان پر پوشیدہ نہ کر یہی وجہ ہے کہ ہر شہر کی خبروں سے وہاں کے قیدی بہت زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ قید خانہ سے نکلے تو قید خانہ کے دروازہ پر یہ بات لکھ دی یہ زندوں کا قبرستان ہے غموں کا گھر ہے دوستوں کی آزمائش اور دشمنوں کی خوشی کا مقام ہے۔ پھر آپ نے قید خانہ کا میل کچیل دھویا، بدن صاف پاک کیا اور خوبصورت کپڑے پہن کر بادشاہ کے پاس جانے کے ارادے سے چل دیئے۔

وہب نے بیان کیا جب شاہی دروازے پر پہنچے تو فرمایا میرا رب میرے لئے کافی ہے دنیا سے بے نیاز کرنے والا ہے میرا رب میرے لئے کافی ہے اپنی مخلوق سے بے احتیاج کر دینے والا ہے اس کی پناہ لینے والا غالب رہتا ہے اس کی ثنا بزرگ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد گھر کے اندر داخل ہوئے اور بادشاہ کے سامنے پہنچے تو دعا کی اے اللہ میں اس کی خیر کی بجائے تیری خیر کا تجھ سے طالب ہوں اور اس کے اور دوسروں کے شر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں۔ بادشاہ نے جب آپ کی طرف دیکھا تو آپ نے اس کو عربی میں سلام کیا۔ بادشاہ نے کہا یہ کیا زبان ہے، فرمایا میرے چچا اسمٰعیل کی زبان ہے۔ پھر آپ نے بادشاہ کو عبرانی زبان میں دعا دی۔ بادشاہ نے پوچھا یہ کونسی زبان ہے فرمایا یہ میرے باپ دادا کی زبان ہے۔ بادشاہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف تھا اگرچہ ستر زبانوں میں گفتگو کر سکتا تھا جس زبان میں بات کرتا تھا آپ اسی زبان میں جواب دیتے تھے۔ مگر عبرانی اور عربی صرف یہ دو زبانیں نہ جانتا تھا۔ بادشاہ واقف نہ تھا۔ حضرت یوسفؑ کی اس وقت عمر تیس سال کی تھی اس نوجوانی میں آپ کی یہ کمال لیاقت دیکھ کر متحیر ہو گیا اور اپنے قریب بٹھایا۔

فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ۝　　جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں تو ان سے کہا کہ آپ ہمارے نزدیک آج سے بڑے معزز اور معتبر ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے بادشاہ نے حضرت یوسف سے کہا میں اپنا خواب آپ کے منہ سے اپنے سامنے سننا چاہتا ہوں فرمایا بہت اچھا۔ اے بادشاہ آپ نے خواب میں دیکھا سات سفید رنگ کی خوبصورت گائیں نیل میں سے برآمد ہوئیں اور ساحل نیل سے نکل کر آپ کے سامنے آگئیں ان کے تھن دودھ سے بھرے

ہوئے تھے اس کے بعد نیل کی کیچڑ سے سات دبلی گائیں برآمد ہوئیں جو بھوکی تھیں ان کے پیٹ لگے ہوئے تھے ان کے پاس نہ دودھ تھا نہ تھن ان کی داڑھیں تھیں اور کیلے (جیسے نوکیلے دانت) تھے اور کتوں کے پنجوں کی طرح پنجے تھے اور درندوں کی ناک کی طرح ان کی ناکیں تھیں درندوں کی طرح انہوں نے موٹی گایوں کو چیر پھاڑ ڈالا، کھال کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گوشت کھا لیا، ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا اور مینگی کو چوس لیا۔ آپ یہ منظر دیکھ کر تعجب ہی کر رہے تھے کہ ایک ہی جڑ سے اناج کی سات سبز بالیں اور سات سیاہ (خشک) بالیں نمودار ہوئیں جڑ کے سوتے سب کے کیچڑ اور پانی کے اندر تھے آپ یہ تماشا دیکھ رہے تھے اور تعجب کر رہے تھے کہ جب جڑ ایک ہے اور سوتے سب کے پانی میں ہیں تو یہ سبز خوشہ دار اور یہ سوکھی سیاہ بالیں کہاں سے پیدا ہو گئیں۔ یکایک ایک ہوا چلی جس کی وجہ سے خشک بالیوں کے پتے جھڑ کر سبز خوشہ دار بالیوں پر گرے اور سبز بالیوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر سیاہ ہو گئیں یہ خواب دیکھ کر آپ بیدار ہو گئے اور دہشت زدہ ہو گئے۔ بادشاہ نے کہا خدا کی قسم یہ خواب اگرچہ عجیب تھا مگر اس کی تعجب آفرینی اس بیان سے زیادہ نہیں جو میں نے آپ سے سنا۔ اے سچے انسان اب اس خواب کے متعلق آپ کیا مشورہ دیتے ہیں، آپ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ان پیداوار کے سالوں میں آپ کاشت بہت زیادہ کرائیں اور پیدا شدہ غلہ کو مع ان کے درختوں اور بالیوں کے ذخیرہ کر لیں تاکہ (قحط کے سالوں میں) درخت اور بالیں (یعنی سب کا بھوسہ) جانوروں کی خوراک بن جائے اور لوگوں کو آپ یہ بھی حکم دے دیں کہ وہ اپنے غلہ کا پانچواں حصہ اٹھا کر الگ رکھ دیا کریں (اور اس طرح ہر سال کی پیداوار کا پانچواں حصہ ان کے پاس جمع ہو جائے) جو غلہ آپ اسٹاک کر لیں گے وہ تو مصر اور اطراف مصر کے لئے کافی ہو جائے گا اور جب دور کے اطراف سے لوگ آپ کے پاس غلہ کی طلب میں آئیں گے تو آپ کے پاس ان سے وصول کیا ہوا روپیہ اتنا جمع ہو جائے گا کہ آپ سے پہلے مصر کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس جمع نہ ہوا ہو گا۔ بادشاہ نے کہا اس کام کی سرانجام دہی کون کرے گا کون غلہ جمع کرے گا کون فروخت کرے گا یہ دھندا میری طرف سے کون کرے گا۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝ یوسفؑ نے کہا مجھے ملک (مصر) کی پیداوار اور مال پر مقرر کر دو میں اس کام کی بخوبی نگہداشت کرنے والا اور جاننے والا ہوں۔ حضرت یوسفؑ نے اپنی امانت داری اور کارگزاری کا خود اظہار کیا اور خود عہدہ طلب کیا تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے احکام مخلوق میں جاری کر سکیں، حق کو قائم کریں اور عدل کو دنیا میں پھیلائیں یہ اسی کام کے لئے انبیاء آتے ہیں اور ان کی بعثت کی غرض یہی ہوتی ہے آپ کو معلوم تھا کہ میرے سوا اور کوئی اس کام کو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، پس آپ نے عہدۂ حکومت کی طلب خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کی تھی جاہ و اقتدار کی طلب نہ تھی، خلفاء راشدین کی خلافت کا مقصد بھی یہی تھا اور حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ سے جھگڑا بھی اسی بنیاد پر تھا کیونکہ آپ اس کام کے زیادہ اہل تھے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں آپ کو اپنے نفس پر زیادہ قابو تھا اور احکام الٰہی کو جاری کرنے کی صلاحیت آپ میں حضرت معاویہؓ سے زیادہ تھی۔

بیضاوی نے کہا طلب عہدہ کی شاید یہ وجہ ہو کہ آپ نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ بادشاہ مجھے کوئی کام سپرد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے آپ نے عہدہ کی تعیین کر دی اور ایسے کام کی ذمہ داری طلب کی جس میں نفع عمومی تھا اور سب لوگ اس سے مستفید ہو سکتے تھے۔

اس آیت سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ اگر انسان کو اپنی ذات پر اطمینان اور بھروسہ ہو تو حکومت کا کوئی عہدہ اور قضاء کی طلب جائز ہے اور اپنی اہلیت کو ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بات بھی نکلتی ہے کہ بادشاہ کافر ہو یا ظالم اس کی طرف سے کسی کام پر مامور ہونا (بشرطیکہ وہ کام اللہ ہی کے احکام کے مطابق کر سکتا ہو اور بادشاہ کی طرف سے مانع نہ ہو) جائز ہے، ظالموں اور فاسقوں کی طرف سے جلیل القدر محترم اسلاف نے عہدۂ قضاء کی خدمات اسی غرض سے قبول کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ (حاکم یوسفؑ نہ تھے صرف مشیر تھے) بادشاہ آپ سے مشورہ لے کر خود حکم جاری کرتا تھا اور آپ کی رائے میں دخل نہ دیتا تھا، گویا اجراء احکام میں آپ کا حکم تھا۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے اگر وہ اِجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو بادشاہ ان کو فوراً حاکم بنا دیتا مگر اس لفظ کو کہنے کی وجہ سے بادشاہ نے دو سال ٹال دیا اس مدت میں یوسف بادشاہ کے پاس اس کے گھر میں رہتے رہے۔

بغوی نے دوسری سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جس روز حضرت یوسفؑ نے درخواست حکومت کی تھی اس دن سے جب ایک سال کی مدت گزر گئی تو بادشاہ نے آپ کو بلا کر تاج پہنایا اور شاہی تلوار باندھی اور جواہر سے جڑا ہوا تخت آپ کے لئے بچھوایا اور تخت کے گرد ریشمی پردہ لٹکا دیا تخت تیس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا تھا اس پر دس بستر بچھے ہوئے تھے اور ساٹھ بار یک پردے تھے پھر تاج پہن کر آپ کو برآمد ہونے کا حکم دیا۔ آپ سر پر تاج رکھے برآمد ہوئے برف کی طرح آپ کا رنگ گورا اور چاند کی طرح روشن تھا بدن کی صفائی کی وجہ سے چہرے کا رنگ (یعنی عکس) بدن پر نظر آتا تھا آپ اس شان کے ساتھ جا کر تخت پر بیٹھ گئے۔ تمام حکام آپ کے فرماں بردار ہو گئے بادشاہ مصر کی پوری حکومت آپ کو سپرد کر کے اپنے گھر میں چلا گیا۔ بادشاہ نے قطفیر کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا اور یوسفؑ کو اس کی جگہ مقرر کر دیا۔ یہ قول ابن اسحاق کا ہے۔

ابن زید کا بیان ہے کہ ریان شاہ مصر کے پاس خزانے بہت تھے تمام خزانے اس نے یوسفؑ کے تصرف میں دے دیئے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحاق کی روایت سے بیان کیا ہے اور روایت میں ذکر کیا ہے کہ انہی دنوں میں قطفیر کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ نے اس کی بیوی زلیخا سے یوسفؑ کا نکاح کرا دیا۔ نکاح کے بعد یوسفؑ زلیخا کے پاس پہنچے تو ان سے فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں زلیخا نے جواب دیا اے صدیق! مجھے آپ ملامت نہ کریں آپ کو معلوم ہے کہ میں خوبصورتی میں ایک ہی عورت تھی اور یہ بھی جانتے ہی ہیں کہ حکومت اور دنیا کے لحاظ سے میں کتنے عیش میں تھی اور میرا شوہر عورتوں کے قابل نہ تھا اور آپ کے حسن و صورت کی جو حالت تھی وہ بھی خداداد تھی اس لئے آپ کو دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اہل روایت کا خیال ہے کہ یوسفؑ نے زلیخا کو دوشیزہ پایا۔ زلیخا کے بطن سے آپ کے دو لڑکے پیدا ہوئے افرائیم اور میشا۔

غرض مصر کی حکومت یوسفؑ کے لئے مستقل ہو گئی آپ وہیں مقیم ہو گئے۔ مرد اور عورت سب آپ کو پسند کرتے تھے آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ اور ہم نے ایسے عجیب طور سے یوسفؑ کو اس سرزمین میں جما دیا عطا کر دیا کہ وہاں جس جگہ چاہیں رہیں۔ یعنی بادشاہ کی مجلس میں جس طرح ہم نے یوسفؑ کو جگہ دی تھی اسی طرح سرزمین مصر میں ہر جگہ اس کو رہنے کا اختیار دیا۔ جہاں چاہے رہ سکتا تھا۔

نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نعمت عطا کرتے ہیں اور نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

" رحمت " سے مراد ہے نعمت دنیا جس کا مزہ فوراً یا کچھ مدت کے بعد ملنے والا اچھا ہے۔ الْمُحْسِنِيْنَ سے حضرت ابن عباسؓ اور وہب کے نزدیک صبر کرنے والے مراد ہیں۔ مجاہد وغیرہ نے کہا حضرت یوسفؑ برابر بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے آخر بادشاہ مسلمان ہو گیا اور بہت سے لوگ بھی مشرف باسلام ہو گئے اسی طرح حضرت یوسفؑ کو دینی اجر مل گیا۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ اور یقیناً ثواب آخرت دنیوی اجر سے ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو ایمان لائے اور نافرمانی سے بچتے رہے۔

جب حضرت یوسفؑ اطمینان کے ساتھ حکومت پر جم گئے تو انہوں نے غلہ جمع کرنے کی تدبیر کی بڑی بڑی حفاظت گاہیں اور غلہ رکھنے کے گھر بنوائے اور قحط سالی کے لئے وہاں غلہ جمع کیا اور معمول کے مطابق بقدر ضرورت خرچ بھی کیا یہاں تک کہ پیداوار کی کثرت کے سات سال گزر گئے اور قحط سالی کا دور آ گیا اور ایسا ہولناک قحط پڑا جس کی نظیر کبھی سننے میں آئی نہ دیکھنے میں۔

روایت میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ اور بادشاہ کے مصاحبین کے لئے ہر روز صرف ایک بار دوپہر کے وقت کھانا مقرر کیا تھا قحط سالی کے دور میں سب سے پہلے آدھی رات کے وقت بادشاہ ہی کو بھوک نے ستایا اور وہ بھوک بھوک کہہ کر چلا

انہی حضرت یوسفؑ نے قحط پڑنے کے سال کا زمانہ ہے۔ کال کے دنوں سال پہلے کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا اور لوگ یوسفؑ سے غلہ خریدنے لگے حضرت نے نقد روپے پیسے کے عوض غلہ دیا اس طرح مصر کا سارا نقد اور روپیہ پیسہ آپ کے پاس آ گیا، دوسرے سال زیور اور جواہر لے کر غلہ فروخت کیا، تیسرے سال چوپائے اور مویشی دے کر لوگوں نے غلہ لیا، چوتھے سال غلام و باندیاں دے کر غلہ حاصل کیا، پانچویں سال جائیدادیں، زمینیں اور مکانات بھی غلے کے عوض بیچ ڈالے، چھٹے سال بچے فروخت کر دیئے ساتویں سال خود اپنی جانوں کا سودا کر دیا یہاں تک کہ نقد مال، زیور، جانور، جائیداد، غلام سب یوسفؑ کا ہو گیا اہل مصر کی کوئی چیز نہیں رہی اور آخر میں خود آزاد بھی نہیں رہے بلکہ ہر شخص یوسفؑ کا غلام ہو گیا۔

میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہو تو شاید شریعت یوسفی میں جائز ہو کہ کوئی شخص اپنی جان و اولاد کو فروخت کر دے یا خود کو غلام بنا لے تو آپ کی شریعت میں جائز ہی تھا۔ بعض علماء نے فتویٰ بھی دیا ہے کہ فاقہ کی وجہ سے مرنے کے خطرے سے آدمی اپنی جان اور اپنی اولاد کو بھی فروخت کر سکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

غرض یہ حالت دیکھ کر مصری بول اٹھے کہ ایسا عالی قدر بادشاہ کبھی کسی کا نہیں ہوا جو ساری رعایا کے جان و مال اور اولاد کا مالک ہو گیا ہو۔ یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا اب آپ کی کیا رائے ہے بادشاہ نے کہا جو آپ کی رائے وہی میری رائے ہے ہم تو آپ کے تابع ہیں حضرت نے فرمایا تو میں اللہ کو اور آپ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تمام اہل مصر کو میں نے آزاد کر دیا ان کی ساری املاک (زر و زیور مویشی جائیداد) ان کو واپس کر دیں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت قحط کے زمانے میں خود بھی بھوکے رہتے تھے لوگوں نے کہا سارا غلہ ملک مصر کا تو آپ کے قبضے میں ہے اور آپ بھوکے رہتے ہیں فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میرا پیٹ بھرا ہو گا تو میں بھوکے کو بھول جاؤں گا۔ بادشاہ کے باورچیوں کو بھی آپ نے حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ کے لئے صرف دوپہر کو ہی کھانا تیار کریں تاکہ پیٹ بھرنے کے بعد بادشاہ بھوکوں کو بھول نہ جائے۔ اسی لئے بادشاہ ناشتہ دوپہر کو کرتے تھے دن بھر صبح سے دوپہر تک بھوکے رہتے اور بھوکوں کو بھولتے نہیں تھے۔

اہل مصر کے علاوہ چاروں طرف سے لوگ حضرت یوسفؑ کے پاس غلہ لینے آتے تھے مگر آپ کسی کو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہو ایک شتر سے زیادہ غلہ نہیں دیتے تھے تاکہ تھوڑا تھوڑا سب لوگوں کو پہنچ جائے۔ لوگوں کے آپ کے پاس قحط میں آتے رہتے تھے اور آپ سب کو دیتے تھے۔ کنعان اور شام کے باشندے بھی قحط میں مبتلا ہو گئے کوئی ملک ایسا نہ تھا جو قحط زدہ نہیں رہا۔ حضرت یعقوبؑ اور آپ کے اہل و عیال مقام عربات علاقہ فلسطین سرحد شام میں رہتے تھے یہاں لوگوں کی زندگی صحرائی زندگی تھی اونٹ اور بکریاں پالتے تھے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے کے لئے مصر بھیجا اور فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کا بادشاہ نیک صالح ہے لوگوں کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا ہے۔ تم بھی تیار ہو جاؤ اور مصر جا کر غلہ لاؤ آپ نے یوسفؑ کے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روک لیا اور دوسرے بیٹوں کو روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا۔

وَجَاءَ إِخْوَةُ يُوسُفَ فَدَخَلُوا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهُ مُنكِرُونَ ۝

اور یوسفؑ کے بھائی آئے اور یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا اور وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔ یعنی دس بھائی یوسفؑ کے پاس پہنچے۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد نے فرمایا حضرت یوسفؑ نے پہلی ہی نظر میں بھائیوں کو پہچان لیا۔ حسن نے کہا اولین نظر میں نہیں پہچانا جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو پہچانا۔

حضرت ابن عباسؓ نے بھائیوں کے یوسفؑ کو نہ پہچاننے کی یہ وجہ بیان کی کہ کنوئیں میں ڈالنے اور اب سامنے آنے کے درمیان چالیس برس کی مدت گذر گئی تھی۔ طول زمانہ شناخت سے مانع ہوا۔ عطاء نے کہا حضرت یوسفؑ اس وقت شاہانہ تاج پہنے شاہی تخت پر رونق افروز تھے اس لئے بھائی نہ پہچان سکے۔ بعض نے کہا اس وقت آپ شاہی ریشمی لباس پہنے تھے اور گردن میں سونے کا ہار تھا۔

میں کہتا ہوں اس قول کی بنیاد اس مسئلہ پر ہو سکتی ہے کہ شریعت یوسفی میں مرد کے لئے سونے اور ریشمی لباس کا پہننا

درست تھا۔

حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو دیکھا تو انہوں نے عبرانی زبان میں کلام کیا آپ نے فرمایا مجھے بتاؤ تم کون لوگ ہو اور تمہارا کیا کام ہے میں تم کو نہیں جانتا بھائیوں نے کہا ہم ملک شام کے چرواہے ہیں، قحط کی تکلیف میں مبتلا ہو کر آپ کے پاس غلہ لینے آئے ہیں حضرت نے فرمایا شاید آپ لوگ ہمارے ملک میں یہاں کے احوال کی جستجو میں آئے ہیں، کہنے لگے خدا کی قسم ہم جاسوس نہیں ہیں سب ایک باپ کی اولاد ہیں ہمارا باپ بڑا صادق ہے اس کو اللہ کے پیغمبروں میں شمار کیا جاتا ہے حضرت یوسف نے کہا آپ لوگ کتنے ہیں بولے ہم بارہ بھائی تھے، ہمارا ایک بھائی جاتا رہا وہ ہم سب میں چھوٹا تھا، جنگل کو گیا تھا وہاں مر گیا۔ باپ کی نظر میں وہ سب سے پیارا تھا آپ نے پوچھا یہاں تم کتنے ہو، بولے دس ہیں فرمایا ایک اور کہاں ہے بولے باپ کے پاس رہ گیا ہے جب سے اس کا ماں جایا بھائی مرا ہے باپ کو اسی سے تسکین خاطر ہوتی ہے، فرمایا کون جانے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ بھی ہے یا نہیں کہنے لگے بادشاہ سلامت ہم تو اجنبی ملک میں ہیں یہاں تو ہم کو جاننے والا کوئی نہیں ہے آخر حضرت یوسفؑ نے ہر ایک کو ان کی تعداد کے مطابق ایک ایک اونٹ غلے کا دے دیا اور سب کا سامان سفر درست کرا دیا۔ جہاز تھسامان سفر کو کہتے ہیں۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَكُمْ مِنْ أَبِيكُمْ ۚ اور جب ان کا سامان سفر درست کرا دیا تو یوسفؑ نے ان سے کہا (اب کی مرتبہ) اپنے علاتی بھائی کو میرے پاس لے کر آنا اگر تم سچے ہو۔ اگر تم اپنے بھائی کو لے آؤ گے تو ایک بار شتر میں تم کو اور دوں گا اور تمہاری عزت بڑھ جائے گی۔

أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ﴿٥٩﴾ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں غلہ کا ناپ پورا دیتا ہوں (کسی کو کم نہیں دیتا) اور میں بہترین میزبان ہوں، مجاہد نے کہا یعنی تمہاری مہمانی اچھی طرح کرتا ہوں۔

فَإِنْ لَمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾ اور تم اس کو میرے پاس لے کر نہ آئے تو میرے پاس نہ آنا تم کو ایک ناپ غلہ بھی میرے پاس سے نہیں ملے گا اور میرے ملک میں بھی داخل نہ ہونا۔

لا تقربون یا نہی کا صیغہ ہے یا نفی ہے جس کا عطف جزا پر ہے (میرے پاس نہ آنا یا قریب بھی نہ آؤ گے)۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾ بولے اس کی طرف سے باپ کو پھسلانے کی ہم کوئی تدبیر ضرور کریں گے اور (جو کچھ آپ نے حکم دیا اس کی) بلاشبہ تعمیل کریں گے۔ یعنی اس کی جدائی کا غم باپ کو ضرور ہو گا مگر ہم کوئی چال چلیں گے اور باپ کے پاس سے لانے کی کوئی تدبیر کریں گے اور اس کی طرف سے باپ کو پھسلائیں گے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا تو اپنے میں سے کسی بھائی کو میرے پاس بطور ضمانت چھوڑ جاؤ کہ اس کو لا سکو یہ سن کر بھائیوں نے آپس میں قرعہ اندازی کی قرعہ میں شمعون کا نام نکل آیا شمعون وہی شخص تھا جس کی یوسفؑ کے متعلق سب بھائیوں سے زیادہ اچھی رائے تھی (اور اسی نے مشورہ دیا تھا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو) چنانچہ شمعون کو یوسفؑ کے پاس چھوڑ دیا باقی سب چلے گئے۔

وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾

اور یوسفؑ نے اپنے (غلہ ناپنے والے) خادموں سے کہا ان کا سرمایہ (یعنی غلہ کی قیمت جو انہوں نے دی ہے) انہیں کے سامان میں (رکھ) دو کہ گھر لوٹ کر جب وہ (لوٹایا ہوا) سرمایہ دیکھیں گے تو واپسی کا حق پہچان کر امید ہے لوٹ آئیں گے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ ان کا سرمایہ جو انہوں نے غلہ کی قیمت میں دیا تھا جوتے اور کھالیں تھیں بعض نے کہا کہ آنکھوں کی قسم کے ستو تھے۔ اول قول حسب رائے بغوی زیادہ صحیح ہے۔

بعض علماء نے کہا کہ حضرت یوسفؑ نے تکمیل احسان اور اتمام نوازش کے جذبہ کے زیر اثر بھائیوں کا سامان واپس رکھوا دیا تھا کہ وہ جان لیں کہ بادشاہ کی ہم پر بڑی عنایت ہے کہ اس نے سامان بھی واپس کر دیا اور اسی خیال کے تحت دوبارہ مصر کو لوٹ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسفؑ نے باپ اور بھائیوں سے غلہ کی قیمت وصول کرنا اچھا نہ سمجھا اور ایسی حالت میں کہ باپ

بھائی محتاج تھے۔ قیمت لینے کو کمینہ پن خیال کیا۔ کلبی نے کہا یوسف کو اندیشہ ہوا کہ کہیں باپ کے پاس اور روپیہ نہ ہو اور روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ لوٹ کر نہ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسف کو معلوم تھا کہ یہ لطف و لوگ ہیں ان کی دیانت ان کو آمادہ کرے گی کہ یہ سرمایہ لوٹا کر لائیں یہ اس پونجی کو اپنے لئے حلال نہ سمجھیں گے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا جب لوٹ کر باپ کے پاس پہنچے تو بولے اباہم ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے کہ اس نے ہماری بڑی مہمانی کی اور ایسی عزت کی کہ اگر نسل یعقوبؑ کا بھی کوئی آدمی ہوتا تو ہماری اتنی عزت نہ کرتا۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ بات سن کر فرمایا جب تم شاہ مصر کے پاس لوٹ کر جاؤ تو اس سے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ آپ نے جو ہمارے ساتھ احسان کیا ہے اس کے عوض ہم آپ کے لئے دعا کرتے ہیں اللہ آپ پر رحمت نازل فرمائے پھر فرمایا شمعون کہاں ہے۔ بیٹوں نے جواب دیا اس کو شاہ مصر نے بطور ضمانت اپنے پاس روک لیا ہے اس کے بعد پورا قصہ بیان کر دیا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اس کو یہ بات بتائی تھی کیوں۔ بیٹوں نے جواب دیا اس نے ہم سے عبرانی زبان میں گفتگو کی اور کہا تم جاسوس ہو اور پورا قصہ بیان کر کے کہا۔

يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ ہم کو غلہ دینے کی ممانعت کر دی گئی ہے یعنی اگر ہم بنیامین کو لے کر نہ جائیں گے تو آئندہ ہم کو غلہ نہیں ملے گا۔ کَیْل (ناپ۔ پیمانہ) سے مراد ہے غلہ۔ کذا قال الحسن۔ بعض اہل تفسیر نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ شاہ مصر نے ہم میں سے ہر ایک کے نام پر تو غلہ دے دیا اور بنیامین کے نام کا غلہ نہیں دیا۔

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ لہٰذا آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں تاکہ ہم کو غلہ مل جائے (اور کوئی ممانعت نہ رہے) یا یہ مطلب ہے کہ اس کے حصہ کا غلہ بھی مل جائے اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔ کوئی تکلیف اور دکھ نہ ہونے دیں گے۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ (یعقوبؑ نے) کہا کیا میں اس کے بارہ میں تمہارا ویسا ہی اعتبار کر لوں جیسا اس کے بھائی کے بارے میں اس سے پہلے کیا تھا (تم کیا حفاظت کرو گے) اللہ ہی سب سے بڑھ کر محافظ ہے اور وہی سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے امید ہے کہ اللہ اس کی حفاظت کرے گا اور مجھ پر رحم فرمائے گا۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنا سرمایہ (یعنی وہ سرمایہ جو غلہ کی قیمت میں انہوں نے شاہ مصر کو دیا تھا) اس کے اندر پایا جو ان کو واپس کر دیا گیا تھا۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ کہنے لگے ابا (دیکھئے) اور ہم کو کیا چاہئے...... یعنی اس سے بڑھ کر اور کیا احسان ہوگا کہ شاہ مصر نے ہماری مہمان نوازی کی خاطر و مدارات کی اچھی طرح سے رکھا پھر غلہ ہمارے ہاتھ فروخت کیا اور پھر ہماری دی ہوئی قیمت بھی ہم کو لوٹا دی۔

یا یہ مطلب ہے کہ اس سے بڑھ کر ہم جھوٹ کے طالب نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ کے احسان کے متعلق کلام کرنے میں ہم اور کیا چیز طلب کریں۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے بیان میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے ہماری سچائی کی دلیل آپ کے سامنے آ گئی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہم مزید سرمایہ آپ سے طلب نہیں کرتے۔

هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ یہ ہمارا سرمایہ موجود ہے جو ہم کو لوٹا دیا گیا ہے۔

وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ اور اپنے گھر والوں کے واسطے رسد لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک بار شتر غلہ زیادہ لائیں گے...... ضمیر کا عطف فعل محذوف پر ہے یعنی ہمارا یہ سامان واپس کر دیا گیا تاکہ ہم اس سے قوت حاصل کریں اور گھر والوں کے لئے رسد خریدنے کے واسطے بادشاہ کے پاس لوٹ کر جائیں اور وہاں سے غلہ لائیں۔ اس صورت میں مَا نَبْغِيْ میں مَا استفہامیہ ہوگا۔

مَارَ يَمِيْرُ مَيْرًا (مجرد) اِمْتَارَ يَمْتَارُ اِمْتِيَارًا (ثلاثی مزید باب افتعال) دوسرے شہر سے غلہ لے کر آیا۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ اس کا عطف مَا نَبْغِیْ پر ہو اور مَا نافیہ ہو یعنی ہم اور کسی چیز کے طلبگار نہیں اور گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے۔

وَنَحْفَظُ اَخَانَا یعنی آمد و رفت میں ہر خطرہ سے اس کی حفاظت کریں گے وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ یعنی اس کے حصہ کا ایک بار شتر غلہ ہم مزید حاصل کریں گے فی کس ایک اونٹ غلہ ملتا تھا۔

ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ۝ یہ غلہ (جو ہم لائے ہیں) تھوڑا ہے گھر والوں کے لئے کافی نہیں۔ یا یہ (مزید) غلہ آسان ہے بادشاہ سخی ہے اس کو کوئی دشواری نہیں اس سے ملنے میں دشواری ہے۔

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ

(یعقوبؑ نے) کہا میں کو اس وقت تک ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک اللہ کی قسم کھا کر مجھے پکا عہد نہ دو گے کہ تم اس کو ضرور میرے پاس لے ہی آؤ گے ہاں اگر کہیں گھیر ہی جاؤ تو مجبوری ہے۔

مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی ایسا عہد جس کو اللہ کی قسم کھا کر پختہ کیا گیا ہو یا اس پر اللہ کو گواہ بنایا گیا ہو۔

اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ کا مطلب مجاہد نے بیان کیا مگر یہ کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ۔ قتادہ نے کہا مگر یہ کہ تم بے بس اور مغلوب ہو جاؤ اور تم میں حفاظت کی طاقت ہی نہ رہے۔

یہ استثناء مفرغ ہے یعنی ہر حال میں تم اس کی حفاظت کرو گے ہاں اگر ایسی حالت ہو جائے کہ تم بے بس ہو جاؤ یا یہ مطلب ہے کہ اس کو واپس لانے سے کسی وجہ سے تم باز نہ رہو گے مگر یہ کہ تم مغلوب ہو جاؤ۔

فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ پس جب انہوں نے باپ کو مضبوط عہد دے دیا، کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا اللہ رب محمد کی قسم۔ غرض یہ کہ انہوں نے جب انتہائی کوشش کی اور قسمیں کھالیں اور بنیامین کو بھیجے بغیر حضرت یعقوبؑ کو کوئی چارہ نہ رہا تو

قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ۝ (یعقوبؑ نے) کہا جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ گواہ (یا نگراں) ہے۔ کعب نے کہا جب حضرت یعقوبؑ نے فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا کہا تو اللہ نے فرمایا اپنی عزت کی قسم تو نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے تو میں دونوں کو لوٹا کر تیرے پاس پہنچا دوں گا۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ

(بیٹے جب حضرت یعقوبؑ کے پاس سے جانے لگے تو) یعقوبؑ نے کہا میرے بیٹو! شہر کے ایک دروازے سے یعنی ساتھ ساتھ داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازے سے گھسنا۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے بڑے حسین و جمیل، سرو قامت، گل رخسار، صحت مند اور طاقت ور جوان تھے اور شاہ مصر کے نزدیک ان کی عزت زبان زد خلائق تھی اس وجہ سے حضرت یعقوب کو خیال ہوا کہ کہیں (اجتماعی) حالت میں داخل ہوتے دیکھ کر کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ حدیث میں آیا ہے نظر حق ہے۔ نظر لگنے کے متعلق جو احادیث آئی ہیں۔ سورۂ نون کی آیت وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ الخ کی تفسیر میں ہم نے ذکر کر دی ہیں۔

پہلی مرتبہ روانگی کے وقت حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کو یہ نصیحت نہیں کی تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت ان سے کوئی مصر میں واقف نہ تھا پھر بنیامین بھی ان کے ساتھ نہ تھا اور اس مرتبہ (کوئی چیز پاس نہیں رہا تھا) بنیامین بھی ہمراہ جا رہا تھا۔ ابراہیم نخعی نے کہا کہ یوسفؑ کے سامنے جدا جدا جانا مقصود تھا۔ اول تشریح زیادہ صحیح ہے۔

وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اور میں اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی بات کو بھی اس کے مقابلہ میں دفع نہیں کر سکتا۔ یعنی جو ہونے والی چیز ہے وہ ہو کر رہے گی اللہ کا جو حکم ہو چکا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احتیاط تقدیر سے نہیں بچاتی۔ رواہ الحاکم امام احمد نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے اور بزار نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے اللہ کے سوا اور کسی کا حکم نہیں چلتا۔ جو حکم خدا ہو چکا ہے وہ ہر تم

کو بیٹے کو اس کے مقابلہ میں کوئی چیز تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی اس سے آگے حضرت یعقوبؑ نے اللہ ہی پر اپنے اعتماد و توکل کا اظہار کیا اور فرمایا

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ کرنے والوں کو توکل کرنا چاہئے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُم مَّا كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا اور جب وہ (مصر پہنچ کر شہر کے اندر) اس طور پر داخل ہوئے جس طرح باپ نے ان کو حکم دیا تھا تو باپ (واقعہ) اس چیز کو بالکل دفع نہ کر سکتا تھا جو اللہ کی طرف سے آنے والی تھی مگر یعقوبؑ کے دل میں خواہش تھی جس کو انہوں نے پورا کر لیا (اور ہمارے سکھا دینے کی وجہ سے وہ تھے بلاشبہ جاننے والے۔ اسی لئے انہوں نے وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ کہہ دیا تھا لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے) روایت میں آیا ہے کہ شہر کے چار دروازے تھے چاروں دروازوں سے یہ لوگ داخل ہوئے تھے۔ مَا كَانَ يُغْنِي یعنی دفع نہیں کر سکتے۔ یعنی اللہ کے طے شدہ فیصلے سے کچھ بھی۔ چنانچہ بنیامین پکڑے گئے اور حضرت یعقوبؑ پر دوہری مصیبت پڑ گئی إِلَّا حَاجَةً یعنی یہ فقط یعقوبؑ کا ارمان تھا اللہ شفقت پدرانہ تھی کہ کہیں ان کو نظر نہ لگ جائے۔ قَضَاهَا یعنی اپنی خواہش کو یعقوبؑ نے ظاہر کر دیا اور بیٹوں کو نصیحت کر دی۔

وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ اور وہ بلاشبہ جاننے والے تھے ہمارے سکھا دینے کی وجہ سے۔ تعلیم دینے سے مراد ہے وحی کے ذریعہ سے واقف بنا دینا عقلی دلائل بتانا۔

لِمَا عَلَّمْنَاهُ (میں اگر مَا موصولہ ہو تو اس) سے مراد ہوگا مَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ کہنا یا مَا مصدریہ ہوگا اور مَا عَلَّمْنَا کا معنی ہوگا ہمارا سکھانا، تعلیم دینا۔ بعض نے کہا ذُو عِلْمٍ سے مراد ہے با عمل یعنی جو علم ہم نے یعقوبؑ کو عطا کیا تھا اس پر وہ عامل بھی تھے۔ سفیان کا قول ہے جو عالم علم کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ عالم ہی نہیں ہے۔ بعض نے کہا ذُو عِلْمٍ سے مراد ہے نگہداشت رکھنے والا۔

وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی یعقوبؑ کی بات کو یا تقدیر کو نہیں جانتے اور اس سے واقف نہیں کہ تدبیر تقدیر کو دفع نہیں کر سکتی۔ یا اس بات سے ناواقف ہیں کہ اللہ اپنے دوستوں کو الہام کرتا ہے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ اور جب برادران یوسف۔ یوسفؑ کے پاس پہنچے۔ تو کہا آپ نے جو بھائی کو لانے کا حکم دیا تھا ہم اس کو لے آئے۔ حضرت یوسفؑ نے کہا تم نے بہت اچھا کیا ٹھیک کیا اور تم کو عنقریب اس کا اچھا بدلہ ملے گا پھر آپ نے ان کو عزت اور اکرام کے ساتھ ٹھہرایا اور ان کی مہمانی کی اور دستر خوان بچھوایا اور حکم دیا کہ آمنے سامنے دو دو بیٹھیں (یعنی دو دو شریک ہو جائیں۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور دو دو بیٹھ گئے) بنیامین تنہا رہ گئے اور رو پڑے اور کہنے لگے اگر میرا بھائی یوسفؑ زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا تمہارا یہ بھائی اکیلا رہ گیا ہے میں اس کو اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہوں، چنانچہ آپ نے بنیامین کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھلایا۔ پھر رات ہوئی تو آپ نے بستر کرانے کا حکم دے دیا اور فرمایا دو دو بھائی ایک بستر پر ساتھ سو جائیں۔ بنیامین اس وقت بھی تنہا رہ گئے تو حضرت نے فرمایا یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سو جائے گا۔ سوتے میں بنیامین کو یوسفؑ چپٹا لیتے تھے اور ان کی خوشبو سونگھتے تھے صبح تک یوں ہی کرتے رہے۔ روبیل کہنے لگا (بھائیو) ہم نے تو کبھی ایسا واقعہ دیکھا نہیں (کہاں بادشاہ مصر اور کہاں ہم اور ہم پر بادشاہ کی یہ مہربانی اور بنیامین پر یہ خصوصی عنایت) صبح کو حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ (یہ شخص اکیلا ہے) اس کا کوئی دوسرا رفیق نہیں ہے اس لئے اس کو میں اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھوں گا۔ اس کے بعد آپ نے ایک مکان میں قیام کرنے کا حکم دیا اور کھانا جاری کر دیا۔

آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ اور اپنے ساتھ اپنے بھائی بنیامین کو جمع کر لیا اور اپنے ہی ساتھ اس کو ٹھہرا لیا۔ جب منقل

باعث گئی اور تنہائی کا وقت آیا تو بنیامین سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے بنیامین نے کہا بنیامین، یوسف نے پوچھا بنیامین کا کیا معنی بنیامین نے کہا مردہ کا بیٹا (وضع حمل کی حالت میں بنیامین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا) حضرت یوسف نے کہا کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارے مرحوم بھائی کی جگہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں، بنیامین نے کہا بادشاہ کی طرح بھائی کس کو نصیب ہے، لیکن آپ یعقوب اور راحیل کے بیٹے نہیں ہیں یوسف یہ سن کر رو دیئے اور کھڑے ہو کر ان کو گلے لگا لیا اور

قَالَ اِنِّیْٓ اَنَا اَخُوْكَ کہا میں حقیقت میں تمہارا بھائی ہوں یعنی یوسف ہوں۔

فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ اب تم ان کی ان حرکات سے رنجیدہ نہ ہو جو ہمارے ساتھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ اللہ نے ہم پر اپنا کرم کر دیا جو اطلاع میں نے تم کو دی ہے اس کی خبر ان کو نہ دینا۔ اس کے بعد آپ نے ہر بھائی کو ایک ایک بار شتر غلہ دے دیا اور بنیامین کو بھی اس کے نام کا ایک اونٹ بھر اناج دے دیا۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ پھر جب ان کو سامان سفر دے کر تیار کر دیا تو پانی پینے کا کٹورا اپنے بھائی بنیامین کے سامان میں رکھ دیا یعنی خادموں کو حکم دے دیا کہ کٹورا بنیامین کے سامان میں چھپا دو۔ خادموں نے چھپا دیا۔

سِقَایَةٌ اور صُوَاعٌ دونوں سے مراد ایک ہی چیز ہے۔ سقایہ پانی پینے کا برتن جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ برتن زبرجد کا تھا ابن اسحاق نے کہا چاندی کا تھا۔ کسی نے کہا سونے کا تھا۔ عکرمہ نے کہا چاندی کا تھا مگر مرصع تھا غلے کے احترام میں حضرت یوسفؑ نے اس کو غلہ ناپنے کا پیمانہ مقرر کر دیا تھا اور اس میں آپ پانی بھی پیتے تھے۔ سدی نے کہا بھائی کے سامان میں وہ پیالہ پوشیدہ کرا دیا اور بھائی کو جتلایا بھی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہ ہوا۔ کعب نے کہا جب حضرت یوسفؑ نے بنیامین سے کہا میں تمہارا بھائی ہوں تو بنیامین نے کہا اب تو میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا تم واقف ہو کہ میری وجہ سے باپ پر بہت غم پڑا تھا اب اگر میں تم کو روک لوں گا تو ان کا غم اور بڑھ جائے گا اور جب تک میں تم کو بدنام کر کے مشہور نہ کر دوں اور کسی نازیبا فعل کی تمہاری طرف نسبت نہ کر دوں اور ناروا حرکت کا مرتکب نہ قرار دے دوں اس وقت تک میں تم کو روک بھی نہیں سکتا (روکنے کا کوئی قانون نہیں اور جھوٹی وجہ بھی قائم کرنے میں تمہاری بدنامی ہوگی) بنیامین نے کہا مجھے کچھ بھی پروا نہیں جو بات آپ چاہیں کریں، میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا تو میں اپنا جام تمہارے سامان میں پوشیدہ کرائے دیتا ہوں پھر تمہارے اوپر چوری کا الزام قائم کروں گا، تاکہ تم کو چھوڑ دینے (اور روانہ کر دینے) کے بعد پھر تم کو لوٹا لینا میرے لئے ممکن ہو سکے۔ بنیامین نے کہا آپ جو چاہے کریں۔

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ پھر ایک اعلانچی نے پکارا اے قافلے والو تم یقیناً چور ہو۔

مؤذن منادی۔ لفظ ثُمَّ بتا رہا ہے کہ قافلے والوں کی روانگی سے کچھ وقت کے بعد اعلانچی نے اعلان کیا تھا (کیونکہ ثُمَّ فصل ودیم کی تاخیر اور کچھ مدت پہلے فعل سے پیچھے آنے کو ظاہر کرتا ہے جَاءَ زَیْدٌ ثُمَّ بَكْرٌ زید آیا کچھ مدت کے بعد بکر آیا۔ مترجم) یہ واقعہ بھی اسی طرح ہوا تھا، قافلہ روانہ ہو گیا اور حضرت یوسفؑ نے اتنی تاخیر کی کہ قافلہ ایک منزل پہنچ گیا یا گھروں کی آبادی سے نکل گیا پھر ان کے پیچھے آدمی دوڑایا جس نے پیچھے سے پہنچ کر ندا دی۔ اَلْعِیْرُ لدے ہوئے اونٹ، مجازاً مراد اونٹوں والے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا یا خَیْلَ اللّٰهِ ارْكَبِیْ اے اللہ کے سوارو سوار ہو جاؤ۔ رواہ ابوداؤد من حدیث سمرۃ بن جندبؓ (گھوڑوں کو خیل کہتے ہیں مگر حدیث میں گھوڑوں کے سوار مراد ہیں) آمد و رفت رکھنے کی وجہ سے اونٹوں کو عیر کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا عیر جمع ہے عَیْر کی۔ سُقُفٌ کی طرح عین پر ضمہ تھا مگر یاء کی مناسبت کی وجہ کسرہ دے دیا گیا اور عیر کا معنی ہے گدھا مجازاً مراد ہو جاتا ہے گدھوں والا قافلہ پھر اس لفظ کے استعمال میں مزید توسیع کر لی گئی اور ہر قافلہ پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ مجاہد نے کہا وہ قافلہ گدھے سواروں ہی کا تھا۔ فراء نے کہا وہ اونٹ والے تھے (برادران یوسفؑ چور نہ تھے پھر ان کو چور کیوں کہا اور

چوری کی تہمت ان پر کیوں لگائی۔ اس سوال کے جواب میں) کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے حکم کے بغیر منادی نے یہ لفظ از خود کہہ دیا تھا یا یہ کہ حضرت یوسفؑ نے حکم دیا تھا اور بے ساختہ یہ لفظ ان کی زبان سے نکل گیا تھا یا یوں کہا جائے کہ واقعی وہ چور تھے حضرت یوسفؑ کو انہوں نے چرا لیا تھا۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اللہ ہی نے ایسا کہنے کا حکم دیا تھا اور اس سے کسی بات کی وجہ نہیں دریافت کی جا سکتی لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ اس میں حکمت حضرت یعقوبؑ کا امتحان تھا آئندہ ہم اس کا ذکر کریں گے۔

قَالُوا وَأَقْبَلُوا عَلَيْهِم مَّاذَا تَفْقِدُونَ ﴿٧١﴾ قافلے والے تلاش کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تمہاری کیا چیز گم ہو گئی (تم کس چیز کو ڈھونڈ رہے ہو) فقد کسی چیز کا کھو جانا کہ یہ بھی معلوم نہ ہو وہ کہاں گئی اور کہاں ہے۔

قَالُوا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ تلاش کرنے والوں نے کہا بادشاہ کا پانی پینے کا کٹورا ہم کو نہیں ملتا ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں اور تمہارے سوا ہمارا خیال کسی اور پر نہیں ہے۔

وَلِمَن جَاءَ بِهِ حِمْلُ بَعِيرٍ وَأَنَا بِهِ زَعِيمٌ ﴿٧٢﴾ اور جو شخص اس کو لا کر حاضر کرے گا اس کو ایک بار شتر غلہ ملے گا اور میں اس کے دلوانے کا ذمہ دار ہوں..... یعنی بطور مزدوری اس کو ایک بار شتر غلہ ملے گا اور میں ذمہ دار ہوں اس کو مزدوری دلوں گا (مزدوری سے مراد ہے اجرت، معاوضہ، انعام۔ مترجم) اس آیت سے مزدوری اور کفالت اور کام سے پہلے مزدوری مقرر کر دینے کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ عَلِمْتُم مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كُنَّا سَارِقِينَ ﴿٧٣﴾

بولے خدا کی قسم تم یہ یقیناً جانتے ہو کہ ہم اس سرزمین میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چور نہیں ہیں۔ یہ لوگ دو مرتبہ مصر آئے تھے اس لئے اہل مصر ان کی امانت داری سے واقف ہو چکے تھے جو سرمایہ ان کے سامان میں بندھ کر ان کے ساتھ چلا گیا تھا وہ بھی انہوں نے واپس لا کر دے دیا تھا اور اپنے جانوروں کے منہ پر انہوں نے جالیاں بھی چڑھا دی تھیں کہ کسی کی کھیتی باڑی پر منہ نہ ڈال دیں یہ تمام باتیں ان کی امانت داری پر دلالت کرتی تھیں اور لوگ ان باتوں سے واقف تھے، اسی لئے اہل مصر کے علم کو ان لوگوں نے اپنی شہادت میں پیش کیا۔

قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ ﴿٧٤﴾ (منادی اور اس کے ساتھیوں نے) کہا اگر تم لوگ بے گناہی کے دعوی میں جھوٹے ہو تو چور یا چوری کی سزا تمہارے نزدیک کیا ہونی چاہئے۔

قَالُوا جَزَاؤُهُ مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٧٥﴾

انہوں نے جواب دیا اس چوری کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں پیمانہ نکلے تو سامان والا ہی اس کا عوض ہے (یعنی اسی کو غلام بنا لیا جائے) اور ہم ظالموں یعنی چوروں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کی شریعت میں چور کی یہی سزا تھی کہ جب چوری ثابت ہو جائے تو چور کو صاحب مال کے سپرد کر دیا جائے اور وہ چور کو اپنا غلام بنا لے۔ اس پر منادی نے کہا پھر تو تمہارے سامان کی تلاشی لی جائے گی۔

روایت میں آیا ہے کہ سرکاری آدمی ان سب کو لوٹا کر لے گئے اور حضرت یوسفؑ نے سامان کی تفتیش کا حکم دیا۔

فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے (دوسرے) بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی شروع کی۔ یعنی بنیامین کے سامان کی تلاشی سے پہلے ایک ایک کر کے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی اور انہیں کی تلاشی سے آغاز کیا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ قتادہ نے کہا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کسی کے سامان کو کھولتے اور اس کے تھیلے کے اندر دیکھتے تھے تو تہمت لگانے کے گناہ کے خوف سے استغفر اللہ کہتے تھے (کیونکہ جانتے تھے کہ میں تلاشی غلط لے رہا ہوں یہ شخص چور نہیں ہے) جب سب کی تلاشی ہو چکی اور صرف بنیامین رہ گیا تو خود ہی بولے میرے خیال میں اس نے نہیں لیا ہے (اس کی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں) بھائیوں نے کہا خدا کی قسم جب تک اس کی بھی تلاشی نہ لی جائے گی ہم نہیں چھوڑیں

گے اس سے آپ کے دل کو بھی پورا اطمینان ہو جائے گا اور ہمارے دلوں کو بھی۔

ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ ۚ آخر (بنیامین کا سامان کھولا اور) اپنے بھائی بنیامین کے تھیلے سے پیمانہ برآمد کر لیا۔ یہ دیکھ کر بھائیوں نے شرم کے مارے سر جھکا لئے اور بنیامین کی طرف رخ کر کے کہنے لگے تو نے یہ کیا حرکت کی ہمارے منہ کالے کر دیئے ہم کو رسوا کر دیا تو نے یہ کیا۔ اے اولاد راحیل تمہارے ہاتھوں ہمیشہ ہم پر مصیبت ہی آئی ہے۔ بنیامین نے کہا اولاد راحیل کو ہمیشہ تمہارے ہاتھوں مصائب اٹھانے پڑے ہیں تم نے ہی میرے بھائی کو لے جا کر جنگل میں ہلاک کیا (رہا یہ معاملہ تو) یہ پیمانہ اسی نے میرے سامان میں رکھا جس نے تمہارے سامانوں میں تمہارا سرمایہ رکھا تھا۔ غرض (بنیامین) تلاشی میں پکڑ لیا گیا۔ آدمی (یعنی تلاشی لینے والے) نے بنیامین کی گردن پکڑ کر یوسف کے روبرو پیش کر دیا جیسے چوروں کو لے جایا جاتا تھا۔

كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ ایسی تدبیر ہم نے یوسف کی خاطر کی تھی۔ کہ ہم نے یہ تدبیر اس کو سکھائی اور وحی بھیجی۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ منادی نے جو إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ کہا تھا وہ کلام خود نہ تھا بلکہ حضرت یوسفؑ کے حکم سے تھا اور آپ کا حکم بھی وحی پر مبنی تھا اس لئے گناہ نہیں تھا۔

بغوی نے لکھا ہے اس جگہ کید سے مراد ہے کید کا بدلہ یعنی جس طرح برادران یوسف نے یوسفؑ کے ساتھ پہلے فریب کیا تھا اسی طرح اس وقت ہم نے ان کے ساتھ کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے تو حضرت یوسف سے پہلے ہی فرما دیا تھا فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا کہ وہ تم سے فریب کریں گے۔ پس جب انہوں نے فریب کیا تو ان کے معاملہ میں یوسفؑ کے لئے ہم نے بھی ویسا ہی کیا۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مخلوق کی طرف سے کید کا معنی ہے سازش، فریب اور اللہ کی طرف سے کید کا معنی ہے صحیح (مخفی) تدبیر۔

مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (ہم نے یہ تدبیر اس لئے کی) کہ یوسف بادشاہ (مصر) کے مذہب (اور قانون) کے اعتبار سے اپنے بھائی کو لے نہیں سکتے تھے (اور اپنے پاس روک نہیں سکتے تھے) بادشاہ کے قانون و مذہب میں تو چور کو مارا جاتا تھا اور چوری کے مال سے دوگنا جرمانہ کیا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس جگہ دین کا ترجمہ کیا سلطان، ضحاک اور قتادہ نے کہا حکم اور قانون۔

إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ ہاں اللہ کو منظور ہوتا تو دوسرے حکم کو بادشاہ کا حکم کر سکتا تھا (استثناء منقطع ہے) چنانچہ ایسا ہی ہوا حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے دریافت کیا کہ تمہارے نزدیک چوری کی سزا کیا ہونی چاہئے تو اللہ نے ان سے کہلوایا: چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کو مالک مال کا غلام بنا دیا جائے گا اس طرح مشیت الٰہی حضرت یوسفؑ کا مقصد حاصل ہو گیا۔

نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ۗ (علم عطا فرما کر) ہم جس کو چاہتے ہیں بڑے درجے عنایت کرتے ہیں۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ اور ہر جاننے والے سے اوپر دوسرا جاننے والا ہے یعنی ہر ذی علم مخلوق سے زیادہ دانا علیم ہے۔ علیم کا معنی ہے بہت زیادہ علم رکھنے والا (مراد اللہ) یا ہر ذی علم مخلوق سے اوپر دوسری ذی علم مخلوق ہے۔ خواہ یہ فوقیت علمی بعض لحاظ سے ہو جیسے حضرت خضر کو بعض اعتبار سے حضرت موسیٰؑ پر علمی فوقیت حاصل تھی (اگرچہ حضرت موسیٰؑ نبی مرسل ہونے کی وجہ سے صاحب شریعت تھے اور حضرت خضر پر علمی برتری رکھتے تھے مگر بعض کائناتی واقعات کا انکشاف حضرت خضرؑ کو تھا حضرت موسیٰؑ کو نہ تھا) اسی بناء پر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا موسیٰ جو علم مجھے اللہ نے عطا فرمایا ہے آپ اس سے ناواقف ہیں اور جو علم تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت خضر و موسیٰؑ کے طویل قصہ کے ذیل میں نقل کی ہے۔ یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا تم اپنی دنیا کے کاموں کو خود ہی مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے دوسرے سے برتر ہے ورنہ تسلسل علمی لازم آئے گا (اگر علم کی انتہا اللہ کی ذات پر مانی جائے اور پوری مخلوق میں باہم علمی برتری اور کامل برتری کا سلسلہ قائم کیا

جائے تو یہ ترقی کہیں جا کر ختم نہیں ہوتی رہے گی۔ (علمی تسلسل کا یہی معنی ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہر عالم کے اوپر دوسرا عالم ہے اور یہ سلسلہ اللہ کی ذات پر جا کر ختم ہوتا ہے پس اللہ ہر عالم سے بڑھ کر علم رکھنے والا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ برادران یوسفؑ نے کہا اگر یہ بنیامین چوری کرتا ہے تو کوئی تعجب نہیں اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ یعنی یوسفؑ نے بھی چوری کی تھی جو اس کا ماں جایا تھا۔ سعید بن جبیرؒ اور قتادہ نے کہا حضرت یوسفؑ کے نانا کا ایک بت تھا وہ اس کی پوجا کرتا تھا حضرت یوسفؑ نے خفیہ طور پر اس کو لے لیا اور توڑ کر راستہ میں پھینک دیا تاکہ نانا اس کی پوجا نہ کر سکے۔ کذا اخرج ابن مردویہ عن ابن عباس مرفوعاً۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے سعید بن جبیرؒ کی روایت سے بھی اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے بیان کیا ایک روز ایک سائل آیا حضرت یوسفؑ دستر خوان سے (چھپا کر) کچھ کھانا اٹھا لیتے تھے اور فقیروں کو دے دیتے تھے اس روز بھی ایسا ہی کیا۔

میں کہتا ہوں حضرت یوسفؑ بھی گھرانے کے ایک فرد تھے اور فقیروں کو دینے پر حضرت یعقوبؑ راضی تھے اس لئے یہ چوری نہ تھی بھائیوں نے یوسفؑ کی چغلی کی وجہ سے اس کو چوری کہا۔

محمد بن اسحاق نے مجاہد کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت یوسفؑ کی والدہ راحیل کا انتقال ہو گیا تو آپ اپنی پھوپھی بنت اسحاق کے پاس رہتے تھے پھوپھی کو آپ سے بڑی محبت تھی اور پھوپھی نے ہی آپ کو پرورش کیا جب آپ بڑے ہو گئے تو حضرت یعقوبؑ کو آپ سے حد سے زیادہ محبت ہو گئی اور آپ نے اپنی بہن سے کہا بہن اب تم یوسفؑ کو مجھے دے دو۔ خدا کی قسم یوسفؑ کا ایک ساعت بھی میری نظر سے غائب ہونا میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا ہے، بہن نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں اس کو چھوڑنے والا نہیں۔ بہن نے کہا اچھا تو چند روز کے لئے میرے پاس رہنے دو شاید چند روز کے بعد اللہ مجھے اس کی طرف سے صبر عطا کر دے۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ بات مان لی حضرت اسحاقؑ کی کمر کا ایک پٹکا تھا اور بطور وراثت بڑی اولاد کو ملتا تھا حضرت یعقوبؑ کی بہن آپ سے بڑی تھیں اس لئے وہ پٹکا بہن کو ملا تھا اور اس کے پاس تھا۔ بہن نے کیا پٹکا حضرت یوسفؑ کی کمر سے کپڑوں کے اندر لپیٹ دیا، پھر خود ہی کہا حضرت اسحاقؑ کا پٹکا گم ہو گیا ہے، گھر والوں کی تلاشی لی جائے گی، بچہ بچہ سب کی تلاشی لی گئی تو حضرت یوسفؑ کے پاس برآمد ہو گیا، حضرت یعقوبؑ کی بہن نے کہا کہ اب تو یہ میری سپردگی میں رہے گا، حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اس نے اگر ایسا کیا ہے تو تمہاری ہی سپردگی میں رہے گا (حضرت اسحاقؑ کی شریعت میں چور کا مالک مال والا ہو جاتا تھا) غرض اس تدبیر سے حضرت یعقوبؑ کی بہن نے حضرت یوسفؑ کو مرتے دم تک اپنے پاس روکے رکھا۔ یہی بات آپ کے بھائیوں نے آپ کے متعلق کہی اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ بھائیوں کی یہ بات یوسفؑ نے اپنے دل میں چھپالی گویا سنی ان سنی کر دی اور ان پر ظاہر بھی نہیں کیا کہ میں نے تمہاری یہ بات سن لی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جو بات دل میں چھپالی تھی اور بھائیوں سے نہیں کہی تھی وہ بات وہی تھی جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے یعنی

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ یوسفؑ نے کہا یعنی دل میں کہا کہ اس چوری کے درجہ میں تو تم اور بھی برے ہو۔ یعنی یوسفؑ نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے تو اپنے بھائی کو بیچ ڈالا تو تم یوسفؑ سے زیادہ برے ہوئے یا یہ مطلب ہے کہ تم نے چوری کی نسبت یوسفؑ کی طرف کی اس سے زیادہ بری تو تمہاری حرکت ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ۞ اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اس سے بخوبی اللہ واقف ہے۔ یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ تم بیان کر رہے ہو وہ غلط ہے۔

جب حضرت یوسفؑ نے بنیامین پر قبضہ کر لیا تو بھائی غضبناک ہو گئے اولاد یعقوب کو غصہ آتا تھا تو ان کے غصہ کو برداشت کرنے کی تاب کسی میں نہیں رہتی تھی۔ روبیل کی تو یہ حالت تھی کہ اس کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹھہری نہیں

ہو واقف ہو۔ مَا فَرَّطْتُم میں مَا زائدہ ہے یا مصدری یا موصولہ۔ بیضاوی کے نزدیک مَا کو حالتِ رفع میں نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس کو مبتدا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ مِنْ قَبْلُ اس وقت خبر ہو گا تو قَبْلُ کا مضاف الیہ مذکور ہونا ضروری ہے۔

فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ　　اس لئے میں اس سرزمین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا تاوقتیکہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے۔

اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ　　یا اللہ حکم دے دے یعنی یعقوبؑ کی معرفت اللہ مجھے یہاں سے جانے اور بھائی کو چھوڑ جانے کا حکم بھیج دے۔ یا میری موت کا حکم بھیج دے یا میرے بھائی کو رہا کرنے کا حکم دے دے یا بھائی کو چھڑانے کے لئے اہل مصر سے لڑنے کا حکم دے دے۔

وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝　　اور وہ سب حاکموں سے اعلیٰ اور بالا ہے جس کا حکم غلط نہیں ہوتا۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ　　تم لوگ اپنے والد کے پاس لوٹ جاؤ اور جا کر کہہ دو ابا آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کی۔ یعنی بظاہر امر ہم نے اس کے سامان سے چوری کا مال برآمد ہوتے دیکھا (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی نے چوری کی)

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا　　اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو مشاہدے سے ہم کو معلوم ہوا۔ یعنی ہم جو کہہ رہے ہیں کہ اس نے چوری کی اس وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ ہم کو یقین ہو چکا اور ہم نے خود دیکھ لیا کہ بادشاہ کا پیالہ اس کے تھیلے سے برآمد ہوا۔ بعض اہل تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہم نے کوئی شہادت بھی بغیر ذاتی علم کے نہیں دی اس لئے ہماری طرف سے شہادت نہیں ہے (ہم کو حقیقت کا کیا علم ہمارے سامنے تو اس نے چرایا نہیں۔ مترجم) بلکہ آپ کے بیٹے کی حرکت کی اطلاع ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ حضرت یعقوبؑ نے ان سے فرمایا عزیز مصر کو تو معلوم نہ تھا کہ چور کو چوری کی سزا میں غلام بنا لیا جاتا ہے یہ بات اس کو تمہارے قول سے معلوم ہوئی اس کے جواب میں بیٹوں نے کہا ہم نے تو عزیز مصر سے وہی بات کہی جو ہم کو (اپنے مذہب سے) معلوم تھی۔ حضرت یعقوبؑ اور آپ کی اولاد کا چور کے متعلق شرعی فیصلہ یہی ہوتا تھا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ۝　　اور غیب کی باتوں کے تو ہم حافظ تھے نہیں (یا یہ ترجمہ ہے کہ باطنی احوال کے تو ہم نگراں تھے نہیں) حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ کیا ہم رات دن اس کے اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کے تو نگراں تھے نہیں ممکن ہے رات کو اس کے سامان میں پیالہ چھپا دیا گیا ہو (اور واقع میں اس نے نہ چرایا ہو) مجاہد اور قتادہ نے یوں مطلب بیان کیا کہ جب قسم کھا کر ہم نے عہد کیا تھا تو ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا آئندہ چوری کرے گا (اور پکڑا جائے گا) اور آپ پر ایسی مصیبت آ پڑے گی، جیسی یوسفؑ کی وجہ سے پڑی تھی ہم نے جو اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا تو انہی چیزوں سے کیا تھا جن سے حفاظت ممکن تھی۔

وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا　　اور اس بستی سے جہاں ہم تھے آپ دریافت کر لیں۔ قریہ سے مراد ہے مصر۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مصر کا وہ گاؤں مراد ہے جہاں منادی نے آکر روکا تھا اور اسی جگہ سے ان کو مصر واپس لوٹنا پڑا تھا۔

وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا　　اور جس قافلے میں ہم آئے ہیں اس سے بھی آپ دریافت کر لیں۔ حضرت یعقوبؑ کے ہم وطن کچھ کنعانی باشندے بھی اسی قافلے میں آئے تھے۔ ابن اسحاق نے کہا جو بھائی مصر میں ترک کیا تھا وہ جانتا تھا کہ یوسفؑ کے سابق واقعہ کی وجہ سے میں اور میرے بھائی باپ کی نظر میں متہم ہیں اب اس لئے اس نے بھائیوں سے کہا کہ باپ سے یہ بات کہنا۔

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝　　اور ہم بلاشک و شبہ یقیناً سچے ہیں۔

بقول بغوی ایک شبہ

حضرت یوسفؑ نے باپ کو اپنی موجودگی کی اطلاع نہیں دی بلکہ اپنے بھائی بنیامین کو بھی ہمیشہ کے لئے روک لیا اور باپ

سے جدا کر دیا جاتا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ میری جدائی میں باپ کا کیا حال ہوا اور بنیامین کے چھوٹ جانے سے کیا حال ہوگا، آپ کے اس کردار سے تو قطع رحم، عقوق اور سنگدلی کا مظاہرہ ہوتا ہے آپ نے ایسا کیوں کیا۔

حضرت مفسرؒ کی صراحت کے مطابق شبہ کا ازالہ

لوگوں نے اس کردار اور سلوک پر بہت لے دے کی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے قلبی تقاضوں کے خلاف یہ سب کچھ اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا۔ اللہ کو یعقوب کا پے در پے کڑا امتحان لینا تھا کہ ان کے درجات میں ترقی کی ہے اور معاف کی صف میں ان کو شامل کرنا ہے (حضرت ابراہیمؑ کا بھی تو بڑا سخت امتحان لیا گیا۔ یہاں تک کہ بیٹے کو تو ذبح کر دینے کا حکم دے دیا گیا تھا اور اس سے پہلے آپ کو اور ویران بے آب و گیاہ میدان میں شیر خوار بچہ اور اس کی ماں کو چھوڑ دینے کا حکم ہو چکا تھا مگر یہ تمام امتحانات درجات ترقی کے تھے جس میں حضرت ابراہیمؑ پورے اترے اس سے کم درجے کا امتحان حضرت یعقوب کا لیا گیا، صرف بیٹوں کو باپ سے جدا کر دیا گیا۔ مترجم)

بعض نے کہا حضرت یوسف نے بھائیوں سے اپنا یوسف ہونا ظاہر نہیں کیا کیونکہ آپ کو اندیشہ تھا کہ بھائی کوئی اور سازش نہ کریں اور باپ کو جا کر اطلاع نہ دیں، باپ سے چھپا لیں (آپ چاہتے تھے کہ اس تدبیر سے باپ مصر میں آجائیں اور آکر اپنی آنکھوں سے یوسف کی حالت دیکھیں۔ مترجم) یہ جواب ہی صحیح ہے دوسرا جواب کچھ نہیں ہے۔

یہ فقیر مترجم کہتا ہے کہ حضرت یوسف کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج ان کو سجدہ کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس خواب کی تعبیر پوری ہونی تھی جس کی ظہوری صورت اللہ نے یہ پیدا کردی کہ جو کچھ ہوا اس سب کا انتظام اللہ نے ظہور واقعہ سے پہلے کر دیا تھا، ترتیب ظہوری تو بعد کو ہوئی اس لئے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور حضرت مفسر قدس سرہ کا جواب ہی صحیح جواب ہے۔

غرض بڑے بھائی کو مصر میں چھوڑ کر دوسرے نو بھائی کنعان کو لوٹ آئے اور بڑے بھائی نے جو کچھ کہا تھا وہ باپ سے عرض کر دیا۔

قَالَ　یعقوب نے کہا۔ بات یوں نہیں جیسی تم نے بیان کی۔

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا　بلکہ تم نے خود اپنے دل سے اپنے لئے ایک بات بنا لی ہے بادشاہ کو کب معلوم تھا کہ (شریعت اسرائیلی میں) چور کو پکڑ کر غلام بنا لینے کا حکم ہے تم خود اس غرض کے لئے بھائی کو مصر لے گئے تاکہ تم کو کچھ فوری فائدہ مل جائے۔

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ　سو صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (یعنی لوگوں سے شکایت نہ ہوگی)

عَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا　اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو مجھ تک پہنچا دے گا یعنی یوسف کو بنیامین کو اور جو بھائی مصر میں رہ گیا ہے ان کو سب کو۔

إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝　(میرے اور ان کے احوال سے) وہی خوب واقف ہے (اور اپنے انتظام اور تدبیر میں) حکمت والا ہے۔ اس نے مجھے اس دکھ میں بھی کسی مصلحت ہی سے ڈالا ہے۔ بنیامین کے قید اور غلام ہو جانے کی اطلاع جب حضرت یعقوب کو پہنچی تو اس وقت آپ کا غم و اندوہ آخری حد پر پہنچ گیا اور خیال کر لیا کہ ان بیٹوں کی سازش سے مجھے یہ جسم دکھ پہنچے ہیں۔

وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ　اور سب کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ　اور افسوس و حسرت سے کہنے لگے ہائے یوسف۔ اسف کا معنی ہے انتہائی حزن اور اندوہ۔ اسفی اصل میں اسفی بیاء متکلم تھا۔ عبدالرزاق اور ابن جریر نے موقوفاً سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ سوائے امت محمدیہ کے کسی اور امت کو مصیبت کے وقت إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ حضرت یعقوب پر

بجز چاہئے تو افسوس سے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ نہیں کہا بلکہ حسرت وافسوس کا اظہار کیا۔ بیہقی نے بھی یہ روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ضعیف سند میں بوساطت حضرت ابن عباسؓ اس کو مرفوعاً بیان کیا گیا ہے۔ ثعلبی نے سعید بن جبیرؓ کے طریق سے اس کو مرفوعاً بیان کیا ہے۔

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ اور روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ غم سے جی ہی جی میں گھٹا کرتے۔

یعنی روتے روتے آنکھوں کی سیاہی جاتی رہی اور نابینا ہو گئے۔ مقاتل نے کہا چھ برس نابینا رہے۔ بعض اہل تفسیر نے تشریح کی کہ نگاہ کمزور ہو گئی (یعنی آنکھوں کے سفید ہونے سے مراد ہے نگاہ کا ضعف)

کَظم سانس کا مخرج اَخَذَ بِكَظْمِهٖ اس نے فلاں شخص کے سانس بھر آنے کے راستے کو پکڑ لیا۔ کظوم سانس رک جانا، سانس بند ہو جانا، مجازی معنی خاموش ہو جانا۔ کظیم بمعنی کاظم جس کا سانس رک گیا ہو بند ہو گیا ہو۔ مطلب یہ کہ یعقوبؑ اپنے غم و غصے کو ضبط کرنے والے تھے لوگوں سے کہتے نہ تھے۔ اسی سے ہے کظم البعیر اونٹ نے جگالی کرنی چھوڑ دی اور کھائی ہوئی غذا پیٹ میں روک لی۔

کظم السقاء بھرنے کے بعد مشک کا منہ باندھ دیا۔ کظیم کا معنی بھی پُر بھرا ہوا بھی آتا ہے۔ بھری ہوئی مشک کا منہ باندھ دیا جاتا ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے بند کر دیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر معنی کے لحاظ سے کظیم بمعنی مکظوم ہو سکتا ہے یعنی غم و غصہ سے بھرا ہوا۔

قتادہ نے کہا حضرت یعقوبؑ کے سینے میں غم گھومتا تھا مگر زبان سے کلمۂ خیر کے سوا کچھ نہیں کہتے تھے۔ حسن نے کہا جس روز سے یوسفؑ باپ کی گود سے جدا ہوئے اس روز سے یوم ملاقات تک اسّی ۸۰ سال گزر گئے اور اس مدت میں یعقوبؑ کا آنسو خشک نہیں ہوا باوجودیکہ آپ کے زمانے میں روئے زمین پر آپ سے زیادہ اللہ کے نزدیک کسی کی عزت نہ تھی اور اللہ کو آپ سے زیادہ پیارا کوئی بندہ نہ تھا۔

تنقیح مبحث

علماء تصوف اور اصحاب معرفت کہتے ہیں کہ فناء قلب کے بعد صوفی کے دل کا لگاؤ اللہ کے سوا کسی سے نہیں رہتا اور سوائے محبوب حقیقی کے کسی مخلوق کی محبت کی گنجائش ہی نہیں رہتی، حضرت یعقوبؑ تو جلیل القدر پیغمبر اور صاحب بصیرت مقرب ولی اللہ تھے، یوسفؑ کی محبت آپ کے دل میں کیسے سما گئی اور فراق یوسف میں اتنے کیوں روئے کہ نور نظر جاتا رہا۔ اگر اس کی یہ توجیہ کی جائے کہ سارا عالم جلوہ گاہ الوہیت اور آئینہ حقیقت ہے یوسفؑ سے حضرت یعقوبؑ کے دل کی وابستگی حقیقت سے دوسروں سے دل کا لگاؤ نہ ہونے کی کیا وجہ۔ اس کے علاوہ یہ کہ عالم کو جلوہ گاہ حقیقت سمجھ کر غیر اللہ سے دل کی وابستگی تو علم تصوف کی ابتدا اور توسط کا درجہ ہے، حضرت یعقوبؑ تو کاملین میں سے تھے معرفت کی آخری چوٹی پر پہنچے ہوئے تھے ان کے دل کا یوسفؑ سے لگاؤ اور وابستگی کس طرح ممکن تھی۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تنقیح پر غور کرو۔

تنقیح:-

فناء کے بعد صوفی کے دل کا لگاؤ کسی دنیوی چیز سے نہیں رہتا آخرت سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی حالت اس سے جدا ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ ملعون ہے، مگر اللہ کی یاد اور اللہ کی یاد سے قریب کرنے والی چیزیں اور عالم اور طالب علم (ملعون نہیں ہے) یہ حدیث ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے اور طبرانی نے صحیح سند سے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے بزار نے بھی حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور طبرانی نے صحیح سند سے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

آخرت اللہ کو پسند ہے اور اس سے دل کا تعلق بھی پسند ہے ارشاد خداوندی ہے وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَ

یَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ میرے خاص بندوں ابراہیم اسحاق اور یعقوب کا ذکر کرو جو طاقت والے اور صاحبان بصیرت تھے۔ یعنی اللہ کی اطاعت میں قوی اور اللہ کی معرفت و بصیرت رکھنے والے تھے۔

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ہم نے ان کو ایک خصلت خالص طور پر عطا کی تھی جس میں کوئی کدورت اور آمیزش نہ تھی یعنی دار آخرت کی یاد کیلئے مخصوص کر دیا تھا۔ مالک بن دینار نے فرمایا مراد یہ ہے کہ ہم نے دنیا کی محبت اور یاد ان کے دلوں سے نکال دی تھی اور آخرت کی محبت اور یاد کیلئے ان کو مخصوص کر دیا تھا ہر عمل و ترک عمل میں آخرت ہی ان کے پیش نظر رہتی تھی۔ آخرت ہی کو دار (مکان) کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا مکان نہیں گزرگاہ ہے اور مکان صرف آخرت ہے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ آخرت اور آخرت کی یاد ہی اللہ کو پسند ہے اور آخرت کی ہر چیز قابل پسندیدگی اور مستحق ستائش ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے خواب میں کہا گیا کہ ایک سردار نے ایک مکان بنوایا (مکان کے اندر) دسترخوان لگوایا اور کھانے والوں کو بلانے کے لئے ایک بلانے والے کو بھیجا۔ بلانے والے نے جا کر لوگوں کو کھانے کی دعوت دی داعی کی دعوت کو جس نے قبول کر لیا اس نے گھر کے اندر آ کر دسترخوان سے کھانا کھا لیا۔ اور سردار اس سے خوش ہو گیا اور جس نے داعی کی دعوت کو قبول نہیں کیا وہ گھر میں داخل نہ ہوا اور نہ کھانا کھایا اور سردار اس سے ناراض ہو گیا۔ پس اللہ سردار ہے محمد داعی ہے اور گھر اسلام ہے اور دسترخوان جنت ہے رواہ الدارمی عن ربیعۃ الجرشی۔

یہ معرفت کی وہ چوٹی ہے جس پر کاملین ہی کی رسائی ہے، عوام اور ابتدائی زینے پر قدم رکھنے والوں کا تو ذکر ہی کیا ہے درمیانی درجہ والوں کی بھی وہاں تک پہنچ نہیں ہے۔ رابعہ بصری کو اگر معرفت کی یہ رفعت حاصل ہوتی تو وہ نہ کہتیں کہ میں جنت کو جلا دینا چاہتی ہوں تاکہ جنت کے لالچ میں لوگ اللہ کی عبادت نہ کریں۔ خالص اللہ کے لئے اس کی عبادت کریں، کیا ان کو یہ آیت معلوم نہ تھی، اللہ تو فرماتا ہے۔ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ یعنی جو شخص اللہ سے ملنے کا امیدوار ہے تو اللہ کی ملاقات کا وقت آخرت میں ضرور آنے والا ہے اور جنت اسی کی ملاقات کا نام ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت کی مٹی پاکیزہ (خوشبودار) اور اس کا پانی شیریں ہے اور وہاں بڑے میدان ہیں (جہاں سرسبز درخت ہیں) گویا اس کے درخت یہ (تنزیہی کلمات) ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ رواہ الترمذی عن ابن مسعودؓ۔ صحیحین نے صحیح میں اور حاکم و طبرانی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں تمہارے لئے ہر ایک لفظ کے بدلے میں جنت کے اندر ایک درخت لگایا جائے گا۔

حضرت مجدد قدس سرہ نے فرمایا تنزیہی معنی کا صوری لباس تو یہی (سبحان اللہ وغیرہ) حروف و الفاظ ہیں آخرت میں ان کا پیرایہ ظہور جنت کے پھل اور درخت ہیں (دنیا میں ان کلمات کے ساتھ اور آخرت میں جنت کے ساتھ) محبت کا تعلق گویا حقیقی معنی سے وابستگی (کی شکل) ہے۔

حضرت مجدد نے فرمایا میں کہتا ہوں کہ ہر شخص کی جنت یہ ہے کہ اللہ کے اسماء و صفات میں سے جو اسم بھی اس شخص کے تعین اور تشخص کا مبداء ہے اس کا ظہور ہو جائے اور یہ ظہور اس شخص کے لئے درختوں، نہروں، شاندار مکانوں اور حور و غلمان کی شکل میں ہوگا اور چونکہ اللہ کے اسماء و صفات میں تفاوت ہے کوئی صفت جامع ہے کوئی غیر جامع۔ کسی کا قرب ذات سے زیادہ ہے کسی کا کم پس جیسی صفت کسی کا مبدء تعین ہوگی ویسی جنت اس کے لئے ہوگی، جنتوں کے تفاوت اور اونچ نیچ کا فرق اسماء و صفات کے تفاوت کی وجہ سے ہوگا۔[1] جنت کے بعض درخت پھلواری اور آتشیں اجسام کی شکل و کیفیت کے بھی ہو جائیں گے۔

---

[1] اللہ کی صفات متعدد ہیں رحمانیت بھی اس کی صفت ہے اور رحمن اور رحیم اس کا صفتی نام ہے اسی طرح قدرت، علم، ارادہ، مشیت وغیرہ اس کی صفات ہیں اور قدیر، علیم، مرید وغیرہ اس کے نام ہیں اب جس شخص کی تعینات جس اسم کا پرتو اور اثر ہوتی ہے ویسی ہی جنت اس کے لئے ہوگی کیونکہ جنت ایک شکل ہے صفت خداوندی کی ان صفات میں بعض جامع ہیں اور بعض کو ذات کے قریب ہے جیسے صفت الوہیت یا قدرت یا علم پس جس شخص کا مبدء تعین یہ صفات ہوں گی اس کو ایسی جنت ملے گی جو جامع تر اور ذات کی جلوہ پاشی کے قریب ہوگی۔ (مترجم)

وجود اور آپ کا حسن و جمال اگرچہ اسی دار دنیا میں پیدا ہوا لیکن دوسری مخلوق کی طرح نہ تھا بلکہ در حقیقت وہ موجودات آخرت کی جنس میں سے تھا دنیوی اشیاء کا مربی تو صفات کا عدمی (ذاتی) رخ ہوتا ہے اور جنت اور اس کی موجودات کی تربیت صفات کا وجودی رخ کرتا ہے پس جس طرح اہل کمال کی قلبی وابستگی آخرت کی چیزوں سے درست ہے اسی طرح حضرت یوسف سے حضرت یعقوب کی شیفتگی بھی نامناسب نہیں۔

حضرت مجدد کا یہ تیج انکشاف اور واضح بصیرت بے نظر اور کشف ہے تھی آپ کو حسن یوسف کی اس تنقیح تک پہنچایا ہے اگر اس تحقیق کو مان لیا جائے تو دو شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا شبہ

حضرت مجدد قدس سرہ نے ایک اور جگہ صراحت کی ہے کہ انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ باقی ممکنات ظلال اسماء و صفات (اسماء و صفات کے عکس اور پرتو) کے جولان گاہ اور مقامات ظہور ہیں۔ نفس اسماء و صفات کے مظہر و جلوہ گاہ نہیں ہیں (یعنی انبیاء وملائکہ کے علاوہ دوسری مخلوق پر براہ راست صفات و اسماء کا پرتو نہیں پڑتا بلکہ ظلال صفات کا عکس پڑتا ہے) اور (جس طرح انبیاء وملائکہ کا مبدء تعینات اسماء و صفات ہیں اسی طرح ظلال صفات دوسری مخلوق کے تعین کا مبدء ہیں نفس صفات اس کے لئے مبدء تعین نہیں۔ لیکن اس جگہ فرمایا کہ تمام ممکنات (مجرد ہوں یا مادی انبیاء ہوں یا اولیاء خواص ہوں یا عوام) کے مبادی تعین اصل اسماء اور نفس صفات ہیں۔ یہ بیان میں تضاد اور اختلاف ہو گیا۔ اور کیسے ممکن ہے کہ دنیوی اشیا بھی جلوہ گاہ صفات ہوں اور اخروی اشیاء بھی پرتو گاہ اسماء لیکن اول الذکر کی طرف سے صفات کا عدمی اور امکانی رخ ہو اور مؤخر الذکر کی تعمیر تربیت صفات کے وجودی رخ کی ممنون کرم۔

ازالہ

انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ باقی ممکنات اگر ظلال صفات کی جولان گاہ اور مظاہر ہوں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نفس صفات کے مظاہر اور جلوہ گاہ نہ ہوں کیونکہ ظل کا ظل اصل کا ظل ہوتا ہے پس یہ ممکنات ظلال صفات کے ظل ہیں تو نفس صفات کے بھی ظل ہوں گے (اول تخلیق براہ راست ہوگی اور دوسری تخلیق بالواسطہ) پس اسماء و صفات انبیاء اور ملائکہ پر جلوہ انداز ہوں گے بالواسطہ اور باقی ممکنات پر ان کی جلوہ پاشی ظلال کی وساطت سے ہوگی۔ اس کے بعد دنیوی اشیاء پر صفات کی جو جلوہ پاشی بوساطت ظلال ہو رہی ہے اس جلوہ پاشی میں صفات کا عدمی رخ (یعنی ذاتی امکان) ملحوظ ہے۔ اور اخروی اشیاء پر جلوہ ریزی میں ان کا وجودی اور اضافی یعنی ذات خداوندی کے لئے ثبوت وجوبی کا رخ معتبر ہے۔

دوسرا شبہ

کلام سابق سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمام مخلوق خواہ انبیاء ہوں یا عوام علاوہ حضرت یوسف کے جلوہ گاہ صفات اور جولان گاہ اسماء ہیں لیکن صفات کا عدمی رخ ملحوظ ہے (یعنی صفات کے ذاتی امکانی عدمی رخ کی جلوہ گاہ تمام مخلوق ہے) اور حضرت یوسف بھی صفات خداوندی کا مظہر ہیں مگر اس میں صفات کا اضافی وجودی رخ ملحوظ ہے (یعنی صفات کے وجودی اور نسبت الی الذات کا پرتو حضرت یوسف پر پڑا تھا اس لئے آپ آخرت کی چیزوں کے ہم جنس ہو گئے تھے) اس سے حضرت یوسف کی تمام انبیاء بلکہ سید الانبیاء پر فضیلت لازم آتی ہے۔

ازالہ

آخرت کی جنس سے تو تمام ہی انبیاء تھے حسن آخرت تو سب ہی کے اندر پوشیدہ تھا کہیں یوسفی لقب پا کر ظاہر ہو گیا کہیں ظاہر نہیں ہوا اس کا مفہوم کوئی اہمیت نہیں رکھتا حق بات یہی ہے کہ تمام انبیاء صفات کے وجودی رخ کے اعتبار سے مظہر صفات ہیں۔ ان پر صفات کی ضیا پاشی ذاتی اعتبار سے نہیں بلکہ نسبت الی اللہ کے اعتبار سے ہے۔ رہا حسن آخرت کا علاوہ یوسف کے اوروں سے عدم ظہور تو اس کی وجہ اللہ ہی کے علم میں ہے ہم واقف نہیں بہر حال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ انبیاء کا مظہر

حضور ﷺ نے یہ حالت دیکھی تو دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اور آپ (بھی روتے ہیں)؟ فرمایا اے ابن عوف یہ دل کی رقت ہے۔ اس کے بعد ایک اور حالت ہوئی تو فرمایا آنکھ روتی ہے دل غمزدہ ہے اور ہم زبان سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے ہمارا رب ناراض ہو اے ابراہیمؑ ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں۔

صحیحین میں حضرت اسامہ بن زیدؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک نواسے کی نزع کی حالت تھی غرغرہ شروع ہو گیا تھا اسی حالت میں حضور ﷺ پہنچ گئے اور یہ حالت دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا؟ تو آپ نے فرمایا یہ دل کی رقت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دی ہے اللہ اپنے رحم دل بندوں پر ہی رحم فرماتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اللہ آنکھ سے رونے اور دل سے غمگین ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے یا رحم فرماتا ہے (یعنی معاف کر دیتا ہے) اس کی وجہ سے لفظ سے حضور ﷺ نے زبان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور میت کو عذاب دیا جاتا ہے اس پر اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے اس حدیث کا یہ ترجمہ مشہور ہے لیکن اس فقیر کے نزدیک اگر یبکی اهله علیه کا ترجمہ اس طرح کیا جائے تو بہتر ہے کہ میت پر عذاب ہوتا ہے باوجودیکہ اس کے گھر والے (اس کی اچھائیوں کا ذکر کر کے) اس پر روتے ہیں واللہ اعلم۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے رخسار پیٹے گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی سی پکار پکارے وہ ہم سے متعلق نہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں بیزار ہوں اس شخص سے جو سر منڈائے، سینہ پیٹے اور کپڑے پھاڑے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ۝

بیٹے کہنے لگے آپ تو ہمیشہ یوسفؑ کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ گھل گھل کر جاں بلب ہو جائیں یا مر ہی جائیں۔

حرضا بیماری یا بڑی سالی کی وجہ سے ہلاکت کے قریب پہنچا ہوا شخص۔ حرض اصل میں مصدر ہے اسی لئے تو اس کی جمع آتی ہے نہ مؤنث کا صیغہ اس جگہ مصدر بمعنی صفت ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے حرض کا معنی ہے غم یا عشق یا بڑی سالی کی وجہ سے بدن کا یا مذہب کا یا عقل کا بگاڑ اور خرابی اور جس کے بدن یا مذہب یا عقل میں خرابی پیدا ہو گئی ہو یا جاں بلب ہو اس کو بھی حرض کہا جاتا ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ　یعقوب نے کہا میں تو بس اللہ ہی سے اپنے رنج و غم کا شکوہ کرتا ہوں۔ بث: سخت ترین غم جس کو ضبط کرنے کی تاب نہ رہے اور آدمی اس کو ظاہر کرنے اور پھیلانے پر مجبور ہو جائے (لغت میں بث کا معنی ہے پھیلانا) حسن البصریؒ نے بث کا ترجمہ کیا ہے حاجت۔ مقصد یہ ہے کہ میں تم سے کسی سے شکایت نہیں کرتا اللہ ہی سے شکوہ کرتا ہوں تم مجھے چھوڑ دو مجھے شکایت سے نہ روکو۔

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے پاس ان کا ایک ہمسایہ آیا وہ بولا اے یعقوبؑ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت بہت جاتی رہی اور آپ فنا ہو چکے حالانکہ آپ اپنے باپ کی عمر کو نہیں پہنچے۔ یعقوبؑ نے فرمایا یوسفؑ کے غم میں جو اللہ نے مجھے مبتلا کر دیا اسی سے میری قوت ٹوٹ گئی اور اسی نے مجھے فنا کر دیا۔

اللہ نے یعقوب کے پاس وحی بھیجی یعقوب تو میرا شکوہ میری مخلوق سے کرتا ہے۔ یعقوبؑ نے کہا اے میرے رب مجھ سے خطا ہو گئی تو میری خطا معاف فرما دے۔ اللہ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کر دیا اس کے بعد حضرت یعقوبؑ سے جب کیفیت و حالت پوچھی جاتی تو فرماتے اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ سے دریافت کیا گیا آپ کی نظر کیوں جاتی رہی اور کمر کیوں کمان ہو گئی۔ فرمایا یوسفؑ پر روتے روتے میری نظر جاتی رہی اور یوسفؑ کے

بھائی کے غم میں میری کمر کمان ہو گئی اس پر اللہ نے یعقوبؑ کے پاس وحی بھیجی، تو میری شکایت کرتا ہے قسم ہے اپنی عزت کی جب تک تو مجھ سے دعا نہیں کرے گا میں تیرا یہ دکھ دور نہیں کروں گا اس وقت حضرت یعقوبؑ نے کہا اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ اللہ نے وحی بھیجی قسم ہے اپنی عزت کی اب اگر وہ دونوں مردہ بھی ہوئے ہوتے تو تیرے لئے میں ان کو زندہ کر دیتا تجھ سے میری ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ ایک بار تم لوگوں نے ایک بکری ذبح کی تھی اور تمہارے دروازہ پر ایک مسکین آکر کھڑا ہو گیا مگر تم نے اس کو اس میں سے کچھ کھانے کو نہیں دیا۔ تمام مخلوق میں مجھے سب سے زیادہ پیارے انبیاء ہیں اور ان کے بعد مساکین۔ اب تم کھانا تیار کرو اور مسکینوں کی دعوت کرو۔ حسب ہدایت حضرت نے کھانا بنوایا پھر فرمایا جو روزہ دار ہو وہ آج رات کو یعقوبؑ کے گھر والوں کے پاس کھانا کھائے۔

روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت یعقوبؑ جب دن کا کھانا کھاتے تو ندا کرا دیتے کہ جو شخص دن کا کھانا کھانا چاہے وہ یعقوبؑ کے پاس آجائے اور جب شام کو افطار کرتے (یعنی رات کا کھانا کھاتے) تو ندا کرا دیتے جو شخص شام کا کھانا کھانا چاہے وہ یعقوبؑ کے پاس آجائے اس طرح صبح شام آپ مسکینوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

وہب بن منبہ نے بیان کیا اللہ نے حضرت یعقوبؑ کے پاس وحی بھیجی (اور فرمایا) کیا تجھے معلوم ہے کہ میں نے کس وجہ سے تجھے سزا دی اور انیس برس یوسفؑ کو تجھ سے الگ رکھا، حضرت یعقوبؑ نے کہا میرے اللہ مجھے نہیں معلوم فرمایا وجہ یہ تھی کہ تو نے ایک مرتبہ ایک بکری کا بچہ بھونا اور پڑوسی سے کنجوسی کی خود کھالیا اور اس کو کچھ نہیں دیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی مبتلاء مصیبت ہونے کا سبب یہ ہوا کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک بچھڑے کو اس کی ماں کے سامنے ذبح کیا اور وہ بیچاری چیختی رہی۔

وہب اور سدی وغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیلؑ جیل خانہ کے اندر حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے اور پوچھا صدیق کیا آپ نے مجھے پہچانا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا میں ایک پاک صورت دیکھ رہا ہوں اور پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا میں روح الامین ہوں، رب العالمین کا قاصد ہوں حضرت یوسفؑ نے فرمایا آپ تو سب سے بڑھ کر پاکیزہ، مقربین کے سردار اور رب العالمین کے امین ہیں اور یہ گناہگاروں کے داخل ہونے کی جگہ ہے یہاں آپ کے آنے کا کیا سبب ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا یوسفؑ کیا آپ واقف نہیں کہ انبیاء کی پاکی کی وجہ سے اللہ ناپاک گھروں کو پاک کر دیتا ہے اور جس زمین میں پیغمبر داخل ہوتے ہیں وہ زمین سے زیادہ پاک ہو جاتی ہے۔ اے اطہر الطاہرین اور اے منتخب نیک بندوں کی اولاد آپ کی وجہ سے اللہ نے قید خانہ کو اور اس کے ماحول کو پاک کر دیا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا آپ نے مجھے صدیق کے نام سے کیوں پکارا اور منتخب پاک لوگوں میں میرا شمار کیوں کیا، مجھے تو ان بدکاروں کے مقام میں داخل کیا گیا ہے اور بد چلن لوگوں کے ناموں میں میرا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اللہ نے آپ کا نام صدیقوں میں شامل کیا، خالص منتخب بندوں میں آپ کا شمار کیا اور آپ کے صالح اسلاف کی فہرست میں آپ کو بھی داخل کر دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے دل کو فتنہ میں پڑنے نہ دیا اور حق تعالیٰ کے کہنے کو نہیں مانا۔ حضرت یوسفؑ نے پوچھا روح الامین کیا آپ کو یعقوبؑ کی بھی کوئی اطلاع ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا ہاں اللہ نے ان کو صبر جمیل عطا فرمایا وہ آپ کے غم میں مبتلا ہوئے اور غم کی زیادتی میں گھٹے رہتے حضرت یوسفؑ نے پوچھا ان کے غم کا کچھ اندازہ بھی ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا ستر عورتوں کے غم کے برابر جن کے بچے مر گئے ہوں اس حضرت یوسفؑ نے فرمایا کیا آپ کو کچھ معلوم ہے کہ میری ان سے ملاقات بھی کبھی ہو گی حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا ہاں اس پر حضرت یوسفؑ کا دل خوش ہو گیا اور فرمایا مجھے جو بھی مصیبت پہنچی ہے اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں اگر میں یعقوبؑ کو دیکھ لوں۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے یعنی اللہ کی حکمت و رحمت کو جتنا میں جانتا ہوں کہ وہ پکارنے والے کو نامراد نہیں چھوڑتا اور جو بے قراری کے ساتھ اس کی طرف لوٹتا ہے اس کو رد نہیں کرتا یہ مطلب ہے کہ از روئے الہام یوسفؑ کے زندہ ہونے سے جو میں واقف ہوں تم واقف نہیں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عزرائیلؑ حضرت یعقوبؑ کی ملاقات کو گئے حضرت یعقوبؑ نے پوچھا اے پاکیزہ خوشبو اور حسین صورت والے فرشتے کیا آپ نے میرے بچے کی روح قبض کی ہے حضرت عزرائیلؑ نے جواب دیا، نہیں۔ یہ سن کر حضرت یعقوبؑ کو کچھ سکون ہو گیا اور آپ کو یوسف کے دیکھنے کی تمنا ہوئی۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا ہے میں اور تم سب آئندہ ان کو ضرور سجدہ کریں گے۔ سدی نے بیان کیا جب بیٹوں نے باپ کو بادشاہ کے حسن سلوک کی اطلاع دی تو آپ کو یوسف کے زندہ ہونے کا خیال پیدا ہو گیا اور ملنے کی خواہش بھی اور فرمایا شاید وہ یوسف ہو۔ ابن ابی حاتم نے نضر بن عربی کا بیان نقل کیا ہے نضر نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو ۲۴ سال حضرت یوسفؑ کے زندہ یا مردہ ہونے کی کوئی خبر نہیں ہوئی آخر ایک روز موت کا فرشتہ انسانی شکل میں آپ کے سامنے آ گیا اور حضرت نے دریافت کیا آپ کون ہیں ملک الموت نے کہا میں موت کا فرشتہ ہوں حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں تم کو یعقوبؑ کے معبود کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم نے یوسف کی جان قبض کر لی ملک الموت نے جواب دیا نہیں۔ یہ جواب سن کر حضرت نے فرمایا

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ میرے بیٹو! جاؤ یوسف کی اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو اللہ کی رحمت سے ناامید تو کافر لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے تحسسوا کا ترجمہ کیا تلاش کرو۔ قاموس لغت میں تحسس کا معنی ہے کسی کی کسی اطلاع کی جستجو۔ رَوح سے مراد ہے رحمت بعض کے نزدیک مراد ہے مصیبت سے نجات اور خدا کی عطا کردہ خوشی۔

الکافرون یعنی وہ لوگ جو اللہ کی ذات و صفات کو نہیں جانتے اور انکار کرتے ہیں۔ اللہ کو پہچاننے والا اس کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہوتا۔

غرض سب بھائی لوٹ کر مصر کو گئے اور حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝

پھر جب یوسف کے پاس پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے بڑی تکلیف پہنچی ہے اور ہم کچھ نکمی چیز لائے ہیں سو آپ پورا غلہ دے دیجئے اور ہم کو خیرات سمجھ کر دے دیجئے بے شک اللہ خیرات دینے والوں کو جزائے خیر دیتا ہے۔

الضر بھوک کی شدت ، تنگ حالی کا مراد ہی ترجمہ حضرت ابن عباسؓ نے کیا ہے۔ مزجٰۃ ردی ناچلنے والے درہم۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ابو عبید اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ کی روایت میں آیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے لیکن سعید بن منصور اور ابن المنذر اور ابوالشیخ نے کہا۔ عکرمہ نے اس کا ترجمہ کیا تھوڑے درہم۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ کی روایت ہے کہ عبداللہ بن حارث نے کہا (بضاعۃ مزجاۃ سے مراد ہے) صحرائی لوگوں کا مال سانپ والی اور گھی۔ روایت میں گھی کی جگہ پنیر آیا ہے۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابو صالح کے حوالہ سے لکھا ہے چراگاہ کی گھاس اور صنوبر کی لکڑی۔

ابن النجار نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ستو کے ستو تھے۔ بعض علماء نے کہا کچے چمڑے اور جوتے تھے۔ ازجاء (مصدر باب افعال۔ مزجاۃ اسم مفعول مؤنث) کا اصل لغوی معنی ہے دھکا دینا اور ہنکانا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا کہ اللہ بادل کو ہنکاتا ہے چلاتا ہے۔ ردی اور کھوٹوں کو بھی مزجاۃ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کوئی ان کو لیتا نہیں ان کو پھینکا جاتا ہے اسی طرح اگر بیش قیمت سامان کے عوض تھوڑے درہم دیے جائیں تو ان کو بھی نیاچار کر دیے جاتے ہیں کیونکہ

حالت دوسری ردی چیزوں کی ہے کہ ان کو بطور قیمت کوئی شخص نہیں لیتا اگر بائع خود چشم پوشی کرے اور قبول کرلے تو دوسری بات ہے۔

فاوف لنا یعنی ان قلیل یا کھوٹے درہموں میں غلہ ہم کو اتنا ہی پورا پورا دے دیجئے جتنا اس سے پہلے آپ نے کھرے درہموں میں دیا تھا اور جو قیمت کم رہ جائے وہ بطور خیرات آپ چھوڑ دیجئے۔ اکثر مفسروں نے تصدق علینا کا تفسیری مطلب یہی بیان کیا ہے لیکن ابن جریج اور ضحاک نے کہا کہ درخواست تصدق کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی خیرات میں ہمارے بھائی کو واپس کر دیجئے۔ جزا دینے سے مراد ہے دنیا اور آخرت میں اچھا بدلہ دینا۔ اجزاء اور تصدق دونوں کا معنی ہے مہربانی کرنا حالت سفر میں صلوٰۃ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اللہ کی طرف سے صدقہ (مہربانی) ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے تم اللہ کی مہربانی کو قبول کرو۔ رواہ البخاری۔ لیکن عرف شرع میں تصدق ایسی مہربانی کرنے کو کہتے ہیں جس کا مقصد ثواب کی طلب اور اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو اور یہ تصدق اسی شرعی عرف پر مبنی ہے۔

حسن بصریؒ کا یہ قول کہ جب آپ نے ایک آدمی کو ان الفاظ میں دعا کرتے سنا اے اللہ مجھ پر صدقہ کر تو فرمایا اللہ تصدق نہیں کرتا تصدق تو وہ کرتا ہے جو ثواب کا طلبگار ہو تم یوں دعا کرو اے اللہ! مجھے عطا فرما مجھ پر مہربانی کر حسن بصری نے جو اللہ کی طرف صدقہ دینے کی نسبت سے انکار کیا اور ممانعت فرمائی تو آپ کی مراد اس سے شرعی صدقہ و خیرات تھی جو طلب ثواب کے لئے ہوتی ہے (لغوی اعتبار سے اس کا معنی صحیح ہے لغت میں تصدق کا معنی ہے مہربانی کرنا پس اللہ سے مہربانی کی درخواست کرنا صحیح ہے)

ضحاک نے کہا بادشاہ سے برادران یوسف نے یہ نہیں کہا اللہ آپ کو جزا دے گا کیونکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ شاہ مصر مومن ہے یا نہیں (اور اللہ کی طرف سے آخرت میں جزاء خیر صرف مومن کے لئے مخصوص ہے) اصل میں ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شاہ مصر خیرات بھی دے گا یا نہیں۔

فائدہ

سفیان بن عیینہ سے کسی نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور پیغمبر کے لئے بھی صدقہ حرام تھا فرمایا نہیں کیا تم نے آیت وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ نہیں سنی۔ کذا اخرج ابن جریر۔ میں کہتا ہوں سفیان نے اس آیت سے استدلال کیا کہ دوسرے پیغمبروں کے لئے صدقہ لینا جائز تھا۔ مگر یہ استدلال اس وقت صحیح ہوگا جب حضرت یوسف کے بھائیوں کا نبی ہونا ثابت ہو جائے۔

(یہ فقیر کہتا ہے کہ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر جن میں حضرت یعقوبؑ بھی شامل تھے کچھ صدقہ کیجئے حضرت یعقوبؑ عَلَيْنَا کی ضمیر سے مستثنیٰ نہیں۔ اس صورت میں سب بھائیوں کی نبوت ثابت ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت یعقوبؑ تو مسلم النبوت نبی تھے۔ مترجم)

بھائیوں کا یہ دردناک کلام سن کر حضرت یوسفؑ کے دل میں رقت آگئی آنسو ٹپک پڑے اور پوشیدہ راز ظاہر ہو گیا اس لئے

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝ بولے کیا وہ بھی تم کو یاد ہے جو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا جبکہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا۔ یعنی جو ظلم تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کہ یوسفؑ کو لے جا کر اس کے بھائی کو اکیلا کر دیا اور طرح طرح سے اس کو ذلیل کیا کہ وہ بے چارا اپنی ذلت کو زبان پر بھی نہیں لا سکتا تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو برا سلوک اور بے جا حرکت تم نے کی وہ بھی تم کو یاد ہے اس سے توبہ کرو۔

اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ اس وقت اپنے فعل کی برائی سے تم ناواقف تھے یا اس کے نتیجے سے ناواقف تھے حضرت یوسفؑ کا مقصد تو توبہ کی ترغیب دینا اور بھائیوں پر مہربانی کا اظہار کرنا تھا ڈانٹنا اور ملامت کرنا مقصود نہیں تھا۔ آیت لَا تَثْرِيْبَ

عَلِمْتُمْ الْیَوْمَ میں صراحت ہے کہ ملامت کرنا مقصود نہ تھا۔ کلبی نے حضرت یوسفؑ کے اس قول کی یہ وجہ بیان کی کہ آپ نے بھائیوں سے جب مالک بن دعر کا یہ قول نقل کیا گیا کہ میں نے کنوئیں کے اندر ایک پڑا غلام پایا تھا جس کو اتنے درہم میں میں نے خرید لیا تو بھائیوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا اے بادشاہ ہم نے ہی وہ غلام بیچا تھا۔ حضرت یوسفؑ کو یہ بات سن کر غصہ آیا اور آپ نے سب بھائیوں کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ شاہی آدمی ان کو قتل کرنے لے چلے یہوداہ نے منہ پھیر کر دیکھا اور کہا یعقوب پر ہم میں سے ایک کے نہ ہونے کا اتنا غم پڑا اور اتنا روئے کہ نظر جاتی رہی جب سب بیٹوں کے مارے جانے کی ان کو اطلاع ملے تو ان کا کیا حال ہوگا۔ پھر سب بھائیوں نے کہا اگر آپ ایسا ہی کر رہے ہیں تو ہمارے والد کو ہمارا یہ سامان بھیج دیجئے وہ فلاں مقام پر رہتے ہیں اس وقت حضرت یوسفؑ کو رحم آگیا اور آپ رونے لگے اور قول مذکور کہا۔

عبداللہ بن یزید بن ابی فروہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جب سنا کر بنیامین کو روک لیا گیا تو ایک خط لکھ کر بیٹوں کے ہاتھ حضرت یوسفؑ کو بھجوایا بیٹوں کے تیسرے پھیرے کا ذکر ہے۔ یعقوب اسرائیل اللہ (عبداللہ) بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے شاہ مصر کے نام۔

حمد و ستائش کے بعد واضح ہو کہ ہم ایسے گھرانے والے ہیں جو ہمیشہ سپرد مصائب رہے ہیں میرے دادا ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو آگ میں ڈالا گیا پھر اللہ نے اس آگ کو ان کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا میرے باپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کی گردن پر چھری رکھ دی گئی تاکہ ان کو ذبح کر دیا جائے مگر اللہ نے ان کا فدیہ (جنت سے مینڈھے کی شکل میں) بھیج دیا (اور ان کو محفوظ رکھا) اب رہا میں تو میرا ایک بیٹا تھا جو سب اولاد سے مجھے پیارا تھا اس کے بھائی اس کو جنگل کو لے گئے پھر شام کو اس کا خون آلودہ کرتہ لا کر مجھے دے دیا اور کہا اس کو بھیڑیئے نے کھا لیا۔ اس پر روتے روتے میری آنکھیں جاتی رہیں پھر میرا ایک بیٹا اور تھا جو مرحوم کا ماں جایا بھائی تھا میں اس کو دیکھ کر تسلی حاصل کر لیتا تھا اب آپ نے اس کو روک لیا اور یہ خیال کیا کہ اس نے چوری کی ہے ہم ایسے خاندان والے ہیں جو چوری نہیں کرتے نہ چور ہمارے ہاں پیدا ہوتا ہے اگر آپ میرے بیٹے کو مجھے واپس کر دیں تو بہتر ہے ورنہ آپ کو ایسی بد دعا دوں گا کہ اس کا اثر آپ کی ساتویں نسل تک پڑے گا۔ حضرت یوسفؑ نے خط پڑھا تو آنسوؤں کو روک نہ سکے اور سامنے آکر فرمایا هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ یعنی جب کہ تم کو معلوم نہ تھا کہ یوسفؑ آخر میں کس مرتبہ تک پہنچے گا اس وقت تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا کچھ معلوم بھی ہے۔ بعض لوگوں نے جَاهِلُونَ کا ترجمہ کیا ہے قصوروار گنہگار۔ حسن بصریؒ نے ترجمہ کیا جب کہ تم جوان تھے اور جوانی کی جہالت میں مبتلا تھے اس وقت تم نے کیا کیا تھا۔

قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنتَ يُوسُفُ ۖ کہنے لگے کیا سچ مچ آپ ہی یوسفؑ ہیں۔ یہ استفہام تقریری ہے (کیا واقعی آپ ہی یوسفؑ ہیں) ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت یوسفؑ پردے کے پیچھے سے کلام کرتے تھے پھر جب هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ فرمایا تو پردہ ہٹا دیا اور نقاب اٹھا دیا اس وقت بھائیوں نے پہچان لیا۔

میں کہتا ہوں قصہ مذکورہ کا تفصیلی بیان ابن اسحاق کے اس قول سے انکار کر رہا ہے اور یہ بھی بعید از فہم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس بات کو کہتے وقت آپ مسکرا دیئے مسکرانے سے موتیوں کے ہار کی طرح اگلے دانت سامنے آگئے اور بھائیوں نے دیکھ کر ان کو یوسفؑ کے دانتوں کی طرح قرار دیا۔

عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ بھائی یوسفؑ کو اس وقت تک نہ پہچان سکے جب تک آپ نے سر سے تاج نہ اتار دیا۔ آپ کے سر کے اوپر ایک جانب تل تھا جو موروثی تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے بھی تھا حضرت اسحاقؑ کے بھی تھا اور (حضرت اسحاق کی والدہ) حضرت سارہ کے بھی تھا علامت کو پہچان کر بھائی بول اٹھے بلاشبہ آپ یوسفؑ ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے کہا کہ بھائیوں نے (یقین کے ساتھ نہیں بلکہ) یونہی گمان سے کہا تھا۔

قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ۖ یوسفؑ نے کہا میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا ماں جایا بھائی ہے۔ بھائیوں نے تو

صرف آپ کو دریافت کیا تھا۔ مگر آپ نے اپنے مزید تعارف اور بھائی کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے بھائی کا بھی ذکر کر دیا اور واضح کر دیا کہ اللہ نے جو احسان کیا وہ ہم دونوں پر کیا۔

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا　بلاشبہ اللہ نے ہم دونوں پر کرم فرمایا کہ سلامتی اور عزت کے ساتھ دونوں کو یکجا کر دیا اور ملا دیا۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝　واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا اور مصائب و طاعات پر صبر کرتا ہے تو اللہ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر نہیں کھوتا۔

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے ادائے فرائض کرتا ہے اور معاصی سے اجتناب کرتا ہے اور مصائب پر صبر کرتا ہے اور ادائے طاعات پر پابند رہتا ہے اور گناہوں سے اپنے آپ کو روکے رکھتا ہے تو ایسے لوگوں کا اجر اللہ ضائع نہیں کرتا نہ دنیا میں نہ آخرت میں وہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے۔ بجائے اَجْرَهُمْ کے اَلْمُحْسِنِيْنَ کا لفظ ذکر کر کے بتانا چاہا ہے کہ نیکوکار وہی ہے جو متقی بھی ہو اور صابر بھی۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ۝　بولے بخدا بلاشبہ اللہ نے آپ کو ہم پر برتری عطا فرمائی اور ہم یقیناً خطاوار تھے۔ یعنی معذرت پیش کرتے ہوئے انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ جمالی صورت اور کمالی سیرت اور تمام دنیوی و اخروی فضائل کے لحاظ سے اللہ نے آپ کو ہم پر برتری عطا فرمائی اور ہم نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس کے ہم خطاوار ہیں۔ خٰطِئِيْنَ قصداً خطا کرنے والے) خَطِئَ قصداً خطا کی اور اَخْطَاَ (باب افعال) بلا قصد خطا کی۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝　یوسف نے کہا آج تم پر کوئی الزام نہیں (یعنی میں نے معاف کیا) اللہ تمہارا قصور معاف کرے وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ (امید ہے معاف کر دے گا)

تَثْرِيْبَ: آنکھوں کی چربی چھیل دینا ثرب آنکھوں پر چھائی ہوئی چربی بطور مجاز کسی کو لعنت ملامت کرنا جس سے مجرم کی آبروریزی اور توہین ہو رہی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج جبکہ میں تم لوگوں کو لعنت ملامت کر سکتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہتا تو پھر آئندہ مجھ سے برا بھلا کہنے کا تو احتمال ہی نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اقرار کے بعد میں نے تم کو معاف کر دیا اللہ تم کو معاف کرے وہ ارحم الراحمین ہے اور میں نادار محتاج ہوں جب میں نے معاف کر دیا تو اللہ تو بے نیاز اور غفور ہے وہ ضرور معاف کر دے گا اور توبہ کرنے والے پر مہربانی فرمائے گا۔

بیضاوی نے لکھا ہے جب بھائیوں نے یوسف کو پہچان لیا تو کہا آپ صبح شام ہم کو کھانے پر بلاتے ہیں اور ہم سے جو آپ کے معاملے میں قصور ہو گیا تھا اس کی وجہ سے ہم کو آپ سے شرم آتی ہے۔ حضرت یوسف نے کیا کریمانہ جواب دیا، فرمایا مصر والے مجھے گزشتہ نظر ہی سے دیکھتے تھے لوگ کہتے تھے سبحان اللہ ایک غلام جو بیس درہم میں بیچا گیا تھا اللہ نے اس کو کہاں پہنچایا اب جو لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں غلام نہیں تمہارا بھائی ہوں اور حضرت ابراہیم کا پوتا ہوں تو تمہاری وجہ سے مجھے عزت مل گئی اور مصر والوں کی آنکھوں میں میری عظمت پیدا ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے جب حضرت یوسف نے اپنا تعارف کرا دیا تو پھر باپ کا حال پوچھا اور فرمایا میرے بعد میرے باپ کی کیا حالت ہوئی، بھائیوں نے بتایا باپ کی آنکھیں روتے روتے جاتی رہیں۔ حضرت یوسف نے اپنا کرتہ ان کو دیا اور باپ کو بلا لاؤ اور فرمایا

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ　میرا یہ کرتہ لے جا (کر) میرے باپ کے منہ پر ڈال دو (اس سے) ان کی بینائی آ جائے گی۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ میرے پاس بینا ہو کر آ جائیں گے۔ حسن نے کہا حضرت یوسف کو اللہ نے اطلاع دے دی ہوگی جب ہی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بینا ہو جائیں گے اللہ کی طرف سے اطلاع پانے کے بغیر وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ مجاہد نے کہا حضرت جبرئیل نے حضرت یوسف کو اللہ کی طرف سے حکم دیا تھا۔

حضرت یعقوب کو اپنا کرتہ بھیج دیجئے یہ وہ قمیص تھی جو حضرت ابراہیم کا تھا جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو کپڑے اتار لئے گئے تھے اس وجہ سے جبرئیل نے جنت سے ایک ریشمی قمیص لا کر آپ کو پہنا دیا تھا یہ کرتہ حضرت ابراہیم کے پاس رہا پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت اسحاق کو میراث میں ملا اور حضرت اسحاق کے بعد حضرت یعقوب کو پہنچا۔ یوسف جب جوان ہو گئے تو حضرت یعقوب نے وہ کرتہ ایک نلکی میں سربند کر کے بطور تعویذ حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا تا کہ آپ کو نظر نہ لگے ہر وقت وہ یوسف کے گلے میں رہتا تھا جب آپ کو کرتہ اتار کر کنویں میں ڈالا گیا تو حضرت جبرئیل نے آ کر تعویذ کھول کر اس میں سے کرتہ نکال کر حضرت یوسف کو پہنا دیا پھر حضرت یوسف جب بھائیوں سے مذکورہ بالا گفتگو کر رہے تھے تو حضرت جبرئیل نے آ کر کہا وہ قمیص بھیج دیجئے اس کے اندر جنت کی خوشبو ہے جس دکھی اور بیمار پر اس کو ڈالا جائے گا وہ تندرست ہو جائے گا اس اطلاع کے بعد آپ نے وہ کرتہ بیٹے یہودا کے سپرد کر دیا اور فرمایا اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو بینا ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں حضرت مجدد قدس سرہ کے کشف سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ حسن یوسف دنیوی چیزوں سے نہ تھا بلکہ آپ کا حسن اور وجود جنت کی چیزوں کی جنس سے تھا تو اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اس کرتے کو جنت سے آیا ہوا مانیں بلکہ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حضرت یوسف کا پہنا ہوا تھا جو یوسف تو خود جنت کی چیزوں کی جنس میں سے تھا (آپ کی ہستی اس عادی دنیا کی چیز نہ تھی)۔

وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾ اور آپ (سب بھائی اور باپ) اپنے سب گھر والوں کو (عورتوں کو، بچوں کو، خادموں کو) میرے پاس لے آئیں۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾

اور جب قافلہ چلا تو ان کے باپ نے کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے کی وجہ سے بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسف کی خوشبو آ رہی ہے۔

یعنی جب وہ قافلہ جس میں حضرت یوسف کا قمیص تھا اور مصر سے کنعان جانے کے لئے چلا تھا شہر کی آبادی سے نکلا تو حضرت یعقوب نے حاضرین سے کہا مجھے یوسف کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اگر تم سٹھیایا ہوا نہ قرار دو تو میں کہتا ہوں کہ یوسف کی ملاقات ہونے والی ہے۔ ریح یوسف فرمایا ریح قمیص یوسف نہیں فرمایا اس سے مترشح ہو رہا ہے کہ جنت کی خوشبو یوسف کی ہی خوشبو تھی، قمیص یوسف کی نہ تھی۔

بغوی نے لکھا ہے باد صبا نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ بشارت دینے والے کے پہنچنے سے پہلے یوسف کی خوشبو کو پہنچا دے۔

مجاہد نے کہا تین روز کی مسافت سے یوسف کی خوشبو یعقوب کو پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابن عباس کے ایک قول میں آٹھ راتوں کی مسافت کا ذکر آیا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہوا قمیص یوسف کی خوشبو لے کر یعقوب تک پہنچی جس سے آپ کو جنت کی خوشبو محسوس ہوئی اس سے معلوم ہو گیا کہ زمین پر سوائے قمیص کی خوشبو کے جنت کی اور کوئی خوشبو نہیں تھی اسی لئے آپ نے اِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ فرمایا۔ تُفَنِّدُونِ کا معنی ہے بڑھاپے کی وجہ سے عقل میں نقصان آ جانا اور تفنید کا باب تفعیل ہے، معنی ہے کسی کو سٹھیایا ہوا قرار دینا۔ اسی لئے عجوز مفندہ نہیں کہا جاتا کیونکہ عورت کا نقصان عقل ذاتی ہوتا ہے صرف بڑھاپے کی وجہ سے نہیں ہوتا عورت: ناقص العقل فطرتاً ہوتی ہے۔

لَوْلَا کا جواب محذوف ہے یعنی اگر تم مجھے سٹھیایا ہوا نہ سمجھو تو مجھے سچا جانو میں کہتا ہوں کہ یوسف کی ملاقات قریب ہو گی۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾ وہ کہنے لگے آپ تو اپنی اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں۔

ضلال سے مراد یہ ہے کہ یوسف کی محبت ان کی یاد کی کثرت اور امید وصال رکھنے کی وجہ سے آپ کی عقل صحیح راستے سے ہٹ

گئی ہے اور آپ پرانی غلطی میں مبتلا ہیں۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ　　پھر جب بشارت دینے والا (یوسف کے پاس سے) یعقوب کے پاس پہنچا تو کرتہ یعقوب کے چہرے پر ڈال دیا جس سے فوراً یعقوب لوٹ کر بینا ہو گئے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا قافلے کے پہنچنے سے پہلے بشارت دہندہ پہنچا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ یہودا تھا۔ سدی کا بیان ہے یہودا نے کہا جب میں خون آلودہ کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان کو اطلاع دی تھی کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو اب میں ہی یہ کرتہ لے کر جاؤں گا اور اطلاع دوں گا کہ یوسف زندہ ہیں جیسے ان کو غم دیا تھا ویسے ہی ان کو خوشی بھی کروں گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کرتہ لے کر یہودا ننگے سر ننگے پاؤں دوڑتا ہوا نکل چلا صرف سات روٹیاں ساتھ لی تھیں وہ بھی پوری نہ کھا سکا اور اسی فرسخ کی مسافت طے کر کے باپ کے پاس پہنچا۔ بعض نے کہا خوش خبری دینے والا مالک بن دعر تھا فَارْتَدَّ بَصِيْرًا کا معنی یہ ہے کہ یعقوبؑ دوبارہ بینا ہو گئے بلکہ دوسرے طاقتور اور بڑھاپے کے بعد جوان ہو گئے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝　　یعقوب نے کہا کیا میں نے تم لوگوں سے نہیں کہہ دیا تھا کہ اللہ کی جو باتیں میں جانتا ہوں تو نہیں جانتے۔ یعنی یوسفؑ کے زندہ ہونے اور اس سے ملاقات ہونے کی اطلاع میں نے تم کو پہلے ہی دے دی تھی یا میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو اور مجھے یوسفؑ کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔

بغوی کا بیان ہے روایت میں آیا ہے حضرت یعقوبؑ نے پوچھا یوسفؑ کس حال میں ہے بشارت دینے والے نے جواب دیا وہ مصر کے بادشاہ ہیں حضرت نے فرمایا بادشاہ ہے تو میں کیا کروں میں پوچھتا ہوں تم نے کس مذہب پر ان کو چھوڑا بشیر نے کہا اسلام پر، فرمایا اب نعمت کامل ہو گئی۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِــِٕيْنَ ۝　　بیٹوں نے کہا ابا ہمارے گناہوں کو معاف کر دینے کی اللہ سے دعا کر دیجئے کوئی شک نہیں کہ ہم خطاوار تھے یعنی ہم اپنی خطا کا اقرار کرتے ہیں آپ کے اور یوسفؑ کے حق میں ہم نے جو قصور کیا اس کی معافی کی دعا اللہ سے کر دیجئے۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝　　یعقوبؑ نے کہا میں اپنے رب سے تمہارے قصور کے معاف کر دینے کی عنقریب درخواست کروں گا بلاشبہ وہ غفور و رحیم ہے (معاف فرما دے گا)۔

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ حضرت یعقوب نے سحر ہونے تک توقف رکھا کیونکہ پچھلی رات رہتے ہمارا رب دنیا کے آسمان پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کون ہے جو مجھے پکارے میں اس کی دعا قبول کروں کون ہے جو مجھ سے سوال کرے میں اس کو عطا کروں اور کون ہے جو مجھ سے مغفرت کی درخواست کرے اور میں اسے معاف کروں۔ رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرۃ۔ غرض جب سحر کا وقت آیا تو حضرت یعقوب نماز پڑھنے کو کھڑے ہو گئے اور نماز سے فارغ ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی اے اللہ مجھ سے بے صبری یوسف کے معاملے میں ہو گئی تھی تو معاف فرما دے اور میرے بیٹوں نے جو کچھ میرے اور یوسف کے ساتھ کیا اس کو بھی بخش دے۔ اللہ نے وحی بھیجی میں نے تم کو اور تمہارے لڑکوں کا قصور بھی معاف کر دیا۔

عکرمہ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ سے یہ مراد ہے کہ شب جمعہ میں میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔ وہب نے کہا بیس سال سے زیادہ مدت تک ہر شب جمعہ میں حضرت یعقوب لڑکوں کے لئے استغفار کرتے رہے۔ طاؤس نے کہا شب جمعہ کی سحر میں حضرت یعقوب نے دعا کی اور وہ رات اتفاق سے عاشورہ محرم کی بھی رات تھی۔ شعبی نے کہا سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ کا یہ مطلب ہے کہ میں یوسفؑ سے معاف کر دینے کو کہوں گا وہ معاف کر دیں گے تو پھر اللہ سے تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ خدا اسی وقت معاف کرتا ہے جب مظلوم بھی اپنا حق معاف کر دے۔

بعض علماء نے کہا حضرت یعقوبؑ جاننا چاہتے تھے کہ بیٹوں نے سچے دل سے توبہ کی ہے یا نہیں یا یہ بات معلوم ہونے تک آپ نے دعا کو موخر کر دیا۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا کہ بشارت دینے والے قاصد کے ساتھ حضرت یوسفؑ نے دو سو اونٹنیاں اور بکثرت سامان بھی بھیجا تھا۔ تاکہ حضرت تمام اہل و عیال و متعلقین کو لے کر مصر آجائیں چنانچہ آپ مصر جانے کو تیار ہو گئے اور زن و مرد بہتر اور مسروق کے بقول ۳۹۰ شخص روانہ ہو گئے جب یہ قافلہ مصر کے قریب پہنچا تو حضرت یوسفؑ اور بادشاہ چار ہزار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے روانہ ہو گئے۔ مصر کے اور لوگ بھی حضرت یوسفؑ کی معیت میں استقبال میں شریک تھے، حضرت یعقوبؑ یہودا پر سہارا دیئے پیدل آرہے تھے، سواروں اور دوسرے لوگوں کو ملاحظہ فرمایا تو دریافت کیا یہودا کیا یہ فرعون مصر ہے، یہودا نے جواب دیا نہیں ابا یہ تو آپ کے صاحبزادے ہیں۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ جب یعقوبؑ اور ان کے گھر والے یوسفؑ کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔

میں کہتا ہوں شاید حضرت یوسفؑ مصر سے روانہ ہو کر کسی خاص مقام تک پہنچ گئے اور وہاں کسی خیمہ یا محل میں اتر کر رک گئے تاکہ قافلہ وہاں پہنچ جائے تو اس کا استقبال کریں اور حضرت یعقوبؑ اپنے متعلقین کے ساتھ اسی مقام پر پہنچ کر حضرت یوسفؑ کے پاس (قصر یا خیمہ کے اندر) داخل ہوئے ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے جب یوسفؑ اور یعقوبؑ ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے تو حضرت یوسفؑ نے سلام کرنا چاہا لیکن حضرت جبرئیلؑ نے روک دیا اور فرمایا پہلے وہ سلام کریں پھر آپ کرنا۔

میں کہتا ہوں شاید یہ اس محبوبیت الٰہیہ کا اثر تھا جو حضرت یوسفؑ میں نمودار ہو گئی تھی آخر حضرت یعقوبؑ نے ہی ابتدائی سلام کیا اور کہا اے غموں کے دور کرنے والے تجھے سلامتی ہو۔

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ ماں باپ سے مراد ہیں حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی خالہ لیّا جس طرح دوسری آیت میں چچا کو اللہ نے باپ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اسی طرح اس آیت میں خالہ کو ماں قرار دیا ہے۔ یا یہ وجہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کی والدہ کے بعد لیّا سے نکاح کر لیا تھا اور لیّا ہی نے آپ کی پرورش کی تھی اور پرورش کرنے والی کو ماں کہا ہی جاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کی ماں بنیامین کی ولادت کے وقت مر چکی تھیں۔

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ ماں زندہ تھیں اور ابوین سے ماں باپ ہی مراد ہیں۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت یوسفؑ کی والدہ کو زندہ کر دیا تھا اور وہ حضرت یعقوبؑ کے ساتھ مصر آئی تھیں۔

بغوی نے لکھا ہے روایت ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اتر کر معانقہ کیا، ثوری نے کہا ہر ایک دوسرے کے گلے سے ملا اور دونوں رونے لگے یوسفؑ نے کہا ابا میری وجہ سے آپ اتنا روئے کہ آپ کی نظر جاتی رہی کیا آپ کو یقین نہ تھا کہ قیامت کے دن ہم دونوں ضرور ملیں گے حضرت یعقوبؑ نے فرمایا بیٹے یقین کیوں نہ تھا مجھے تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں تیرا مذہب بدل نہ گیا ہو اور پھر قیامت کے دن میرے اور تیرے درمیان رکاوٹ حائل ہو جائے۔

وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ اور کہا چلو مصر کے اندر امن کے ساتھ اللہ نے چاہا تو رہو گے۔

یعنی تم کو شہر کے اندر داخل ہونے کے اجازت نامے کی ضرورت نہیں۔ شاہی اجازت نامہ کے بغیر اس زمانہ میں کوئی مصر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ اب قحط اور دوسری مصائب کا آپ لوگوں کو کوئی اندیشہ نہیں۔

جنگل سے یہاں لے آیا یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا باوجودیہ کہ کنواں شدید ترین قید خانہ تھا لیکن حضرت یوسفؑ نے کرم ذاتی سے کام لے کر اس کا ذکر نہیں کیا تاکہ بھائیوں کو شرمندگی نہ ہو اس کے علاوہ جیل خانہ سے رہائی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی کیا کہ کنویں سے نکل کر تو غلام ہونا پڑا اور عورتوں کے پھندے میں گرفتار ہونے سے سابقہ پڑا اور قید خانہ سے نکل کر بادشاہ بنائے گئے (تو جیل خانہ سے نکالنا اللہ کا عظیم الشان احسان ہوا) اَلْبَدْوِ: صحرائی میدان جہاں چرواہے اور صحرائی لوگ اپنے جانوروں کو لے کر رہتے ہیں۔ نَزَغَ: یعنی ہمارے درمیان فساد ڈلوا دیا۔ یہ لفظ نَزَغَ الرائض الدابۃ سے ماخوذ ہے ایڑ مار کر سوار نے گھوڑے کو اکسایا اور چلایا۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۝ بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی عمدہ تدبیر کرتا ہے یقیناً وہی بڑے علم اور حکمت والا ہے۔ یعنی اس کی تدبیر لطیف ہے دشوار ترین امور میں بھی کارفرمائی اور نفوذ اسی کی حیثیت کا ہے۔

بغوی نے لَطِیْفٌ کا ترجمہ کیا ہے صاحب لطف یعنی مہربان۔ حقیقت میں لطیف اس محسن کو کہتے ہیں جو دوسروں تک نہایت آہستگی کے ساتھ اپنا احسان پہنچا دے۔ هُوَ الْعَلِیْمُ یعنی اپنی مصلحتوں اور تدبیروں کی حقیقت سے وہی واقف ہے اور وہی حکیم ہے۔ یعنی اس کا ہر کام اسی وقت اور اسی طرح پر ہوتا ہے جیسا حکمت کا تقاضا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے ہر چیز کے ذخیرے اور خزانے کی ماں باپ کو سیر کرائی کاغذ کا ذخیرہ دیکھ کر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اتنا کثیر اندوختہ کاغذ کا تیرے پاس پڑا ہے اور تو نے ایک خط صرف آٹھ منزل کے فاصلے پر مجھے نہیں بھیجا۔ حضرت یوسفؑ نے جواب دیا جبرئیلؑ نے مجھے کوئی ہدایت کی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا تو نے جبرئیلؑ سے اس کی وجہ کیوں دریافت نہیں کی۔ حضرت یوسفؑ نے کہا آپ حضرت جبرئیلؑ سے زیادہ بے تکلف ہیں آپ ہی دریافت فرمالیں حضرت یعقوبؑ نے جبرئیلؑ سے (اطلاعی خط بھیجنے کی ممانعت کی) وجہ دریافت کی حضرت جبرئیلؑ نے کہا مجھے اللہ نے ایسا ہی حکم دیا تھا کیونکہ آپ نے وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ کہا تھا اس پر اللہ نے فرمایا تم کو بھیڑیے کا تو اندیشہ ہوا اور میرا خوف نہیں ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے اہل تاریخ کہتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کے پاس مصر میں ۲۴ سال انتہائی امن چین اور قابل رشک خوشحالی کے ساتھ گزارے پھر مصر ہی میں آپ کی وفات ہوگئی وفات کے وقت حضرت یوسفؑ کو وصیت کی کہ مجھے لے جا کر میرے باپ اسحٰقؑ کے پاس دفن کرنا یوسفؑ نے وصیت کی تعمیل کی اور لے جا کر شام میں دفن کر دیا پھر مصر لوٹ آئے۔

امام احمد نے الزہد میں مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت یعقوبؑ جب بہت کمزور اور اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہوگئے تو اپنے بیٹے یوسفؑ سے فرمایا کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈال کر میری پشت پر ہاتھ رکھ کر رب یعقوبؑ کی قسم کھا کر اقرار کرو کہ مجھے میرے باپ دادا کے ساتھ دفن کرو گے میں زندگی کے کاموں میں ان کا شریک رہا تو مرنے کے بعد مجھے انہی کے قبرستان کے ساتھ دفن کرنا۔ جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت یوسفؑ نے ایسا ہی کیا کنعان میں لے جا کر آباؤ اجداد کے ساتھ دفن کر دیا۔ سعید بن جبیرؓ نے فرمایا ساز کے تابوت میں حضرت یعقوبؑ کی میت کو بیت المقدس لے گئے اتفاق ایسا ہوا کہ اسی روز عیص کا بھی انتقال ہو گیا دونوں کو ایک ہی مقبرے میں (یا ایک ہی قبر میں) دفن کیا گیا دونوں کی عمر ۱۴۷ برس ہوئی عیص اور یعقوب ساتھ ہی ایک بطن سے پیدا ہوئے تھے (اگرچہ توام نہ تھے) جب حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی امور کامل طور پر درست ہوگئے تو آپ نے خیال کیا یہ راحت اور نعمت باقی رہنے والی تو ہے نہیں۔ دنیا کی کسی نعمت کو بقا نہیں اس لئے حسن خاتمہ کی دعا کی اور کہا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۝

اے میرے رب تو نے مجھے سلطنت کا ایک بڑا حصہ عطا فرمایا اور خوابوں کی تعبیر دینا سکھائی اے آسمانوں اور زمین

کے پیدا کرنے والے تو میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ مجھ کو پوری فرماں برداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لے اور نیک بندوں کے ساتھ شامل کر دے۔

مِنَ الْمُلْكِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی سلطنت کا حصہ یعنی مصر کی حکومت۔ جس شخص کے ہاتھ میں نظم و نسق ہو اس کے اقتدار کی ہمہ گیری کو ملک کہتے ہیں۔ مِنْ تَاْوِیْلِ (علم) کی مِنْ تبعیضیہ ہے) یعنی کچھ کچھ خواب کی تعبیر دینی۔ مکمل تعبیر کا علم تو حضرت یوسفؑ کو بھی نہیں دیا گیا تھا (اللہ کا علم کامل ہے) وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ۔ فَاطِرَ بمعنی پیدا کرنے والا ایجاد کرنے والا۔ وَلِیّ یعنی ذمہ دار، کارساز، دوست یا وہ ذات جو دونوں جہان میں نعمت عطا فرمانی اور کارسازی کرتی ہے۔ اور ملک فانی کو ملک باقی سے بدل دے۔ الصّٰلِحِیْنَ سے مراد ہے انبیاء کیونکہ صلاحیت کامل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان ہر خطا سے معصوم ہو اور معصوم انبیاء کے سوا کوئی نہیں (یعنی الصالحین سے مراد ہیں کامل صالحین اور کامل صالحین صرف انبیاء ہیں)۔

قتادہ نے کہا سوائے یوسفؑ کے اور کسی نبی نے اپنی موت کی دعا نہیں کی۔ میرے نزدیک تو قتادہ کا قول غلط ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی۔ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْأَعْلٰى۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں سنا کرتی تھی کہ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کو دنیا و آخرت (میں سے ایک کو منتخب کر لینے) کا اختیار نہیں دے دیا جاتا (اور وہ آخرت کو پسند نہیں کر لیتا) چنانچہ حضور ﷺ کی بیماری میں جب آخر وقت آگیا اور آپ کی ہچکی بندھ گئی تو میں نے خود سنا حضور ﷺ فرما رہے تھے۔ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا یہ سن کر میں نے یقین کر لیا کہ حضور ﷺ کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کو پسند کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین عن سعد۔

قصہ کا تکملہ

حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی احوال جب درست ہو گئے اور ماں باپ اور دوسرے متعلقین بھی مل گئے تو اس وقت اپنے رب سے ملنے کا شوق غالب آیا اور مذکورہ دعا کی۔ حسن بصریؒ نے فرمایا اس کے بعد آپ چند سال زندہ رہے۔ دوسرے علماء کا خیال ہے ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ حضرت یعقوبؑ سے کتنی مدت جدا رہے علماء کے اس مسئلہ میں مختلف اقوال ہیں کلبی نے کہا ۲۲ سال جدا رہے۔ بعض نے ۴۰ سال مدت جدائی بیان کی۔ حسن بصریؒ نے کہا سترہ سال کی عمر میں کنوئیں میں ڈالے گئے اور باپ سے اسی برس غائب رہے اور حضرت یعقوبؑ کی ملاقات کے بعد ۲۳ سال جئے اور ۱۲۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ توریت میں آپ کی عمر ۱۱۰ سال ذکر کی گئی ہے۔

عزیز کی بیوی کے بطن سے حضرت یوسفؑ کے تین بچے ہوئے افرائیم، میشا اور (تیسری لڑکی) رحمت۔ افرائیم کی نسل میں سے یوشع بن نون پیدا ہوئے۔ رحمت حضرت ایوب صابر کی بیوی تھیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بعد حضرت یوسفؑ ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہے بہر حال بوقت وفات (بر قول صحیح) آپ کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

اہل مصر نے سنگ مرمر کے ایک تابوت میں بند کر کے نیل میں آپ کو دفن کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کی وفات کے بعد ہر محلے والوں نے اپنے محلہ میں آپ کو دفن کرنا چاہا تاکہ ان کے محلے والوں کو برکت حاصل ہو۔ اختلاف اتنا بڑھا کہ باہم جنگ ہونے اور لڑنے مرنے کا اندیشہ ہو گیا آخر سب نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو نیل کے اندر دفن کر دیا جائے۔ نیل کا پانی پورے شہر میں پہنچتا تھا اس طرح آپ کی برکت سے پورا شہر بہرہ اندوز ہو گا۔

عکرمہ نے کہا نیل کے داہنی جانب آپ کو دفن کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جانب بہت سرسبز اور شاداب ہو گیا اور دوسرا جانب خشک ہو گیا پھر آپ کو داہنی جانب سے نیل کے بائیں جانب منتقل کیا گیا تو داہنی جانب سوکھ گیا اور بایاں جانب سر

بیچ ہو گیا آخر نیل کے وسط میں دفن کر دیا۔ اس طرح نیل کے دونوں کنارے سر سبز ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ تک آپ کی قبر نیل ہی میں رہی پھر حضرت موسیٰؑ نے آپ کا تابوت نیل سے نکلوا کر ملک شام کو منتقل کیا اور باپ دادا کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ ابن اسحاق و ابن ابی حاتم نے بحوالۂ عروہ بن زبیرؓ بیان کیا کہ اللہ نے جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر شام کو لے جاؤ تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا تھا کہ یوسفؑ کی ہڈیاں بھی ساتھ لے جانا مصر کی زمین میں نہ چھوڑنا بلکہ ارض مقدسہ میں لے جا کر دفن کر دینا۔ حضرت موسیٰؑ نے تلاش کی کہ کوئی یوسفؑ کی قبر کا نشان بتائے دانا مل جائے تلاش کے بعد صرف ایک بڑھیا اسرائیلی ملی جس نے کہا کہ اے اللہ کے نبی میں یوسفؑ کی قبر کا مقام جانتی ہوں اگر آپ مجھے اپنے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جائیں اور سرزمین مصر میں چھوڑ کر نہ جائیں تو میں آپ کو قبر بتا دوں گی۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا میں تیری خواہش کے مطابق کر دوں گا۔ حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ جس وقت چاند نکلے گا اسی وقت یہاں سے روانہ ہوں گے چاند نکلنے کا وقت آ گیا اور حضرت یوسفؑ کا تابوت اس وقت تک آپ برآمد نہ کر سکے اس لئے آپ نے اللہ سے دعا کی کہ چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو جائے تاکہ وعدہ خلافی نہ ہو دعا قبول ہو گئی اور چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو گئی پھر بڑھیا آپ کو اپنے ساتھ لے گئی اور نیل کے پانی کے اندر ایک طرف کو حضرت یوسفؑ کی قبر دکھا دی۔ جس کے اندر سے ایک مرمر کا صندوق حضرت موسیٰؑ نے نکلوالیا اور اس کو اٹھا کر لے گئے۔

حضرت یوسفؑ کے بعد تو اللہ کے خاندان میں بے در بے مصر کے فرعون ہوتے رہے اور بنی اسرائیل ان کے زیر حکم رہے مگر حضرت یوسفؑ کے مذہب پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے اور آپ کے ہاتھ سے اللہ نے فرعون کو ہلاک کرا دیا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝

یہ (قصۂ یوسفؑ) غیب کی خبروں میں سے ہے جو وحی کے ذریعہ سے ہم آپ کو بتا رہے ہیں اور آپ ان (برادران یوسفؑ) کے پاس اس وقت موجود نہ تھے جبکہ انہوں نے اپنا ارادہ پختہ کر لیا تھا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے

یعنی کنوئیں کے گڑھے میں یوسفؑ کو ڈالنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا مقصد یہ ہے کہ قصۂ یوسفؑ کا وحی کے ذریعے سے آپ کے پاس آنا اور آپ کا بذریعۂ وحی اس پر مطلع ہونا ثابت ہو رہا ہے کیونکہ اولاد یعقوبؑ میں سے کسی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی کہ آپ نے ان کی زبانی سن لیا ہو اور خود وہاں موجود نہ تھے اور نہ آپ کی قوم والوں کو یہ قصہ معلوم تھا کہ کسی سے پوچھ کر آپ نے بیان کر دیا ہو۔ یہ مؤخر الذکر آیت مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ میں ذکر کر دی گئی ہے اس لئے یہاں ذکر نہیں کی گئی۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ یہود و قریش دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسفؑ کا قصہ دریافت کیا تھا۔ جب آپ نے توریت کے موافق ذکر کر دیا تب بھی وہ اسلام نہیں لائے اس پر رسول اللہ ﷺ کو سخت رنج ہوا اس پر آیت نازل ہوئی۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا تَسْــَٔـلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کی کتنی ہی زیادہ خواہش ہو اور آپ ان سے اس کا کچھ معاوضہ تو طلب نہیں کرتے یہ تو صرف تمام جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔ یعنی آپ کتنی ہی ان کے مؤمن ہو جانے کی خواہش کریں اور کتنے ہی معجزات کا اظہار کریں لیکن اللہ نے چونکہ ان کے کافر رہنے کا فیصلہ کر دیا ہے اس لئے وہ ایمان نہیں لائیں گے اور آپ ان سے اس قرآن کو پیش کرنے یا خبریں بیان کرنے کی کوئی اجرت بھی تو نہیں مانگتے (کہ ان پر کچھ مالی بوجھ پڑتا ہو) یہ قرآن تو محض ایک عمومی نصیحت نامہ ہے (جس کو ماننے میں پیسے صرف کرنا نہیں پڑتے) جو اس کو نہ مانے گا تو اتمام حجت ہو جائے گا اور جو ایمان لانے والے ہیں ان کے لئے رحمت و بصیرت ہے۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ۝ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ۝ اور بہت سی نشانیاں آسمانوں اور زمین میں

ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے مگر وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتے اور یہ لوگ خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ ان میں سے اکثر شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔ کَاَیِّنْ کے معنی ہیں کثیر یعنی اللہ کی صنعت، حکمت اور کمالِ قدرت و توحید کی بکثرت دلیلیں ہیں جو ان کی نظر کے سامنے آتی ہیں اور یہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مگر ان کی طرف توجہ نہیں کرتے، منہ پھیرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی آیاتِ عبرت ان کے سامنے آتی ہیں اور قوموں کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر غور و فکر نہیں کرتے اور عبرت اندوز نہیں ہوتے۔ اور اگر اللہ کے وجود و خالقیت کا اقرار کرتے بھی ہیں تو اس کی عبادت میں دوسروں کو شریک بناتے ہیں اللہ کی عبادت کے ساتھ دوسروں کی بھی پوجا کرتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو جواب دیتے تھے اللہ نے اور جب دریافت کیا جاتا تھا کہ اوپر سے پانی کون برساتا ہے تو کہتے تھے اللہ۔ مگر اس کے باوجود پتھروں کی پوجا کرتے تھے اور کہتے تھے پتھر کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی (یعنی بعض ستاروں کو بارش ہونے میں دخیل سمجھتے تھے فقط ظاہری اسباب کی حیثیت سے نہیں بلکہ علتِ حقیقیہ کی حیثیت سے۔ مترجم)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول عرب کے مشرکوں کے لبیک کہنے کے سلسلے میں ہوا۔ عرب کے مشرک (احرام باندھنے یا طواف کرنے کے وقت) ان الفاظ میں لبیک کہتے تھے اے اللہ! ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک ہے جس کو تو نے شریک بنایا ہے اور تو اس کا مالک ہے وہ مالک نہیں۔

علماء نے کہا مشرکوں کی یہ دعا (یعنی شرک آمیز دعا) آسائش و فراغت کے زمانے میں ہوتی تھی کہ اپنے رب (کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے شریکوں کو پکارتے اور رب) کو بھول جاتے تھے۔ لیکن جب مصیبت میں گرفتار ہوتے اور چاروں طرف تو اس وقت صرف اللہ کو پکارتے تھے۔ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ جب جہازوں اور کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو خالص طور پر اللہ کو پکارتے ہیں اور جب اللہ سمندر سے بچا کر خشکی میں پہنچا دیتا ہے تو پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف علماء و مشائخ کے احکام پر چلتے اور ان کو رب قرار دیتے ہیں یا اللہ کی طرف والد ہونے کی نسبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ کی اولاد ہے یا (مجوسی ہیں) نور و ظلمت کی الوہیت کے قائل ہیں۔ منجملہ شرک کے قدریہ فرقہ کا یہ قول بھی ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے توحید خالص تو اہل سنت کا قول ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں۔ بلکہ مسبب کی طرف سے غافل ہو کر اسباب پر نظر رکھنا (اور عملی طور پر اسباب کو ہی کارساز قرار دینا) بھی شرک کی قسم ہے اہل توحید صرف صوفیا ہیں (جن کی نظر اسباب پر نہیں بلکہ ہر وقت مسبب پر ہوتی ہے۔ مترجم)۔

أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝

سو کیا پھر بھی ان کو اس بات کا خوف نہیں کہ اللہ کے عذاب کی کوئی آفت ان پر آپڑے جو ان کو گھیر لے یا اچانک ان پر قیامت آجائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ یعنی کیا یہ اپنے رب کو بھول گئے اور مطمئن ہو گئے کہ کوئی چھا جانے والا عذابِ خداوندی ان پر آجائے۔ قتادہ نے غَاشِيَةٌ کا ترجمہ کیا پڑنے والی آفت اور ضحاک نے کہا اس سے مراد ہے آسمانی بجلیاں اور بھیانک حوادث۔ بَغْتَةً اچانک جس کی پہلے سے نہ کوئی علامت ہو نہ ظہور وقت متعین ہو۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ اور وہ بے خبر ہوں اس کے لئے تیار بھی نہ ہوں۔ أَفَأَمِنُوا میں استفہام انکاری ہے یعنی ان کے لئے یہ خدا فراموشی اور عذاب فراموشی اور عذاب سے بے خوفی مناسب نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوگ بازاروں میں مشغول ہوں گے کہ ایک سخت چیخ لوگوں کو ہیجان میں ڈال دے گی۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آدمی (بائع اور مشتری) کپڑا پھیلائے ہوئے (سودا کرنے میں مشغول) ہوں گے کہ قیامت آجائے گی نہ خرید و فروخت کر سکیں گے نہ کپڑے کو لپیٹ سکیں گے یہ حدیث اور

قیامت کی تشریح سورۂ اعراف کی آیت يَسْئَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا کی تفسیر کے ذیل میں کر دی گئی

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۱۰۸)

(اے محمد ﷺ) آپ کہہ دیجئے کہ یہ توحید اور آخرت کی تیاری کی دعوت میرا راستہ ہے میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہوں علی وجہ البصیرت (یقین پر) قائم ہوں اور وہ لوگ بھی جو میرے پیرو ہیں اور اللہ ہر طرح کے نقص اور شرک سے پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

سَبِيلِي میرا طریقہ میرا راستہ۔ أَدْعُو إِلَى اللَّهِ سبیلی کی تشریح ہے یعنی میں اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانے اور ہر نامناسب وصف سے اس کو پاک سمجھنے اور اس کے قرب کی طلب کرنے کی طرف لوگوں کو بلاتا ہوں۔ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ بصیرت سے مراد ہے یقین اور معرفت یعنی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خود تراشیدہ خیالات کو مانتے ہیں جن کا ان کو خود کوئی علم نہیں ہوتا۔ یا بصیرت سے مراد ہے بیان اور واضح روشن دلیل۔ وَمَنِ اتَّبَعَنِي یعنی جو لوگ مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور میری تصدیق کرتے ہیں وہ بھی اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ کلبی اور ابن زید نے کہا رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے والوں پر لازم ہے کہ جس راستے کی طرف رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی ہے اسی کی طرف وہ بھی لوگوں کو بلائیں اور قرآن کا ذکر کرتے رہیں یہ مطلب ہے کہ میں اور میرا اتباع کرنے والے بصیرت پر ہیں۔ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا مَنِ اتَّبَعَنِي سے صحابہ کرام مراد ہیں، بہترین راہ ہدایت پر تھے، معدن علم تھے، خزانہ ایمان تھے اور اللہ کا لشکر تھے۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا جو سنت پر چلنا چاہے وہ مُردوں کے طریقے پر چلے یعنی رسول ﷺ کے راستہ پر چلنے والے صحابہ کا گروہ اس امت میں سب سے زیادہ نیک باطن گروہ تھا جن کا علم بہت گہرا تھا اور بناوٹ بالکل نہ تھی اللہ نے اپنے نبی ﷺ کی رفاقت اور اپنے دین کی اشاعت کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا اور راہ مستقیم پر گامزن تھے تم لوگ انہیں کے اخلاق اور زندگی کے طریقوں کو اختیار کرو اور انہی سے مشابہت پیدا کرو۔ وَسُبْحَانَ اللَّهِ یعنی میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور شرک سے اس کے پاک ہونے کا اعتراف و اقرار کرتا ہوں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ اور آپ سے پہلے ہم نے مختلف بستیوں والوں میں جتنے رسول بھیجے اور جن کو وحی بھیجتے رہے وہ سب آدمی ہی تھے (فرشتے نہیں تھے) یہ تردید ہے کافروں کے اس قول کی کہ ہمارا رب چاہتا تو ملائکہ کو ہدایت کے لئے بھیج دیتا۔

نُوحِي إِلَيْهِم یعنی جس طرح آپ کے پاس وحی بھیجی اسی طرح ان پیغمبروں کے پاس بھی وحی بھیجتے رہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہو گئے ہیں۔ أَهْلِ الْقُرَىٰ یعنی وہ قصبوں اور شہروں کے رہنے والے تھے صحرائی خانہ بدوش نہ تھے۔ صحرائی لوگ بد خلق اکھڑ اور سخت ہوتے ہیں اور قصبوں، شہروں والے اہل فضل، مہذب، ذی علم اور حلیم الطبع ہوتے ہیں۔

حسن بصری نے کہا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے کسی جن کو نبی نہیں بنایا، کسی عورت کو بھی اور کسی صحرائی کو بھی۔

میں کہتا ہوں اس آیت سے تو جنوں کی نبوت کی نفی نہیں ہوتی (رسول جنات میں سے بھی ہوتے ہیں) اللہ نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ اس کے علاوہ اس جگہ انسانوں کی طرف پیغمبر بھیجنے کا ذکر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنات کے پاس جن کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ اللہ نے خود فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰۹)

تو کیا یہ لوگ ملک میں نہیں چلے پھرے کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان قوموں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے گزرے ہیں اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے بہت ہی اچھا ہے جو گناہوں سے بچتے ہیں سو کیا تم اتنا نہیں سمجھتے۔ یعنی آپ کی تکذیب کرنے والے مشرک ملک میں چل پھر کر کیا نہیں دیکھتے کہ اپنے پیغمبروں کو اور ان کے معجزات کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا برا انجام ہوا ان کے برے انجام کو دیکھ

کہ ان کو عبرت حاصل کرنا اور آپ کی تکذیب نہ کرنا چاہئے تھا۔ اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہو کر دنیا پر ٹوٹے پڑتے ہیں ان کا انجام کیا ہوا اس کو دیکھنے کے لئے دیدۂ عبرت نگاہ کی ضرورت ہے ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ پچھلے دنیا پرستوں کا کیا انجام ہوا اور اللہ نے اپنے دوستوں اور طاعت شعار بندوں کے لئے کیا سلوک کیا انہیں نازل شدہ عذاب سے ان کو بچا لیا اور آخرت میں جو کچھ ان کو دیا جائے گا وہ اس دنیا سے کہیں بہتر ہوگا عقل سے کام لینے کی اور یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آخرت ہی بہتر ہے۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ یہاں تک کہ جب پیغمبر مایوس ہو گئے اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی تو ان کو ہماری مدد پہنچی پھر اس عذاب سے جس کو ہم نے چاہا وہ بچا لیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں لوٹایا جاتا۔

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ کا تعلق سابق آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا سے ہے یعنی ہم نے آپ سے پہلے آدمیوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا اور ان کی امتوں نے ان کی تکذیب کی یہاں تک کہ جب وہ ناامید ہو گئے الخ۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق محذوف کلام سے ہے اصل کلام یوں تھا کہ ان کافروں کو اس بات سے فریب خوردہ نہ ہونا چاہئے کہ اتنے زمانے تک ان پر عذاب نہیں آیا اور اب تک تباہی سے بچے ہوئے ہیں کیونکہ ان سے پہلے لوگوں (مثلاً امت نوح وغیرہ) کو بڑی لمبی مہلتیں دی جا چکی ہیں یہاں تک کہ پیغمبر بھی ان کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ باوجود کفر میں ڈوب جانے کے یہ لوگ عیش و آرام میں ہیں مدت دراز سے چین و راحت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ قَدْ كُذِبُوْا کا معنی بظاہر یہی ہے کہ پیغمبروں کو گمان ہو گیا کہ اللہ نے جو ہم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا وعدہ پورا نہیں کیا چونکہ یہ معنی غلط ہے اسی لئے حضرت عائشہؓ نے كُذِبُوْا کی قراءت کا انکار کر دیا اور كُذِبُوْا کی جگہ كُذِّبُوْا پڑھا مگر كُذِبُوْا کی قراءت متواتر ہے تو حضرت عائشہؓ کو اس کا علم نہ ہوا البتہ ظاہری معنی نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر قوم کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے خیال کر لیا کہ قوم نے جو ہم سے ایمان کا وعدہ کیا وہ غلط کیا یہ ایمان نہیں لائیں گے یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں نے گمان کر لیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی ہم سمجھتے تھے کہ ہماری مدد بہت جلد کی جائے گی مگر ہمارا یہ فہم غلط تھا۔ یا ظَنُّوْا کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے یعنی یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ کافر خیال کرنے لگے کہ پیغمبروں نے جو ہم کو توحید کی دعوت دی تھی اور بصورت خلاف ورزی عذاب کی دھمکی دی تھی وہ غلط تھی ہم سے جھوٹ کہا گیا تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں پر ایمان لانے والوں کو خیال ہو گیا کہ پیغمبروں نے جو ہم سے فتح و نصرت کا اور کافروں کی ہلاکت کا وعدہ کیا تھا وہ غلط نکلا کچھ موافق نہ ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک آیت کا ظاہری مطلب ہی مراد ہے۔ پیغمبر بھی بشر تھے اور بہ تقاضائے بشریت ان کو گمان ہونے لگا کہ ہم سے جو فتح و نصرت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ غلط نکلا یہ گمان پیغمبروں کے ضعف قلب اور تقاضائے بشریت کا نتیجہ تھا پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت پڑھی حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ یعنی یہاں تک کہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے لوگ کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی یہ مطلب وہی ہے جس کا حضرت عائشہؓ نے انکار کر دیا اور اسی وجہ سے كُذِبُوْا کی قراءت کا بھی انکار کر دیا۔

بیضاوی نے لکھا ہے اگر صحیح روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ثابت ہو جائے تو اس وقت ظَنّ سے مراد ہوگا وسوسہ اور بے اختیار دل میں پیدا ہونے والا خیال۔ طیبی نے لکھا ہے روایت صحیح ہے بخاری نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت کا (حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ) تمثیلی معنی مراد ہے یعنی مصیبت اور نزول عذاب میں انتہائی تاخیر کو بطور تمثیل بیان کیا گیا ہے۔ كُذِبُوْا بغیر تشدید ذال کے کوفیوں کی قراءت ہے۔ دوسرے لوگوں کی قراءت كُذِّبُوْا تشدید ذال ہے یعنی پیغمبروں کو یقین ہو گیا کہ کافروں نے ان کی ایسی تکذیب کی ہے کہ اس کے بعد ایمان لانے کی امید نہیں رہی۔ قتادہ نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ پیغمبر جب تکذیب کرنے والوں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے

گمان کر لیا کہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کو بھی جھوٹا کر دیا گیا اور سخت شدائد میں مبتلا ہونے اور امداد میں تاخیر کی وجہ سے ان میں بھی تزلزل پیدا ہو گیا اور وہ بھی ایمان سے پھر جائیں گے۔ مَنْ نَّشَآءُ سے مراد ہیں انبیاء اور ان کے ساتھی اہل ایمان چونکہ انبیاء اور ان کے ساتھی مستحق نجات تھے اور کسی دوسرے کے نجات پانے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا اس لئے صراحتاً ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور مبہم طور پر مَنْ نَّشَآءُ فرمایا۔ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا بَأْسٌ عذاب۔ یعنی آیا ہوا اللہ کا عذاب لوٹایا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے مَنْ نَّشَآءُ سے بعض مؤمن مراد ہوں اور کافروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بعض مؤمن عذاب سے ہلاک کر دیئے گئے ہوں، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً ڈرو اس عذاب سے جو صرف انہیں لوگوں پر نہیں آئے گا جنہوں نے ظلم کیا ہوگا۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ان (انبیاء اور ان کی امتوں کے یا یوسف اور ان کے بھائیوں) کے قصے میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ یعنی ان دانشمندوں کے لئے عبرت ہے جن کی عقل سلیم اور محسوس پرستی کی طرف میلان سے پاک ہے حقیر پادشاہ سے مرتبہ شاہی پر فائز کرنا اور بوریہ سے اٹھا کر تخت شاہی پر پہنچا دینا عبرت آفریں ہے۔ صبر کا انجام سلامتی اور عزت ہے اور فریب کا نتیجہ رسوائی اور ندامت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (یہ قرآن) کوئی بنائی ہوئی بات (کہ اس سے عبرت و نصیحت نہ ہو) بلکہ اس سے پہلے کی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعہ ہدایت و رحمت ہے۔

يُفْتَرٰى از خود گھڑی ہوئی تراشی ہوئی۔ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد ہے توریت و انجیل۔ كُلِّ شَيْءٍ سے مراد ہے ہر ضروری دینی بات۔ جس کی بندوں کو حاجت ہوتی ہے ہر دینی امر کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے خواہ براہ راست یا حدیث، اجماع اور اجتہاد کے واسطہ سے۔ جو مسئلہ حدیث سے ثابت ہے وہ قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ہم نے ہر پیغمبر کو اس لئے بھیجا کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ جو کچھ تم کو حکم دیں لے لو اور جس چیز سے روک دیں رک جاؤ۔ جو مسئلہ اجماع سے ثابت ہے وہ بھی قرآن سے ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلّٰى ہدایت ظاہر ہونے کے بعد جو شخص رسول ﷺ سے کٹ جائے گا اور اہل ایمان کے راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر چلے گا تو ہم اس کو اسی کے اختیار کردہ راستہ پر چلنے دیں گے۔ اور جو مسئلہ قیاس سے ثابت ہے وہ بھی قرآن سے ہی ثابت ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ اے عقل والو نصیحت حاصل کرو عبرت پکڑو۔

چونکہ اہل ایمان ہی قرآن سے نفع اندوز ہوتے ہیں اس لئے انہی کو خصوصیت سے ذکر کیا (اگرچہ قرآن کی راہنمائی ہر شخص کے لئے عام ہے)

شیخ ابو منصور ماتریدی نے فرمایا حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے صبر کی تلقین ہے۔ یوسف کے بھائی تو یوسف کے ساتھ دین میں موافق تھے اور سب ایک باپ کے بیٹے تھے یوسف کے ساتھ انہوں نے بد سلوکی کی اور یوسف نے صبر کیا اور انجام ان کی خطاؤں سے درگزر کی اور معاف کر دیا تو آپ کو تو اپنی قوم کی ایذاء رسانی پر زیادہ صبر کرنا چاہئے آپ کی قوم تو کافر و جاہل ہے۔

وہب کا قول ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی اس میں قرآن کی طرح پوری سورت یوسف نازل فرمائی۔

ذی الحجہ ۱۲۰۲ھ کو سورۂ یوسف کی تفسیر ختم ہوئی بحمد اللہ دار رمضان ۱۳۸۱ھ کو تفسیر سورۂ یوسف کا ترجمہ ختم ہوا۔ فالحمد للہ

سورۂ رعد مکی ہے اس میں تینتالیس آیتیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ یہ قرآن کی (یا کامل سورت کی) آیات ہیں۔ الکتاب سے مراد ہے قرآن مجید یا پوری سورت اور تلک سے آیات کی طرف اشارہ ہے اور آیات الکتاب میں اضافت تبعیضی ہے یعنی یہ آیات قرآن یا سورت کا ایک حصہ ہیں۔

وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے وہ بالکل حق ہے لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔ (یہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا کہ والذی کو استیناف قرار دے کر الذی کو مبتدا اور الحق کو خبر مان کر جملہ کو بالکل علیحدہ مستقل تسلیم کیا جائے لیکن حضرت مفسر نے لکھا ہے کہ) اگر الکتاب سے مراد سورت ہو تو الذی سے مراد قرآن ہوگا اور اس کا الکتاب پر عطف بحالت جر ایسا ہی ہوگا جیسا عام کا عطف خاص پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ آیات سورت کی اور قرآن کی آیات ہیں اور اگر الکتاب سے مراد قرآن ہو اور الذی سے مراد بھی قرآن ہی ہے تو ایک صفت کا دوسری صفت پر عطف ہوگا اور الحق خبر ہے جس کا مبتدا محذوف ہے یعنی وہی حق ہے۔

ایک شبہ

الحق پر الف لام کا اجارہ ہے کہ قرآن ہی حق ہے تو کیا حدیث رسول اللہ ﷺ اور اجماع اور قیاس حق نہیں ہے۔

جواب

ما اُنْزِلَ سے مراد عام ہے جو کچھ نازل کیا گیا خواہ صریحاً یا ضمناً قیاس، اجماع اور حدیث کے اتباع کرنے کا حکم چونکہ قرآن میں صریحاً ہے اس لئے ارکان ثلاثہ بھی ضمناً حق ہیں۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ الخ یعنی اکثر لوگ چونکہ غور و نظر کی غلطی اور فکر و نظر کے اختلال میں مبتلا ہیں۔ اس لئے وہ قرآن کی حقانیت سے واقف نہیں۔ مقاتل نے کہا اس آیت کا نزول مشرکین مکہ کے حق میں ہوا تھا۔ مشرکوں نے کہا تھا محمد ﷺ نے قرآن خود بنالیا ہے اللہ نے اس قول کی تردید فرمادی اور اگلی آیات میں اپنی توحید کے دلائل بیان فرمائے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝

اللہ ایسا قادر ہے جس نے بغیر ستونوں کے آسمانوں کو اونچا کھڑا کر دیا جو تم کو نظر آرہے ہیں پھر وہ عرش پر قائم ہو گیا اور سورج و چاند کو کام پر لگا دیا ہر ایک ایک وقت معین میں چلتا رہتا ہے وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے وہی صاف صاف طریقے سے دلائل بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی پیشی کا یقین کر لو۔

عَمَدٍ ستون، یہ عِماد کی یا عَمُود کی جمع ہے جیسے اُہُب اِہاب کی اور اَدَم اَدِیم کی جمع ہے۔ تَرَوْنَهَا جملہ علیحدہ ہے (اسی کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے) یا عَمَد کی صفت ہے یعنی اللہ نے بغیر محسوس اور مرئی ستونوں کے اونچا آسمان قائم کیا ہے۔ اس میں صانع حکیم کی ہستی کی دلیل ہے تمام اجسام جسمانیت میں برابر ہیں (صورت جسمیہ طبعیہ نوعیہ ہے جس کا تحقق تمام اجسام علویہ وسفلیہ میں یکساں ہے شیخ بو علی ابن سینا کا بھی یہی قول ہے۔ مترجم) پھر خصوصیت میں اختلاف (کہ کسی کو پست رکھا کسی کو بلند کیا اور دوسرے نوعی خواص کا تفاوت) چاہتا ہے کہ مختلف خواص عطا کرنے والا کوئی پس پردہ ہے جو نہ جسم ہے نہ جسمانی اسی نے بعض خواص میں بعض دوسرے ممکنات پر اپنے ارادہ و اختیار سے ترجیح دی ہے۔ دوسری دلائل توحید و وجود جو ذیل میں بیان کی گئی ہیں ان سے بھی اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر اسی طرح استدلال کیا جا سکتا ہے۔

اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کی پوری تحقیق سورۂ یونس میں ذکر کر دی گئی ہے۔ تسخیر شمس و قمر سے مراد ہے ان کو کام پر لگا دینا ایک مخصوص مقدار و انداز کے مطابق یہ رواں دواں ہیں جس سے حوادث یومیہ پیدا ہوتے ہیں۔

كُلٌّ يَّجْرِيْ یعنی ان میں سے ہر ایک دوری حرکت میں چلتا ہے۔

لِاَجَلٍ مُّسَمًّى یعنی معین وقت میں جس میں وہ اپنا دورہ پورا کر لیتے ہیں یا ایک وقت معین تک چلتے رہیں گے یعنی دنیا کے فنا ہونے تک۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی ہست و نیست کرنا اور زندگی و موت دینا اور پورے امور حکومت کا انتظام کرنا اس کا کام ہے۔

يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وہی دلائل آثار کھول کھول کر علیحدہ علیحدہ بیان کرتا ہے یا ایک کے بعد ایک دلیل پیدا کرتا رہتا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تاکہ تم ان پر غور کرو اور اللہ کے کمال قدرت کو جان لو اور سمجھ لو کہ جو خدا ان چیزوں کو پیدا کر سکتا اور ان کا انتظام رکھ سکتا ہے وہ ان کو فنا کرکے دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے اور تم کو سزا و جزا بھی دے سکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ اور وہی تو ہے جس نے زمین کو بچھایا تاکہ اس پر قدم جم سکیں اور جاندار چل پھر سکیں۔

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ اور زمین میں پہاڑ بنائے رواسی سے مراد پہاڑ ہیں۔ رَسِیَ الشَّیْءُ وہ چیز جم گئی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ابو قبیس زمین پر سب سے پہلے قائم کیا گیا۔

وَاَنْهٰرًا اور دریا بنائے پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں اس لئے ایک ہی فعل (جعل) کے تحت دونوں کو ذکر کیا۔

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ اور زمین میں ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کیں [illegible] (اچھے برے کا یہ مطلب ہے کہ طرح طرح کے پھل پیدا کئے جن کی مختلف قسمیں ہیں اور کم سے کم دو قسمیں تو ضرور ہیں (ممکن ہے کہ زوجین اثنین سے نر و مادہ مراد ہوں۔ واللہ اعلم بمرادہ۔ مترجم)

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ چھا دیتا ہے رات کو دن پر یعنی رات کی تاریکی سے دن کی روشنی کو چھپا دیتا ہے جس کی وجہ سے روشن فضا تاریک ہو جاتی ہے اور جو چیز تاریک تھی وہ روشن ہو جاتی ہے (شاید حضرت مفسرؒ کی اس سے مراد یہ ہے کہ طرفین سے چھا جانا مراد ہے رات دن پر چھا جاتی اور دن کی روشنی رات کی تاریکی کو چھپا لیتی ہے۔ مترجم)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ بیشک ان امور میں سوچنے والوں کے لئے (توحید اور قدرت و حکمت کے) دلائل موجود ہیں ان کی رنگینی اور خواص کا تنوع بتا رہا ہے کہ ان کا صانع کوئی کامل قدرت حکیم ہے جو ان کا انتظام کر رہا

ہے اور تمام اسباب کو فراہم کر رہا ہے۔

وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ اور زمین میں پاس پاس ملے ہوئے مختلف قطعات ہیں کوئی عمدہ اور پیداواری ہے اور کوئی شور یا سنگین کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کرنے کے قابل ہے درخت بونے کے قابل نہیں کوئی درختوں کی سرزمین ہے کھیتی کے ناقابل، کسی میں سبزہ کم ہے (یا بنجر ہے) اور کوئی سبز مزار ہے اگر یہ فعل قادر مختار اور صانع حکیم کا نہیں تو پھر یہ اختلاف کیوں ہے اور کیوں خواص میں تفاوت ہے زمین کی طبیعت ایک ہی ہے لوازم طبیعت بھی یکساں ہیں سماوی اسباب کی تاثیر بھی ایک ہی جیسی ہے وضع اور نسبت میں بھی کوئی فرق نہیں پھر سوائے اس کے کہ ایک قادر مختار کی حیثیت کی کار فرمائی قرار دی جائے اور کیا سبب اختلاف کہا جا سکتا ہے۔

وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰي بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوروں کے درخت ہیں کچھ تو ایک تنے سے اوپر دو شاخہ ہو گئے ہیں اور کچھ دو تنے نہیں ہوئے ان میں سے ہر ایک کو ایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں۔

زَرْعٌ اصل میں مصدر ہے اس لئے اس کو جمع لانے کی ضرورت نہیں۔

صِنْوَانٌ، صِنْوٌ کی جمع ہے جیسے قِنْوَانٌ (خوشے) قِنْوٌ کی جمع ہے اس کے تثنیہ کا نون مکسور ہوتا ہے اور بغیر تنوین کے ہوتا ہے اور جمع کے نون پر ہر حرکت مع تنوین کے آتی ہے ایک جڑ سے دو تنے برآمد ہوں تو ان کو صِنْوٌ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ کے متعلق فرمایا آدمی کا چچا اس کے باپ کا صِنْوٌ ہوتا ہے۔

غَيْرُ صِنْوَانٍ یعنی الگ الگ ہوتے ہیں جڑیں جدا جدا ہوتی ہیں۔

الْاُكُلِ پھل یعنی مقدار میں مزہ ... میں رنگ میں خوشبو میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ ترمذی نے بروایت حسن اور حاکم نے بسند صحیح حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دقل اور فارسی اور میٹھا اور کھٹا۔

ان سب میں بھی صانع حکیم کی قدرت کی جھلک ہے اصول کے ایک اسباب ایک جیسے پھر ان کا باہمی اختلاف کسی قادر مختار کی خصوصی عطا ہے۔ مجاہد نے کہا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ سے سب آدمی پیدا ہوئے لیکن کوئی اچھا ہے کوئی برا۔ حسن نے اس کی تشبیہ انسانوں کے دلوں سے دی ہے۔ یعنی زمین ایک خمیر تھا اللہ نے اپنے دست قدرت سے اس کو پھیلایا پھیلا کر اور پاک اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے پھر اس پر آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے ایک ٹکڑے سے پھل پھول اور کھیتی درخت پیدا کئے اور دوسرے کو شور یا سنگین کر اور بنجر کر دیا باوجودیکہ سب پر ایک طرح کا پانی برسایا۔ آدمیوں کی حالت بھی اسی طرح ہے سب کو آدم سے پیدا کیا اور سب کے لئے ہدایت نامہ کا پانی آسمان سے اتارا کچھ دل تو اس کی وجہ سے نرم پڑ گئے اور ان کے اندر خشوع پیدا ہو گیا اور کچھ سخت ہو گئے اور غافل بن گئے۔

حسن نے کہا خدا کی قسم جو شخص بھی قرآن کا جلیس (ہم نشین) ہوا تو اٹھنے کے وقت کچھ زیادتی لے کر اٹھا یا کمی لے کر (فائدے یا نقصان لے کر) اللہ نے فرمایا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ان امور میں بھی سمجھ داروں کے لئے توحید کے دلائل موجود ہیں جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اور غور کرتے ہیں ان کو ان امور کے اندر اللہ کی توحید نظر آتی ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ اور اے محمد اگر آپ کو تعجب ہو تو واقعی ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم خاک ہو گئے تو کیا ہم از سر نو پھر قیامت کے دن پیدا ہوں گے۔

جملہ استفہامیہ قَوْلُهُمْ کا بدل ہے یا مقولہ یعنی منصوب ہے یعنی ان کا یہ قول حشر کا انکار کر رہا ہے وہ اس بات کا تو اقرار کرتے ہیں کہ اول تخلیق اللہ نے کی لیکن دوبارہ پیدا کئے جانے کے منکر ہیں حالانکہ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ کسی کام کی ابتدا سے دوبارہ اس کو کرنا آسان ہوتا ہے بشرطیکہ ابتدا ارادہ و اختیار کے ساتھ علم اور ارادہ کے تحت کی گئی ہو بے تقاضا ارادہ و بغیر جانے بوجھے نہ کی گئی ہو اور مشرکوں کو اللہ کی با اختیار خالقیت اور علم و ارادہ کے ساتھ موجد ہونے کا تو اقرار تھا۔ وہ فلاسفہ کی طرح خدا کو غیر مختار نہیں جانتے تھے پھر تخلیق جدید کا انکار بے عقلی کی بات تھی۔ مترجم)

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ مشرک جو آپ کے دعویٰ رسالت کی تکذیب کرتے ہیں باوجودیکہ کھلے ہوئے معجزات دیکھ رہے ہیں اور واضح دلائل بھی ان کے سامنے ہیں پھر بھی ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جن میں نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں اور آپ کو ان کی اس حرکت پر تعجب ہو رہا ہے تو ان کا یہ قول بھی تعجب کے لائق ہے کہ ہم خاک ہو جانے کے بعد کیا دوبارہ از سر نو پیدا کئے جائیں گے۔ حالانکہ اللہ ہی نے تمام وہ چیزیں جن کی تفصیل ذکر کر دی گئی نیست سے ہست کی ہیں پھر ان کے مرنے کے بعد دوبارہ ان کو پیدا کرنا تو آسان ہے۔

آیات مذکورہ اور دوسری آیات جو بتانا چاہتی ہیں کہ ان کا ایک (با اختیار) فاعل ہے اسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کے امکان پر بھی ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے ان سے اللہ کا قادر مطلق ہونا اور مختلف ماہیت کی چیزوں میں مختلف تصرفات کرنا ثابت ہو رہا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ہے یعنی قیامت کا انکار کرنے والے اپنے رب کے منکر ہیں کیونکہ اس کی قدرت کا انکار کرتے ہیں اور جو نا قدرت ہو (عاجز ہو) وہ رب ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ اور یہی لوگ ہیں جن کی گردنوں میں گمراہی کے طوق ہیں (جن سے خلاصی کی کوئی امید نہیں یا) دوزخ کے اندر ان کے گلے میں آگ کے طوق ہوں گے۔ قیامت کے دن ان کو طوق پہنائے جائیں گے۔

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ اور یہی (قیامت کے دن) دوزخی ہوں گے۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ جس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے کبھی نہیں نکالے جائیں گے۔ ضمیر فصل (یعنی هُمْ) کا درمیان میں لانا بتا رہا ہے کہ کفار ہی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ خلود فی النار کافروں کے لئے مخصوص ہے اہل سنت کا یہی قول ہے۔ معتزلہ کا قول اس کے خلاف ہے (وہ مومن فاسق کو دوامی دوزخی کہتے ہیں کیونکہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو وہ ایمان سے خارج جانتے ہیں اگرچہ کافر نہیں کہتے۔ مترجم)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ

اور یہ لوگ بھلائی (عافیت کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے برائی (یعنی مصیبت کے نزول) کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعات عقوبت گزر چکے ہیں۔

اِسْتِعْجَال وقت مقررہ سے پہلے کسی چیز کی طلب کرنا (عجلت طلبی) سیئہ سے مراد ہے عذاب اور سزا اور حسنہ سے مراد ہے نعمت و عافیت۔ مشرکین مکہ عافیت کی جگہ عذاب (خداوندی) کے طالب تھے اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب بھیج دے۔

اَلْمَثُلٰتُ ان جیسے دوسرے کافروں پر نازل ہونے والی سزائیں۔ یعنی سابق کافروں پر نازل ہونے والی عقوبتوں سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور کیوں ان کو اپنے اوپر ویسے ہی عذاب نازل ہونے سے ڈر نہیں لگتا۔ مَثُلَةٌ مَثْلَةٌ جیسے صَدُقَةٌ اور صَدْقَةٌ قہر سزا کو کہتے ہیں کیونکہ سزا جرم کی مثل ہوتی ہے قصاص کو بھی مثال اسی وجہ سے کہا جاتا ہے اَمْثَلْتُ الرَّجُلَ میں نے اس کا قصاص لے لیا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے معاف کر دیتا ہے۔

عَلٰى ظُلْمِهِمْ یعنی باوجود یہ کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت منکرین قیامت کے متعلق ہے اور منکرین قیامت کی مغفرت اللہ کبھی نہیں کرے گا تو مغفرت سے مراد ہے ڈھیل دینا فوراً پکڑ نہ کرنا یعنی اللہ حلیم ہے کافروں کو بھی باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے ڈھیل دیتا رہتا ہے اور ان کو فی الفور عذاب نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ عذاب آنے میں عجلت کے طلب گار ہوتے ہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت عذاب دیتا ہے جب اللہ کی طرف سے عذاب آجاتا ہے تو کوئی اس کو دفع نہیں کر سکتا۔ سدی نے کہا کہ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ۔ مؤمنوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں جتنی آیات گناہگار مؤمنوں کو امید مغفرت دلاتی ہیں اور ان سب سے بڑھ کر امید گاہ مغفرت یہ آیت ہے اس آیت میں عَلٰى ظُلْمِهِمْ کا لفظ امید دلا رہا ہے کہ بغیر توبہ کے بھی مغفرت ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ کرنے والا ظلم پر نہیں رہتا۔ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے یہ حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ابن ماجہ نے مرفوعاً نقل کی ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ اور آیت وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ دونوں کا تعلق مؤمنوں سے ہے مگر دونوں مشروط بہ مشیت ہیں، مطلب یہ ہے کہ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی اور واحدی نے سعید بن مسیبؒ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اللہ کی طرف سے معافی اور درگزر نہ ہوتی تو یہاں کوئی زندہ نہ رہتا اور اگر اس کی طرف سے عذاب کی دھمکی نہ ہوتی تو ہر ایک اس کی رحمت پر بھروسہ کر بیٹھتا۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اور یہ کفار کہتے ہیں ان پر کوئی (خاص) معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں ان کے رب کی طرف سے نہیں نازل کیا گیا۔ ایۃ یعنی کوئی خاص نشانی اور معجزہ جو ان کی نبوت کو ثابت کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر جو معجزات نازل کئے گئے کافروں کے نزدیک وہ خود اطمینان بخش نہیں تھے اور عناد و ضد کی وجہ سے خود پسند معجزات کے طلب گار تھے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ آپ صرف (مخالفت کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والے نبی ہیں اور ہر قوم کے لئے راہنما ہوتے چلے آئے ہیں۔ یعنی آپ کے ذمے صرف احکام الٰہی پہنچا دینا اور نہ ماننے والوں کو عذاب کا خوف دلانا ہے۔ مطلوبہ معجزات کو پیش کرنا اور جبراً ہدایت یافتہ بنا دینا آپ کا کام نہیں۔ راہ حق کی طرف بلانا آپ کا کام ہے اور ہر قوم کی ہدایت کے لئے کوئی نہ کوئی پیغمبر آتا رہا ہے جو خود اولو معجزات پیش کرتا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ فرمائشی معجزات کسی نے بھی پیش نہیں کئے۔

سعید بن جبیرؒ کے نزدیک ہادی سے مراد اللہ ہے۔ یعنی ہر قوم کو ہدایت یاب بنانا اور ہدایت پر قدرت رکھنا تو اللہ کا کام ہے وہی ہدایت پر قادر ہے يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ عکرمہ نے کہا ہادی سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ۔ یعنی آپ تو صرف ڈرانے والے اور ہر قوم کو راستہ دکھانے والے ہیں۔

رافضی کہتے ہیں اصل آیت میں وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ عَلِيٌّ تھا ہر قوم کے ہادی علی ہیں تھا عثمان نے حسد کی وجہ سے علیؓ کا لفظ ساقط کر دیا۔ ان کو اللہ سزا دے ان کو نہیں معلوم کہ اللہ نے قرآن کے متعلق وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ فرمایا ہے ہم ہی قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگر بفرض محال ان کے قول کو مان بھی لیا جائے تو پھر اصل آیت کی رو سے رسول اللہ ﷺ پر بھی

حضرت علیؓ کی فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ آیت کا مطلوب اس وقت یہ ہو گا کہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے ہادی تو علیؓ ہیں (یعنی آپ ہدایت کے درجہ پر فائز نہیں یہ کام تو علیؓ کا ہے)
اللہ کا علم کامل ہے قدرت تام ہے، قضاء وقدر کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہیں وہ ہر فرمائشی معجزہ کو پیدا کر سکتا ہے اور قادر مطلق ہے ان کافروں کو ہدایت بھی کر سکتا ہے مگر مطلوب معجزات کی درخواست سے طلب ہدایت مقصود نہیں بلکہ محض عناد کے زیر اثر ایسی فرمائشیں کی جاتی ہیں اس لئے ان فرمائشوں کو پورا نہیں کرتا اور چونکہ ان کے کافر رہنے کا ازلی فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے اس لئے ہدایت یاب ہونے کی ان کو توفیق بھی نہیں دیتا۔ ان تمام مضامین پر آیات ذیل دلالت کر رہی ہیں۔
اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ کسی مادہ کو حمل رہتا ہے اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے۔
مَا تَحْمِلُ (میں مَا مصدری ہے یعنی) حاملہ ہونے کو اللہ جانتا ہے یا (مَا موصولہ ہے یعنی) جس چیز کو مادہ اپنے پیٹ میں اٹھائے ہوتی ہے۔ نر یا مادہ ایک یا متعدد، پورے سالم اعضاء والا یا ناقص اور اس کی ہر موجود اور آئندہ حالت کو اللہ جانتا ہے۔
تَغِيْضُ، غَاضَ کا مضارع ہے اور غَاضَ لازم بھی ہے بمعنی اِنْغَاضَ (باب انفعال) کے اور متعدی بھی ہے بمعنی اَغَاضَ (باب افعال) کے۔ قاموس میں ہے غَاضَ الْمَاءُ پانی کم ہو گیا گھٹ گیا۔ غَاضَ ثَمَنُ السِّلْعَةِ سامان کی قیمت گھٹ گئی۔ غَاضَ الْمَاءَ وَثَمَنَ السِّلْعَةِ اس نے پانی تھوڑا کر دیا کم کر دیا اور سامان کی قیمت گھٹا دی۔
تَزْدَادُ، اِزْدَادَ سے مضارع ہے اِزْدِيَادٌ (افتعال) لازم بھی آتا ہے۔ جیسے اِزْدَادَ الْقَوْمُ عَلٰی عَشْرَةٍ قوم دس افراد سے زیادہ ہو گئی اور متعدی بھی آتا ہے جیسے وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ہم ایک بار شتر بڑھا دیں گے۔ اگر دونوں فعلوں کو لازم کہا جائے تو مَا مصدری ہو گا یعنی ارحام کے گھٹنے اور بڑھنے کو اللہ جانتا ہے رحم کے گھٹنے بڑھنے سے مراد ہے رحم کے اندر والی چیز کے جثہ، مدت اور تعداد کا گھٹنا بڑھنا اور اگر دونوں فعل متعدی مانے جائیں تو مَا موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور مصدریہ بھی۔

مسئلہ

باتفاق علماء حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا چھ مہینے میں عورت کا بچہ پیدا ہو گیا، حضرت عثمانؓ نے عورت کو سنگسار کر دینے کا حکم دے دیا حضرت ابن عباسؓ (مانع ہوئے اور) فرمایا کتاب اللہ کی روشنی میں اگر میں تم سے اس مسئلہ میں مناظرہ کروں تو تمہارے خلاف جواب ہو گا اللہ نے فرمایا: وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اس کا حالت حمل میں رہنا اور دودھ چھٹنے میں تیس ماہ ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے دونوں آیتوں کے ملانے سے مدت حمل کم سے کم چھ ماہ آتی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر تعزیری سزا منسوخ کر دی۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سزا ساقط کر دی اور کسی نے مخالفت نہیں کی تو یہ اجماع سکوتی ہو گیا (کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے) بعض چھ ماہ کا بچہ پیدا ہوتا اور زندہ بھی رہتا ہے۔
امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل دو سال ہے۔
دار قطنی اور بیہقی نے سنن میں ابن المبارک کے طریق سے از داؤد بن عبدالرحمٰن از ابن جریج از جمیلہ بنت سعد ایک حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تکلے کے سایہ کی بقدر بھی کوئی عورت حمل میں دو سال سے آگے نہیں بڑھتی دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے حمل دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا خواہ بادلی تکلے کے سایہ کے برابر ہو۔
ایک قول میں امام شافعیؒ و امام احمدؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت حمل چار سال ہے دوسری روایت میں امام مالکؒ کا قول آیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مدت حمل پانچ برس ہے حماد بن سلمہ نے کہا ہرم بن حیان کو ہرم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ماں کے پیٹ میں چار برس رہا تھا (ہرم بہت زیادہ بوڑھے آدمی کو کہتے ہیں)

بیہقی کا بیان ہے کہ ولید بن مسلم نے امام مالک بن انس سے کہا مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا عورت کے پیٹ کی مدت میں دو سال سے تکلے کے سایہ کے بقدر بھی اضافہ نہیں ہوتا امام مالک نے فرمایا۔ سبحان اللہ یہ کون کہتا ہے میری پڑوسن محمد بن عجلان کی بیوی بہت سچی عورت ہے اور اس کا شوہر بھی بڑا سچا آدمی ہے اس عورت کے تین بطن بارہ سال میں پیدا ہوئے ہر بطن چار سال میں۔

ابن ہمام نے کہا ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جو مدت بتائی ہے وہ (حضرت عائشہؓ کا) قیاس نہیں ہے ایسے مسائل میں قیاس کو دخل نہیں (صرف سماعی ہے (رسول اللہ ﷺ سے آپ نے بیان کی ہوگی) لہٰذا مرفوع کے حکم میں ہے (یعنی حضرت عائشہؓ کا قول نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے) اور حدیث مرفوع بمعرض محمد بن عجلان کی بیوی کے قول سے زیادہ قابل اعتماد ہے اگر حدیث کی نسبت شارع کی طرف صحیح ثابت ہو جائے تو پھر حدیث میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہو سکتا اور ولید بن مسلم کی روایت اگر صحیح بھی ہو اور امام مالکؒ نے ایسا ہی فرمایا ہو اور عورت نے بھی ایسا ہی بیان کیا ہو تب بھی اس میں غلطی کا احتمال ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ چار برس تک (حیض کا) خون نہیں آتا اور چار سال کے بعد بچہ پیدا ہوا تو اس سے یہ یقین کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ عورت پورے چار برس حاملہ رہی ہو سکتا ہے کہ اس کی پاکی کی مدت دو سال یا اس سے زیادہ رہی ہو پھر دو سال یا اس سے کم مدت حمل والی ہوئی ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ پیٹ کے اندر حرکت ہوتی ہوئی چار سال تک محسوس ہوتی رہی (لا محالہ بچہ ہی حرکت کرتا ہوگا) تو حرکت سے بچہ کے وجود پر بھی استدلال قطعی نہیں بغیر بچہ کے (صرف ریاح وغیرہ کی) حرکت بھی ممکن ہے ہم سے بیان کیا گیا تھا کہ ایک عورت نے نو ماہ تک پیٹ میں کسی چیز کی حرکت محسوس کی اس عرصہ میں خون بھی رکا رہا اور پیٹ بھی بڑھ گیا جب وضع حمل کا وقت آیا اور دایہ جا کر بیٹھی اور درد زہ سے قریبی پھوٹ گیا اور رفتہ رفتہ پیٹ گھٹ گیا اور کوئی بچہ پیدا نہ ہوا آخر دایہ اٹھ گئی..... شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر چھ سال گھر سے غائب رہا جب واپس آیا تو بیوی کو حاملہ پایا حضرت عمرؓ نے اس کو سنگسار کرانے کا ارادہ کیا حضرت معاذؓ نے فرمایا امیر المؤمنین اگر اس عورت پر آپ کو (زنا کی) دست رس ہو بھی گئی تب بھی اس کے پیٹ کے بچہ پر آپ کو کوئی دست رس نہیں ہو سکتی یعنی اس کو آپ قتل نہیں کر سکتے جب بچہ پیدا ہو جائے تو عورت کو سنگسار کرا سکتے ہیں غرض بچہ پیدا ہوا اور ایسا ہوا کہ اس کے دو اگلے دانت بھی نکل آئے تو اس شخص نے بچہ کو دیکھا تو بولا قسم ہے رب کعبہ کی یہ میرا بچہ ہے۔ (حضرت عمرؓ نے عورت کی سزا منسوخ کر دی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو سال سے زائد مدت حمل حضرت عمرؓ نے تسلیم کر لی)۔

جواب

یہ سزا کی منسوخی تو اس وجہ سے ہوئی کہ مرد نے اس بچہ کو اپنا بیٹا ہونا تسلیم کر لیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اسی کا بیٹا ہے اور جس کا فراش ہوتا ہے بچہ اسی کا شمار مانا جاتا ہے (خواہ وہ بچہ زنا کا ہی ہو مگر ماں چونکہ شوہر ہی کا کہی) اس لئے حضرت عمرؓ نے سزا موقوف کر دی۔

مسئلہ

ایک بطن میں ایک رحم کے اندر زیادہ سے زیادہ کتنے بچے ہوتے ہیں اس کی کوئی حد نہیں۔ بعض نے کہا اگر چار بچوں کا ہونا تو معلوم ہوا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا یمن میں مجھ سے ایک شیخ نے بیان کیا تھا کہ اس کی بیوی کے پانچ بطن ہوئے اور ہر بطن میں پانچ پانچ بچے ہوئے۔ میں کہتا ہوں ہندوستان میں ایک خبر مشہور ہوئی تھی کہ پورب کی طرف قاضی قدوہ کی بیوی کے ایک بطن میں ایک جھلی میں سو بچے ہوئے اور سب زندہ ہے۔

بغوی نے لکھا ہے اہل تفسیر کہتے ہیں کہ یَغِیضُ الْاَرْحَامُ حیض ہے جو بچہ پر اثر انداز ہوتا ہے اگر حاملہ کو حیض آنے لگے

ہیں رات کے فرشتے چڑھ جاتے ہیں تو ان کے پیچھے دن کے فرشتے آجاتے ہیں اور دن کے فرشتے چڑھ جاتے ہیں تو ان کے بعد رات کے فرشتے آجاتے ہیں اور بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اور آفات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔[1]

بغوی نے صحیح سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں فجر اور عصر کی نماز میں دونوں کا اجتماع ہوتا ہے رات بھی جو فرشتے تم میں رہتے ہیں فجر کو جب وہ چڑھ جاتے ہیں تو ان کا رب باوجودیکہ خود بخوبی واقف ہوتا ہے پھر بھی فرشتوں سے پوچھتا ہے تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں ان کو ہم نے نماز پڑھتے چھوڑا اور جب ہم پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ یعنی چھپنے والے اور ظاہر ہونے والوں میں سے ہر ایک کے آگے۔

وَمِنْ خَلْفِهِ یعنی اس کے باقی اطراف میں۔ (حضرت مفسرؒ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خَلْف سے مراد صرف پیچھے کا رخ نہیں بلکہ دایاں بایاں رخ بھی اس میں شامل ہے کیونکہ دائیں بائیں رخ سے حفاظت کرنے پر بھی تو فرشتے مقرر ہیں)

يَحْفَظُونَهُ یعنی اگر تقدیری وقت اور حکم نہیں آیا ہے تو حفاظت کرتے ہیں اور تقدیر کا لکھا آچکا ہے تو بندے کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

مجاہد نے کہا ہر بندے پر ایک فرشتہ موکل (مقرر) ہے جو سوتے جاگتے اس کی حفاظت کرتا ہے اور ہر جن وانس اور کیڑے مکوڑے سے اس کی نگہداشت کرتا ہے جو (ضرر رساں) چیز بھی بندے پر آنا چاہتی ہے فرشتہ اس سے کہتا ہے ہٹ پرے چل ہاں اللہ ہی کا حکم کسی چیز کے آپہنچنے کا ہوتا ہے تو وہ چیز پہنچ جاتی ہے کعب احبار نے کہا اگر اللہ فرشتوں کو تم پر مامور نہ کرو یتا جو کھانے پینے اور برہنگی کے وقت تمہارے قریب رہتے ہیں تو جنات تم کو جھپٹ لیتے یا يَحْفَظُونَهُ سے مراد ہے کہ آدمی کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں اس مطلب پر مُعَقِّبَات سے مراد ہوں گے وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں ہاتھ پر بیٹھے نیکیاں اور بدیاں لکھتے رہتے ہیں (اور چونکہ یہ فرشتے چار ہیں دو دن کے اور دو رات کے اس لئے مُعَقِّبَات بصیغۂ جمع فرمایا۔ مترجم)

اللہ نے فرمایا ہے إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ۔ ابن جریج نے کہا یعنی آدمی پر اس کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں۔

[1] ابن جریر نے کنانہ عدوی کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے بتائیے کہ بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔ فرمایا ایک فرشتہ تیرے دائیں ہاتھ کی طرف ہے جو تیری نیکیوں پر مامور ہے اور وہ بائیں ہاتھ والے فرشتے کا سردار ہے جب تو کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب تو کوئی ایک بدی کرتا ہے تو بائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے میں اس کو لکھ لوں تو دائیں ہاتھ والا کہتا ہے (ابھی ٹھہرو) شاید یہ توبہ و استغفار کرے جب تین بار ایسا کہہ چکتا ہے تو دائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے اچھا لکھ لو اللہ اس سے ہم کو بچائے یہ برا ساتھی ہے نہ اس کو اللہ کا پاس و لحاظ ہے نہ اللہ سے شرم اللہ فرماتا ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ جو کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتا مگر ایک محافظ تیار اس کے پاس لکھنے کیلئے موجود رہتا ہے جو لکھ لیتا ہے اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں اللہ فرماتا ہے لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ اور ایک فرشتہ تیری پیشانی پر مقرر ہے جب تو اللہ کے لئے اس کو نیچے رکھتا ہے تو وہ تجھے سربلند کرتا ہے اور اگر تو غرور کرتا ہے تو وہ تجھے شکستہ کر دیتا ہے (ذلیل کر دیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے لبوں پر مامور ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ تو محمد ﷺ پر جو درود پڑھے اس کی نگہداشت کریں اور ایک فرشتہ تیرے منہ کا محافظ ہے کہ سانپ (وغیرہ) تیرے منہ میں داخل ہونے نہ پائیں۔ اور دو فرشتے تیری دونوں آنکھوں پر مامور ہیں یہ ہر آدمی کے دس فرشتے ہوئے۔ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں پر اترتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں سے الگ ہیں۔ یہ کل ہر آدمی کے لئے بیس فرشتے ہیں اور ابلیس دن میں ہے اور اس کی اولاد رات کو آتی ہے۔ (از مظہری قدس سرہٗ)

یوں مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ کے دونوں ترجمے ہو سکتے ہیں وہ فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں اللہ کے حکم سے یا بندہ کی حفاظت کرتے ہیں اللہ کے حکم کی وجہ سے۔ اول مطلب پر معقبات کی صفت ہوئی اور دوسرے مطلب پر یحفظونہ سے اس کا تعلق ہو گا۔ یا امر اللہ سے مراد ہے اللہ کا عذاب یعنی اللہ کے عذاب سے بندے کو بچاتے ہیں۔ ان کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں، مہلت طلب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ میں مِنْ بمعنی باء ہے یعنی اللہ کے حکم کے سبب اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

بعض کے نزدیک معقبات سے مراد وہ آدمی ہیں جو بادشاہ کے گرد اس کی حفاظت کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور بادشاہ اپنی عام خیال کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ اللہ کے جاری کردہ فیصلہ سے وہ مجھے بچالیں گے۔

بغوی نے لکھا ہے بعض نے کہا ہے کہ لہ معقبات میں ہ کی ضمیر محمد ﷺ کی طرف راجع ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے اللہ کی طرف سے کچھ فرشتے مقرر ہیں جو آپ کے آگے پیچھے رہتے ہیں اور شیاطین جن و انس کے شر اور حوادث لیل و نہار سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں۔

عبدالرحمن بن زید نے کہا اس آیت کا نزول عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ کے سلسلہ میں ہوا۔ کلبی نے بروایت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل عامری اور اربد بن ربیعہ عامری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادہ سے چلے۔ آپ مسجد کے اندر صحابہ کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے دونوں مسجد میں داخل ہو گئے۔ عامر بن طفیل کانا تھا مگر تھا بہت ہی حسین خوبصورتی کی وجہ سے لوگ نظر اٹھا اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے عرض کیا یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آرہا ہے فرمایا آنے دو اگر اللہ کو اس کی بھلائی منظور ہو گی تو اس کو ہدایت کردے گا۔ عامر آکر کھڑا ہو گیا اور بولا محمد ﷺ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا۔ فرمایا جو دوسرے مسلمانوں کے حقوق و فرائض ہوں گے وہی تمہارے ہوں گے (یعنی نفع و نقصان میں تم مسلمانوں کے برابر کے شریک ہو جاؤ گے) کہنے لگا اپنے بعد یہ حکومت میرے سپرد (کرنے کا وعدہ) کریں تو میں مسلمان ہو جاؤں گا حضور ﷺ نے فرمایا اس کا اختیار مجھے نہیں یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے کرے، کہنے لگا تو آپ صحرائیوں بدویوں اور خانہ بدوشوں پر مجھے حاکم بنادیں اور شہریوں (گھروں میں رہنے والوں) پر آپ حاکم رہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ بھی نہیں ہو سکتا بولا پھر آپ مجھے کیا دیں گے۔ فرمایا میں گھوڑوں کی لگامیں تم کو سپرد کردوں گا جن پر سوار ہو کر تم جہاد کرو گے۔ بولا کیا آج تک میرے پاس یہ نہیں ہیں (یعنی گھوڑے تو میرے پاس موجود ہیں جن پر سوار ہو کر میں جنگ کرتا ہوں) اچھا آپ میرے ساتھ اٹھ کر آئیے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ حضور ﷺ اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لئے عامر نے اربد سے کہہ دیا تھا کہ جب تو مجھے محمد ﷺ کے ساتھ باتوں میں مشغول دیکھے تو ان کے پیچھے سے آکر تلوار سے حملہ کردینا چنانچہ عامر جب رسول اللہ ﷺ سے کچھ جھگڑا اور گفتگو میں لوٹ پلٹ کرنے لگا تو اربد حملہ کرنے کے ارادے سے گھوم کر حضور ﷺ کے پیچھے آگیا اور ایک بالشت تلوار نیام سے کھینچ بھی لی لیکن اللہ نے اس کو روک دیا اور وہ پوری تلوار نہ کھینچ سکا عامر اس کی طرف اشارے بھی کرتا رہا رسول اللہ ﷺ نے جو منہ پھیر کر اربد کو دیکھا اور تلوار نکالنے کی کوشش میں مشغول پایا تو دعا کی اے اللہ جس طرح تو چاہے میری طرف سے ان کا کام تمام کردے (یعنی مجھے ان کا تدارک کرنا پڑے تو غیب سے ان کو ختم کردے) اس روز ابر کا نام کو نہ تھا دن سخت گرمی کا تھا اور فضا صاف تھی لیکن یکدم اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور اس کو سوختہ کردیا۔ عامر پیٹھ پھیر کر بھاگا اور کہنے لگا محمد ﷺ تو نے اپنے رب سے دعا کی اس نے اربد کو مار ڈالا خدا کی قسم میں تیرے اوپر اتنے کم سن گھوڑے اور نوجوان لڑکے چڑھا کر لاؤں گا کہ اس سارے میدان کو فوج سے بھر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تجھے ایسا کرنے ہی نہ دے گا اور قیلہ کی دونوں شاخیں یعنی اوس و خزرج بھی تجھے ایسا نہ کرنے دیں گے (ان کی موجودگی میں تو کچھ نہیں کر سکتا) غرض عامر ایک سلولیہ عورت کے گھر جا کر اترا اور صبح کو اٹھ کر ہتھیار باندھے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دوڑاتا ہوا صحرا میں پہنچا اور غرور سے کہنے لگا اے موت کے فرشتے میرے سامنے

نکل کر آیا پھر کچھ شعر پڑھنے لگا اور بولا قسم ہے لات و عزیٰ کی اگر دوپہر تک میں محمد ﷺ اور اس کے ساتھی یعنی ملک الموت تک پہنچ گیا تو اپنا یہ برچھا دونوں کے آرپار کردوں گا۔ اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کی ایک جھپٹ اس کے منہ پر رسید کی اور عامر چکرا کر زمین پر گر پڑا اور اسی وقت اس کی ران پر ایک بڑی گلٹی نکل آئی مجبوراً سلولیہ عورت کے گھر لوٹ گیا اور کہنے لگا اونٹ کی گلٹی کی طرح گلٹی اور سلولیہ کے گھر میں موت۔ پھر گھوڑا منگوا کر سوار ہوا اور دوڑاتا ہوا اجل آیا آخر گھوڑے کی پشت پر ہی مر گیا اور اسی طرح اللہ نے رسول ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔

عامر طاعون سے مرا اور اربد بجلی سے ہلاک ہوا اور اسی واقعہ کے سلسلہ میں اللہ نے نازل فرمایا سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۭ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ـ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت وہ فرشتے کرتے ہیں جو رسول ﷺ کے آگے پیچھے ہیں۔ جیسا کہ ثعلبی نے روایت کیا۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اربد بن قیس اور عامر بن طفیل مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عامر نے کہا محمد ﷺ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے حضور ﷺ نے فرمایا جو مسلمانوں کا فائدہ ہو گا وہ تمہارا بھی ہو گا اور جو مسلمانوں پر فرض ہو گا وہ تم پر بھی ہو گا۔ عامر نے کہا کیا اپنے بعد آپ میرے لئے یہ حکومت مقرر کر دیں گے حضور ﷺ نے فرمایا یہ نہ تم کو ملے گی نہ تمہاری قوم کو یہ سن کر عامر نے اربد سے چپکے سے کہا میں محمد ﷺ کو باتوں میں لگاؤں گا تم تلوار سے ان پر حملہ کر دینا غرض اس کے بعد دونوں لوٹ گئے (پچھلے وقت) عامر نے کہا محمد ﷺ اور امیرے ساتھ اٹھ کر چلو حضور ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے اربد نے تلوار سونت لی اور قبضہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ہاتھ سوکھ گیا رسول اللہ ﷺ نے گردن پھیر کر اس کو دیکھ لیا پھر دونوں کو چھوڑ کر آپ واپس چلے گئے۔ دونوں چلے گئے جب مقام رقم میں پہنچے تو بحکم خدا اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور بجلی نے اس کو ہلاک کر دیا اس پر اللہ نے آیت اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى ...... شَدِيْدُ الْمِحَالِ تک نازل فرمائیں۔ (ثعلبی اور طبرانی کی روایت میں فرق یہ ہے کہ ثعلبی کی روایت میں اربد بن ربیعہ کہا ہے اور طبرانی کی روایت میں اربد بن قیس۔ ثعلبی کی روایت میں عامر کا طاعون سے ہلاک ہونا مذکور ہے اور طبرانی کی روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ثعلبی کی روایت میں بہت زیادہ تفصیل ہے اور طبرانی کی روایت مختصر ہے وغیرہ۔ مترجم)۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْۗءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی اچھی حالت کو بری حالت سے نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی اچھی حالت کو نہیں بدلتے اور جب اللہ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا چاہتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں اور کوئی اللہ کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا۔

مَا بِقَوْمٍ یعنی کسی قوم کی عافیت اور نعمت کو نہیں بدلتا۔ مَا بِاَنْفُسِهِمْ یہاں تک کہ وہ اپنے اچھے احوال کی جگہ برے احوال اختیار نہ کر لیں۔

وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ یعنی اپنے اچھے احوال کو خود اپنے ہاتھوں بگاڑ دینے کے بعد جب اللہ ان پر مصیبت ڈالنا چاہتا ہے، عذاب دینا اور تباہ کرنا چاہتا ہے۔ فَلَا مَرَدَّ لَهٗ تو اس کو کوئی لوٹانے والا نہیں۔ مَرَدَّ مصدر ہے بمعنی اسم فاعل۔ مِنْ وَّالٍ کارساز جو دیکھ کر مصیبت کو دفع کر سکے۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ ارادۂ خداوندی کے خلاف ہونا محال ہے (یہی مسلک اہلسنت کا ہے معتزلہ قائل ہیں کہ جس طرح حکم خداوندی کی خلاف ورزی ممکن بلکہ واقع ہے اسی طرح اللہ کے ارادہ و مشیت کی خلاف ورزی بھی ہو سکتی ہے۔ مترجم)

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝

وہی تو تم کو ڈرانے اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور بوجھل بھاری پانی سے بھرے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ یعنی کڑک کا خوف، سفر میں بارش کے ضرر کا خوف۔ بعض وقت کھیتی تباہ ہونے کا خوف اور بعض مکانوں کے گر جانے کا خوف اور گرمی کو دور کرنے اور کھیتی اور پھلوں اور درختوں کو فائدہ پہنچنے کی امید۔ سحاب سحابة کی جمع ہے بادل (سَحَبَ کھینچا السحاب کھینچا) ہوا کے ساتھ فضا میں بادل کھنچ کر آتے ہیں اسی لئے ابر کو سحاب کہا جاتا ہے کذا فی القاموس۔ بیضاوی نے سحاب کو اسم جنس کہا ہے۔

ثِقَال ثقيلة کی جمع بھاری یعنی بارش سے بھرے ہوئے۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت علیؓ نے فرمایا بادل پانی کی چھلنی ہے۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ ۚ اور اس کے خوف سے رعد اور دوسرے فرشتے اس کی پاکی اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یعنی سبحان اللہ وبحمدہ کہتے ہیں۔ ترمذی اور نسائی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رعد کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مقرر ہے اس کے پاس آگ کے کوڑے ہوتے ہیں جن سے وہ بادلوں کو ہنکاتا ہے۔[1]

مِنْ خِيفَتِهِ اللہ کے خوف سے۔ خیفتہ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے کہا الملائکة سے مراد وہ فرشتے ہیں جو رعد کے مددگار اور اس کے زیر حکم ہیں اس صورت میں من خیفتہ کی ضمیر رعد کی طرف لوٹائی جا سکتی ہے یعنی رعد کے خوف سے اس کے مددگار تسبیح کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو شخص رعد کی آواز سن کر سُبْحَانَ الَّذِي يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ پڑھے اور بجلی اس پر گر پڑے تو (گویا) دین اسلام پر مرے گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ رعد کی آواز سن کر باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے سُبْحَانَ مَنْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ اور فرماتے تھے یہ زمین والوں کے لئے سخت دھمکی ہے۔

جویبر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رعد (فرشتہ) بادلوں پر مامور ہے جہاں حکم ہوتا ہے بادلوں کو چلاتا ہے اور پانی کے سمندر اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں (بھرے ہوئے) ہیں اور وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اور جب وہ پاکی بیان کرتا ہے تو آسمان کا کوئی فرشتہ باقی نہیں رہتا جو اس کی تسبیح کے ساتھ خود بھی بلند آواز سے تسبیح نہ کرے اس وقت بارش اترتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے رب نے فرمایا اگر میرے بندے میرے حکم پر چلتے تو میں رات میں ان کو بارش سے سیراب کرتا اور دن میں ان پر دھوپ نکال دیتا (تاکہ ان کے کاروبار کا نقصان نہ ہو) اور ان کو رعد کی آواز بھی نہ سناتا (کہ وہ خوف زدہ ہو جائیں) رواہ احمد بسند صحیح والحاکم۔ بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے اس کو سننے والے تسبیح اور تحمید کرتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یا یہ مطلب ہے کہ رعد تسبیح کرتا ہے یعنی بادل کی گرج اللہ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہے اور اس کے فضل و نزول رحمت کا بھی اظہار کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ مطلب اس وقت ہوگا جب رعد کا فرشتہ ہونا ثابت نہ ہو۔

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ اور وہ بجلیاں بھیجتا اور جس پر چاہتا ہے ان کو گراتا ہے۔ صواعق صاعقة کی جمع ہے، صاعقہ ہلاک کرنے والی بجلی۔ یہاں مراد ہے ٹوٹ کر گرنے والی بجلی کہ جس پر گرتی ہے

---

[1] ترمذی، احمد اور نسائی نے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہودیوں نے حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ رعد کیا ہے۔ فرمایا بادل کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس طرف اللہ حکم دیتا ہے وہ بادل کو ہنکاتا ہے یہ آواز کیسی ہوتی ہے جو ہم کو سنائی دیتی ہے۔ فرمایا اس کی آواز ہوتی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک فرشتہ ابر پر مامور ہے جو نافرمان بادلوں کو جمع کرتا ہے اس کے ہاتھ میں کوڑا ہے جب وہ کوڑا اٹھاتا ہے تو چمک پیدا ہو جاتی ہے جب اٹھاتا ہے تو گرج پیدا ہوتی ہے تو جب مارتا ہے تو بجلی گرتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)

اس کو سوختہ کر دیتی ہے۔

وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ ۚ اور وہ اللہ کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ سے جھگڑتے ہیں یعنی اللہ کی توحید اللہ کی قدرت کاملہ اللہ کے علم محیط اور لوگوں کے دوبارہ پیدا ہونے اور سزا و جزا دیئے جانے کے متعلق اللہ کے رسول سے جھگڑتے ہیں۔ جدال جھگڑے میں سختی کرنا۔ یہ لفظ جَدَل سے بنا ہے۔ جدل کا معنی ہے قتل کر دینا۔ یعنی اللہ کی صفات کمالیہ کی تو یہ نشانیاں ہیں جو اوپر ذکر کر دی گئیں اور اس حالت میں بھی یہ لوگ جھگڑتے ہیں اور اس کے وجود و کمال قدرت کا انکار کرتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن علی باقر نے فرمایا بجلی مسلم و غیر مسلم سب پر گرتی ہے مگر ذکر کرنے والے مسلم پر نہیں گرتی۔

نسائی اور بزار نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو دور جاہلیت کے کسی بڑے آدمی کے پاس دعوت ایمان دینے کے لئے بھیجا اس شخص نے کہا جس رب کی طرف تو مجھے بلا رہا ہے وہ کس چیز کا ہے لوہے کا ہے، تانبے کا ہے، چاندی کا ہے، سونے کا ہے۔ صحابیؓ نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کو جواب سنا دیا آپ ﷺ نے دوسری بار اور تیسری بار بھیجا (اور اس شخص نے وہی جواب دیا) اس کے بعد اللہ نے اس پر ایک بجلی گرا دی جس سے وہ سوختہ ہو کر رہ گیا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ الخ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول اربد بن ربیعہ کے حق میں ہوا تھا۔ اربد نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا تمہارا رب کس چیز کا ہے، موتی کا ہے، یاقوت کا ہے یا سونے کا ہے اس پر آسمان سے ایک بجلی گری جس نے اربد کو جلا دیا۔

حسن بصریؒ سے جب آیت وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ الخ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا عرب کے شیطان (بڑے مشرکوں) میں سے ایک شخص تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بلانے کے لئے چند آدمیوں کو بھیجا وہ بولا محمد ﷺ کا رب جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو بتاؤ کس چیز کا بنا ہوا ہے، سونے کا ہے، چاندی کا ہے، لوہے کا ہے، تانبے کا ہے۔ ان لوگوں نے اس کے قول کو بڑی گستاخی سمجھا اور واپس آکر خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضور ﷺ نے ہم کو ایسے آدمی کے پاس بھیجا کہ اس سے بڑھ کر کافر اور اللہ کا سرکش اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کے پاس پھر جاؤ۔ حسب الحکم صحابہ دوبارہ گئے اس شخص نے پہلی مرتبہ سے بھی زیادہ گستاخانہ کلام کیا اور بولا کیا محمد ﷺ کے کہنے سے میں ایسے رب کو مان لوں جو نہ مجھے دکھائی دیتا ہے نہ میں اس کو پہچانتا ہوں۔ صحابہ لوٹ آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے تو پہلی بات سے بھی زیادہ بری بات کہی۔ فرمایا پھر لوٹ کر جاؤ۔ صحابہ پھر لوٹ کر گئے اس سے گفتگو کر ہی رہے تھے اور وہ بھی یہی بات کر رہا تھا کہ اچانک ایک بدلی اٹھی اور سب کے سروں پر آگئی اور اس میں گرج اور چمک پیدا ہوئی اور ایک کڑک اس شخص پر گر پڑی اور سب کے سامنے وہ سوختہ ہو گیا۔ صحابہ دوڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دینے آنے لگے راستے میں صحابہؓ کی ایک جماعت اور مل گئی اور انہوں نے کہا وہ آدمی جل گیا۔ لوٹ کر آنے والوں نے دریافت کیا تم کو کیسے معلوم ہوا۔ جماعت صحابہؓ نے کہا اللہ نے اپنے رسول کے پاس وحی بھیجی اور یہ آیت نازل فرمائی وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ۔

وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۞ حالانکہ وہ بڑی سخت قوت والا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حسن بصریؒ نے اس کا ترجمہ کیا سخت گیرنے والا اور مجاہد نے کہا سخت قوت والا اور ابو عبیدہ نے کہا سخت سزا دینے والا۔ بعض نے کہا سخت تدبیر اور مقابلہ والا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے مِحَال بروزن کتاب۔ مکر، خفیہ تدبیر سے کسی کام کو کرنے کا ارادہ۔ تدبیر، قدرت، جھگڑا، عتاب، سزا، شخی، قوت، شدت، ہلاک ہونا، ہلاک کرنا ان معانی میں سے کثر اس جگہ مراد لئے جا سکتے ہیں۔ مِحَال کا وزن فِعَال ہے (میم اصلی ہے) مَحْل سے مشتق ہے بعض نے کہا مفعل کا وزن مفعل ہے (میم اصلی نہیں) اس وقت حول یا حیلہ یا حیلولۃ سے برخلاف قیاس مشتق ہو گا۔ اسی بناء پر حضرت ابن عباسؓ

نے اس کا ترجمہ کیا شدید القول اور حضرت علیؓ نے فرمایا سخت پکڑ والا۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے، یعنی اسی کی دعوت واجب القبول ہے اور دوسرے کی دعوت قابل قبول نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسی کی سچی پکار ہے وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت کی طرف بلایا جائے اور اسی سے حاجتیں پوری کرنے کی دعا کی جائے۔ یا دعوۃ الحق سے مراد ہے اخلاص کے ساتھ دعا کرنا۔ یعنی اخلاص کے ساتھ دعا اسی سے کی جاسکتی ہے۔ ان تمام توجیہات پر حق سے مراد ہوگا وہ مفہوم جو باطل کی ضد ہے۔

دَعْوَةُ موصوف ہے الحق صفت۔ موصوف کو صفت کی طرف مضاف کر دیا گیا ہے جیسے مسجدُ الجامع اور جانبُ الغربی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الحق کا موصوف المدعو محذوف ہو یعنی دعوة الحق المدعو۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد اللہ ہے۔ اللہ کی ہی پکار حق کی طرف بلاوا ہے۔

ایک شبہ

اگر حق سے مراد اللہ ہو تو کلام غیر مفید ہوگا۔ اللہ کی پکار تو اللہ کے ساتھ مخصوص ہی ہے جیسے دوسروں کی پکار دوسروں کے ساتھ مخصوص ہے۔

ازالہ

(بے شک اللہ حق ہے لیکن) اللہ کو حق ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی پکار، حق کی پکار ہے۔ دعوت حق، حق ہوتی ہے، جیسے باطل کو پکارنا باطل ہوتا ہے۔ گویا یہ جملہ اپنے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی رکھتا ہے۔ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا دعوت حق توحید ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا دعوت حق لا الٰہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے خاص ہے توحید اور شہادت کی دعوت۔

اگر آیت کا نزول عامر اور اربد کے متعلق مانا جائے تو دونوں جملوں کا مقصد یہ ہوگا کہ ان دونوں شخصوں کو اس طور سے ہلاک کرنا کہ ان کو پتہ بھی نہ ہو اللہ کی خفیہ تدبیر کے زیر اثر تھا اور رسول اللہ ﷺ کی دعا کی وجہ سے تھا یعنی آپ کی دعا قبول ہوگئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ رسول برحق ہیں جب ہی تو آپ کی دعا اللہ نے قبول فرمائی۔ اور اگر آیت کو کسی شان نزول سے متعلق قرار نہ دیا جائے بلکہ عام مانا جائے تو کافروں کو تہدید کرنی مقصود ہوگی کہ تم اللہ کے رسول سے جھگڑتے ہو، اللہ بڑا طاقت اور خفیہ تدبیر کرنے والا ہے اور رسول کی دعا قبول کرنے والا ہے۔

یا صرف کافروں کی بد عقیدگی اور گمراہی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ (تہدید مقصود نہیں)۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ پانی خود بخود اس کے منہ تک آجائے حالانکہ وہ پانی از خود آگے بڑھ کر اس کے منہ تک آنے والا نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ۔ الَّذِيْنَ سے مراد یا تو کفار ہیں اور يَدْعُوْنَ کا مفعول محذوف ہے، یعنی بت وغیرہ ترجمہ اس طرح ہوگا اور وہ کافر جو اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کو پکارتے ہیں ان کی عبادت اور یاد کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یا الَّذِيْنَ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی کافر پوجا کرتے ہیں۔ ترجمہ اس طرح ہوگا اور جن بتوں کو یہ کافر پوجتے ہیں۔ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ وہ بت ان کافروں کی کوئی درخواست حصول نفع کی ہو یا دفع ضرر کی قبول نہیں کرتے۔ لا یستجیبون کا معنی ہے لا یجیبون منظور نہیں کرتے۔ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ مستثنیٰ محذوف ہے اور باسط سے پہلے مضاف بھی

بعد از ف ہے مگر اتنی ہی منظوری جتنی منظوری اس شخص کے لئے ہوتی ہے جو پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے کہ پانی خود اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ یعنی ایک پیاسا جو کنویں کی منڈیر پر بیٹھا پانی کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو اور پانی کو اپنی طرف بلا رہا ہو خود تو اندر جھک نہیں سکتا پانی کو بلاتا ہے۔

وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ (ظاہر ہے کہ) پانی اس کے منہ تک خود پہنچنے والا نہیں وہ تو بے جان اور بے شعور چیز ہے اس کو معلوم بھی نہیں کہ کون اس کو پکار رہا ہے نہ وہ کسی کے بلاوے کو قبول کر سکتا اور نہ دعوت پر آ سکتا ہے۔ کافروں کے معبودوں کی بھی یہی حالت ہے کافر بتوں کو پکارتے ہیں بتوں کو ان کی پکار کا پتہ بھی نہیں ہوتا وہ بے شعور و بے جان ہیں وہ ان کی دعا قبول نہیں کر سکتے۔ مطلب کی یہ تشریح مجاہد اور عطاء نے کی ہے اور حضرت علیؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ لیکن بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ بتوں کی عبادت اور دعا کی عدم افادیت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو پینے کے لئے چلو بھر کر پانی لینا چاہتا ہو اور دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلائے اور پانی کو ہتھیلی میں اٹھانا چاہے ظاہر ہے کہ پانی کو پکڑنے والا پکڑ نہیں سکتا اور اس کے منہ تک پانی پہنچ نہیں سکتا۔ بتوں کے پجاریوں کی بھی یہی حالت ہے۔ بت نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتے نہ ضرر (ان کی عبادت ایسی ہے جیسے پانی کو پکڑنے کی کوشش) یہ تشریح حضرت ابن عباسؓ کے قول میں بھی آئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا غیر اللہ کی پوجا کرنے والے ایسے ہیں جیسے کوئی پیاسا اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کے اندر پھیلا دے جب تک ہتھیلیاں پھیلائے رکھے گا چلو نہ بنائے گا پانی نہ آئے گا اور منہ تک نہیں پہنچے گا۔ اس صورت میں بت پرستوں کی ناکامی کی ہتھیلیاں پھیلائے رکھنے والے پیاسے کی ناکامی سے تشبیہ ہو گی۔

وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ اور (ان باطل معبودوں سے) کافروں کا درخواست کرنا محض بے اثر ہے۔ ضلال بے کار، ضائع، سراسر خسارہ۔

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ تشریحی قول نقل کیا ہے کہ کافروں کا اپنے رب کو پکارنا بالکل بے سود ہے بے کار ہے غموم و معاصی کے پردے خدا تک پہنچنے میں آڑے آتے ہیں ان کی دعائیں رب تک پہنچتی ہی نہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝

اور اللہ ہی کے سامنے سب سر خم کئے ہوئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام کے اوقات میں۔

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا یعنی ملائکہ اور اہل ایمان بندے خوشی سے اللہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

وَّكَرْهًا اور وہ منافق و کافر جو تلوار کے خوف سے سر خمیدہ ہوتے ہیں، کراہت کے ساتھ سر جھکاتے ہیں یا مصائب کی شدت اور ضرورت ان کو سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے اگرچہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔

وَّظِلٰلُهُمْ اور بالتبع ان کے سائے بھی سر خمیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سجدہ کرنے سے مراد ہو تابع مشیت ہونا اور امر اللہ اور قدرت کے دائرہ میں محصور رہنا خواہ ان کا خود ارادہ ہو یا نہ ہو مشیت کے تابع سب ہیں اور سایوں کے تابع مشیت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جس طرح چاہتا ہے سایوں کو پھیلاتا اور سمیٹتا، بڑھاتا اور گھٹاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد ہوں حقائق اور ملائکہ و مومنین کی ارواح اور ظلال سے مراد ہوں اشخاص و اجسام۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے ظاہر کو سایہ اور باطن کو فیئ سے تشبیہ دی تھی اور دعا کی تھی اور سجدہ میں عرض کیا تھا میری سیاہی (ظاہری جسم) اور میرا خیال (باطنی نور) تجھے سجدہ کرتا ہے (ظلال کی یہ تشریح اول تشریح سے بہتر ہے کیونکہ سایہ اسی سیاہی کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کی آڑ کی وجہ سے دھوپ وہاں نہیں پہنچتی اور سایہ کا یہ مفہوم عدمی ہے۔ سجدہ کرنے کی نسبت اس کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر سایہ سے مراد ظاہر اور جسم ہو تو سجدہ کی نسبت اس کی طرف کرنا صحیح ہے۔ مترجم)

غدو اور آصال سے مراد ہے ہمہ اوقات ہمیشہ۔ آصال جمع ہے اصیل کی، اس کا واحد ہے عصر سے مغرب تک درمیانی وقت کو اصیل کہتے ہیں۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ آپ دریافت کیجئے کہ آسمان و زمین کا رب کون ہے یعنی ان کو پیدا کرنے والا ان کا انتظام رکھنے والا اور ان کے تمام امور کا متولی کون ہے۔ یہ استفہام تقریری ہے (یعنی کیا ایسا ہے کہ اللہ ہی خالق و مدبر ہے) کیونکہ مشرک بھی تو کل سمجھتے تھے اور ان کو بھی یہ امر تسلیم تھا کہ ان کا اور آسمان و زمین کا خالق اللہ ہی ہے۔

قُلِ اللّٰهُ ۭ آپ خود ہی کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ان کا خالق ہے۔ یعنی اگر وہ کوئی جواب نہ دیں تو ان کی طرف سے آپ جواب دے دیں کہ اللہ ہی آسمان و زمین کا رب ہے کیونکہ وہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ان کا بھی یہی جواب ہوگا یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کا خالق و رب ہونا اتنا ظاہر ہے کہ اس کا کوئی منکر ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا آپ ہی ان کی طرف سے جواب دے دیجئے یا قُلِ اللّٰهُ کہنے سے مشرکوں کو جواب کی دریافت تسلیم و تنبیہ مقصود ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں سے پوچھا کہ آسمان و زمین کا خالق کون ہے تو انہوں نے جواب دیا آپ ہی بتائیے اس پر اللہ نے فرمایا قُلِ اللّٰهُ آپ جواب دے دیجئے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے اس طرز کلام سے یہ جواب ان پر لازم کر دیا۔

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ آپ کہہ دیجئے تو پھر بھی کیا تم اس کے سوا دوسروں کو کارساز و مددگار قرار دیتے ہو۔ اس کلام کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی کیا تم اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہو اور پھر دوسروں کو اپنا کارساز بناتے ہو یہ بات تقاضائے عقل کے خلاف ہے کیونکہ جن کو تم کارساز بناتے ہو ان کی حالت تو یہ ہے کہ

لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ ان کا اپنا نفع و ضرر بھی ان کے بس میں نہیں۔ اپنے لئے وہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں نہ آنے والے ضرر کو اپنے اوپر سے دفع کر سکتے ہیں جب ان کی خود اپنے لئے یہ حالت ہے تو تمہاری کارسازی کیا کر سکتے ہیں اور کس طرح تم کو فائدہ پہنچا سکتے اور تم پر آنے والے ضرر کو دفع کر سکتے ہیں۔ مشرکوں کے گمراہ ہونے اور بتوں کو اپنا کارساز بنانے کی یہ دوسری تردید ہے کہ تم جو ان کی شفاعت کے امیدوار ہو وہ تمہاری شفاعت تو کیا اپنے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڏ آپ پوچھئے کہ کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں نابینا سے مراد ہے بے عقل بے بصیرت یا وہ شخص جو اپنی بصیرت سے کام نہ لے۔ اور بصیر سے مراد وہ بصیرت مند آدمی جو اپنی بصیرت سے عبادت کی حقیقت اور تقاضوں کو سمجھتا ہو اور جانتا ہو کہ عبادت و کارسازی کا مستحق کون ہے اس کی عبادت کی جائے اور کس کو کارساز سمجھا جائے۔ بعض علماء نے کہا اعمیٰ سے مراد وہ معبود ہے جو تمہاری طرف سے لاعلم ہے اور بصیر سے مراد وہ معبود ہے جو تمہارے احوال سے واقف ہو۔

اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ڬ یا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں۔ یعنی کیا کفر اور ایمان برابر ہو سکتے ہیں۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ یا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انہوں نے بھی کسی چیز کو پیدا کیا ہو جیسا خدا نے پیدا کیا ہے پھر ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی واحد اور غالب ہے۔

ام بمعنی بل ہے۔ استفہام انکاری ہے۔ خَلَقُوْا شرکاء کی صفت ہے یعنی ایسے شرکاء جنہوں نے پیدا کیا ہو۔ فَتَشَابَهَ کہ دونوں کی تخلیق میں باہم اشتباہ ہو گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جن معبودوں کو شریک بنا رکھا ہے وہ کسی چیز کے خالق

نہیں کہ ان کو خدا کی تخلیق اور معبودوں کی تخلیق میں اشتباہ ہو جاتا اور یہ کہتے کہ خدا خالق ہے اس لئے معبود ہے اور ہمارے معبود بھی خالق ہیں اس لئے وہ بھی مستحق عبادت ہیں۔ بلکہ جن کو یہ اللہ کا شریک ٹھہرا رہے ہیں وہ تو بالکل عاجز ہیں ان میں تو بالکل ہی قدرت نہیں۔ دوسری مخلوق میں بھی کچھ نہ کچھ قدرت ہے۔ ان معبودوں میں تو اتنی بھی سکت نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اجسام ہوں یا اعراض یا غیر مادی ارواح جس کو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اگر وہ کسی چیز کو پیدا کرنا نہ چاہے تو اس کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں لہٰذا اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں جو لوگ (یعنی معتزلہ فرقہ والے) کہتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اللہ ان کے افعال کا خالق نہیں۔ وہ اسی گروہ میں سے ہیں جن کو دونوں اشیاء اور خدا کی تخلیق ایک جیسی معلوم ہوتی ہے (حضرت مفسر کے کلام سے اس طرف اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت کے نزدیک معتزلہ کا گروہ بھی مشرک ہے یا مشرکوں جیسے عقائد رکھتا ہے اس فرقہ معتزلہ کو بدعتی گروہ بھی قرار دیا ہے۔ لیکن کافر کسی نے نہیں کہا۔ مترجم)

وَهُوَ الْوَاحِدُ یعنی اللہ ربوبیت اور معبودیت میں اکیلا ہے بلکہ اصل وجود میں بھی واحد ہے اصل وجود میں اس کا کوئی شریک نہیں سارے عالم کا وجود تو ظلی ہے اور اللہ کے وجود کا پرتو ہے۔

الْقَهَّارُ وہی ہر چیز پر غالب ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہر چیز فی ذاتہٖ معدوم ہے بغیرہ موجود ہے خود اس کا اپنا وجود نہیں پھر کس طرح اس موجود کا مقابلہ کر سکتی ہے جس کا وجود ذاتی ہے اور اسی کی ہستی اصل ہستی ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ ۢبِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ

اللہ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے پھر وہ سیلاب خس و خاشاک کو بہا لایا جو (پانی کے) اوپر آ رہا ہے۔

اَوْدِيَةٌ وادی کی جمع ہے وہ ندی نالے جہاں پانی بکثرت بہتا ہے وادی کہلاتے ہیں مجازاً وادی میں بہنے والے پانی کو بھی وادی کہہ لیا (یعنی بہنے کی نسبت پانی کی بجائے وادی کی طرف کر دیتے ہیں جیسا کہ آیت مذکورہ میں آیا ہے) بارش ہونے سے تمام وادیاں تو نہیں بہتی ہیں بعض بہتی ہیں اسی لئے اس کو بصورت نکرہ ذکر کیا (یعنی غیر معین وادیاں)

بِقَدَرِهَا یعنی وادیوں کے اندازے کے موافق چھوٹی بڑی جیسی بھی ہوں۔

السَّيْلُ وادیوں میں بہنے والا پانی سیلاب زَبَدًا کف، جھاگ، میل کچیل جو سیلاب کے اوپر آتا ہے۔ رَابِيًا چڑھا ہوا پانی کے اوپر۔

وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ اور

جن چیزوں کو آگ کے اندر زیور یا سامان بنانے کے لئے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل اوپر آ جاتا ہے۔

يُوْقِدُوْنَ کا فاعل ضمیر مستتر ہے مراد لوگ۔ فاعل معلوم معروف تھا اس لئے ذکر نہیں کیا۔ اِيْقَاد (مصدر باب افعال) پگھلانے کے لئے کسی چیز کو آگ میں تپانا۔

مِمَّا میں مِنْ ابتدائیہ ہے یعنی جو چیزیں لوگ پگھلانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں ان سے بھی پانی کے جھاگوں کی طرح جھاگ اور میل کچیل پیدا ہوتا ہے۔ یا مِنْ تبعیض کے لئے ہے یعنی بعض چیزوں سے جھاگ پیدا ہوتے ہیں۔

لہ آیت اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ کی تفسیر کے ذیل میں کسی جگہ نہیں کی روایت آئی ہے جو چند وسائط سے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت معقل بن یسار تک پہنچتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے اندر شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ (طور پر داخل ہو جاتا) ہے میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں جس کی وجہ سے اقسام شرک چھوٹے ہوں یا بڑے سب دور ہو جائیں گے۔ صحابہؓ نے عرض کیا فرمائیے فرمایا ہر روز تین بار کہے اے اللہ میں واقف طور پر تیرے ساتھ شرک کرنے سے تیری پناہ لیتا ہوں اور نادانستہ شرک کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں۔ اور (شرک) یہ (بھی) ہے کہ مجھے اللہ نے اور فلاں شخص نے دیا اور یہ بھی شرک ہے کہ تم کوئی یوں کہے کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو فلاں شخص مجھ کو قتل کر ڈالتا۔

مِمَّا يُوقِدُونَ — جس کو تپاتے ہیں سونا چاندی اور تانبا، پیتل، سیسہ یا لوہا۔ یہ عام ہے ہر پگھلائی جانے والی دھات اس میں داخل ہے۔

ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ زیور بنانے کے لئے جیسے سونا چاندی پگھلایا جاتا ہے۔

أَوْ مَتَاعٍ یا کچھ سامان ظروف بنانے کے لئے جیسے برتن بنانے کے لئے تانبا پیتل پگھلایا جاتا ہے یا آلے بنانے کے لئے یا کھیتی کے اوزار کے لئے لوہا پگھلایا جاتا ہے۔ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ کہنے سے دھاتوں کو پگھلانے کی غرض کا اظہار مقصود ہے۔

زَبَدٌ مِثْلُهُ پانی کے کف کی طرح اس سے بھی میل اوپر آجاتا ہے۔ یعنی بھٹی میں پڑ کر اس سے بھی میل نکل کر اوپر آجاتا ہے۔

كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ

یعنی اللہ کے نازل کردہ علم (قرآن اور دوسری کتب سماویہ) سے لوگ طرح طرح کے دنیوی اور اخروی فائدے حاصل کرتے ہیں اور اپنے دلوں کی وسعت کے مطابق اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور یہ علم خداوندی قیامت تک ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اس کو کبھی زوال نہیں ہے اس کی تشبیہ بارش کے پانی سے دی جاتی ہے اوپر سے بارش ہوتی ہے ندی نالے بھر جاتے ہیں وادیاں بہہ نکلتی ہیں وادی کی جتنی وسعت ہوتی ہے اور جتنی ضرورت ہوتی ہے اتنا ہی پانی اس میں سماتا ہے چھوٹی ندی میں تھوڑا پانی اور بڑی ندی میں زیادہ پانی رواں ہو جاتا ہے لوگ اس پانی سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اس پانی کا کچھ حصہ زمین کے اندر بھی سما جاتا ہے اور اندر گھسنے کے بعد وہی چشموں اور کنوؤں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کچھ حصہ زمین کے اوپر گڑھوں اور تالابوں میں رک جاتا ہے اور مدت تک باقی رہتا ہے۔

یا اللہ کے نازل کردہ علم کو دھات سے تشبیہ دی جا سکتی ہے لوگ زیور، برتن، ہتھیار اور اوزار وغیرہ بنانے میں اس سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اور اس سے بنا ہوا سامان مدت دراز تک باقی رہتا ہے۔ رہا باطل یعنی منکرین و مشرکین (کی خود ساختہ خرافات اور نفس) کی اختراعات اور شیطانی توہمات تو ظاہر ہے کہ وہ سب بے اصل ہیں پراگندہ اور منتشر ہیں بے بنیاد بے اصل ہے بے حقیقت اور بے ثبات ہے ناکارہ ہے اور بے فائدہ ہے ان میں منفعت نہیں ہے ان کو ہم ان جھاگوں اور میل کچیل سے تشبیہ دے سکتے ہیں جو سیلاب اور پگھلائی ہوئی دھات کے اوپر آجاتا ہے جو کوڑا کرکٹ سیلاب کے اوپر آجاتا ہے سیلاب اس کو ادھر ادھر پھینک دیتا ہے، اسی طرح حق بھی باطل کو جمنے نہیں دیتا ادھر ادھر پراگندہ کر دیتا ہے۔

جُفَاءً وہ میل کچیل جو سیلاب یا پگھلائی ہوئی دھات کے اوپر آکر ادھر ادھر منتشر ہو جاتا ہے۔ جَفَا الْوَادِي (ثلاثی مجرد) اور أَجْفَا الْوَادِي (ثلاثی مزید) دونوں ہم معنی ہیں۔ یعنی وادی اور سیلابی نالے نے کوڑا کرکٹ ادھر ادھر پھینک دیا۔ بعض اہل لغت نے کہا کہ جُفَاءً کا معنی ہے منتشر، پراگندہ، جَفَأَتِ الرِّيحُ ہوا نے پراگندہ کر دیا۔

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ۔ یعنی اصل پانی اور دھات تو زمین میں قائم رہتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علم نافع کی بھی یہی حالت ہے یہ بھی پائیدار اور قائم رہنے والا اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے۔

كَذَٰلِكَ یعنی جس طرح اللہ نے حق و باطل کی مذکورہ تمثیل بیان کی اسی طرح غیر واضح امور کو کھول کر سمجھانے کے لئے اللہ تمثیلات سے کام لیتا ہے۔ بعض علماء نے کہا اس میں اہل ایمان کے لئے در پردہ پیام تسکین ہے کہ کفر اگرچہ بظاہر بلند بالا نظر آتا ہے لیکن اس کی تاریکی چھٹ جائے گی اور نور اسلام چمکے گا۔ اور اس کی روشنی ہمیشہ قائم رہے گی۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ

جن لوگوں نے اپنے رب کا کہنا مان لیا ان کے واسطے اچھا بدلہ ہے اور جن لوگوں نے اس کا کہنا نہ مانا ان کے پاس اگر دنیا بھر کی چیزیں موجود ہوں اور اس کے ساتھ اتنی اور بھی ہو تو وہ

[illegible]

سب اپنی رہائی کے لئے دے ڈالیں گے (مگر ان کی رہائی نہ ہوگی)

اَلْحُسْنٰی مفعول مطلق کی صفت ہے یا مفعول بہ محذوف کی صفت ہے۔ یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوت اسلام کو اچھی طرح قبول کر لیا اور اس کے احکام کی تعمیل کی یا اپنے رب کی اچھی دعوت کو قبول کر لیا۔

اَلَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ سے مراد کفار ہیں۔ اس صورت میں لِلَّذِیْنَ کے لام کا تعلق یضرب سے ہوگا یعنی اللہ دونوں گروہوں کے حال بطور تمثیل بیان کرتا ہے۔ دعوت الٰہیہ کو قبول کرنے والوں کے احوال کو بھی اور نہ قبول کرنے والوں کے احوال کو بھی۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک اَلْحُسْنٰی مبتدا مؤخر ہے اور لِلَّذِیْنَ خبر مقدم یعنی اچھا ثواب یا جنت ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کر لی۔ اس تقدیر پر اَلَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ بجائے خود مبتدا ہوگا اور لَوْ اَنَّ لَهُمْ الخ اس کی خبر۔

لَافْتَدَوْا بِهٖ یعنی قیامت کے دن اگر کل زمین کی دولت ان کو مل جائے تو دوزخ سے اپنی رہائی کے لئے وہ دے دیں گے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ ان لوگوں کا سخت حساب ہوگا۔ ابراہیم نخعی نے کہا سوء حساب یہ ہے کہ ان سے سختی کے ساتھ حساب فہمی کی جائے گی اور کوئی گناہ معاف نہیں کیا جائے گا۔

وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۟ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور جہنم بری قرارگاہ ہے۔ اللہ نے ایک اور آیت میں فرمایا ہے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ۔ ان کا بچھونا اور اوڑھنا جہنم کا ہوگا۔

اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰی ؕ جو شخص یقین رکھتا ہو کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے کیا ایسا شخص اس کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ اندھے سے مراد ہے بے بصیرت اور دانش و حق کو باطل سے تمیز نہ کرنے والا۔ روایت میں آیا ہے کہ قول اول الذکر شخص سے مراد ہیں حضرت حمزہ یا حضرت عمار اور نابینا سے مراد ہے ابو جہل۔

اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۟ۙ پس نصیحت تو سمجھدار ہی لوگ قبول کرتے ہیں یعنی سلیم دانش والے جو عقل کو جذبات حمیت و تعصب سے اور فہم کو وہم سے پاک رکھتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ یعنی یوم میثاق میں جو اللہ کی ربوبیت کا انہوں نے اقرار کیا تھا اور اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں بَلٰی کہا تھا اس کو پورا کرتے ہیں اور اللہ نے جو اپنی کتابوں میں احکام کی پابندی کا وعدہ لیا تھا اس کو بھی پورا کرتے ہیں۔

وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ۟ۙ اور پیمان کو نہیں توڑتے یعنی اللہ سے اور آپس میں بندوں سے کئے ہوئے وعدوں کو نہیں توڑتے۔ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ میں صرف عہد خداوندی کی صراحت تھی اور اَلْمِیْثَاق کا لفظ عام ہے اللہ سے کیا ہوا عہد ہو یا بندوں سے کئے ہوئے وعدے۔

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ اور وہ لوگ جوڑے رکھتے ہیں ان تمام چیزوں کو جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ کے قول میں تمام انبیاء اور ساری آسمانی کتابوں پر بغیر تفریق کے ایمان لانا اور تمام مومنوں کے ساتھ تعاون و تنظیم اور قرابت سے حسن سلوک کرنا داخل ہے (ان تمام چیزوں کو جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے) بغوی نے لکھا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک اس جگہ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ سے مراد صرف صلہ رحم ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اللہ نے فرمایا میں ہی اللہ ہوں میں ہی رحمن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمن سے لفظ رحم کو مشتق کیا جو اس کو جوڑے رکھے گا میں اس کو

وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾ اور (بالخصوص) حساب آخرت کی خرابی سے خوف کھاتے ہیں اس لئے آخرت کی حساب فہمی سے پہلے وہ خود اپنے نفسوں سے اسی زندگی میں حساب فہمی کرتے ہیں (اور سوچتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا گناہ کئے ہیں پھر اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہیں)

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا اور جن لوگوں نے صبر کیا یعنی جو احکام ان کو دیئے گئے ہیں ان پر ثابت قدم رہے (حضرت ابن عباسؓ) یا مصائب اور شدائد پر صابر رہے (عطاء) بعض علماء کے نزدیک صبر سے مراد ہے نفسانی خواہشات سے اجتناب کرنا۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ صبر سے مراد ہو خواہشات کی مخالفت پر جما رہنا۔ یہ تفسیر تمام اقوال کو جامع ہے۔[1]

ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ اپنے رب کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے۔ کسی دوسری دنیوی غرض کے لئے نہیں نہ دکھاوٹ اور شہرت کے لئے۔ (نہ مال و جاہ و حکومت کے حصول کے لئے۔ مترجم)

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اور نماز قائم کی یعنی فرض نماز اور سنتیں و نوافل میں سے اپنی مرضی کے مطابق جس قدر چاہا نماز پڑھی۔

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ اور جو کچھ مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ بطور زکوٰۃ فرض اور بطور نفقہ واجب اور بطور صدقہ نفل راہ خدا میں خرچ کیا۔ (خلاصہ) مال میں سے شرائط مقررہ کے مطابق کچھ مال زکوٰۃ میں ادا کرنا ضروری ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی اگر مسلمانوں کو یا اسلام کو ضرورت ہو تو مزید کچھ مال امدادی طور پر دینا لازم ہے اِنَّ فِي الْاَمْوَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ اور کچھ مال بطور خیرات دینا مستحب ہے۔ اَنْفَقُوْا کا لفظ ان تینوں صورتوں کو حاوی ہے حضرت مفسرؒ کی یہی مراد ہے۔ مترجم)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً چھپا کر اور کھلم کھلا۔ نفل خیرات چھپا کر دینا افضل ہے (تاکہ شہرت طلبی کا شائبہ بھی نہ ہو) اور (لوگوں کی بدگمانی کو دور کرنے اور دوسروں کو ترغیب دینے) کے لئے زکوٰۃ کو کھلم کھلا دینا بہتر ہے۔ مسلمانوں پر زکوٰۃ کا وجوب کم ہوتا ہے (اول تو اتنا مال ہی نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ واجب ہو اور اگر ہو بھی تو اس کے اسلام کا تقاضا ہے کہ پہلے ہی سے ادا کر دے) عموماً مسلمان نفل خیر، خیرات کرتا ہی رہتا ہے (اتنی سی ایک دو امت کو ہی واجب ہوتی ہے) کہ اس لئے سِرًّا کو عَلَانِيَةً سے پہلے ذکر کیا۔ (ورنہ زکوٰۃ کی ادائیگی دوسرے خیرات پر مقدم ہے اس لئے عَلَانِيَةً کا لفظ سِرًّا سے پہلے آنا چاہئے تھا۔)

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اور نیکی سے بدی کو دفع کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نیک کام کر کے کئے ہوئے بُرے کاموں کی تلافی کر دیتے ہیں اللہ نے فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ بلاشبہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے پیچھے نیکی بھی کر لے اس کو مٹا دے گی۔ رواہ احمد بسند صحیح۔

ابن عساکر نے عمرو بن اسود کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دس گناہ تو نے کئے ہوں تو ایک نیکی بھی ایسی کر جس سے تو گناہوں کو اتار دے۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص گناہوں کے بعد نیکیاں کر لیتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی اتنی تنگ زرہ پہن رکھی ہو جس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو (یعنی اتنے گناہ کئے کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا) پھر اس نے ایک نیکی کر لی تو زرہ کی ایک کڑی ٹوٹ گئی پھر دوسری کڑی ٹوٹ گئی (اس طرح نیکیاں کرتے کرتے سب کڑیاں ایک کے بعد ایک ٹوٹ گئیں) یہاں تک کہ زرہ زمین پر گر پڑی۔ رواہ الطبرانی۔

---

[1] حاصل اختلاف یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور عطاء کے نزدیک صَبَرُوا کے بعد علیٰ محذوف ہے احکام پر ثابت قدم رہنا یا مصائب پر دونوں صورتوں میں علیٰ صبر کا صلہ ہے اور محذوف ہو گا لیکن بعض علماء کے نزدیک عن (حرف عن) محذوف ہے یعنی خواہشات و گناہوں سے اجتناب کرنا۔ حضرت مفسرؒ کی تفسیر زیادہ عام ہے مگر علیٰ اس صورت میں بھی محذوف ماننا پڑے گا۔ مترجم)

بعض علماء نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ گناہ کو توبہ کے ذریعہ سے دفع کر دیتے ہیں (یعنی حسنہ سے مراد توبہ ہے) امام احمد نے عطاء کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو نے گناہ کیا ہو تو فوراً اس کے بعد توبہ کر لے پوشیدہ گناہ کی توبہ مخفی طور پر اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ (ترجمہ)

بعض علماء کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ برائی کے عوض برائی نہیں کرتے بلکہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ سدی نے کہا مطلب یہ ہے کہ جب ان کے خلاف کوئی جہالت کرتا ہے تو (جہالت کا جواب جہالت سے نہیں دیتے) اور تحمل کرتے ہیں۔ سیئۃ سے مراد ہے جہالت اور حسنۃ سے مراد ہے تحمل۔ قتادہ نے کہا جب کوئی ان سے برائی کرتا ہے اور تو وہ لوٹا کر اس سے بھلائی کرتے ہیں جیسا دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔

حسن نے کہا جب ان کو محروم رکھا جائے تب بھی محروم رکھنے والوں کو وہ محروم نہیں رکھتے بلکہ دے دیتے ہیں ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اگر ان سے قطع قرابت کیا جائے تو وہ پھر بھی قرابت کو جوڑتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان کو جوڑے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قرابت توڑتے ہیں، میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں۔ ان کی زیادتیوں کو برداشت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہہ رہے ہو تو تم ان پر خاک جھونک رہے ہو یعنی ان کو ذلیل کر رہے ہو وہ خسارے میں رہیں گے اور تم کامیاب ہو گے، جب تک تم اس سلوک پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں تمہاری حمایت ہوتی رہے گی۔ رواہ مسلم۔

عبداللہ بن مبارک نے فرمایا یہ مذکورہ بالا آٹھ خصائل ہیں جو جنت کے آٹھ دروازوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں (ہر خصلت جنت کے ایک دروازے کی طرف رہنمائی کر رہی ہے)

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ اس جہان میں نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے۔ عُقْبٰی کسی کام کا بدلہ۔ اَعْقَبَهٗ اس کو بدلہ دیا (قاموس) کام کے پیچھے اس کا بدلہ (نتیجہ) آتا ہے اس کو عُقْبٰی کہا جاتا ہے (خواہ اچھا بدلہ ہو یا برا) لیکن (عرف عام میں) عُقْبَۃ، عُقْبٰی اور عَاقِبَۃ اچھی جزا یعنی ثواب کے لئے خاص کر دیا گیا ہے اور عُقُوْبَۃ، مُعَاقَبَۃ اور عِقَاب کا اطلاق عذاب اور برے بدلہ پر ہی ہوتا ہے۔ ثواب کے متعلق اللہ نے فرمایا خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ اور عذاب کے بارے میں فرمایا ہے۔ فَحَقَّ عِقَابِ۔ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ۔ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ۔ لیکن لفظ عاقبت اگر مضاف ہو تو عقوبت کے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى یا فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِى النَّارِ۔ عاقبت بمعنی عقوبت یا تو بطور استعارہ مستعمل ہے یا بطور اشتراک (یعنی لفظ عاقبت دونوں معنی میں مشترک ہے اچھا انجام اور برا انجام)

حقیقت میں آخرت ہی قرارگاہ ہے اس لئے الدار سے مراد آخرت ہے دنیا تو گزرگاہ ہے قرارگاہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص کے لئے دار آخرت میں اچھا نتیجہ اور ثواب ہو گا۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ یعنی قیام اور رہنے کے باغ۔ عدن کا معنی ہے قیام کرنا[1]

يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور ان کے ماں باپ اور بیبیوں اور اولادوں میں سے جو جنت کے لائق ہوں گے وہ بھی داخل ہوں گے۔

---

[1] مجاہد کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر آیت جنات عدن تلاوت فرمائی پھر فرمایا لوگو! تم کو معلوم ہے کہ جنات عدن کیا ہیں عدن جنت میں ایک قصر ہے جس کے دس ہزار دروازے ہیں اور ہر دروازے پر پچیس ہزار فراخ چشم حوریں متعین ہیں اس قصر میں سوائے نبی، صدیق اور شہید کے اور کوئی داخل نہ ہو گا۔ (از مفسر رحمہ اللہ)

"صالح" سے صرف ایمان مراد ہے کامل (عملی) درستی مراد نہیں۔ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہونی چاہئے۔ ہاں اُلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ میں کامل صلاح والے مراد ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کاملوں کی عزت افزائی کرے گا اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے ایسے لوگوں کو بھی ان کے مرتبے پر فائز کر دے گا جو اپنے اعمال کے لحاظ سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں گے اور کاملین کے اعمال کی طرح ان کے اعمال نہ ہوں گے آباؤ اجداد، اولاد اور بیویاں تو اہل جنت کے درجات پر فائز ہونے کے اہل نہ ہوں گے مگر جنتیوں کی خوشی کی خاطر ان کو بھی اہل جنت کا ساتھی کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ مؤمن ہوں۔ صالح (یعنی مؤمن) ہونے کی شرط بتا رہی ہے کہ بغیر ایمان کے قرابت نسب مفید نہ ہوگی۔ آباء کے اندر دلالۃً نص مائیں بھی داخل ہیں۔

ایک شبہ

طبرانی، حاکم اور بیہقی نے حضرت عمرؓ کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ و حضرت مسور بن مخرمہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میرے نسب اور رشتۂ زوجیت کے علاوہ ہر نسب اور رشتۂ زوجیت ٹوٹ جائے گا۔ ابن عساکر نے صحیح سند سے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث مذکورہ نقل کی ہے۔ ہر نسب اور رشتۂ زوجیت علاوہ میرے نسب اور رشتۂ زوجیت کے منقطع ہو جائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت (نسبی و پیغمبرانی) کے علاوہ اور کسی کی قرابت کام نہ آئے گی (اور آیت میں مؤمنوں کے لئے ان کی قرابت و زوجیت کا سود مند ہونا ذکر ہے)۔

حل

تمام مؤمن رسول اللہ کی اولاد ہیں۔ اللہ نے فرمایا اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ حضرت ابی کی قرأت میں اتنا لفظ اس کے بعد زیادہ ہے۔ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ (رسول اللہ ﷺ مؤمنوں کے باپ ہیں)۔

ایک اور آیت میں آیا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ سورۂ کوثر کی تفسیر میں ہم نے ذکر کر دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق عاص بن وائل نے لوگوں سے کہا اس کو چھوڑ دو یہ تو دم بریدہ ہے اس کے پیچھے اس کی نسل نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ آپ کا دشمن ہی حقیقت میں دم بریدہ ہے اسی کی نسل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ عاص بن وائل کے بیٹے عمر اور ہشام تھے مگر عمرو و ہشام مسلمان ہو گئے اس سے عاص کا ان سے کوئی رشتۂ ولدیت قائم نہیں رہا اور عاص کو لاولد کہہ دیا گیا۔ عمرو و ہشام عاص کے وارث بھی اختلاف مذہب کی وجہ سے نہ قرار پائے بلکہ وہ تو رسول اللہ ﷺ کی اولاد ہو گئے۔ اس توضیح کی روشنی میں حدیث مذکور کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن میرا رشتہ اور نسب سود مند ہوگا اور سب رشتے منقطع ہو جائیں گے میرا نسب و رشتہ براہ راست ہو یا بالواسطہ۔ حاصل مطلب یہ کہ کافروں کا کافروں سے یا کافروں کا مؤمنوں سے رشتۂ قرابت و زوجیت منقطع ہو جائے گا اور مؤمنوں کا باہمی رشتہ سود مند ہوگا۔ اسی مضمون کو اللہ نے آیت اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ الخ میں بیان فرمایا ہے۔

وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ اور ملائکہ باعلامت جنت کے ہر دروازے سے یا تحائف و ہدایا کی پیش کش کے ہر دروازے سے ملائکہ ان کے پاس داخل ہوں گے۔ مقاتل نے کہا روزانہ یعنی ہر رات دن میں تین بار فرشتے ان کو تحفے اور ہدیے پیش کریں گے اور رات دن کی یہ مقدار دنیوی شب و روز کے برابر ہوگی۔

سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔ یعنی جن تکالیف کا تم کو ڈر رہتا تھا اب اللہ نے ان سے تم کو بچا لیا اور لازوال نعمتیں عطا فرما دیں۔

بِمَا صَبَرْتُمْ تمہارے صبر کرنے کی وجہ سے یعنی گناہوں سے بچ کر نفسانی خواہشات کو روک کر طاعت پر

قائم رہے اور مصائب کو برداشت کرتے رہے اس کی وجہ سے تم کو یہ ثواب ملا ہے۔

فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۞ سو اس جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے۔

حضرت ابوامامہؓ کا بیان ہے کہ جنت کے اندر اپنی مسند (مسہری) پر مؤمن راحت اندوز ہو گا خادموں کی دو قطاریں اس کے سامنے ہوں گی۔ دونوں قطاروں کے سرے پر ایک چوبدار دروازہ ہو گا راستے پر فرشتہ اندر آنے کا طالب گار ہو گا مؤمن تک پہنچنے والا خادم اپنے برابر والے خادم سے اور وہ اپنے برابر والے خادم سے (غرض) سلسلہ وار ہر خادم اپنے متصل خادم سے کہے گا کہ فرشتہ دروازہ پر کھڑا اجازت مانگ رہا ہے۔ یہاں تک کہ آخری خادم جو دروازے سے متصل ہو گا وہ دروازہ کھول دے گا فرشتہ اندر آکر سلام کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے اندر سب سے پہلے وہ فقراء مہاجرین داخل ہوں گے جن کے ذریعے سے سرحدوں کی حفاظت ہوتی ہے اور مصائب سے بچاؤ ہوتا ہے۔ غریب لوگوں کی تو بس دل کی دل میں لئے کر مر جاتے ہیں ان کی حاجت پوری نہیں ہوتی اللہ اپنی مشیت کے مطابق فرشتوں سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ اور ان کو سلام کرو فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک ہم تیرے آسمان کے رہنے والے اور تیری مخلوق میں سب سے برتر ہیں کیا تو ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ان کو جا کر سلام کریں۔ اللہ فرمائے گا یہ میرے بندے میری عبادت کرتے تھے کسی چیز کو میرا شریک نہیں قرار دیتے تھے انہی کے ذریعے سے اسلامی سرحدوں کی حفاظت ہوتی تھی اور انہی کے سبب مصائب سے بچاؤ ہوتا تھا لیکن حالت میں مرتے کہ ان کی تمنا ان کے دلوں میں ہی رہتی۔ دنیا میں ان کی حاجت پوری نہیں ہوتی۔ حسب الحکم ملائکہ ان کے پاس آئیں گے اللہ نے فرمایا يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ ۞ سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ

وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں یعنی پختہ اقرار اور قبول کرنے کے بعد پھر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ اور جس چیز کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو توڑ دیتے ہیں۔ یعنی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفرقہ کرتے ہیں اللہ کو مانتے ہیں اور رسول کو نہیں مانتے اور رشتہ داریاں منقطع کرتے ہیں۔

وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ اور زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں یعنی اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں کھیتیاں تباہ کرتے اور نسل (یعنی انسانوں اور مویشیوں) کو ہلاک کرتے ہیں راستے لوٹتے ہیں اور ناحق بغاوت و ظلم کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آخرت میں جو سزا رکھی گئی ہے اس کے باوجود دنیا میں جس گناہ کی سزا اللہ کی طرف سے جلد ملنے کا مستحق ہو جاتا ہے وہ بغاوت اور قطع رحم ہے (اس سے زیادہ جلد عذاب دنیا کو لانے والا اور کوئی گناہ نہیں) رواہ احمد والبخاری فی الادب وابوداؤد والترمذی وابن ماجہ والحاکم وابن حبان۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ راوی ہیں میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے ہیں رحم کو کاٹنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔ متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ راوی ہیں میں نے حضورؐ کو فرماتے سنا ان لوگوں پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جن میں قرابت رحم کو کاٹنے والا موجود ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (احسان کر کے) احسان جتلانے والا جنت میں داخل نہیں ہو گا نہ ماں باپ کا نافرمان نہ ہمیشہ مخمور رہنے والا (نشہ کا خوگر)۔ رواہ النسائی والدارمی۔

أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ ایسے لوگوں پر لعنت ہو گی لعنت سے مراد ہے اللہ کی رحمت سے دوری۔

وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۞ اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہو گی یعنی دار آخرت میں ان کے لئے بری سزا ہے۔ بری سزا سے مراد ہے جہنم کی آگ۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ　اللہ ہی جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا　اور اہل مکہ دنیوی زندگی پر پھولے ہوئے ہیں۔ فَرِحُوْا مغرور ہیں اتراتے ہیں۔ یعنی دنیا میں اللہ نے جو ان کو رزق کی کشائش عطا فرمائی ہے اس پر مغرور ہیں اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ　اور آخرت (کے مقابلہ) میں دنیوی زندگی صرف ایک حقیر متاع ہے جو ہمیشہ رہنے والی نہیں جیسے مسافر کا زاد راہ اور چرواہے کی وقتی غذا۔ دنیوی عیش اور دولت قابل فخر نہیں۔ آخرت کی لذات و آسائش کے مقابلہ میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ دنیاوی سرمایہ کی وسعت قابل افتخار ہے اگر اس کو نعیم آخرت کے حصول کے لئے صرف کیا جائے تو تجارت ہے اور سچی تجارت۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ　(کھلے معجزات اور واضح نشانات نبوت دیکھنے کے باوجود محض عناد اور سرکشی کے زیر اثر (معجزات اور نشانات کے طلبگار ہوتے ہیں) اور کہتے ہیں محمد ﷺ پر کوئی ایسی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی (جو ان کی صداقت کی شہادت دیتی)۔

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ　آپ کہہ دیجئے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ یعنی نزول آیات اور قیام معجزات میں کوئی کمی نہیں مگر (گمراہی اور ہدایت اللہ کے قبضہ میں ہے) آیات و معجزات کا کام (راہ نمائی ہے ہدایت بخشی نہیں (ہدایت بخشی تو اللہ ہے) ہدایت و گمراہی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت پانے کی توفیق نہیں دیتا اور تم جیسے لوگوں کا شمار محرومی کے گروہ میں ہے اس لئے ہر معجزے کے ظہور کے بعد بھی تم ہدایت یاب نہیں ہو سکتے۔

وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ　اور جو شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کی ہدایت کر دیتا ہے۔ یعنی اپنی طاعت ایمان اور مراتب قرب کے حصول اور جنت کی طرف ان لوگوں کو ہدایت کرتا ہے جن کے دل عناد سے اپنی طرف موڑ چکا ہے۔ جس کی توجہ کو وہ اپنی طرف پھیر دیتا ہے وہ عناد چھوڑ کر حق کی طرف مڑ جاتا ہے۔ ایسا آدمی نازل شدہ معجزات بلکہ اس سے بھی ادنیٰ معجزہ اور ضعیف ترین نشان دیکھ کر ایمان لے آتا ہے (مزید فرمائشی معجزات کے ظہور کا طلبگار نہیں ہوتا)۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا　(اللہ کی طرف رجوع کرنے والے) وہ لوگ ہیں جو ایمان لے آئے۔

وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ　اور ان کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یعنی ان کے دلوں میں ایمان و یقین جم جاتا ہے۔ ہر طرح کا شک زائل ہو جاتا ہے۔ ذکر سے مراد ہے قرآن اور اطمینان سے مراد ہے ایمان کیونکہ ایمان دلوں کا سکون ہے اور نفاق دلوں کی بے چینی یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی یاد سے شیطانی وسوسے زائل ہو جاتے ہیں (اس مطلب پر ذکر سے مراد ہوگی اللہ کی یاد۔ صرف قرآن مراد نہ ہوگا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے دل کے دو خانے ہوتے ہیں ایک خانہ میں فرشتہ کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرے خانہ میں شیطان کا ظہور جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو ہٹ جاتا ہے اور اللہ کی یاد نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ آدمی کے دل کے اندر رکھ دیتا ہے اس طرح وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے۔ رواہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف عن عبداللہ بن شقیق ورواہ البخاری تعلیقا عن ابن عباس مرفوعا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے آدمی کے دل پر شیطان مالش کرتا ہے جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو سکڑ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈال دیتا ہے یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ اہل ایمان کے پاک صاف دلوں کی روزی اللہ کی یاد ہے اللہ کی یاد سے ان کو چین اور سکھ ملتا ہے جیسے مچھلیوں کو پانی میں پرندوں کو ہوا میں اور وحشی جانوروں کو جنگل میں لیکن اگر غفلت آفریں کوئی اندرونی خیال دل میں آجاتا ہے یا اہل غفلت کی صحبت اثر انداز ہو جاتی ہے تو دلوں کا چین جاتا رہتا ہے بے چینی

اور عدم سکون پیدا ہو جاتا ہے جیسے پانی سے باہر مچھلی کو اور خشکی کے جانور کو پانی کے اندر اور وحشی جانوروں کو پنجرے میں اضطراب ہوتا ہے۔

صوفیہ صافیہ کے ہر فرد کے لئے ان حالات کا مشاہدہ بالکل بدیہی ہے ہر شخص بقدر تحقیق کا خدمت گزار ان حالات کو دیکھا کرتا ہے اس مطلب پر الَّذِينَ آمَنُوا سے مراد ہوں گے پاک باطن روشن دل صوفیہ۔

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۝ خوب سن لو اللہ کی یاد ہی سے (پاک صاف) دلوں کو چین ملتا ہے۔

بغوی نے اس جگہ ایک شبہ اور اس کا جواب لکھا ہے۔ شبہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ بس مؤمن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور اس جگہ یاد الٰہی سے مؤمن کے قلب کا اطمینان فرمایا گیا ہے۔ ایک حالت میں خوف اور اطمینان ایک دل میں کیسے جمع ہو سکتے ہیں اس شبہ کا جواب اس صورت دیا گیا ہے کہ عذاب کے ذکر کے وقت مؤمن کا دل ڈر جاتا ہے اور ثواب کے وعدہ کے ذکر کے وقت اس کے اندر اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے اللہ کے انصاف اور عذاب سے اور چین پاتا ہے اللہ کے فضل و کرم کے ذکر سے۔ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اطمینان و خوف میں باہم تضاد ہے (لیکن ایک حالت میں دونوں کا اجتماع نہیں ہوتا اطمینان کی حالت جدا ہوتی ہے اور خوف کی جدا)

میرے نزدیک طمانیت اور خوف میں کوئی تضاد نہیں طمانیت انس سے پیدا ہوتی ہے اور انس خوف کی حالت میں بھی ہوتا ہے بلکہ خوف و امید بھی ایک حالت میں جمع ہو سکتے ہیں۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک جوان کے مرنے کے وقت رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا تجھے (اپنے دل کی) کیفیت کیا محسوس ہوتی ہے۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں کا مجھے خوف بھی ہے۔ فرمایا ایسے موقع پر جس بندہ کے دل میں یہ دونوں باتیں جمع ہوتی ہیں اللہ ضرور اس کو اس کی امید کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جس چیز سے اس کو خوف ہوتا ہے اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے۔ رواہ الترمذی و ابن ماجہ۔ ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ طُوبَىٰ لَهُمْ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوشی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے طوبیٰ کا ترجمہ کیا ہے خوشی اور خنکی چشم۔ عکرمہ نے کہا ان کا حال اچھا ہوگا۔ قتادہ نے کہا ان کے لئے بھلائی ہوگی (ان تمام مطالب پر) طوبیٰ بروزن بشریٰ مصدر ہوگا۔ طاب (ماضی) یطیب (مضارع) سے۔[1]

معمر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے اگر تم کو کوئی بھلائی اور فائدہ حاصل ہو جائے تو دوسرا آدمی کوئی دوست تم سے کہتا ہے طوبیٰ لک کیا طوبیٰ تم کو مبارک ہے۔ ابراہیم نے کہا نیکوکار مؤمنوں کے لئے بھلائی اور عزت ہوگی۔ سعید بن جبیر نے کہا حبشی زبان میں طوبیٰ باغ (جنت) کو کہتے ہیں۔ بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابو امامہ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جو تمام جنتوں پر سایہ فگن ہے۔

عبید بن عمیر نے کہا طوبیٰ جنت عدن کے اندر رسول اللہ ﷺ کے جنتی مکان میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں (مومنوں کے ہر جنتی) مکان اور بالاخانہ پر سایہ فگن ہیں۔ سوائے سیاہ رنگ کے ہر رنگ اور ہر پھول اور ہر پھل اور ہر میوہ اللہ نے اس درخت میں پیدا کیا ہے اس کی جڑ سے دو چشمے نکلتے ہیں کافور اور سلسبیل۔

مقاتل نے کہا اس کا ہر پتہ ایک گروہ پر سایہ فگن ہے اور ہر پتہ پر ایک فرشتہ اللہ کی طرح طرح کی تسبیح بیان کرتے ہیں

---

[1] حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے طوبیٰ کا ذکر آیا تو فرمایا ابو بکرؓ کیا تم کو معلوم ہے کہ طوبیٰ کیا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں۔ فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کی لمبائی سے اللہ ہی واقف ہے اس کی ایک شاخ کے نیچے سوار ستر برس تک گھوڑا دوڑا کر چلا رہے (تو اس کو طے نہ کر پائے) الخ (ازالۃ الخفاء)

مشغول ہے۔

احمد، ابن حبان، طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی نے حضرت عتبہ بن عبد اللہ سلمی رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا جنت کے اندر پھل ہوں گے فرمایا ہاں وہاں ایک درخت ہو گا طوبیٰ جو فردوس کے مطابق ہو گا (شاید مطابق ہونے سے یہ مراد ہے کہ پوری جنت فردوس پر چھایا ہوا ہو گا) سائل نے عرض کیا ہماری زمین کے کس درخت سے اس کی مشابہت ہو سکتی ہے فرمایا تیری اس زمین کے کسی درخت سے اس کی مشابہت نہیں کیا تو شام کو گیا ہے۔ سائل نے جواب دیا نہیں فرمایا شام میں ایک درخت ہوتا ہے جو طوبیٰ سے کچھ مشابہت رکھتا ہے اس درخت کو اخروٹ کا درخت کہتے ہیں اس کا ایک تنہ ہوتا ہے اور اوپر جا کر اس کی شاخیں پھیل جاتی ہیں۔ سائل نے کہا وہ کتنا بڑا ہو گا فرمایا اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں کا گلہ لے کر اس کی جڑ کے گرد اگرد گھومے تو اگر تو بوڑھا ہو جائے اور بوڑھا ہو کر گر پڑے تب بھی اس کی جڑ کا دورہ پورا نہ ہو گا۔ سائل نے عرض کیا کیا اس میں انگور بھی ہوں گے فرمایا ہاں عرض کیا ان کا خوشہ کتنا بڑا ہو گا فرمایا چتکبرے کوے کی ایک ماہ کی رفتار (اڑان) کے برابر عرض کیا اس کا ایک دانہ کتنا بڑا ہو گا فرمایا کیا تیرے باپ نے کوئی بڑا بکرا کبھی ذبح کیا ہے۔ عرض کیا جی ہاں فرمایا کیا اس کی کھال اتار کر تیری ماں کو دے کر یہ کہا تھا۔ اس کی دباغت کر کے ایک بڑا ڈول اس کا بنالے جس میں پانی بھر کر ہم اپنے جانوروں کو پلایا کریں گے۔ سائل نے عرض کیا تو (اس سے اندازہ یہ ہوا کہ) اس کا ایک دانہ میرے اور میرے گھر والوں کا پیٹ بھر دے گا فرمایا ہاں اور تیرے سارے کنبہ کا بھی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا طوبیٰ کیا ہے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس کا پھیلاؤ سو سال کی رفتار کے برابر ہے اہل جنت کے کپڑے اس کے شگوفوں سے برآمد ہوں گے۔ رواہ ابن حبان۔

معاویہ بن قرہ نے اپنے باپ کی مرفوع روایت سے بیان کیا ہے کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا ہے اس درخت سے زیور اور کپڑے پیدا ہوں گے اور اس کی شاخیں حصار جنت کے باہر سے دکھائی دیں گی۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے اندر ایک درخت ہے جس کے سایہ میں گھوڑا سوار سو برس تک چلتا رہے تب بھی قطع نہ کر سکے اگر تم اس کا ثبوت چاہتے ہو تو پڑھو وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (متفق علیہ) امام احمد نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد اتنا اضافہ بیان کیا کہ اس کے پتے جنت کو ڈھانک لیں گے۔

ہناد بن سری نے الزہد میں، بغوی نے تفسیر میں آخر میں اتنا اور بھی بیان کیا کہ اس بیان کی اطلاع کعب کو پہنچی تو انہوں نے کہا یہ سچ ہے قسم ہے اس خدا کی جس نے موسیٰ پر توریت اور محمد ﷺ پر قرآن نازل کیا اگر کوئی شخص سہ سالہ یا چہار سالہ اونٹ پر سوار ہو کر اس درخت کے تنہ کے گرد اگرد چکر لگائے تو دورہ پورا نہ کر سکے یہاں تک کہ عمر ختم ہو جائے اور پیر فرتوت ہو کر گر پڑے اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اپنی روح اس میں پھونکی ہے اس کی شاخیں جنت کے باہر سے نظر آئیں گی (یعنی پوری جنت پر وہ سایہ فگن ہو گا) جنت کے ہر نہر اسی درخت کی جڑ سے نکلتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کو طوبیٰ کہا جاتا ہے اللہ اس سے فرمائے گا میرا بندہ جو کچھ چاہتا ہے تو شگافتہ ہو کر اپنے اندر سے اس چیز کو برآمد کر دے۔ حسب الحکم درخت پھٹے گا اور اس کے اندر سے بندہ کی خواہش کے مطابق گھوڑا زین اور لگام پورے ساز سمیت برآمد ہو جائے گا اور بندہ کی خواہش کے مطابق اونٹنی اپنے کجاوے، نکیل اور سامان سمیت برآمد ہو جائے گی اور کپڑے بھی نکل کر اس درخت سے نکلیں گے۔ رواہ البغوی و ابن ابی الدنیا، ابن مبارک اور ابن جریر نے شہر بن حوشب کا قول نقل کیا ہے کہ طوبیٰ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ جنت کا ہر درخت اسی سے پیدا ہے اس کی شاخیں حصار جنت سے باہر دکھائی دیں گی۔

وَحُسْنُ مَاٰبٍ ⃝ اور اچھی ہے ان کی لوٹ کر جانے کی جگہ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

اسی طرح (یعنی دوسرے پیغمبروں کی طرح) ہم نے آپ کو بھی ایک امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے دوسری امتیں گزر چکی ہیں (جن کی طرف دوسرے پیغمبروں کو بھیجا تھا مطلب یہ کہ آپ کی پیغمبری کوئی انوکھی چیز نہیں ہے) تاکہ جو قرآن ہم نے آپ کو وحی کے ذریعہ دیا ہے اس کو پڑھ کر آپ ان کو سنا دیں۔

وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ یہ رحمن کی ناشکری کرتے ہیں، رحمن بہت بڑا رحمت والا جس کی نعمت سب کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اللہ کا ان پر بہت بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے آپ کو ان کے اندر رسول بنا کر بھیجا، قرآن نازل فرمایا جو تمام دنیوی و اخروی منافع کا خزانہ ہے۔ مگر یہ لوگ بڑے شریر ہیں اتنی بڑی نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کرتے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ، مقاتل اور ابن جریج نے بیان کیا کہ اس آیت کا نزول صلح حدیبیہ کے سلسلے میں ہوا (یعنی یہ آیت مدنی ہے) ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ اس کی توضیح اس طرح ہے کہ جب قریش اور صحابہ کا صلح نامہ لکھنے پر اتفاق ہو گیا اور سہیل بن عمرو قریش کی طرف سے آ گیا۔ سورۂ فتح میں تفصیل کے ساتھ ہم نے لکھ دیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم، قریش بولے ہم تو الرحمن کو نہیں جانتے ہم تو صرف یمامہ والے رحمن (یعنی مسیلمہ کذاب) کو جانتے ہیں (ہم اللہ کو رحمن نہیں کہتے) تم وہی لکھو جو پہلے لکھتے تھے یعنی باسمک اللّٰھم (سے تحریر شروع کرو) هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ کا یہی مطلب ہے (یعنی یہ لوگ اللہ کے رحمن ہونے کا انکار کرتے ہیں)

بغویؒ نے لکھا ہے (عام اہل تفسیر میں) مشہور ہے کہ یہ آیت مکی ہے ابوجہل وغیرہ کے حق میں نازل ہوئی حجر اسود کے پاس رسول اللہ ﷺ دعا میں یا اللہ یا رحمن فرما رہے تھے ابوجہل نے یہ لفظ سن پایا فوراً مشرکوں سے جا کر کہا محمد دو معبودوں کو پکار رہے تھے اللہ کو اور رحمن کو اور ہم تو یمامہ والے رحمن کے علاوہ کسی اور رحمن سے واقف نہیں (یمامہ والا رحمن کون سا ہے جس کو محمد پکار رہے تھے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت کفار قریش کے حق میں نازل ہوئی جب کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا رحمن کو سجدہ کرو، کافروں نے جواب دیا رحمن کیا چیز ہے۔

قُلْ هُوَ رَبِّيْ آپ کہہ دیجئے وہ میرا رب ہے جس رحمن کو ماننے سے تم منکر ہو وہی میرا خالق اور کارساز ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ⃝ سوائے اس کے اور کوئی مستحق عبادت نہیں، اسی پر میرا بھروسہ ہے (وہی تمہارے مقابلے میں میری مدد کرے گا) اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے وہی مجھے ثواب دے گا۔

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اگر جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے تو ہمارے مُردہ اسلاف کو ہم سے ملا دیجئے تاکہ ہم ان کو دیکھیں اور ان سے باتیں کریں (اور وہ تمہاری تصدیق کریں۔ مترجم) اور مکہ کے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے ہٹا کر) پھیلا دو اس زمین کو کشادہ کر دو۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اور اگر قرآن کے ذریعہ سے پہاڑوں کو چلا دیا جائے (جگہ سے ہٹا کر پھیلا دیا جائے)

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے عطیہ عوفی کا بیان نقل کیا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی اگر مکہ کے پہاڑوں کو ہٹا دیا جائے تو ہمارے لئے میدان نکل آئے اور ہم اس میں کھیتی کریں، جس طرح ہوا کے ذریعہ سے سلیمان قطع مسافت کرتے تھے اور قوم کو ہوا کے دوش پر قطع مسافت کراتے تھے آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیجئے یا جس طرح عیسیٰ مُردوں کو

زندہ کر دیتے تھے آپ بھی ہمارے مُردوں کو زندہ کر دیجئے (تو ہم ایمان لے آتے) اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ بغوی نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ آیت مذکورہ چند مشرکوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جن میں ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ بن امیہ بھی شامل تھے وہاں سے عبداللہ بن امیہ نے آپ کی زبانی یہ کہلوایا کہ اگر آپ ہم کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں تو قرآن کے ذریعہ سے مکہ کے پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دیجئے تاکہ کشائش پیدا ہو جائے ہماری کھیتی کے لئے اس وقت زمین تنگ ہے اور یہاں چشمے اور نہریں بھی نکال دیجئے تاکہ ہم درخت لگائیں کھیتیاں بوئیں اور باغ تیار کریں۔ آپ اپنے دعوے کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک داؤد سے کم مرتبہ تو نہیں ہیں آپ کہتے ہیں کہ داؤد کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا گئے تھے جو اُن کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے آپ ہوا کو بھی ہمارا تابع بنا دیجئے کہ ہم تجارت کو حاصل کرنے اور دوسری ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے جو شام کو جاتے ہیں ہوا پر چلے جایا کریں اور ہم روز لوٹ آیا کریں۔ آخر آپ کا قول ہے کہ ہوا کو سلیمانؑ کے زیر حکم کر دیا گیا تھا اور آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ عیسیٰ مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور خدا کے نزدیک آپ کا مرتبہ (بقول آپ کے) عیسیٰ سے کم نہیں ہے لہٰذا آپ اپنے دادا قصی یا ہمارے مُردوں میں سے کسی کو زندہ کر دیجئے تاکہ ہم اس سے آپ کے معاملہ میں دریافت کریں کہ آپ کا دعویٰ نبوت صحیح ہے یا غلط۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

ابو یعلیٰ نے مسند میں حضرت زبیر بن عوامؓ کے حوالے سے بھی مذکورہ کے ہم معنی حدیث نقل کی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن یا کسی آسمانی کتاب کے ذریعے سے اگر پہاڑوں کو چلائے جا سکتے ہیں ان کی جگہ سے ان کو ہٹایا جا سکتا ہے۔

اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ یا کسی آسمانی کتاب کے ذریعہ سے زمین طے کی جا سکتی ہے یعنی اللہ ہوا کو تابع حکم بنا سکتا ہے اور لوگ دوش ہوا پر سوار ہو کر قطع مسافت کر سکتے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی آسمانی کتاب کے ذریعے سے زمین پھاڑی جا سکتی ہے اور اس سے چشمے اور نہریں نکالی جا سکتی ہیں۔

اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى یا اس کے ذریعہ سے مُردوں سے کلام کیا جا سکتا ہے یعنی مُردے زندہ ہو کر کلام کر سکتے ہیں۔ اَلْمَوْتٰى سے مراد قصی وغیرہ ہیں۔ شرط کا جواب محذوف ہے یعنی امور مذکورہ میں سے کوئی امر کسی آسمانی کتاب سے سر انجام پانا ممکن ہو سکتا تو اللہ قرآن کے ذریعہ سے بدرجہ اولیٰ ایسا کر دیتا مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔

یا یہ مطلب ہے کہ اگر امور مذکورہ قرآن کی ذریعہ سے کر بھی دیئے جاتے تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے۔ اسی مؤخر الذکر مضمون کو آیت ذیل میں ادا کیا ہے۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى الخ اگر ہم فرشتوں کو اتار کر ان کے پاس بھیج دیتے اور مُردے ان سے کلام کرتے اور ہر چیز کو جمع کر کے ان کی سامنے لے آتے (اور سب توحید و رسالت کی شہادت دیتے) تب بھی یہ ماننے والے نہ تھے۔ بعض نے کہا کہ جواب شرط مقدم ہے وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ جواب شرط ہے اور درمیانی کلام جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے گویا مطلب یہ ہے کہ اگر قرآن کے ذریعہ سے پہاڑ بھی رواں کر دیئے تب بھی یہ کفر ہی کرتے ایمان نہ لاتے کیونکہ ان کے لئے بدبختی لکھ دی گئی ہے ان کافروں کا معبود تو غیر اللہ ہے اللہ کے اسم جلیل کا انکار تو ہے ان کو ہدایت کیسے مل سکتی ہے۔

بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا بلکہ سارا اختیار خاص اللہ ہی کو ہے۔

اس جملہ سے پہلے کچھ کلام محذوف ہے جو عبارت کی رفتار سے سمجھ میں آ رہا ہے پورا کلام اس طرح تھا کہ کافروں کی فرمائشوں کا پورا نہ کیا جانا اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ ایسا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا بلکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ان کی فرمائشیں بلکہ ہر امر کر سکتا ہے مگر اللہ ایسا چاہتا نہیں کیونکہ اس کو علم ہے کہ یہ لوگ اس کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے خواہ کوئی سی بھی نشانی ان کو نظر آ جائے گی اس لئے یہ فرمائشی معجزات اللہ ظاہر نہیں کرتا کہ ان کو ہدایت یاب کرنا نہیں چاہتا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بعض صحابہؓ نے جب مذکورہ بالا معجزات کی درخواست سنی تو ان کی بھی خواہش ہوئی کہ اللہ یہ فرمائشیں پوری کر دے تو

بہتر ہے یہ کافر لوگ اسی طرح سے ایمان لے آئیں (تو مناسب ہے کہ) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَفَلَمْ يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کیا (ان کافروں کے ایمان لانے سے) اہل ایمان ابھی نا امید نہیں ہوئے باوجودیکہ ان معجزات سے بڑھ چڑھ کر یہ کافر معجزات دیکھ چکے پھر بھی ایمان نہ لائے چاند پھٹنے کا معجزہ انہوں نے دیکھا پھر بھی تصدیق نہیں کی، کنکریوں کا کلام کرنا انہوں نے دیکھ لیا اور ایمان نہ لائے، پہاڑوں کے رواں کرنے اور دوش ہوا پر قطع مسافت کرنے سے تو چاند کے پھٹنے کا معجزہ زیادہ موثر ہونا چاہئے اور مُردوں کے کلام کرنے سے کنکریوں کا بولنا زیادہ مشکل ہے، جب یہ معجزات ان کو قبول ایمان پر آمادہ نہ کر سکے تو فرمائشی معجزات کی تکمیل کیا ایمان بخش ہو سکتی ہے۔

اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام دنیا کے آدمیوں کو ہدایت کر دیتا۔ اس کلام کا تعلق ایک محذوف لفظ سے ہے۔ یعنی یہ جانتے ہوئے بھی اہل ایمان کافروں کے ایمان لانے سے نا امید نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت کر دے یا یہ مطلب ہے کہ مومنوں کا ایمان ہے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو مومن بنادے اس ایمان کے باوجود کیا مومن ان کافروں کے ایمان دار بن جانے کی امید رکھتے ہیں ابھی نا امید نہیں ہوئے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا کہ لَمْ يَايْــَٔسْ کا معنی ہے لَمْ يَعْلَمْ یعنی کیا اہل ایمان نہیں جانتے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت یاب کر دے۔

کلبی نے کہا قبیلۂ نخع کے محاورے میں یاس بمعنی علم آتا ہے۔ بعض لوگوں نے ان کو بنی ہوازن کا محاورہ قرار دیا ہے یعنی ہوازن والے یاس کو علم کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فراء نے اس کا انکار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ کسی عرب سے یئست کا معنی علمت نہیں سنا گیا یئست بمعنی علمت نہیں آتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یاس کو مجازاً بمعنی علم قرار دیا جائے۔ علم کا نتیجہ بھی نا امیدی ہوتا ہے۔ مسبّب بول کر سبب مراد لیا جا سکتا ہے جس چیز سے مایوسی ہو وہ مجہول نہیں ہوتی یقیناً معلوم ہوتی ہے لَمْ يَايْــَٔسْ کو لَمْ يَعْلَمْ کے معنی میں لینے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ اسی آیت میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے بموجب لَمْ يَايْــَٔسْ کی جگہ لَمْ يَتَبَيَّنْ آیا ہے اور لَمْ يَتَبَيَّنْ کا معنی ہے لَمْ يَعْلَمْ گویا لَمْ يَتَبَيَّنْ اَفَلَمْ يَايْــَٔسْ کی تفسیر ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اور یہ مکہ کے کافر تو ہمیشہ آئے دن اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے اعمال بد کے سبب ان پر کوئی نہ کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے۔

قارعۃ سے مراد ہے کوئی مصیبت بلاء و آفت خواہ بصورت قحط ہو یا بصورت قید و قتل یا مال کی تباہی اور غارت گری ہو یعنی کفر و بد اعمالی کی وجہ سے ان کافروں پر کوئی نہ کوئی آفت آتی رہے گی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قارعۃ سے مراد ہیں وہ فوجی دستے جو رسول اللہ ﷺ کافروں پر بھیجتے رہتے تھے۔

اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آ جائے گا۔ یعنی فوجی دستے یا کوئی دوسری آفت اگر براہ راست ان پر نہیں آئے گی تو ان کی بستیوں کے قریب کسی جگہ آتی رہے گی اور اس کی چنگاریاں اڑ کر ان پر بھی پڑتی رہیں گی۔ بعض نے کہا تَحُلُّ مخاطب کا صیغہ ہے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یعنی آپ خود ان کی بستیوں کے قریب جا کر اتریں گے۔ چنانچہ حضور ﷺ حدیبیہ میں جا کر اترے تھے۔ موخر الذکر قول اور ابن عباسؓ کی تشریح پر آیت کا نزول کفار مکہ کے متعلق مانا جائے گا۔ اگر آیت میں کفار مکہ مراد ہوں تو وَعْدُ اللّٰهِ سے مراد فتح ہوگی اور اگر آیت عموم پر رکھی جائے تو وعد اللہ سے مراد موت یا قیامت ہوگی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ یہ حقیقت ناقابل شک ہے کہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اللہ کے کلام میں کذب اور وعدہ کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔

ع ۱۰

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ (یعنی جس طرح یہ کافر آپ سے استہزاء کرتے ہیں اسی طرح) آپ سے پہلے پیغمبروں سے کافروں کی طرف سے استہزاء کیا جا چکا ہے۔

فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا　　پھر میں نے کافروں کو ڈھیل دی۔
الملوۃ کا معنی ہے لمبی مدت، طویل زمانہ۔ ملوان رات دن کو امتداد کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں رات دن ملوان نہیں ہیں ملوہ کا حقیقی معنی تو مدت ہے ایک شاعر کا قول ہے۔

نہار و لیل دائم ملوھما　　علی کل حال المرء یختلفان

رات اور دن کی مدت بہرحال آتی جاتی ہے۔ آدمی کا کوئی حال ہو اچھا یا برا ملوکی ھُما کی طرف اضافت جاری ہے کہ ملو (یعنی مدت ہے) بعید رات دن ہی کا معنی نہیں ہے۔ اس تشریح کی بنا پر اَمْلَيْتُ کا ترجمہ ہوا میں نے بغیر عذاب دیئے ان کو چھوڑے رکھا ڈھیل دی۔

ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ　　آخر میں نے عذاب میں ان کو دھر پکڑا سو دیکھو میرا عذاب کیسا رہا۔ مثل واقع ہوا اسی طرح جو لوگ آپ سے استہزاء کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی میں یہی سلوک کروں گا۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ　　بھلا وہ اللہ جو شخص کے اچھے برے تمام اعمال کا نگراں ہے اس مخلوق کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرح علم نہیں رکھتی یعنی اللہ ہر عمل سے واقف ہے اس لئے کسی عمل کا بدلہ اس کی طرح سے فوت نہیں ہو گا۔ ہمزہ سوالیہ ہے اور فا عاطفہ اور معطوف علیہ محذوف ہے پورا کلام اس طرح تھا کیا تم اللہ کے ساتھ بتوں کو شریک قرار دیتے ہو اور جو ذات ہر شخص کے ہر عمل کی نگراں ہے اس کو بے خبر، جماد، عاجز کی طرح سمجھتے ہو۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ　　اور بنا رکھے ہیں انہوں نے اپنے گمان میں اللہ کے ساجھی۔ اس جملہ کا عطف كَسَبَتْ پر ہے اگر ما کو مصدری کہا جائے یا کلام محذوف پر ہے یعنی وہ اللہ کو ایک نہیں کہتے اور استحقاق معبودیت میں دوسروں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے۔

قُلْ سَمُّوهُمْ　　آپ ان سے کہیے کہ ان شریکوں کے اوصاف تو بیان کرو اور پھر خود کرو کہ کیا وہ مستحق معبودیت اور قابل شرکت ہو سکتے ہیں۔

أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ　　یا اللہ کو تم ایسی بات بتا رہے ہو جس سے وہ ساری زمین میں واقف نہیں۔ یعنی جو چیز ہے یا ہونے والی ہے اللہ تو سب سے واقف ہے مگر اس کو ایسی کوئی ہستی معلوم نہیں جو استحقاق عبادت میں اس کی شریک ہو۔ پس کیا تم بتوں کے وہ اوصاف جانتے ہو جن کی وجہ سے وہ مستحق عبادت ہو سکیں۔ اور ایسے شریکوں کی صفات بیان کر سکتے ہو جو مستحق عبادت قرار پا سکیں۔

أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ　　یا (بتوں کو تم اللہ کا شریک) صرف ظاہری طور پر کہتے ہو۔ سطحی طور پر یونہی تم سنا کر زبان سے کہہ دیتے ہو جس کی واقع میں کوئی حقیقت نہیں۔ جیسے حبشی کا نام کافور رکھ دیا جاتا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ کا ترجمہ کیا ہے باطل قول، خرافات۔

بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ　　بلکہ کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں مرغوب معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی شیطان نے ان کی فریب کاری اور مکر سازی کو ان کی نظر میں آراستہ کر دیا ہے (دلکش اور فریفتہ کن بنا رکھا ہے) اس لئے وہ اپنی غلط جھوٹی باتوں اور فریب کاریوں کے تخیل میں مست ہیں۔

وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ　　اور صحیح راستہ سے ان کو روک دیا گیا ہے یعنی دین کی راہ سے اللہ نے ان کو پھیر دیا ہے اور شیطان نے ان کو بہکا دیا ہے۔

وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ　　اور جس کو بے مدد چھوڑ کر اللہ گمراہ کر دے اس کو صحیح راستے پر لانے والا ہدایت کی توفیق دینے والا کوئی نہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا　　دنیوی زندگی میں ان پر عذاب مسلط ہے یعنی قتل ہونا قید ہونا اور جزیہ کا

کرتا۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ اور آخرت کا عذاب تو دنیوی عذاب سے زیادہ سخت اور دوامی اور بلاشبہ موجود ہی ہے (جس میں یہ گرفتار ہوں گا)

وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ اور ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے یعنی جنت کی خوبی اور ندرت کی حالت وہ ہے جو آئندہ بیان کی جا رہی ہے۔ سیبویہ نے کہا مَثَلُ الْجَنَّةِ مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے یعنی جنت کی حالت وہ ہے جو آگے بیان کی گئی ہے۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ دوامی جنت ہے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

اُكُلُهَا دَآئِمٌ اس کے پھل پیوستہ ہوں گے یعنی منقطع نہ ہوں گے۔

بزار اور طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ثوبان ؓ نے فرمایا میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جنت والوں میں سے جو شخص بھی جنت کا کوئی پھل لے گا فوراً اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا پھل دوبارہ آ جائے گا۔

فرقۂ جہمیہ قائل ہے کہ جنت کی راحت فنا پذیر ہے آیت مذکورہ اور حدیث سے اس فرقہ کے قول کی تردید ہو رہی ہے۔

وَظِلُّهَا ؕ اور اس کا سایہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یعنی ہمیشہ رہے گا دنیا میں سایہ دھوپ کی وجہ سے معدوم ہو جاتا ہے۔ جنت میں سایہ اس طرح ختم نہ ہوگا۔

بیہقی نے شعیب بن جیحان کا قول نقل کیا ہے۔ شعیب نے کہا میں اور ابوالعالیہ ریاحی سورج نکلنے سے پہلے نکلے (شاید وقت دیکھ کر) ابوالعالیہ نے کہا مجھے بتایا گیا ہے کہ جنت کا وقت ایسا ہی ہوگا پھر انہوں نے آیت وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ تلاوت کی۔

تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ یہ جنت پرہیزگاروں کے لئے جزا ہوگی یا ان کا انجام اور آخری نتیجہ بصورت جنت ہوگا۔

وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝ اور کافروں کا برا انجام دوزخ ہے۔ عُقْبٰی کا معنی اس جگہ اگر جزا اچھا انجام قرار دیا جائے تو اس لفظ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا جیسے آیت هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ میں لفظ ثواب اور آیت وَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ میں لفظ بشارت آیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے۔ اس سے مراد یا تمام صحابہؓ ہیں یا یہودیوں اور عیسائیوں میں سے وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور آپ کے ساتھی اور حبش کے عیسائی مسلمان۔

يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وہ اس قرآن سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر اتارا گیا ہے کیونکہ قرآن ان کی سابق کتابوں کے موافق ہے۔

وَمِنَ الْاَحْزَابِ اور ان گروہوں میں سے یعنی کافروں میں سے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جتھا بندی کرلی تھی یا ان یہودی اور عیسائیوں میں سے جو مسلمان نہیں ہوئے تھے جیسے کعب بن اشرف اور اسید اور عاقب وغیرہ۔

مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ وہ لوگ ہیں جو قرآن کے کچھ حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی اس حصہ کا انکار کرتے ہیں جو ان کی خواہشات یا ان کی شریعتوں کے موافق نہیں ہوتا۔

بغوی نے لکھا ہے بعض لوگوں کا قول ہے کہ الرحمٰن کا لفظ قرآن مجید میں کم آیا تھا جب حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور آپ کے ساتھی مسلمان ہو گئے اور قرآن میں الرحمٰن کا ذکر انہوں نے کم پایا تو یہ چیز ان کو کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ کیونکہ توریت میں تو یہ لفظ بکثرت آیا ہے اس کے بعد جب بار بار یہ لفظ قرآن میں آیا تو ان کو اس سے خوشی ہوئی۔ اس پر یہ آیت نازل

ہوتی۔

بعض علماء تفسیر کے نزدیک وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ میں منکرین سے مکہ کے مشرک مراد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں جب بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوائی تو مشرکین کہنے لگے ہم تو رحمن یمامہ (مسیلمہ کذاب) کے علاوہ کسی اور رحمن سے واقف نہیں۔ اس پر آیت وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ اور آیت وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ نازل ہوئی۔ بَعْضَهٗ کا لفظ بتا رہا ہے کہ مشرکین لفظ اللہ کے ذکر کا انکار نہیں کرتے تھے بلکہ الرحمن کا لفظ ذکر کرنا ان کو گوارا نہ تھا۔

قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے مجھے تو بس یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دوں۔ اگر یہ قول پیش کرنے کا حکم منکرین اہل کتاب عیسائی اور یہودی کے مقابلہ میں ہے تو آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ آپ کہہ دیجئے جو قرآن مجھ پر نازل ہوا اور جو وحی مجھ پر بھیجی گئی ہے اس میں مجھے اللہ کی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ دین کا مرکزی ستون یہی ہے تم لوگ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ باقی تمہاری شریعتوں سے میرے شرعی احکام کا مختلف ہونا سوائے کوئی انوکھی بات نہیں تمام آسمانی کتابیں اور شریعتیں، جزئی احکام میں باہم اختلاف رکھتی ہیں ایک دوسری کا نسخ کرتی چلی آئی ہیں۔

مگر آیت کو عام کافروں کے حق میں قرار دیا جائے گا تو مطلب اس طرح ہوگا۔ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ کی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کو اللہ، رحمن، رحیم کے مختلف ناموں سے پکارنا توحید کے خلاف نہیں لفظ رحمن کا انکار بے حقیقت ہے (شاید مشرکوں کو لفظ رحمن سے اس لئے چڑ تھی کہ ان کی صلاحیت و استعداد میں رحمت الٰہی کی قابلیت ہی نہیں تھی)

اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ۝ اسی کی طرف میں لوگوں کو بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے نہ کسی دوسرے کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں نہ کسی اور کی طرف میرا رجوع ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ اور ..... جس طرح ہم نے گزشتہ قوموں کے انہیں کی زبانوں میں کتابیں نازل کیں ..... اسی طرح ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں (تمام معاملات، عبادات، حلت و حرمت وغیرہ کا) فیصلہ بنا کر اتارا ہے۔ تاکہ تمہارے اور تمہاری قوم کے لئے اس کو سمجھنا سمجھانا آسان ہو۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَمَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝

اور آپ کے پاس علم پہنچ جانے (یعنی قرآن نازل ہونے) کے بعد اگر آپ ان کی خواہشات پر چلنے لگے تو اللہ کے عذاب و گرفت سے آپ کو بچانے والا اور مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ یعنی کوئی نہ یار و مددگار اور حامی ہوگا جو اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔

روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں نے کہا تھا اس شخص کا مطمح نظر تو صرف عورتیں ہیں (یعنی یہ شخص نفس پرست اور عورتوں کا شیفتہ و فریفتہ ہے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیجے (جو فرشتے نہ تھے آپ کی طرح آدمی تھے) اور ہم نے ان کے لئے بیویاں اور اولاد (نرینہ و مادینہ) مقرر کیں (جیسے آپ کو عطا کی گئیں)۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اور کسی رسول کے اختیار میں نہیں (نہ کسی رسول کے لئے جائز ہے) کہ کوئی آیت (معجزہ اور حکم جو اس سے طلب کیا جائے وہ خود) لے آئے (کیونکہ سب پیغمبر بندے ہیں کوئی رب نہیں)۔

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ہاں اللہ کے حکم (اور اجازت) سے۔ (وہ معجزات اور احکام پیش کرتے تھے)۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۞ ہر مدت (اور ہر چیز کے وقت) کے لئے (اس کی طرف سے لوح میں) ایک مقرر تحریر ہے (اسی تحریر میں ہر چیز کی ابتدا اور انتہا لکھی ہوئی ہے)۔
مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ زید فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنی مدت تک زندہ رہے گا۔ کافر ہوگا یا مومن وغیرہ وغیرہ۔
اسی طرح قرآن کی ہر آیت کے نزول اور ہر معجزے کے ظہور کو بھی اللہ نے لکھ دیا ہے کہ فلاں وقت نزول یا ظہور ہوگا۔ لوگ خواہ کتنی بھی طلب میں عجلت کریں مگر وقت مقررہ سے پہلے کوئی بات نہیں ہو سکتی۔
قرآن کے وہ احکام جو توریت کے خلاف تھے اہل کتاب ان کو نہیں مانتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس خیال اور انکار کو دور کرنے کے لئے اللہ نے لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ فرمایا ہو۔ یعنی ہر مدت اور وقت کے لئے اللہ نے حکم نازل فرمایا ہے اور صرف مقررہ مدت کے لئے یہودیوں کو کوئی معین حکم دیا ہے یہودیوں کی مصلحت کے مطابق اللہ نے وقتی احکام بھیجے ہیں (جب مقررہ مدت ختم ہو گئی تو دوسرے زمانے کے لئے دوسرے احکام بھیج دئیے اور پہلے احکام بدل دیئے)۔
يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹاتا اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت برقرار رکھتا ہے۔[1]
اس آیت کے مطلب میں اختلاف ہے سعید بن جبیرؒ اور قتادہؒ نے فرمایا جن احکام کو خدا چاہتا ہے منسوخ کر دیتا اور بدل دیتا ہے اور جن کو چاہتا ہے منسوخ نہیں کرتا یہی آیت لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کا بھی مطلب مناسب ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوح محفوظ میں سے جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے اس میں ثبت کر دیتا ہے۔ لوح محفوظ کی جو تحریر مٹانے کے قابل ہوتی ہے جس کو تقدیر معلق کہا جاتا ہے اس کو مٹا دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسری چیز پیدا کر دیتا ہے کہ خواہ اس قضاء کا معلق ہونا لوح محفوظ میں درج ہو یا صرف اللہ کے علم میں پوشیدہ ہو اور تحریر لوح مٹانے کے قابل نہیں ہوتی جس کو تقدیر مبرم کہتے ہیں اس کو نہیں مٹاتا قضاء مبرم دور نہیں ہوتی۔
حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے رزق اور عمر اور سعادت و شقاوت کے یعنی یہ امور نہیں بدلے جاتے۔
بغوی نے لکھا ہے ہم کو حضرت حذیفہ بن اُسیدؓ کی روایت سے یہ فرمان رسول پہنچا ہے کہ استقرار نطفہ کے چالیس یا پینتالیس دن کے بعد ایک فرشتہ داخل ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے اے میرے رب یہ شقی ہے یا سعید یہ دونوں باتیں لکھ دی جاتی ہیں پھر فرشتہ کہتا ہے اے رب یہ نر ہے یا مادہ یہ دونوں امور بھی لکھ دیئے جاتے ہیں پھر اس کا عمل، اثر، عمر اور رزق لکھ دیا جاتا ہے پھر یہ تحریریں لپیٹ دی جاتی ہیں جن کے اندر اس کے بعد تبدیل ہونی بند ہوگی۔
صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور آپ سچے تھے اور اللہ کی طرف سے آپ کو سچا بنایا گیا تھا کہ آدمی کی بناوٹ ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورت نطفہ پھر اتنے ہی روز بصورت علقہ (لوتھڑا یا خون جما ہوا) پھر اتنی ہی مدت بصورت مضغہ (گوشت کی بوٹی) رہتی ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ چار باتوں

[1] طبرانی نے ضعیف سند سے بیان کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے بدبختی اور خوش بختی اور زندگی اور موت کے (یعنی ان چاروں چیزوں کو نہیں بدلتا)۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت سے حضرت رباب کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ رزق کی وسعت و کثرت کو مٹا بھی دیتا ہے اور رزق میں زیادتی بھی کر دیتا ہے اور عمر کی میعاد کو مٹا بھی دیتا ہے اور اس میں زیادتی بھی کر دیتا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے آیت يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ ہر شب قدر میں ہوتا ہے اللہ رتبہ اٹھاتا ہے اور بہاؤ کی روزی سے بچا جاتا ہے اور رزق دیتا ہے سوائے زندگی اور موت اور شقاوت و سعادت کے کہ ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ (از مؤلف رحمہ اللہ)

کے لئے بھیجتا ہے فرشتہ اس کا عمل اس کی زندگی اس کا رزق اور اس کا شقی (دوزخی) یا سعید (جنتی) ہونا لکھ دیتا ہے اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

بغوی نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے دونوں حضرات نے فرمایا اللہ سعادت و شقاوت کو بھی مٹا دیتا ہے اور رزق و مدت حیات کو بھی اور جو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ جب شریف کا طواف کرنے میں روتے تھے اور کہہ رہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے اہل سعادت میں لکھا ہے تو مجھے اس میں قائم رکھ (میرا نام ان کی فہرست سے نہ مٹا) اور اگر تو نے میرے لئے شقاوت لکھ دی ہے تو میرا نام اہل شقاوت کی فہرست سے مٹا دے اور اہل سعادت و مغفرت میں لکھ دے بلاشبہ تو جو کچھ چاہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہے قائم رکھتا ہے تیرے ہی پاس ام الکتاب (اصل کتاب ہر چیز کا تحریری علم) ہے۔ ایسی ہی روایت حضرت ابن مسعودؓ سے بھی آئی ہے۔

بعض آثار میں آیا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض آدمیوں کی عمر کے تیس سال باقی ہوتے ہیں لیکن جب وہ قرابت کو قطع کرتا ہے (قطع رحم کرتا ہے) تو لوٹا کر تیس سال کے تین دن کر دیئے جاتے ہیں اور بعض آدمیوں کی عمر کے تین دن باقی رہتے ہیں اور وہ کنبہ کی پرداخت (صلہ رحمی) کرتا ہے تو تین دن کھینچ کر تیس سال کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ اثر نقل کرنے کے بعد بغوی نے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی کی عمر کے جب صرف تین گھنٹے رہ جاتے ہیں تو اللہ رات کے آخری تین گھنٹوں میں نزول اجلال فرماتا ہے اور کتاب مندرج شدہ کو پہلے گھنٹہ میں ملاحظہ فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی بھی اس کتاب کو نہیں دیکھ سکتا پس جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثبت فرما دیتا (باقی قرار رکھتا ہے) ہے۔

میں کہتا ہوں حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کے مطابق مقامات مجددیہ میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے ایک شخص ملا طاہر لاہوری تھے حضرت مجدد صاحبؒ کے دونوں صاحبزادگان حضرت محمد سعید اور حضرت محمد معصوم کے معلم تھے حضرت مجدد قدس سرہ نے بنظر کشف ملاحظہ فرمایا کہ ملا طاہر کی پیشانی پر لکھا ہے "ملا طاہر لاہوری شقی" حضرت نے اس کا ذکر اپنے لڑکوں سے کر دیا صاحبزادگان تو ملا طاہر کے شاگرد تھے ہی اس لئے انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ اللہ سے دعا کر کے اس شقاوت کو مٹا کر سعادت سے بدل دے حضرت نے فرمایا میں نے لوح محفوظ میں لکھا دیکھا ہے کہ یہ قضاء مبرم ہے جس کو بدلا نہیں جا سکتا لڑکوں نے دعا کرنے کے لئے اصرار کیا حضرت مجدد نے فرمایا مجھے یاد آیا کہ حضرت غوث الثقلین محی الدین عبد القادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا۔ میری دعا سے قضاء مبرم بھی بدل دی جاتی ہے اس لئے میں دعا کرتا ہوں اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہوں اے اللہ تیری رحمت وسیع ہے تیرا فضل کسی ایک پر ختم نہیں ہو جاتا میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور تیرے بے پایاں فضل سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرما لے اور ملا طاہر کی پیشانی سے شقاوت کی تحریر مٹا کر اس کی جگہ سعادت کے نقوش ثبت کر دے جیسے تو نے میرے آقا حضرت غوث اعظمؒ کی دعا قبول فرمائی تھی۔ حضرت مجدد قدس سرہ کا بیان ہے اس دعا کے بعد وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ میری نظر کے سامنے لفظ شقی کو ملا طاہر کی پیشانی سے مٹا کر اس کی جگہ "سعید" لکھ دیا گیا اور اللہ کے لئے یہ بات دشوار نہیں۔

حضرت مفسرؒ کا بیان ہے اس تقریر کے بعد میرے دل میں ایک اشکال پیدا ہوا کہ کسی کی دعا سے قضاء مبرم کے ٹل جانے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے اگر قضاء مبرم بھی ٹل جاتی ہے تو وہ مبرم ہی کب ہوئی ایسی قضاء کو مبرم کہنا ہی غلط ہے اس اشکال کا جواب اللہ نے میرے دل میں اس طرح القاء کیا کہ قضاء معلق دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس کا معلق ہونا لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے دوسری وہ قضاء جس کا مبرم ہونا لوح محفوظ میں درج نہیں۔ اس کا معلق یا مبرم ہونا صرف اللہ کے علم میں ہے لوح محفوظ میں چونکہ اس کی تعلیق مکتوب نہیں اس لئے تحریر لوح کے اعتبار سے اس کو قضاء مبرم کہا جاتا ہے حضرت غوث الثقلین نے جس قضاء مبرم کو اپنی دعا سے بدل جانا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہی قضاء ہے جو لوح محفوظ میں مبرم یعنی غیر معلق لکھی ہے اور علم الٰہی میں

معلق غیر مبرم ہے۔ مثلاً طاہر کی بدبختی بھی اسی قسم کی تھی۔ لوح میں غیر معلق یعنی مبرم تھی، لیکن اللہ کے علم میں معلق غیر مبرم تھی اس لئے بدل دی گئی۔ واللہ اعلم۔

ضحاک اور کلبی نے آیت یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کراماً کاتبین آدمی کے تمام افعال و اقوال اپنے رجسٹروں میں لکھ لیتے ہیں ان میں کچھ ایسے اعمال و اقوال بھی ہوتے ہیں جن کا نہ کوئی ثواب ہوتا ہے نہ عذاب مثلاً کوئی کہتا ہے میں نے کھالیا میں نے پی لیا میں وہاں گیا میں گھر سے نکلا۔ یہ کلام اگر سچا ہوتا ہے تو اس پر نہ ثواب مرتب ہوتا ہے نہ عذاب اور کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو موجب ثواب و عذاب ہوتے ہیں۔ اول قسم کے اندراجات کو اللہ کراماً کاتبین کے رجسٹروں سے مٹا دیتا ہے اور دوسری قسم کی تحریروں کو قائم رکھتا ہے۔ کلبی نے اتنا مزید بیان کیا کہ جمعرات کے دن ایسے لاحاصل اعمال و اقوال مٹائے جاتے ہیں۔

عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول تشریح آیت کے ذیل میں اس طرح بیان کیا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے، لیکن آخر میں نافرمانی کرنے لگتا ہے اور اسی گمراہی پر مر جاتا ہے تو اللہ اس کے سابق نیک اعمال مٹا دیتا ہے اور جو شخص مرتے دم تک اطاعت پر قائم رہتا ہے اللہ اس کی نیکیاں قائم رکھتا ہے۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام آدمیوں کے سارے دل ایک آدمی کے دل کی طرح رحمٰن کی ایک چٹکی میں ہیں جس طرح چاہتا ہے پھیر دیتا ہے پھر حضورؐ نے یہ دعا کی اے اللہ اے دلوں کو پھیر دینے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے (یعنی اپنی اطاعت پر قائم رکھ)

حسن نے آیت کی تفسیر اس طرح کی جس کی موت کا وقت آجاتا ہے اللہ اس کو لے جاتا ہے یعنی (اس کی زندگی کا نقش) مٹا دیتا ہے اور جس کی موت کا وقت نہیں آیا ہوتا اس کو قائم رکھتا ہے۔

سعید بن جبیرؒ نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو گناہ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے معاف نہیں کرتا۔

عکرمہؒ نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ توبہ سے معاف کرنا چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں ثبت کر دیتا ہے۔ اس نے خود دوسری آیت میں فرمایا اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ۔

مسلم نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن بعض آدمیوں کی پیشی ہوگی تو حکم ہوگا اس کے سامنے اس کے صغیرہ گناہ پیش کرو حسب الحکم صغیرہ گناہ اس کے سامنے لائے جائیں گے اور کبیرہ گناہ الگ رکھے جائیں گے ... [illegible] ... رسول اللہ ﷺ ہنس دیے یہاں تک کہ آپ کی کچلیاں بھی نمودار ہو گئیں۔ مؤلف نے کہا میں کہتا ہوں شاید یہ عمل ان لوگوں کے لئے ہوگا جو محبوبیت کے سمندر میں غرق ہیں صاف باطن عالی قدر صوفی ہیں۔

سدی نے کہا مطلب یہ ہے کہ اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے یعنی چاندنی کو مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت کرتا ہے یعنی سورج یا دھوپ کو لے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کتاب آیت میں اظہار کیا ہے فرمایا ہے فَمَحَوْنَآ اٰیَةَ الَّیْلِ وَ جَعَلْنَآ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً ہم نے رات کی نشانی یعنی چاندنی مٹا دی اور دن کی نشانی نظروں کے سامنے لے آئے۔

ربیع نے کہا اس آیت کے مطلب کا تعلق ارواح سے ہے۔ اللہ سونے کی حالت میں ارواح کو قبض کر لیتا ہے اس کے بعد جس کو موت دینا چاہتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور جس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اس کی روح کو لوٹا دیتا ہے اللہ نے خود فرمایا ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا الخ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے جو اعمال ریاکاری اور شہرت کے حصول کے لئے کئے جاتے ہیں اللہ ان کو کراماً کاتبین کے دفتر سے مٹا دیتا ہے اور جو اعمال خالص اللہ کے لئے کئے

جاتے ہیں ان کو قائم رکھتا ہے۔

بعض اہل علم نے یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ ایک قوم کو مٹاتا ہے اور دوسری قوم کو قائم رکھتا ہے۔

وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ اور اسی کے پاس اُم الکتاب ہے۔ ام الکتاب، کتاب کی اصل جیسے ام القرآن سے مراد ہے "اللہ کا علم"۔ حضرت ابن عباسؓ نے کعب احبار سے ام الکتاب کا معنی دریافت کیا تو حضرت کعبؓ نے فرمایا علم الکتاب (یعنی اللہ کا علم) عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کے پاس دو کتابیں ہیں ایک کتاب تو وہ ہے جس میں محو و اثبات ہوتا ہے (یعنی بدلتا رہتا ہے) کچھ مٹایا جاتا ہے، دوسری کتاب ہے اس کے مندرجات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

بغوی نے کہا ام الکتاب لوح محفوظ ہے جس کے مندرجات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ عطا نے کہا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کی ایک لوح محفوظ ہے اتنی بڑی کہ بقدر پانچ سو برس کی راہ کے اس کی لمبائی ہے سفید موتی کی بنی ہوئی ہے اس کے دونوں پٹھے یاقوت کے ہیں اللہ روزانہ تین سو ساٹھ بار اس کو ملاحظہ فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اس میں سے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اور اگر (آپ کی وفات سے پہلے) ہم آپ کو اس بات کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں۔ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ سے مراد ہے دنیا میں مسلمانوں کو مشرکوں پر غالب کر کے اہل اسلام کے ہاتھوں ان کو سزا دینا اور مغلوب کرنا۔ اللہ نے یہ وعدہ آیت سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ میں دیا تھی (ان کا جتھہ شکست پائے گا اور سب پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے) یہ شکست جنگ بدر کے دن کفار کو ہوئی بڑے بڑے قتل ہوئے کچھ قید۔

اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ یا ہم وعدہ پورا کرنے سے پہلے آپ کو وفات دے دیں اور آپ کی زندگی میں ان کو کامل شکست ہو تو آپ ان کی شکست کریں ان کی ہدایت کرتے رہیں اور ان کے جلدی عذاب پانے کی خواہش نہ کریں۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ تو آپ کے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ آپ کر چکے۔

وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اور ہمارے ذمہ حساب فہمی ہے اور قیامت کے دن سزا دینا ہے جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم ان کو سزا دے دیں گے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا۔

کیا (مکہ کے کافروں نے) نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو ہر چہار طرف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں۔

بغوی نے اکثر اہل تفسیر کا قول بیان کیا ہے کہ زمین سے مراد ہے کافروں کی زمین اور کم کرنے سے مراد ہے مسلمانوں کا کافروں کی زمین کو فتح کرنا۔ کیونکہ مسلمانوں کے مفتوحات بڑھنے کا معنی ہی یہ ہے کہ کافروں کے مقبوضات میں کمی آئے۔ پورا مطلب اس طرح ہے کہ ہم نے جو ان کو وعید دی ہے کہ یہ بہت کچھ کفر کی حمایت میں صرف کریں گے لیکن وہ تمام مصارف ان کے لئے باعث حسرت بن جائیں گے آخر ان کو مغلوب ہونا پڑے گا کیا ان کو اس قول کی سچائی کا انکار ہے کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سرزمین کفر گھٹا رہے ہیں مسلمانوں کے مفتوحات بڑھ رہے ہیں کیا ان کی عبرت اندوزی کے لئے یہ مشاہدہ کافی نہیں ہے۔ آیت کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ، قتادہ اور اکثر علماء نے کی ہے۔ آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیام تسکین ہے تاکہ آپ فکر نہ کریں اور رنجیدہ نہ ہوں اور یقین رکھیں کہ اللہ کا وعدہ فتح پورا ہو کر رہے گا۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک "زمین کی کمی" سے مراد ہے ویرانی اور تباہی اس تو پیر مطلب کا خلاصہ اس طرح ہوگا کیا ان لوگوں کو اپنی بربادی اور اپنی کھیتوں کی ویرانی کا اندیشہ نہیں کیا ان کو نہیں نظر آتا کہ ہم ان کی بستیوں کو اجاڑ رہے ہیں اور آبادیوں کے رہنے والوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ تفسیر مجاہد اور شعبی کی طرف منسوب ہے۔

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ اور اللہ (اپنی مخلوق کے معاملات میں) جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ اس کے حکم کو ہٹانے والا کوئی نہیں ہے۔ یعنی اس کی قضا کو رد کرنے والا اور اس کے حکم کو توڑنے والا کوئی نہیں معقب کا معنی ہے کسی چیز کو پیچھے کی طرف پلٹ دینے والا اور موڑ کر بے کار کر دینے والا۔ مطلب یہ ہے

کہ اللہ نے اسلام کی ترقی اور کفر کی بربادی کا حکم دے دیا ہے ایسا ضرور ہو کر رہے گا اس کو پلٹنے والا کوئی نہیں۔

وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ اور وہ جلد محاسبہ کرنے والا ہے۔ یعنی دنیا میں قتل و قید اور جلا وطنی کی سزا دینے کے بعد قیامت کے دن ان سے حساب فہمی کرے گا۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور ان سے پہلے گزشتہ اقوام میں جو کافر گزرے ہیں انہوں نے بھی اپنے اپنے انبیاء اور مومنوں سے قبل فریب کئے تھے جیسے ان لوگوں نے آپ سے فریب کیا ہے "مکر" کا معنی ہے نامعلوم طریقوں سے کسی کو دکھ پہنچانا۔

فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا پس اللہ ہی کے پاس ہے ان کا مکر یعنی ان کے مکر کی سزا۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ ہی ان کے فریب کا خالق ہے خیر و شر اسی کے قبضہ میں ہے نفع اور ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے اس کی اجازت اور حکم کے بغیر کسی کا فریب کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لہذا ان کی فریب کاری بے سود ہے۔

يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ جو شخص بھی جو کچھ کرتا ہے اللہ اس کو جانتا ہے اور عمل کے مطابق بدلہ بھی دے گا یہی اللہ کی خفی تدبیر ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ نامعلوم طریقے سے دیتا ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ اور کافروں کو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ دونوں گروہوں میں سے کس کے لئے آخرت میں اچھی جزا ہوگی جب کہ غفلت کی حالت میں کافر جلانے والے عذاب ہوں گے اور مومن جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ کلام گویا مکر اللہ کی تفسیر ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا وہ (کفار مکہ یا سرداران یہود) کہتے ہیں کہ آپ پیغمبر نہیں ہیں۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ آپ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان میری نبوت پر اللہ کی شہادت کافی ہے۔

یعنی میری سچائی نبوت کے لئے اللہ کی شہادت کافی ہے۔ اس نے میری رسالت کی صداقت ایسے دلائل سے واضح کر دی ہے کہ ان کے بعد کسی اور شاہد کی ضرورت نہیں۔ اور وہی قیامت کے دن فیصلہ کرے گا اس روز ان منکروں کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝ اور ان لوگوں کی شہادت کافی ہے جن کے پاس اللہ کی کتابوں کا علم ہے۔ یعنی ایمان رکھنے والے اہل کتاب کی شہادت کافی ہے جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ۔ رہا کافروں کا انکار تو اس کی بناء محض حسد، عناد اور ریاجاہ کی طلب پر ہے۔ بغض و حسد ان کو اقرار کرنے سے روک رہے ہیں۔ اس تفسیر کی بناء پر بعض علماء نے کہا کہ پوری سورت اگرچہ مکی ہے مگر یہ آیت مدنی ہے۔

شعبی اور ابو بشر نے آیت کی مندرجہ بالا تفسیر کا انکار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ تو مدنی تھے ہجرت کے بعد مسلمان ہوئے تھے ان کے حق میں آیت کا نزول نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں آیت کو اگر ہم مکی ہی قرار دیں تب بھی آیت میں اہل کتاب مراد ہونا ممکن نہیں ہے گویا اللہ نے کفار مکہ سے فرمایا کہ اگر تم کو محمدؐ کی رسالت کا یقین نہیں ہے تو اہل کتاب سے دریافت کر لو معتبر اہل کتاب تصدیق کریں گے اور محمدؐ کی نبوت کی شہادت دیں گے۔

حسن اور مجاہد نے ام الکتاب سے مراد لوح محفوظ لی ہے اور مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد اللہ ہے دونوں جملوں کا ملا کر یہ مطلب ہوگا کہ اس کی شہادت کافی ہے جو مستحق الوہیت ہے اور لوح محفوظ کی تحریر کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں۔ وہی سچے اور جھوٹے کو سزا دے گا تم دونوں میں ہم دونوں میں سے کوئی ہو۔ حسن اور سعید بن جبیر کی قرأت میں مِنْ عِنْدِهِ بکسر میم آیا ہے اس قرأت سے بھی حسن و مجاہد کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ والحمد للہ سورۂ الرعد کی تفسیر اور اس کے ترجمے کی تصحیح ختم ہوئی (از مصحح)

سورۂ ابراہیم

یہ سورت مکی ہے اس میں باون آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٓرٰ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ الٓر (یہ سورت یا قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری

لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ تاکہ آپ لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں۔ یعنی آپ ہماری کتاب کی ہدایات کی طرف لے آئیں۔ یعنی آپ ہماری کتاب کی ہدایت کی طرف لوگوں کو بلائیں اور نفع و نقصان میں امتیاز پیدا کرنے والے امور کی تعلیم دیں۔

تاریکیوں سے مراد ہیں طرح طرح کی گمراہیاں اور نور سے مراد ہے ہدایت۔ اذن سے مراد ہے توفیق اور اسباب سہولت فراہم کر دینا۔ در اصل اذن داخلہ کی اجازت دینا ہے یعنی اندر داخل ہونے میں سہولت دے دینا ہے (رکاوٹ دور کر دینا ہے)

اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ۙ (نور کی طرف نکال کر لائیں یعنی) اس خدا کے راستہ کی طرف لائیں جو غالب اور مستحق ستائش ہے اس کے سوا کوئی بھی قابل تعریف نہیں۔

اللہ کے یہ دونوں اوصاف ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ غالب و محمود اللہ کی راہ پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا اور نامراد نہیں رہتا۔

اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اس اللہ کا راستہ جس کی (مخلوق اور مملوک) ہر وہ چیز ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ ۙ اور بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کے لئے۔

ویل کا معنی ہے نزول شر (اس سے مراد ہے پوری خرابی) بیضاوی نے لکھا ہے ویل کا معنی وال کے معنی کی ضد ہے وال کا معنی ہے نجات (ویل کا معنی ہے ہلاکت) ہلاک کی طرح ویل مصدر ہے مگر اس سے کوئی صیغہ مشتق نہیں ہے۔ بیضاوی کے … کو جیتی زندگی کا … یہ … وعید قرار پانے کا کافروں سے مراد ہیں وہ منکر ہیں کتاب جو تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں نہیں آتے۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ

جو دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ استحباب چن کر پسند کرنا کسی چیز کو اپنا محبوب

قرار دے لینا۔ دنیوی زندگی سے مراد ہے دنیا کی لذتیں۔ اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکنے کا مطلب ہے اللہ کے پیغمبر کے اتباع سے روکنا۔

وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا اور اللہ کے راستہ میں کجی ڈھونڈتے ہیں یعنی عیب چینی اور ... خورده گیری کے لئے دین میں کجی ڈھونڈتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ حق سے منہ موڑ کر اور رخ موڑ کر اللہ کی راہ کے طلب گار ہوتے ہیں حالانکہ ایسا ممکن نہیں (کہ حق سے منہ موڑ کر اللہ کا راستہ مل جائے) ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ راہ حق سے منہ موڑ کر دنیا کے طلب گار ہوتے ہیں مراد یہ ہے کہ حرام مال چاہتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ (۳) ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں یعنی ایسی گمراہی میں ہیں جو حق سے دور ہے۔ حق سے دور ہونا حقیقت میں گمراہ کا وصف ہے لیکن بطور مبالغہ کے گمراہی کی صفت قرار دے دیا گیا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ اور ہم نے ہر پیغمبر کو اسی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا۔

قوم سے مراد ہے وہ قوم جس میں پیغمبر پیدا ہوا اور مبعوث ہوا۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے حضرت قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ لسان قوم سے مراد ہے قوم کی بولی اگر قوم عربی ہوتی تو پیغمبر کی زبان بھی عربی ہوتی اور عربی میں ہی اس کو پیام دے کر بھیجا گیا اور اگر قوم کی زبان عجمی ہوتی تو پیغمبر کو بھی عجمی زبان میں پیام دے کر بھیجا گیا۔ اسی طرح سریانی کو سریانی زبان میں (اور عبری کو عبری زبان میں ۔ مترجم) پیام دیا گیا۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمْ تاکہ (پیغمبر کی امت کو جو احکام دیئے گئے تھے وہ قوم کے سامنے کھول کر بیان کر دے اور قوم والے آسانی کے ساتھ ان کو سمجھ لیں اور پیغمبر کو قوم کے خلاف تبلیغ کی ایک مضبوط دلیل مل جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہر پیغمبر کو اسی کی قوم کی اصلاح کے لئے (خصوصیت کے ساتھ) بھیجا گیا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کو تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا مگر اولاً اپنی قوم کو تبلیغ کرنے کے لئے آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ دوسری آیت ہے لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا تیسری آیت ہے لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ (اول آیت میں صرف اقرباء کو تبلیغ کرنے کا حکم ہے۔ دوسری آیت میں اہل مکہ اور دوسرے آس پاس والوں کو اور تیسری آیت میں تمام عرب کو۔ مترجم) اس لئے اہل حجاز کے لئے (اول اور بلاواسطہ) اور پھر بالواسطہ تمام انسانوں کے لئے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور واضح عربی زبان میں پیام نازل فرمایا گیا پس اہل حجاز نے اللہ کا کلام اور پیام رسول اللہ ﷺ سے سیکھا پھر اس کو نقل کیا اور دوسرے لوگوں نے (اپنی زبانوں میں) اس کے ترجمے کئے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں۔ رواہ احمد و مسلم فی الصحیح عن جابرؓ۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفار قریش چونکہ سب سے پہلے منکر نبوت ہوئے اس لئے دوسرے کافر نبوت کفار قریش کے تابع ہوئے اور کفار قریش سب کے امام۔ اسی طرح جو قریش ایمان لے آئے اور دوسروں سے پہلے ایمان لائے اور دوسرے لوگ ان کے بعد مؤمن ہوئے اس لئے ایمان لانے والے قریشی امام اور دوسرے مؤمن ان کے تابع ہوئے پس خیر و شر دونوں میں قریش امام اور باقی لوگ ان کے پیرو قرار پائے۔

حضرت جریرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ قائم کیا اس کو اس طریقے (پر چلنے) کا اور قائم کرنے کا ثواب بھی ملے گا اور اس طریقے پر جتنے لوگ چلیں گے ان کے ثواب کے برابر بھی اجر ملے گا (بعد کو اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی (ایسا نہ ہوگا کہ ان کا ثواب گھٹا کر طریقہ حسنہ قائم کرنے والے کا ثواب بڑھا دیا جائے) اور جس نے اسلام میں کوئی طریقہ برا ایجاد کیا اس پر اس طریقے کو (اختیار کرنے) کا گناہ بھی ہوگا اور (آئندہ) جو لوگ اس طریقے پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی ہوگا مگر اس سے برے طریقہ پر چلنے والوں کے گناہ (اور سزا) میں کوئی کمی نہیں ہو جائے گی۔ رواہ مسلم۔

ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے مدینے

والا) لوگ علم میں تمہارے تابع ہیں۔ مدینے والوں سے مراد ہیں انصار اور مہاجر دوسرے لوگ مہاجرین و انصار کے تابع ہیں مگر انصار دین (قبول فتح) میں مہاجرین کے تابع ہیں۔ دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

حضرت ابو رافع کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر والوں کے لئے شیخ (سب کا بزرگ) ایسا ہے جیسے امت کے لئے پیغمبر۔ رواہ ابن النجار والخلیلی فی مشیخۃ۔ حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر میں شیخ ایسا ہے جیسے اپنی قوم (امت) میں پیغمبر۔ رواہ ابن حبان فی الضعفاء۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ رواہ احمد والترمذی و ابو داؤد و ابن ماجۃ والدارمی عن کثیر بن قیس۔ ترمذی نے راوی کا نام قیس بن کثیر بتایا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور لوگ تمہارے تبع ہیں لوگ تمہارے پاس اطراف سے دین سیکھنے آتے ہیں تم ان سے اچھا سلوک کرو بھلائی کی ان کو نصیحت کرو۔ رواہ الترمذی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حدیث الشیخ فی بیتہ کالنبی فی قومہ میں قومہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے (اور النبی سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کتابیں عربی میں اتاری گئی تھیں پھر حضرت جبرئیل نے ان کا ترجمہ مختلف (انبیاء کی) زبانوں میں کیا۔ ابن مردویہ نے بو ساطت کلبی حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جبرئیل کو عربی زبان میں وحی کی جاتی تھی پھر جبرئیل ہر نبی کے پاس ان کی قوم کی زبان میں وحی لے کر آتے تھے۔

ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت سفیان ثوریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ (پیغمبروں پر) وحی تو صرف عربی میں نازل کی گئی پھر ہر نبی نے وحی کا ترجمہ اپنی قوم کی زبان میں کر دیا۔ سفیان ثوریؒ نے یہ بھی کہا قیامت کے دن سریانی زبان ہو گی اور جنت میں جو لوگ جائیں گے وہ عربی میں کلام کریں گے۔

(حضرت مفسرؒ نے کہا) میں کہتا ہوں قومہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع کرنا بعید از فہم ہے آیت لِيُبَيِّنَ لَهُمْ بِلِسَانِ قَوْمِهِ کی صراحت اس کے خلاف ہے۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ　　پس اللہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی ایمان کی توفیق نہیں دیتا۔

وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ　　اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے یعنی ایمان کی توفیق دے دیتا ہے اور حق کا یقین اسکے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ　　اور وہی غالب ہے اس کی مشیت پر کوئی غالب نہیں جس کو وہ ہدایت کر دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت یاب نہیں کر سکتا۔

الْحَكِيْمُ ۝　　بڑا حکمت والا ہے۔ اپنی مصلحت کے تحت ہدایت یاب یا گمراہ کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ　　اور ہم نے اپنی (نو) نشانیاں دے کر موسیٰ کو بھیجا۔

اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ۭ　　(ہم نے یہ پیام دے کر بھیجا) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ اور اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی کرو۔

ایام اللہ سے حضرت ابن عباسؓ حضرت ابی بن کعبؓ مجاہد اور قتادہ کے نزدیک اللہ کی نعمتیں مراد ہیں اور مقاتل کے نزدیک وہ واقعات مراد ہیں جو گزشتہ امتوں (عاد، ثمود، قوم نوح) کو پیش آئے۔ محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایام العرب کا عالم ہے یعنی عرب کی لڑائیوں سے واقف ہے۔ اس تقریر پر کلام کا مطلب اس طرح ہو گا کہ اپنی قوم کو وہ واقعات یاد دلاؤ جو اللہ نے گزشتہ ایام میں ظاہر کئے خواہ وہ بصورت نعمت ہوئے ہوں یا بشکل مصیبت۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ　　بلاشبہ ان واقعات میں (اللہ کی ہستی اس کی قدرت و حکمت اور توحید کی) بڑی نشانیاں ہیں

لِّكُلِّ صَبَّارٍ　　ہر ایسے آدمی کے لئے جو (مصیبت اور طاعت اور گناہ سے اجتناب پر) بہت صبر کرنے والا۔

شَكُوْرٍ (اور نعمتوں پر) بڑا شکر ادا کرنے والا ہو، مراد یہ ہے کہ ہر مومن کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں صبّار اور شکور کے الفاظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہر مومن کے اندر صبر اور شکر کی صفت ہونی لازم ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی حاتم نے بطریق ابو ظبیان حسب روایت علقمہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ صبر آدھا ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے۔ یہ قول علقمہ بن بدر کے سامنے ذکر کیا گیا تو علقمہ نے کہا یہ قرآن میں نہیں ہے کیا اللہ نے نہیں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یعنی ایک آیت میں اللہ نے صبار اور شکور کے لئے اور دوسری آیت میں مومنین کے لئے اس کو آیات توحید اور معارف قرار دیا اس سے معلوم ہوا کہ صابر و شاکر سے مراد مومن ہی ہے۔)

بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ایمان دو حصوں کا مجموعہ ہے اس کا آدھا حصہ صبر میں اور آدھا حصہ شکر میں ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں اور ابو یعلیٰ نے نقل کیا ہے کہ ایمان صبر و سماحت (ایثار) کا نام ہے۔

مسلم اور امام احمد نے حضرت صہیبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کا ہر کام بہتری ہی بہتری ہے، مومن کے علاوہ کسی اور کو یہ بات نصیب نہیں۔ اگر اس کو سکھ پہنچتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔

بیہقی نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے کہ مومن کی عجیب حالت ہے اگر اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ امید ثواب رکھتا اور صبر کرتا ہے اور اس کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کی حمد اور شکر کرتا ہے مومن کو ہر بات میں ثواب دیا جاتا ہے یہاں تک کہ جو لقمہ اٹھا کر وہ اپنے منہ میں رکھتا ہے (اس کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے) حضرت ابو الدرداءؓ کا بیان ہے میں نے ابو القاسم رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ اللہ نے فرمایا عیسیٰؑ میں تمہارے بعد ایک ایسی امت پیدا کروں گا کہ جب ان کو کوئی مرغوب خاطر چیز حاصل ہوگی تو وہ اللہ کی حمد کریں گے اور اگر کوئی ناگوار بات ان کو پیش آئے گی تو وہ ثواب کی امید رکھیں گے اور صبر کریں گے حالانکہ (ان میں) نہ بردباری ہوگی نہ سمجھ۔ حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے رب یہ بات ان کو کیسے حاصل ہوگی جب کہ ان کو نہ بردباری حاصل ہوگی نہ سمجھ فرمایا میں ان کو اپنی بردباری اور علم سے عطا کروں گا۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تم اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہوئی جب کہ اللہ نے تم کو فرعون والوں سے نجات دی جو تم کو بری تکلیفیں دیتے تھے اور تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ نعمت سے مراد انعام (اسم مصدری) ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے مراد ہے عذاب سخت مراد ہے تکلیفیں دینا اور کام لینا یعنی بیگار اور سخت ترین کام لینا مراد ہے یعنی قتل۔ وَيُذَبِّحُوْنَ کا عطف يَسُوْمُوْنَكُمْ پر ہے اور عطف مغایرت کو چاہتا ہے (معطوف، معطوف علیہ سے غیر ہوتا ہے) اور سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں عذاب سے مراد ذبح کرنا ہی ہے۔

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ اور تمہاری ان تمام باتوں میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

اور جب تمہارے رب نے اطلاع دے دی تھی کہ اگر شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا اور ناشکری کرو گے تو (سمجھ لو) میرا عذاب یقیناً سخت ہے۔ یہ بھی حضرت موسیٰؑ کے کلام کا ایک حصہ ہے۔ تاذّن کا معنی ہے اطلاع دے دی، بتا دیا

اور شکر تم و کفر تم کا خطاب بنی اسرائیل کو ہے۔ شکر نعمت سے مراد ہے ایمان لانا اور اپنے پیغمبر کے حکم پر چلنا۔ شکر زیادتی نعمت کا موجب ہے موجود نعمت کو برقرار رکھتا ہے اور غیر موجود کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو جاتا ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو شکر دیا گیا (شکر کرنے کی توفیق دی گئی) وہ زیادتی سے محروم نہ رہے گا۔ رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ۔

بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر تم اطاعت (کی شکل میں شکر ادا) کرو گے تو میں تمہارے ثواب میں زیادتی کر دوں گا۔

اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ سے مراد یہ ہے کہ میں تم کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اپنی نعمت تم سے چھین لوں گا اور آخرت میں عذاب دوں گا کیونکہ میرا عذاب سخت ہے۔

آیت میں وعدۂ زیادت کی تو صراحت ہے اور وعید عذاب کی طرف اشارہ ہے اس سے تنبیہ مقصود ہے اس امر پر کہ زیادتی نعمت تو شکر کی حالت میں لازم ہے اس کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور ناشکری پر عذاب کی وعید کو پورا کرنا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہے تو عذاب دے اور چاہے معاف فرما دے۔

وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝

اور موسیٰ نے کہا (اے بنی اسرائیل) اگر تم اور تمام زمین کے باشندے اللہ کی ناشکری کریں تو اللہ (تم سب کے شکر سے) بے نیاز ہے فی نفسہٖ مستحق حمد اور محمود ہے اس کی حمد آپ اس کی ذات سے پیدا ہو رہی ہے فرشتے بھی اس کی حمد کرتے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد میں مشغول ہے پورا کلام اس طرح تھا اگر تم ناشکری کرو گے تو اپنے آپ کو خود نقصان پہنچاؤ گے اپنی ذات کو مستحق عذاب اور ثواب سے محروم بناؤ گے اللہ بے نیاز اور مستحق حمد ہے۔

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ۬ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛؕ

کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی (تباہی) کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے جیسے ابراہیمؑ اور لوطؑ کی قومیں اور اصحاب الرس اور مدین والے اور ایکہ والے اور تبع کی قوم۔ یہ بھی حضرت موسیٰ کے کلام کا جز ہے اس صورت میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے یا اللہ کا کلام ہے اس صورت میں امت محمدیہ کو خطاب ہوگا۔

لَا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ؕ جن (کی صحیح تعداد) کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت تلاوت کی پھر فرمایا نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان تیس قرن ہوئے ہیں۔ جن سے سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں۔ امام مالک بن انسؒ کو یہ امر پسندیدہ نہ تھا کہ کوئی شخص اپنے اسلاف کا سلسلہ نسب مسلسل حضرت آدمؑ تک جوڑتا چلا جائے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق بھی امام موصوف کی یہی رائے تھی۔

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ان کے پیغمبر (اللہ کی طرف سے) کھلے واضح معجزات لے کر پہنچے (تو غصہ یا تعجب یا استہزاء سے)

فَرَدُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فِیْۤ اَفْوَاهِهِمْ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دے لئے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا انہوں نے غصے سے اپنے ہاتھ اپنے دانتوں سے کاٹے۔ اسی طرح دوسری روایت میں آیا ہے عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب انہوں نے اللہ کی کتاب سنی تو تعجب یا استہزاء سے اپنے ہاتھ منہ میں دے لئے جیسے کسی سے متعجب ہو کر کوئی آدمی منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہے کلبی نے کہا انہوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر پیغمبروں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اشارہ کر کے بتایا کہ منہ بند رکھو اور کوئی بات نہ کرو۔ مقاتل نے کہا انہوں نے اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منہ پر ان کو خاموش کرنے کے لئے رکھ دیئے۔ (اس صورت میں

افواہہم کی ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہوگی) بعض علماء کے نزدیک اَیْدِی کا معنی ہے نعمتیں یعنی پیغمبروں کی نصیحتیں اور احکام شریعت والی وحی۔ یعنی انہوں نے پیغمبروں کے احکام اور شریعت کو پیغمبروں کے منہ پر لوٹا کر دے مارا اور انکار کیا۔ مجاہد و قتادہ نے یہی مطلب بیان کیا محاورہ میں بولا جاتا ہے میں نے اس کی بات اس کے منہ میں لوٹا دی (یعنی اس کے منہ پر) اس کی تکذیب کر دی۔ بعض نے کہا فی افواہہم کا معنی ہے بافواہہم یعنی اپنی زبانوں سے انہوں نے احکام انبیاء کا انکار کیا اور پیغمبروں کی نصیحتوں کو لوٹا دیا۔

وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ اور کہنے لگے (تمہارے دعوے کے بموجب) جو احکام تم کو دے کر اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے ہم (تمہارے دعوے کی صحت و حقانیت کے) منکر ہیں۔

وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ

اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو ہم کو تردد میں ڈالنے والا ہے۔ ان کے پیغمبروں نے کہا کیا تم کو اللہ کے بارے میں شک ہے۔ استفہام انکاری ہے یعنی ہم تو تم کو اللہ کی توحید کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ کی توحید قابل شک نہیں ہے تمام محسوسات اور ذہنی موجودات اللہ کی توحید کو پکار پکار کر ظاہر کر رہی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جو آسمانوں کو اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ یہ فقرہ اللہ کی صفت یا لفظ اللہ سے بدل ہے۔

يَدْعُوْكُمْ وہ تم کو (اپنی طرف ہم کو بھیج کر) بلا رہا ہے تم کو دعوت دے رہا ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ۔

لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ تاکہ تمہارے گناہ معاف کر دے یا یہ مطلب ہے کہ تم کو مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مِنْ ذُنُوْبِكُمْ میں مِنْ زائد ہے مطلب یہ کہ تمہارے سب گناہ معاف کرنے کی طرف تم کو بلا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام ڈھا دیتا ہے اس (گناہ) کو جو مسلمان ہونے سے پہلے کا ہو۔ رواہ مسلم فی حدیث عمرو بن العاص۔ بعض کے نزدیک مِنْ ذُنُوْبِكُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ کیونکہ اسلام سے وہ گناہ معاف ہوتے ہیں جو براہ راست اللہ کے حقوق سے متعلق ہوں انسانوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔ ایک عالم کا قول ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں کافروں کو خطاب ہے وہاں مِنْ ضرور آیا ہے اور جہاں مومنوں کو خطاب ہے وہاں مِنْ نہیں ہے اس تفریق کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کافروں کے خطاب میں جو مغفرت کا اظہار کیا گیا ہے وہ شرط ایمان پر مبنی ہے اور مسلمانوں کے خطاب میں جو مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا جوڑ طاعت اور اجتناب عن المعصیۃ کے ساتھ ہے یعنی ادائے طاعت اور گناہ سے اجتناب کے ذیل میں حقوق انسانی کی ادائیگی اور معاملات باہمی میں حق تلفی سے اجتناب بھی داخل ہے اس لئے خطاب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو شامل ہے۔

وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اور تم کو ایک معین وقت تک چھوڑے رکھے اجل مسمی یعنی وہ وقت جو اللہ نے زندگی کا مقرر کر دیا ہے۔ اس معین وقت تک تم کو چھوڑے رکھے گا عذاب دینے میں جلدی نہیں کرے گا۔

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جن سابق قوموں کو کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا ان کی ہلاکت کفر پر مصر رہنے کے ساتھ مشروط تھی اور یہ قضاء ہلاکت معلق تھی اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی عمریں طویل ہو جاتیں (اور مقررہ عمر سے پہلے ہلاک نہ ہوتے)

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا کافروں نے (پیغمبروں سے) کہا تم تو بس ہماری طرح کے آدمی ہو یعنی تمہاری حقیقت اور صورت انسانوں جیسی ہے تم کو ہم پر کوئی (خلقی) برتری حاصل نہیں ہے پھر خصوصیت کے ساتھ تمہارے پیغمبر ہونے کی کوئی وجہ نہیں اگر انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ کو کوئی نبی اور رسول بھیجنا ہی تھا تو اس نوع میں سے بھیجا جو نوع انسان سے افضل ہوتی۔ دوسری آیت میں کافروں کا اسی مضمون کا قول نقل کیا ہے فرمایا ہے لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً۔

تُرِيدُونَ أَن تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝

(اس دعوت سے) تمہارا مقصد یہ ہے کہ جن معبودوں کی ہمارے اسلاف پرستش کرتے تھے ان کی پرستش سے ہم کو روک دو (اگر یہی بات ہے) تو کوئی کھلی ہوئی دلیل پیش کرو۔ جس سے تمہاری فضیلت اور عزت نبوت کا استحقاق ثابت ہو یعنی مراد یہ ہے کہ ایسی واضح حجت پیش کرو جس سے تمہارا دعوائے نبوت ثابت ہو سکے۔ کافروں نے واضح معجزات کو نہیں مانا اور محض عناد اور ضد کے زیر اثر مزید واضح دلائل کی طلب کی۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

کافروں سے ان کے پیغمبروں نے کہا بے شک ہم تمہاری ہی طرح آدمی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل کرتا ہے۔ یعنی نبوت اور دوسری نعمتیں عنایت کرتا ہے انبیاء نے عام نوعیت بشری سے اپنا اشتراک تسلیم کرتے ہوئے خصائص نبوت کو اللہ کا فضل و انعام بیان کیا۔

وَمَا كَانَ لَنَا أَن نَّأْتِيَكُم بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ اور ہمارے لئے ممکن نہیں کہ اللہ کی مشیت کے بغیر ہم تمہارے سامنے کوئی دلیل لا سکیں۔ یعنی اپنے اختیار اور قابو سے معجزات پیش کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم تمہاری درخواست پوری کریں اس کا مدار تو اللہ کی مشیت پر ہے وہی ہر نبی کو ایسے واضح معجزات عطا فرماتا ہے جن سے نبوت کا ثبوت ہو جائے۔

وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کلام سے انبیاء نے دوسرے ساتھی ایمانداروں کو ہدایت کر دی کہ کافروں کے مقابلے میں تم کو اللہ پر اعتماد کرنا چاہئے اور اپنے توکل علی اللہ کا بھی اظہار کر دیا۔ آیت سے در پردہ وہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا تقاضاء ایمان ہے کیونکہ مؤمن کا جب یہ پختہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ خیر و شر کو پیدا کرنے والا اور نفع و ضرر پہنچانے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تو لازمی طور پر وہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔

وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں جب کہ اسی نے ہم کو ہمارے راستے بتا دیئے ہیں جن کی وجہ سے ہم جانتے اور پہچانتے ہیں کہ تمام امور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہیں۔

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا اور ہم (اور ہمارے مؤمن ساتھی) ضرور تمہاری طرف سے ایذا رسانیوں پر صبر کریں گے۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے پہلے انبیاء نے اللہ پر توکل کرنے اور کافروں کی طرف سے بے نیازی کا اظہار کیا اور اس کلام سے اس کو پختہ کر دیا۔

وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝ اور اہل توکل کو اللہ ہی پر توکل کرنا لازم ہے یعنی ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ ہی پر توکل کریں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا اور کافروں نے اپنے پیغمبروں سے کہا ہم تم کو اپنی زمین (بستی شہر وغیرہ) سے ضرور نکال باہر کر دیں گے یا تم کو ہمارے مذہب میں ضرور لوٹ کر آنا ہوگا۔ یعنی اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارے مذہب میں آنا ہوگا۔ لوٹ کر آنے سے مراد ہے اپنا مذہب چھوڑ کر کافروں کے دین میں آنا کیونکہ پیغمبر بھی کافروں کے مذہب پر پہلے بھی نہ تھے اس لئے لوٹنے سے مراد دوبارہ کفر اختیار کرنا نہیں ہے یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطب تمام مؤمن ہوں پیغمبر بھی اور ان پر ایمان لانے والے رفقاء بھی۔ جماعت کو بطور تغلیب خطاب کیا گیا (پیغمبروں پر ایمان لانے والے پہلے کفر پر تھے، کفر چھوڑ کر ایمان لائے تھے اور پیغمبر بھی کافر نہ تھے اس لئے خطاب تو پیغمبروں کو کیا مگر روئے خطاب دوسرے مؤمنوں کی طرف ہے کہ تم کو دوبارہ اپنے اصلی مذہب کی طرف لوٹنا لازم ہے ورنہ ہم

تم کو نکال دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ اَوْ کا معنی اِلَّا اَنْ (ورنہ) یا اِلٰی اَنْ (یہاں تک) ہو اس وقت دھمکی کا تعلق صرف اخراج سے ہوگا مطلب اس طرح ہوگا کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ یا یہاں تک کہ تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔

فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ پس پیغمبروں کے رب نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے۔ یعنی ہم نے وحی بھیجی اور کہہ دیا۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ اور (کافروں کے گھروں اور) ان کی زمین میں ان کے بعد تم کو (یعنی پیغمبروں کو اور مومنوں کو) ضرور بسائیں گے۔ ان کے بعد سے مراد ان کو ہلاک کرنے کے بعد۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ (میری) یہ (رحمت و عنایت) اس شخص کے لئے ہوگی جو (قیامت کے دن) میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھتا ہو اور میرے عذاب کی وعید سے (یا میرے موعود عذاب سے جو کافروں کے لئے مقرر ہے) خوف کرتا ہے۔

مَقَامِيْ سے مراد ہے اللہ کے سامنے قیامت کے دن کھڑا ہونا لفظ مقام کا اسی معنی میں استعمال آیت وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ میں بھی ہوا ہے۔ یا مقام سے مراد ہے قیام یعنی اعمال کی نگہداشت۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو اعمال کو محفوظ رکھتا ہوں اور ہر شخص میری نگہداشت میں ہے مومن اس سے ڈرتا ہے (اور جزاء اعمال پر یقین رکھتا ہے) بعض علماء نے کہا مقام کا لفظ زائد ہے یعنی جو شخص مجھ سے ڈرتا ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوْا اور انہوں نے (یعنی انبیاء نے اللہ سے دشمنوں پر) فتح پانے کی دعا کی یہی مضمون آیت رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ میں بھی آیا ہے اِسْتَفْتَحُوْا کا عطف اَوْحٰى پر ہے اور ضمیر انبیاء کی طرف لوٹ رہی ہے (اسی کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے) ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے یہی قول نقل کیا ہے اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے یعنی جب انبیاء قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے فتح پانے اور کافروں پر عذاب نازل ہونے کی دعا کی۔ حضرت نوحؑ نے کہا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اور حضرت موسیٰؑ نے کہا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ۔ حضرت ابن عباسؓ اور مقاتل کا قول ہے کہ اِسْتَفْتَحُوْا کی ضمیر کافروں کی طرف لوٹ رہی ہے کافروں کا اسی مضمون کا قول دوسری آیت میں بھی آیا ہے کافروں نے کہا تھا اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے۔ بعض اہل تفسیر نے کہا اِسْتَفْتَحُوْا کی ضمیر دونوں فریقوں کی طرف راجع ہے اہل حق اور اہل باطل دونوں نے دعا کی کہ سچے کو فتح دی جائے اور باطل پرست کو تباہ کر دیا جائے کیونکہ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ہر فریق اپنے مسلک پر مگن تھا۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ اور ہر ظالم سرکش ناکام ہو گیا۔ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے یعنی مومن کامیاب ہوئے اور ناکام اور تباہ ہو گیا ہر سرکش مغرور۔ صاحب قاموس نے جبار کا ترجمہ سرکش اور عنید کا ترجمہ مغرور سے کیا ہے۔ تجبر کا معنی ہے تکبر یعنی بڑا ہونا (خواہ برحق ہو یا ناحق) اللہ جبار ہے یعنی برحق اس کے اندر کبریائی ہے اور ہر سرکش بھی جبار ہے۔ یعنی اس کی بڑائی کا دعویٰ تو ہے مگر غلط اور ناحق۔ یا جبار ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں رحم کا گزر بھی نہ ہو اور ناحق خونریزی کرتا ہو۔ یا جبار ایسے شخص کو کہتے ہیں جو انتہائی غرور کی وجہ سے کسی کا اپنے اوپر کوئی حق نہ سمجھے اور ہر ذمہ داری سے اپنی ذات کو بالا قرار دے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جبار اس کو کہتے ہیں جو اپنی ذات سے اعلیٰ اور بالا کسی کو نہ سمجھے جبر سے (مصدر ہے) انتہائی بڑائی کی طلب کہ اس سے اونچی کوئی چیز نہ ہو اسی معنی کی وجہ سے اس صفت کا تحقق صرف حق تعالیٰ کو ہے اس کے سوا جو بھی اس صفت کا دعویٰ کرے گا وہ یقینی لعنت و ہلاکت اور نامراد ہوگا۔ بعض علماء نے کہا جبار اس کو کہتے ہیں جو مخلوق کو اپنے حکم پر چلنے کے لئے مجبور کرے۔ اور عنید کا معنی ہے حق سے عناد رکھنے والا اور سچائی سے بیزار ہونے والا۔

قاموس میں ہے عَنَدَ دانستہ حق کی مخالفت کی۔ عَنید و عاند حق کی دانستہ مخالفت کرنے والا۔ حضرت ابن عباسؓ نے عنید کا ترجمہ کیا حق سے روگردانی کرنے والا۔ مقاتل نے کہا عنید متکبر کو کہتے ہیں۔ قتادہ نے کہا عنید وہ شخص ہے جو لا الٰہ الا اللہ کا انکار کرے۔

مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ اس کے پیچھے یعنی اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے جہنم ہے۔ مقاتل نے یہی ترجمہ کیا ہے یا یہ مراد ہے کہ اس کے سامنے جہنم ہے دنیا میں گویا وہ جہنم کے کنارے پر کھڑا ہوا ہے۔ جہنم اس کی گھات میں ہے آخرت میں اس کو جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ ابو عبیدہ نے کہا وَرَآء کا ترجمہ ہے آگے۔ یہ لفظ اَضداد میں سے ہے آگے اور پیچھے دونوں اس کے معنی ہیں۔

وَیُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِیْدٍ اور اس کو پانی یعنی پیپ لہو پلایا جائے گا۔ صدید وہ پانی جو دوزخیوں کے جوف اور کھالوں سے بہے گا اور پیپ، خون اس میں آمیختہ ہوگا۔ محمد بن کعب نے کہا جو پانی زناکاروں کے اعضاء نہانی سے بہے گا وہ کافروں کو پلایا جائے گا۔ بر قول بیضاوی مجاہد نے صدید کا ترجمہ کیا پیپ و خون (کچ لہو)۔

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بیہقی، بغوی نے اور ابن ابی الدنیا نے صفۃ النار میں اور حاکم نے اپنی صحیح اسناد سے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے سلسلہ میں فرمایا صدید کو دوزخی کے قریب لایا جائے گا تو اس کو برداشت نہ ہوگی اور زیادہ قریب لایا جائے گا تو اس کے چہرہ کو بھون ڈالے گا اس کے سر کی کھال گر جائے گی جب اس کو پئے گا تو انتڑیوں کا شکر ڈبر سے نکل جائے گا۔ اللہ فرمائے گا وَسُقُوْا مَآءً حَمِیْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ۔

یَّتَجَرَّعُهٗ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے اس کو پئے گا یعنی تکلف کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پئے گا (بدبو، بدمزگی اور ناگواری کی وجہ سے پینے کے طریقے سے نہ پی سکے گا)

وَلَا یَكَادُ یُسِیْغُهٗ اور آسانی کے ساتھ اس کو نگل نہ سکے گا۔ بلکہ وہ صدید اس کے حلق کا پھندا بن جائے گا آسانی سے اندر نہ اترے گا اور یونہی کافر طویل عذاب میں مبتلا رہے گا۔ سَوغ (مصدر) کا معنی ہے آسانی کے ساتھ کسی پینے کی چیز کا حلق سے اتر جانا اور طبیعت کا اس کو (خوش گواری کے ساتھ) قبول کر لینا۔ قاموس میں ہے سَاغَ الشَّرَابُ سَوْغًا آسانی کے ساتھ پینے کی چیز کو حلق میں اتار لیا۔

وَیَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اور موت (یعنی تکلیفیں اور قسم قسم کے عذاب) ہر طرف سے اس پر آئیں گے یعنی ہر طرف سے اس کو طرح طرح کا عذاب گھیر لے گا۔ یا اَلْمَوْت سے مراد موت کی سختیاں اور شدائد ہیں اور کُلِّ مَكَانٍ سے مراد ہے جسم کا ہر حصہ یعنی ہر حصۂ جسم سے اس پر موت کی سختیاں آئیں گی۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابراہیم تیمی کا قول نقل کیا ہے کہ ہر (بن) مو سے اس پر موت (کی شدت) آئے گی۔

وَّمَا هُوَ بِمَیِّتٍ اور وہ مر (بھی نہ) سکے گا کہ تکلیف سے چھوٹ جائے۔ ابن جریجؒ نے کہا سانس گلے میں اٹکا رہے گا نہ منہ سے باہر نکلے گی نہ اندر ہی اترے گی۔ ابن المنذر نے فضیل بن عیاض کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد سانس کا (گلے میں) بند ہو جانا ہے۔

وَمِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِیْظٌ اور اس (عذاب) کے بعد اس سے بھی سخت عذاب ہوگا۔ بعض علماء نے کہا کہ عذاب غلیظ سے مراد ہے دوزخ میں ہمیشہ رہنا کبھی نہ نکلنا۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ آیت اِسْتَفْتَحُوْا کا انبیاء کے قصہ سے کوئی تعلق نہیں یہ بالکل الگ آیت ہے اور اس کا نزول مکہ والوں کے متعلق ہوا اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے قحط میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے فتح یعنی بارش کے لئے اللہ سے دعا کی مگر اللہ نے ان کی مراد پوری نہیں کی اور بجائے پانی کے دوزخ میں دوزخیوں کے جوف کا گندہ پانی پلائے جانے کی وعید سنا

دی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کی عجیب اُخروی حالت لیتی ہے۔ مثل سے مراد ہے ایسی صفت جس میں ندرت ہو۔

اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (یعنی) ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے کچھ راکھ جس کو تیز آندھی کے دن ہوا تیزی کے ساتھ اڑا لے جائے۔ عصوف ہوا کا تیز چلنا (عاصف تیز چلنے والی ہوا) دن کو عاصف بطور مبالغہ قرار دیا گیا جیسے نہارہ صائم اور لیلہ قائم کہا جاتا ہے (آدمی دن میں روزہ رکھتا ہے اور رات کو سوتا ہے دن کو روزہ دار اور رات کو سونے والا بطور مجاز کہا جاتا ہے) اعمال سے مراد ہیں کافروں کی وہ خود تراشیدہ نیکیاں جن کے ثواب کے وہ امیدوار تھے، جیسے (ان کی مفروضہ) خیرات، کنبہ پروری، امداد فقراء، آزادی غلاماں وغیرہ۔ ان تمام کارہائے خیر کی بنیاد چونکہ خداشناسی پر نہ تھی اور ان سے اللہ کی خوشنودی مطلوب نہیں تھی یا بتوں کے نام پر یہ نیکیاں کی جاتی تھیں جو ان کے کسی عمل اور عبادت سے واقف نہ تھے اور نہ بدلہ دینے کی ان میں طاقت تھی اس لئے اللہ نے ایسی خوش اعمالیوں کو آندھی کی خاک سے تشبیہ دی جس کو آندھی اڑا کر لے جاتی ہے۔

لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۭ انہوں نے (دنیا میں) جو کچھ کیا ہوگا (قیامت کے دن) اس کے کسی حصہ پر قادر نہ ہوں گے۔ یعنی کسی عمل کا کوئی ثواب نہ پائیں گے نام ونشان بھی کسی نیکی کا نظر نہ آئے گا۔ اس تشبیہ کا خلاصہ یہی ہے۔

ذٰلِكَ یہ یعنی نیکی سمجھ کر کسی کام کو کرنا اور پھر اس نیکی کا برباد ہو جانا اور نیکی کا گمراہی پر مبنی ہونا۔

هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ (بڑے درجہ کی) حق سے بہت دور کی گمراہی ہے۔ بدکاریوں کا گمراہی ہونا تو در کنار ان کی تو نیکیاں بھی گمراہی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ حق سے مراد ہے حکمت کاملہ اور وہ طریقہ جو کائنات کی تخلیق کے لئے مناسب تھا۔ اس جہان بالا و پست کی یکتا پُر حکمت تخلیق حق و باطل میں امتیاز کا راستہ بتاتی اور صانع حکیم کی واحد ہستی کو ثابت کرتی ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اگر وہ چاہے تو تم کو (دنیا سے) لے جائے (تم کو معدوم کر دے) اور نئی مخلوق پیدا کر دے جو تم سے زیادہ فرماں بردار ہو جس نے یہ آسمان و زمین حکمت سے پیدا کئے ایسا بڑا قادر اس بات پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم کو دنیا سے معدوم کر دے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق پیدا کر دے۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝ اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ بھی دشوار نہیں ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز پر وہ قادر ہو اور دوسری چیز اس کی قدرت سے خارج ہو۔ اور جو ایسا قادر مطلق ہو وہی حق ہے اس امر کا کہ اسی کی پرستش اور اطاعت کی جائے اور اسی سے ثواب کی امید رکھی جائے اور اسی کی ناراضگی سے خوف کیا جائے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا اور اللہ کے حکم سے (اور حساب فہمی کے لئے) سب کے سب (اپنی قبروں سے) باہر نکل آئے (یعنی قیامت کے دن یقیناً قبروں سے نکل آئیں گے گویا نکل ہی آئے)

فَقَالَ الضُّعَفٰۗؤُا پس کہیں گے کمزور (نچلے طبقہ کے) لوگ کمزور سے مراد ہیں مال و دولت میں کمزور یا عقل و دانش میں کمزور۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا ان لوگوں سے جو (دنیا میں) بڑے بن بیٹھے تھے۔ یعنی ان سرداروں اور لیڈروں سے کہیں گے جو پیغمبروں کے اتباع سے روکتے تھے۔

اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا ہم تو بلاشبہ تمہارے تابع حکم تھے تم نے پیغمبروں کی تکذیب اور ان سے اعراض

کرنے کا حکم دیتا ہم تمہارے حکم پر چلے۔ تبعٌ تابع کی جمع ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ تو کیا (تم) ہم سے اللہ کے عذاب کا کچھ حصہ بھی دفع کر دو گے۔ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ میں مِنْ بیانیہ اور مِنْ شَیْءٍ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ وہ کہیں گے اگر اللہ ہم کو (ایمان کی) ہدایت نصیب کر دیتا تو ہم تم کو ہدایت پر آنے کی دعوت دے دیتے۔ لیکن ہم گمراہ تھے سو ہم نے تم کو بھی گمراہ کر دیا جو چیز اپنے لئے پسند کی تھی وہی تمہارے لئے بھی پسند کی یا یہ مطلب ہے کہ ہم تم کو آگ کے کنارے پر لے آئے اب اگر اللہ عذاب سے بچنے کا کوئی طریقہ ہم کو بتا دیتا تو ہم تم کو وہی راستہ بتا دیتے اور تم کو عذاب سے بچا لیتے مگر نجات کا راستہ تو خود ہمارے لئے بھی بند کر دیا گیا۔

سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ۠ ہم بے قراری کریں یا صبر کریں اب ہمارے لئے دونوں باتیں برابر ہیں (کوئی سود مند نہیں) ہمارے لئے بچنے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ مَحِیْصٍ اسم ظرف ہے حِیْصٌ مصدر حیص کا معنی بھاگنے کے لئے مڑنا یا مَحِیْصٌ مصدر ہے جیسے مغیب۔ یہ جملہ یا سرداروں کے کلام کا جز ہے یا دونوں فریقوں کا مقولہ ہے مقاتل کا قول ہے کہ کافر دوزخ کے اندر سب مل کر پانچ سو برس تک فریاد و زاری کریں گے لیکن کوئی حاصل نہ ہوگا پھر پانچ سو برس تک صبر کریں گے پھر بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس وقت کہیں گے سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ۔

ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت کعب بن مالکؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ دوزخی کہیں گے آؤ ہم صبر کریں (شاید اللہ کو رحم آجائے) چنانچہ پانچ سو برس تک صبر کریں گے اور جب یہ دیکھیں گے کہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو کہیں گے سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَا الخ

محمد بن کعب قرظی کا بیان ہے کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ دوزخی دوزخ کے منتظمین سے کہیں گے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے۔ منتظمین دوزخ جواب دیں گے اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِیْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر احکام واضح لے کر نہیں پہنچے تھے دوزخی کہیں گے پہنچے کیوں نہ تھے۔ اس پر منتظمین جواب دیں گے فَادْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ تم خود دعا کرو کافروں کی دعا کا سوائے بیکاری کے اور کچھ نتیجہ نہیں۔ جب وہ ناامید ہو جائیں گے تو کہیں گے یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ اے مالک (داروغہ جہنم) تمہارا رب تو ہمارا کام تمام ہی کر دے (یعنی موت ہی دے دے تو اس عذاب سے چھوٹ جائیں) مالک ان کو اسی برس تک کوئی جواب نہیں دے گا اور اسی برس میں ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہوگا لیکن ہر دن ہزار برس کا ہوگا (یعنی ہمارے ہزار برس کے برابر ہوگا) پھر اسی کے بعد جواب دے گا تم کو یہیں رہنا ہوگا جب وہ ناامید ہو جائیں گے تو ایک دوسرے سے کہے گا تم پر جو مصیبت آئی تھی وہ آتی رہی (اب بجزع فزع کرنا بیکار ہے) ہم کو صبر کرنا چاہئے ممکن ہے صبر سے کچھ اچھا نتیجہ نکل آئے جس طرح دنیا میں جن لوگوں نے خدا کی اطاعت پر صبر کیا تھا اور برائی کو برداشت کیا تھا تو ان کو (حق) فائدہ ہوا! غرض باتفاق (سب) صبر کریں گے اور طویل مدت تک صبر کریں گے (مگر بے سود) پھر جزع فزع کریں گے اور طویل مدت تک کریں گے (لیکن کچھ نتیجہ نہ ہوگا) آخر کار کہیں گے سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ کوئی بچنے کا مقام نہیں۔ اس کے بعد ابلیس کھڑا ہو کر ان کو خطاب کرے گا اور کہے گا اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو وعدے تم کو دیئے تھے ان کے خلاف ہوا اور تم پر میری کوئی زبردستی نہ تھی میں نے تو تم کو صرف دعوت دی تھی تم نے میری دعوت مان لی۔ لہٰذا آج مجھے ملامت نہ کرو خود اپنے کو ملامت کرو۔ ابلیس کا یہ کلام سن کر لوگوں کو خود اپنے سے نفرت ہو جائے گی اس پر

اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ

نہ آئے گی جتنی نفرت تم کو (آج) اپنے سے ہے اس سے زیادہ نفرت اللہ کو تم سے اس وقت تھی جب تم کو ایمان کی دعوت دی جا رہی تھی اور تم انکار کر رہے تھے۔[۱] منکر وہ پکاریں گے اے ہمارے رب (نبی کے قول اور تیرے وعدے کی سچائی) ہم نے دیکھ لی اور سن لیا اب ہم کو (دنیا میں) پھر لوٹا دے ہم اچھے عمل کریں گے ہم کو یقین آگیا۔[۲] اللہ ان کی تردید میں فرمائے گا وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا۔ وہ تیسری مرتبہ پکاریں گے۔ اے ہمارے رب ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور پیغمبروں کا بھی اتباع کریں گے تو تھوڑی مدت تک ہم کو مہلت دے دے۔[۳] اللہ فرمائے گا کیا تم نے اس سے پہلے قسم کھا کر نہ کہا تھا کہ ہم کو فنا نہیں۔[۴] پھر وہ چوتھی مرتبہ پکاریں گے اے ہمارے رب تو ہم کو (یہاں سے) نکال دے ہم جو کام پہلے کر چکے ہیں ان کے سوا دوسرے عمل کریں گے۔[۵] اللہ ان کے تردید میں فرمائے گا کیا ہم نے تم کو اتنی لمبی زندگی نہیں دی تھی کہ اس میں جو نصیحت پکڑنے والا تھا نصیحت پکڑ لیتا اور کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا۔[۶] پھر ایک مدت تک توقف کرنے کے بعد اللہ آگے فرمائے گا کیا میرے احکام تم کو پڑھ کر نہیں سنائے گئے تھے اور تم ان کی تکذیب کرتے تھے۔[۷] یہ بات سن کر وہ کہیں گے کیا ہم پر آئندہ ہمارا رب رحم (بالکل) نہیں کرے گا۔ اس کے بعد پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہم پر ہماری بدبختی غالب آگئی تھی ہم لوگ گمراہ ہو گئے تھے اے ہمارے رب (اب کی بار) ہم کو یہاں سے نکال دے اگر پھر ہم نے دوبارہ ایسا کیا تو ہم بلاشبہ ظالم ہوں گے۔[۸] اللہ فرمائے گا اسی میں ذلت کے ساتھ رہو مجھ سے بات بھی نہ کرو۔[۹] اس وقت وہ بالکل مایوس ہوں گے اور دعا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور باہم نوحہ کریں گے اور دوزخ کا پٹ بند کر دیا جائے گا۔

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ جب معاملہ کا فیصلہ ہو چکا تو شیطان (ابلیس) نے کہا یعنی فیصلہ سے فراغت ہو چکے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو شیطان کافروں سے کہے گا۔ مقاتل نے کہا شیطان کے لئے ایک تخت رکھا جائے گا تمام کفار اپنے پیشواؤں کے ساتھ اس کے پاس جمع ہوں گے اور جن وانس دونوں قسم کے بدبختوں میں وہ تقریر کرے گا۔

ابن جریر، ابن مردویہ، ابن ابی حاتم، بغوی، طبرانی اور ابن المبارک نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ اگلوں پچھلوں کو سب کو جمع کر کے ان کا فیصلہ کر چکے گا تو اہل ایمان کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ کر دیا اب کوئی شخص ایسا ہو جو ہمارے رب سے ہماری سفارش کر دے، لوگ کہیں گے آدمؑ ایسے ہو سکتے ہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے ان کو بنایا تھا اور ان سے کلام کیا تھا چنانچہ سب لوگ جا کر حضرت آدمؑ سے گزارش کریں گے کہ ہمارا رب ہمارا فیصلہ کر چکا اور حکم جاری کر چکا اب آپ اٹھ کر ہماری شفاعت کر دیجئے۔ حضرت آدمؑ کہیں گے نوحؑ کے پاس جاؤ۔ لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جانے کی ہدایت کر دیں گے لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے آپ حضرت موسیٰؑ کا راستہ بتا دیں گے لوگ حضرت موسیٰؑ کے پاس جائیں گے۔ آپ حضرت عیسیٰؑ کا حوالہ

۱۔ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ۔

۲۔ رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔

۳۔ رَبَّنَا اَخِّرْنَا اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ۔

۴۔ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ۔

۵۔ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ۔

۶۔ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ۔

۷۔ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔

۸۔ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔

۹۔ اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنَ۔

کا اظہار کرتے ہوں۔ اسی مفہوم کی طرح دوسری آیت آئی ہے فرمایا وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ۔ قیامت کے دن
تمہارے معبود تمہارے شرک سے بیزار ہو جائیں گے۔ یا یہ معنی ہے جیسے وَقَفِّیْنَ تُوْ نَا شُوْدًا اور مُسْحَان سے بیخبری
زمانہ میں اس وقت ہیں کا تعلق کفرت سے ہو گا۔ مطلب اس طرح ہوگا۔ جس خدا کے ساتھ تم نے مجھے طاعت میں شریک بنایا تھا
یعنی میرے کہنے سے جو لوگ غیر اللہ کی پوجا کرتی تھیں تو تمہارے اس فعل شرک سے پہلے ہی میں خدا کا انکار کر چکا تھا اس نے مجھے
آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو میں نے انکار کر دیا تھا۔

اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۞ بلاشبہ ظالموں کے لئے بڑے دکھ کا عذاب ہے۔ یہ ابلیس کے
کلام کا جزء ہے یا اللہ کا کلام ہے اس قصہ کی گفتگو کو نقل کرنے سے سننے والوں کو تنبیہ کرنی مقصود ہوتی ہے کہ وہ خود اپنا حساب فہمی کر
لیں اور اپنے انجام پر غور کر لیں۔ اس طریقہ سے سننے والوں کے لئے بڑی عبرت اور تخویف یا امید پیدا ہو جاتا ہے۔

وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ
اور جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کئے ان کو یقیناً ایسی جنتوں میں داخل کیا جائے
گا جن کے (درختوں اور عمارتوں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان جنتوں میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے جنتیوں کو
جنت میں لے جانے والے ملائکہ ہوں گے جو بحکم خداوندی جنت کے اندر ان کو لے جائیں گے۔

تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ۞ وہاں ان کو لفظ سلام کہہ کر سلام کیا جائے گا۔ یعنی ایک دوسرے کو سلام
کرے گا اور فرشتے سب کو سلام کریں گے بعض نے کہا سلامتی کی تحیت اللہ کی طرف سے ہوگی۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ۞
کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ (یعنی کلمہ توحید
و ایمان) کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہے اور شاخیں اونچائی میں جا رہی ہیں۔
ضرب مثلاً مثل بیان کی تمثیل کی۔ مثل وہ عبارت جو کسی چیز سے تشبیہ دینے کے لئے بیان کی جاتی ہے۔ کلمہ طیبہ سے
مراد ہے کلمہ توحید جو خلوص کے ساتھ ادا کیا جائے۔ شجرۂ طیبہ سے مراد ہے قوی، بلند، خوش ثمر درخت۔
كَلِمَةً طَیِّبَةً ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کی تفسیر ہے یا مثلاً سے بدل ہے اَصْلُهَا ثَابِتٌ یعنی اس کی جڑ زمین کے اندر مضبوط
طور پر جمی ہوئی ہے جڑ کے موٹے اور پتلے ریشے زمین کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔
فَرْعُهَا سے مراد ہے چوٹی یا شاخیں۔ موقع اللہ کر ترجمہ پر فرع اسم جنس ہوگا اور اضافت کی وجہ سے اس میں استغراق کا
مفہوم ہو جائے گا۔

تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا جو اپنے خالق کے ارادے اور تخلیق کی وجہ سے ہر (اس)
وقت پھل دیتا ہے (جو اس کے رب نے پھل لانے کے لئے مقرر کر دیا ہے) کلمہ طیبہ کی بھی یہی حالت ہے مؤمن کے دل میں
اس کی جڑ یعنی ایمان مضبوطی کے ساتھ قائم ہے جب یہ کلمہ زبان سے نکلتا ہے تو اوپر اٹھتا اور اللہ تک پہنچنے سے اس کو کوئی روک
نہیں سکتا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ اللہ ہی کی طرف پاکیزہ کلمہ چڑھتا ہے ترمذی نے حضرت عبداللہ
بن عمروؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ پڑھنا (قیامت کے دن) میزان (عدل) کا آدھا حصہ ہو
گا اور الحمد للہ (پڑھنا) میزان کو نیکیوں سے بھر دے گا اور لا الٰہ الا اللہ کو (اللہ تک پہنچنے سے) کوئی مانع نہیں۔
ترمذی نے حسن کی سند سے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی بندہ خلوص
کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو ضرور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کلمہ عرش تک
پہنچ جاتا ہے بشرطیکہ اس کا کہنے والا کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔ ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت انسؓ کی روایت سے
بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شجرۂ طیبہ کھجور کا درخت ہے اور شجرۂ خبیثہ حنظل

اللہ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمہ طیبہ) کی برکت سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں (یعنی کافروں) کو (دین و امتحان میں) بچلا دیتا ہے۔ القول الثابت سے مراد ہے کلمہ توحید جس کا اعتراف خلوص کے ساتھ کیا گیا ہو خلوص دل سے کلمہ توحید کا اقرار دل میں جم جاتا ہے اور اس کا ثواب اللہ کے پاس ثابت ہو جاتا ہے دین کے معاملات میں دنیا کے اندر دکھ اور آلام اہل ایمان پر آتے ہیں ان سے ایمان کو نہیں ہلا سکتے وہ ایمان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے ہیں جیسے حضرت زکریاؑ حضرت یحییٰؑ حضرت جرجیسؑ حضرت شمعونؑ اصحاب اخدود (جن کو گڑھوں میں آگ بھڑکا کر جھونک دیا گیا تھا یہ واقعہ یمن میں ہوا تھا اور شاہ ذونواس کے حکم سے ہوا تھا مترجم) حضرت حبیبؓ اور آپ کے ساتھی اور بئر معونہ والے (قاری جن کو دھوکہ سے شہید کیا گیا تھا مگر وہ اپنے ایمان پر قائم رہے) اور آخرت میں یعنی قبروں کے اندر نکیرین کے سوال کے وقت بھی اللہ ان کو اقرار توحید پر قائم رکھتا ہے ظالمین سے مراد ہیں منافق اور کافر یہ لوگ آزمائش کے وقت ثابت قدم نہیں رہتے آغاز مصیبت کے وقت ہی ان کے قدم پھسل جاتے ہیں اور آخرت میں تو ان کا گمراہ ہونا اور ثابت قدم نہ ہونا ظاہر ہی ہے۔

ائمہ ستہ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان سے جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ کا نزول عذاب قبر کے سلسلہ میں ہوا۔ صاحب قبر سے کہا جائے گا تیرا رب کون ہے وہ جواب دے گا اللہ میرا رب ہے محمد میرے پیغمبر ہیں (متفق علیہ)

ابوداؤد اور امام احمد کی روایت میں حدیث مذکورہ ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے (مردہ کے پاس) دو فرشتے آتے ہیں اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تیرا رب کون ہے وہ شخص جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے وہ جواب دیتا ہے میرا دین اسلام ہے فرشتے کہتے ہیں وہ شخص کیا تھا جس کو تمہارے اندر بھیجا گیا تھا وہ شخص جواب دیتا ہے وہ اللہ کے رسول تھے فرشتے کہتے ہیں تجھے کیا معلوم وہ شخص کہتا ہے میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور میں نے اس کو مانا اور اس کو سچا جانا یہی آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (کی مراد) یہی ہے حضور ﷺ نے فرمایا پھر ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے میرے بندے نے سچ کہا اس کے لئے جنت کا بستر کر دو اور اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو حضور ﷺ نے فرمایا پھر اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آنے لگتی ہیں اور حد نگاہ تک اس کے لئے جنت کی وسعت کر دی جاتی ہے کافر کی موت کا ذکر کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا اس کی روح بدن میں لوٹائی جاتی ہے دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ مجھے نہیں معلوم فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ مجھے نہیں معلوم فرشتے کہتے ہیں وہ آدمی جو تمہارے پاس بھیجا گیا تھا اس کی کیا حالت تھی وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ مجھے نہیں معلوم پھر آسمان سے ایک منادی پکارتا ہے اس نے جھوٹ کہا اس کے لئے آگ کا بچھونا کر دو اور آگ کا لباس پہنا دو اور دوزخ کی طرف ایک دروازہ اس کے لئے کھول دو پھر دوزخ کی گرمی اور لو اس پر آنے لگتی ہے اور اس کی قبر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں ادھر سے ادھر نکل جاتی ہیں پھر اس کو عذاب دینے کے لئے ایک اندھے بہرے (فرشتہ) کو مقرر کر دیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ اگر اس کی ضرب پہاڑ پر پڑ جائے تو اس کو بھی خاک کر دے یہ فرشتہ گرز اس کافر پر مارتا ہے جس کی آواز آدمی اور جن کے علاوہ مشرق سے مغرب تک ہر چیز سنتی ہے گویا ضرب سے کافر خاک ہو جاتا ہے پھر دوبارہ اس میں جان ڈالی جاتی ہے۔

حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ مردہ کے دفن سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ اس کے پاس توقف فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے اپنے بھائی کے لئے دعائے مغفرت کرو اور اللہ سے اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی درخواست کرو۔ اس وقت اس

سے سوال کیا جاتا ہے۔ رواہ ابوداؤد۔ شیخین بخاری و مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
بندہ کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس آنے لگتے ہیں تو مردہ ان کی جوتیوں کی کھٹ کھٹ سنتا ہے (اس وقت) دو
فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تو اس شخص یعنی محمد ﷺ کے بارہ میں کیا کہتا ہے۔ مومن جواب دیتا ہے میں
شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے۔ کہا جاتا ہے اپنے دوزخ والے ٹھکانے کو دیکھ اس کی جگہ اللہ نے جنت
میں عطا فرما دیا۔ مومن دونوں ٹھکانوں کو دیکھتا ہے۔ منافق اور کافر سے جب پوچھا جاتا ہے تو اس شخص کی بابت کیا کہتا تھا تو وہ
کہتا ہے مجھے پتہ نہیں معلوم۔ جو بات دوسرے لوگ کہتے تھے میں بھی کہتا تھا تو فرشتے کہتے ہیں نہ تو نے جانا اور نہ (قرآن میں) پڑھا۔ پھر
اس پر لوہے کے ہتھوڑوں کی مار پڑتی ہے اور وہ چیختا ہے اس کی چیخوں کو سوائے جن و انس کے سب قریب والے سنتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میت کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو دو سیاہ فام نیلی (نیلی
آنکھوں والے) فرشتے اس کے پاس آتے ہیں ایک کا نام منکر دوسرے کا نام نکیر ہے۔ دونوں فرشتے پوچھتے ہیں تو اس شخص کے
متعلق کیا کہتا تھا۔ میت جواب دیتا ہے وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد
اس کے بندے اور رسول ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں ہم تو جانتے ہی تھے کہ تو یہی کہے گا پھر اس کی قبر ستر ستر گز ہر طرف وسعت
کر دی جاتی ہے اور روشن کر دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے سو جا۔ وہ جواب دیتا ہے میں واپس جا کر اپنے گھر والوں
کو (اس کیفیت کی) اطلاع تو دے دوں۔ فرشتے کہتے ہیں اس دلہن کی طرح (بے آرام اور محبت کے ساتھ) سو جا جس کو
سوائے اس خصوصیت کے جو سب گھر والوں میں اس کو پیاری ہوتی ہے اور کوئی نہیں اٹھاتا (آخر وہ سو جائے گا) یہاں تک کہ اللہ اس
کو اس کی خواب گاہ سے اٹھائے گا اور اگر مردہ منافق ہوگا تو جواب دے گا میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تھا میں نے بھی ویسے
ہی کہہ دیا مجھے پتہ نہیں معلوم (کہ یہ اللہ کے رسول تھے یا نہ تھے) فرشتے کہیں گے ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تو یہی کہے گا پھر
زمین کو حکم ہو جاتا ہے تو اس پر مل جا (یعنی ایسا دبا کہ تیرے دونوں بازو آپس میں مل جائیں) زمین اس منافق کو اتنا دباتی ہے کہ
اس کی پسلیاں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر نکل جاتی ہیں اسی طرح برابر عذاب میں مبتلا رہے گا یہاں تک کہ اللہ اس کو اس
کی خواب گاہ سے اٹھائے گا۔ رواہ الترمذی۔

وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ ۝ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے کسی کو ایمان کی توفیق دیتا ہے کسی کو توفیق ایمان
سے محروم رکھتا ہے کسی کو ایمان پر قائم رکھتا ہے کسی کو قائم نہیں رکھتا اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابو درداءؓ راوی
ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدم کو پیدا کیا پیدا کرنے کے بعد ان کے داہنے شانہ پر ہاتھ مارا اور ان کی گوری نسل باہر
آگئی۔ گویا (کثرت میں) وہ چھوٹی چیونٹیوں کی طرح تھی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کالی نسل جیسے کوئلہ باہر آگئی۔ پھر اس نسل
کے متعلق جو دائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) جنت کی طرف (جانے والے ہیں) اور مجھے پروا نہیں اور اس نسل کے متعلق جو بائیں
شانہ میں تھی فرمایا (یہ) دوزخ کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے پروا نہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تمام آسمانوں اور زمین والوں کو اللہ عذاب دے تو وہ عذاب دے
سکتا ہے اور وہ ظالم نہیں ہوگا اور اگر سب پر رحم فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے ان کے لئے بہتر ہوگی اگر (کوہ) احد
کے برابر سونا تم راہ خدا میں دے دو تو جب تک تقدیر پر تمہارا ایمان نہ ہوگا اللہ اس کو قبول نہیں فرمائے گا اور جان لو کہ جو
کچھ تم کو پہنچے گا وہ تم سے چوکنے والا نہیں اور جو کچھ نہیں پہنچے گا وہ کسی طرح پہنچنے والا نہیں۔ اگر اس کے خلاف عقیدہ پر مرو گے تو
دوزخ میں جاؤ گے۔ حضرت ابن مسعودؓ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی اسی طرح کی احادیث منقول
ہیں۔ رواہ احمد وابن ماجہ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے
بجائے نعمت الٰہی کے کفر کیا۔ یعنی اللہ کی نعمت کے شکریہ کو ناشکری سے بدل دیا۔ شکر کے بجائے ناشکری کی گئی یہ مطلب ہے کہ

اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا۔ ناشکری کی وجہ سے ان سے اللہ کی نعمت چھین لی گئی تو گویا انہوں نے بجائے نعمت کے ناشکری کو پسند کر لیا۔ بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ واللہ وہ کفار قریش تھے (یعنی کفار قریش آیت میں مراد ہیں) حضرت عمرؓ نے فرمایا: وہ (ناشکرے) قریش تھے اور اللہ کی نعمت محمد ﷺ کی ذات تھی۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کی جنگ میں جو لوگ مکہ والوں میں سے مارے گئے وہ مراد ہیں۔ اللہ نے ان کو پیدا کیا، حرم کا ساکن بنایا، جہاں ہر طرف سے پھل اور غلہ لایا جاتا تھا (اور چین کے ساتھ مکہ والے بیٹھے کھاتے تھے) اصحاب فیل (نے جب کعبہ پر چڑھائی کی تو اللہ نے ان) کو (مکہ والوں کی طرف سے دفع کیا، ان کے لئے رزق کے دروازے کھول دیئے (شام و یمن کو) سردی اور گرمی کے زمانہ میں سفر کرنے کا ان کو خوگر اور مانوس بنایا (تاکہ غلہ، پھل، کپڑا اور ہر ضرورت کی چیزیں ان کو باافراط ملتی رہیں) اور انہی میں سے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا۔ تاکہ آپ ان کو قرآن پڑھ کر سنائیں، ان کے عقائد و اخلاق کو پاکیزہ اور ستھرا بنائیں اور ان کو قرآن و حکمت کی تعلیم دیں اور تمام لوگوں کو ان کا تابع بنایا لیکن انہوں نے تمام نعمتوں کی ناشکری کی، رسول اللہ ﷺ کے دشمن بن گئے اور ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی پر قائم رہے۔ آخر قحط ہفت سالہ میں مبتلا ہوئے اور بدر کے دن قید بھی ہوئے اور مارے بھی گئے اور ذلیل بھی ہوئے اور مرتے دم تک اللہ کی مدد اور نعمتوں سے محروم ہو گئے۔

وَّأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾ اور (کفر پر اصرار کر کے) انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے مقام میں اتار دیا۔

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا یعنی جہنم میں جس میں یہ خود بھی داخل ہوں گے (اور ان کے ساتھ والے بھی) سب کے سب جہنم کی گرمی میں جلیں گے۔ جہنم یا عطف بیان ہے یا فعل محذوف کا مفعول۔

وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٢٩﴾ اور جہنم بری قرارگاہ ہے، برا ٹھکانہ ہے۔ ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا امیر المؤمنین آیت الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا میں کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا قریش کے دو (قبیلے) جو سب سے زیادہ بدکار تھے۔ بنی مغیرہ اور بنی امیہ۔ بنی مغیرہ کے شر سے تو بدر کی لڑائی میں تمہاری حفاظت ہو گئی (یعنی بدر میں ان کا زور ٹوٹ گیا) اور بنی امیہ کو ایک وقت تک مزے اڑانے کا موقع دیا گیا ہے۔ بغوی نے بھی اسی طرح حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے اسی طرح کا قول حضرت علیؓ کا بھی مختلف روایات سے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں بنی امیہ کو حالت کفر میں مزے اڑانے کا موقع دیا گیا یہاں تک کہ ابوسفیانؓ، معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ وغیرہ مسلمان ہو گئے پھر یزید اور اس کے ساتھیوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اہل بیت کی دشمنی کا جھنڈا انہوں نے بلند کیا آخر حضرت حسینؓ کو ظلماً شہید کر دیا اور یزید نے دین محمدی کا ہی انکار کر دیا اور حضرت حسینؓ کو شہید کر چکا تو چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا آج میرے اسلاف ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے آل محمد اور بنی ہاشم سے ان کا کیا بدلہ لیا۔ یزید نے جو اشعار کہے تھے ان میں آخری شعر یہ تھا۔

ولست من خندف ان لم انتقم   من بنی احمد ما کان فعل

(احمد نے جو کچھ (ہمارے بزرگوں کے ساتھ بدر میں) کیا اگر احمد کی اولاد سے میں نے اس کا انتقام نہ لیا تو میں بنی خندف سے نہیں ہوں)

یزید نے شراب کو بھی حلال قرار دے دیا تھا، شراب کی تعریف میں چند شعر کہنے کے بعد آخری شعر میں اس نے کہا تھا:

فان حرمت یوما علی دین احمد   فخذها علی دین المسیح بن مریم

(اگر شراب دین احمد میں حرام ہے تو (ہونے دو) مسیح بن مریم کے دین (یعنی عیسائیت) کے مطابق تم اس کو (حلال سمجھ کر) لے لو۔

یزید اور اس کے ساتھیوں اور جانشینوں کے یہ مزے ایک ہزار مہینے تک رہے اس کے بعد ان میں سے کوئی نہ بچا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا اور انہوں نے اللہ کی مثل دوسروں کو قرار دیا چونکہ اللہ کا کوئی مثل نہیں۔ مثل قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ نام اور عبادت میں اللہ کی طرح دوسروں کو قرار دیا (اللہ کی پرستش کی طرح دوسروں کو معبود بنا لیا)

لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ تاکہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو بھٹکا دیں لِيُضِلُّوْا میں لام سبب اور علت کے لئے نہیں ہے کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کو پوجا کرنے سے ان کی غرض نہ خود گمراہ ہونا تھا نہ دوسروں کو گمراہ کرنا۔ بلکہ یہ لام عاقبت ہے یعنی اللہ کی مثل دوسروں کو قرار دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ گمراہ ہو گئے۔

قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝ آپ کہہ دیجئے کہ چندے عیش کر لو کیونکہ آخر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے یعنی اپنی نفسانی خواہشات یا بت پرستی اور گمراہی میں پڑے کچھ مدت تک مزے اڑاتے رہو۔ جو کچھ تمہارے لئے مقدر کر دیا گیا ہے اور جس وقت تک مزہ اڑانا تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے اتنی مدت تک مزے اڑا لو۔ ذوالنون نے کہا تمتع کا معنی یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی اپنی نفسانی خواہشات سے بہرہ اندوز ہو۔

تَمَتَّعُوْا اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن امر سے مراد حکم نہیں بلکہ یہ ایک تہدید اور عذاب کی دھمکی ہے اور اس بات کی اطلاع ہے کہ تمہاری یہ گمراہیاں تم کو عذاب میں لے جائیں گی۔ اسی لئے امر کے بعد فرمایا کہ آخر تم کو دوزخ میں جانا ہے گویا دوزخ میں جانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

(اے محمد ﷺ) آپ ﷺ میرے ان بندوں سے جو ایمان لے آئے ہیں کہہ دیجئے کہ وہ نماز کو قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر راہ خدا میں کچھ خرچ کریں۔ اہل ایمان کو خصوصی طور پر نماز پڑھنے اور راہ خدا میں خرچ کرنے کی ہدایت کرنے کا حکم دیا اور مؤمنوں کو خاص طور پر عِبَادِیْ فرمایا اور اپنے بندے قرار دیا اس سب سے مقصود اہل ایمان کی عزت افزائی ہے اور اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اہل ایمان ہی حقیقۃً حق عبدیت کو ادا کرنے اور تعمیل احکام کرنے والے ہیں وہ امر کی تعمیل کریں گے۔

يُقِيْمُوْا قُلْ کا مقول نہیں ہے۔ قُلْ کا مفعول محذوف ہے یعنی آپ ان کو حکم دیں کہ تم لوگ نماز پڑھو اور راہ خدا میں خرچ کرو۔ يُقِيْمُوْا اور يُنْفِقُوْا شرط محذوف کی جزا ہے یعنی اگر تم ان کو حکم دو گے تو وہ تعمیل کریں گے اس کلام میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ وہ رسول اللہ کے فرمان بردار ہیں فرمان کو ضرور مانیں گے اور تعمیل کریں گے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝ قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے کہ اس میں نہ خرید فروخت ہو گی (کہ کوئی قصوروار کوئی ایسی چیز خرید کر دے دے جو اس کے قصور کا بدلہ ہو سکے) اور نہ کوئی دوستی ہو گی (کہ دوست اپنے دوست کی سفارش کر کے بچا لے)

ایک شبہ۔ متقی شفاعت کریں گے اور بعض مؤمن بعض مؤمنوں کی بھی شفاعت کریں گے یہ مسئلہ مسلّم ہے۔ اللہ نے فرمایا اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ سب دوست باہم دشمن ہو جائیں گے سوائے تقویٰ والوں کے (یعنی متقی باہم دشمن نہ ہوں گے) پھر دوستی کا نہ ہونا آنے کی جو اس آیت میں صراحت ہے وہ کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

جواب۔ نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم اور تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے جن میں تقویٰ نہ ہو ان میں باہم دوستی نہ ہو گی اور دوستی نہ ہو گی تو ان میں سے کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی اتارا پھر اس پانی سے تمہاری معیشت کے لئے پھل (غلہ، روٹی وغیرہ) پیدا کئے "رزق" کا لفظ عام ہے کھانا ہو یا لباس، سب کو یہ لفظ شامل ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۝

اور (تمہاری سواری و بار برداری کے لئے) جہازوں اور کشتیوں کو تمہارے کام پر لگایا تاکہ اللہ کی مشیت کے مطابق وہ سمندر میں چلیں اور دریاؤں کو بھی تمہارا خدمت گار بنا دیا جہاں چاہتے ہو تم ان کو (رخ موڑ کر) لے جاتے ہو ان کے پانی سے فائدہ حاصل کرتے ہو اور ان پر پل اور بند باندھتے ہو۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ اور تمہارے کام کے لئے سورج اور چاند کو بھی سرگرم کر دیا۔ یعنی انسانوں کے لئے منافع کے لئے یہ تیزی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔

قاموس میں ہے (دَأَبَ فِي عَمَلِهِ) کام میں کوشش اور محنت کی اَدْأَبَ، دَأَبَ اور دُؤُوبٌ مصدر تیزی سے چلانا دائبین شب و روز۔ یعنی دونوں تیز رفتاری کے ساتھ چلتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے اپنی اطاعت میں ان کو تیز رفتار بنا دیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ اور رات دن کو بھی تمہاری خدمت پر لگا دیا۔ رات دن کے پیچھے آتی ہے اور دن رات کے پیچھے تمہارے آرام کے لئے رات بنا دی کہ کام کی تھکان اور ماندگی دور ہو جائے اور کسب معاش کے لئے دن کا اجالا کر دیا۔

وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ اور جو کچھ تم نے اس سے مانگا اس میں سے کچھ (بقدر ضرورت و مناسبت) تم کو دیا۔ مِنْ كُلِّ میں مِن تبعیضیہ ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے شاید مراد یہ ہے کہ تمہاری ضرورتوں کا جو تقاضا تھا اور تمہاری حاجتیں (فطری طور پر) جس چیز کی خواہش مند تھیں وہ سب تم کو دیا خواہ زبان سے تم نے مانگا ہو یا نہ مانگا۔ لفظ کُلّ کثرت کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے (استغراق حقیقی مراد نہیں ہے) جیسے محاورے میں بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص سب کچھ جانتا ہے (یعنی بقدر ضرورت) اس کے پاس ہر شخص آ گیا ہے۔ یعنی بہت آدمی آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی بہت چیزوں کے دروازے ہم نے ان پر کھول دیئے۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو گے تو پوری گنتی نہیں کر سکتے یعنی جن بے شمار اقسام کو بھی نہیں گن سکتے اقرار کا تو ذکر ہی کیا ہے اقرار نعمت تو آگے رہا ان سب کا شکر ادا کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے۔ لیکن اللہ نے اپنے کرم سے ادائے شکر نہ کر سکنے کے اقرار کو ہی اہل ایمان کے لئے شکر کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور جو لوگ شکر سے عاجزی کا اقرار کرتے ہیں ان کو بڑا شکر گزار بندہ فرمایا ہے اور جو لوگ شکر نہ کر سکنے کے باوجود اپنی عاجزی کا اقرار نہیں کرتے ان کے متعلق فرمایا ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ۝ بے شک انسان بے صبرا ناشکرا ہے سختی اور مصیبت میں اللہ کا شکوہ کرتا اور بے صبری کا اظہار کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا رب جو علیم و حکیم ہے یہ مصیبت بھی بڑی مصلحت سے حسب تقاضائے قدرت ہے خواہ اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے اور آسائش و نعمت ملتی ہے تو اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ ناشکرے کی ضد شکر گذار ہے ظاہر ہے کہ شکر اور عدم شکر باہم ضد ہیں اور ظلوم، ظلم کی ضد کو صبر کہا جاتا ہے کیونکہ ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھ دینا مصیبت پر صبر کرنا محل ہے مصیبت کا تقاضا ہے پس اگر مصیبت پر صبر نہ کیا جائے۔ بے صبری کے ساتھ شکایت کرنے لگے تو یہ ظلم ہو جانے گا اسی وجہ سے آیت میں ظلوم سے مجازاً مراد ہے بے صبرا۔ بعض علماء نے کہا کہ انسان کو ظلوم کہنے

کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے دنیا اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہو جانے کے اسباب فراہم کر دیتا ہے یا یوں کہو کہ شکر نعمت کو ترک کر کے آدمی اپنے نفس کو نعمت سے محروم کر دیتا ہے یہی اپنے نفس پر ظلم ہے یا یوں کہا جائے کہ ناشکرا آدمی نعمت پر ظلم کرتا ہے کہ اسکا شکر ادا نہیں کرتا یا غیر منعم کا شکریہ ادا کرتا ہے اور منعم حقیقی کا شکر نہیں کرتا تو اس طرح شکر کا استعمال بے محل کرتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا میرے اور جن وانس کے معاملات عجیب ہیں۔ میں پیدا کرتا ہوں اور وہ دوسروں کو پوجتے ہیں میں رزق دیتا ہوں اور وہ دوسروں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رواہ الحاکم والبیہقی۔ عن ابی الدرداءؓ۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب اس شہر (یعنی مکہ) کو امن والا (شہر) بنا دے جو یہاں رہے (یا آئے) امن سے رہے امن سے ہو جائے۔ حضرت ابراہیم نے اس جگہ مکہ سے خوف کو دور کر دینے اور شہر کو پُرامن بنانے کی دعا کی اور آیت اِجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا سے یہ درخواست کی کہ اس وادی کو امن کی بستی بنا دے۔ (یعنی یہاں وادی میں ایک شہر بسا دے جو پُرامن ہو)

وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی کرنے سے بچائے اور رکھ الگ رکھ۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ انبیاءؑ کا معصوم ہونا محض اللہ کی توفیق اور نگہداشت سے وابستہ ہے (یعنی انسانی فطرت تو انبیاءؑ میں بھی کار فرما ہے خیر و شر کے جذبات تو انبیاءؑ میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتے ہیں جو دلائل اور عناصر پیدا بشر میں کوئی فرق نہیں لیکن اللہ کی توفیق انبیاءؑ کے شامل حال رہتی ہے جو ہر وقت ان کو گناہوں سے بچائے رکھتی ہے) بَنِیَّ (اولاد نسبی) کے لفظ کے اندر اولاد کی اولاد داخل نہیں ہے۔ آیت یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ یا یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ سے مراد جو ساری نسل آدم و اسرائیل ہے وہ عموم مجاز کے طور پر مراد ہے پس آیت زیر تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنی اولاد کے لئے شرک سے محفوظ رکھے جانے کی دعا کی تھی اس سے مراد صرف صلبی اولاد تھی تمام نسل اسماعیل (واسحاق) مراد نہ تھی۔ نسل اسماعیل میں تو بکثرت بت پرست گزرے ہیں لیکن آیت مذکورہ کے لفظ بنی کو دیکھ کر بقول ابن ابی حاتم سفیان بن عیینہ نے بیان کیا کہ اولاد اسماعیل میں سے کوئی بھی بت پرست نہ تھا جن کو بت پرست کہا جاتا ہے ان کی بت پرستی کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ وہ پتھروں کا طواف کر لیا کرتے تھے اور اسکو وہ دوار (طواف) کہا کرتے تھے وہ کہتے تھے کعبہ بھی تو پتھروں کا نام ہے (جس کا طواف کیا جاتا ہے) اس لئے ہم جہاں پتھر نصب کر لیں وہ کعبہ کی طرح ہو جائیں گے (ان کا طواف کیا جا سکتا ہے) در منثور میں اتنا مزید آیا ہے کہ سفیان بن عیینہ سے دریافت کیا گیا پھر آپ نے اولاد اسحاق اور دوسری نسل ابراہیمی کو کیوں اس میں داخل نہیں کیا اولاد اسماعیل کا خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر کیا سفیان نے جواب دیا حضرت ابراہیم نے اس شہر کے رہنے والوں ہی کے لئے دعا کی تھی کہ وہ بت پرستی نہ کریں اور آبادی کے بعد انہی کے لئے دعا کی کہ اللہ اس شہر کو پُرامن بنا دے تمام بستیوں کے لئے دعا نہیں کی تھی اور آیت رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ میں اسی شہر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ سفیان بن عیینہ کی یہ تصریح قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت و اجماع کے بھی۔ خبر متواتر سے ثابت ہے کہ اللہ کی کتاب میں مشرکوں سے مراد اہل مکہ (نسل اسماعیل) ہیں اور اللہ نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ کے علاوہ بھی دوسری آیات سے (یہی) ثابت ہے کہ اہل مکہ مشرک تھے اور ان کے باپ دادا بھی۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ اے میرے رب ان مورتیوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے ان کی وجہ سے لوگ راہ حق سے بھٹک گئے یہ مورتیاں لوگوں کی گمراہی کا سبب بن گئیں۔

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ پس جو شخص (دین میں) میرا پیرو ہو گا وہ میرا ہے یعنی مجھ سے متعلق ہے دنیا اور آخرت میں اسکا تعلق مجھ سے نہیں ٹوٹے گا یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ اور جو میری نافرمانی کرے گا تو (اس کو تو بخش دے اس پر رحم

فرما کیونکہ تو) غفور و رحیم ہے۔ سدی نے کہا اس فقرہ کا مطلب یہ ہے جو میری نافرمانی کرے پھر توبہ کر لے تو اس کو تو معاف کر دے تو غفور رحیم ہے۔ مقاتل نے کہا نافرمانی سے مراد ہے شرک سے کم درجہ کی نافرمانی یعنی شرک کے علاوہ جو میری نافرمانی کرے۔

ظاہر یہ ہے کہ (لفظ عصانی میں شرک بھی داخل ہے لیکن) حضرت ابراہیم نے یہ دعا اس وقت کی تھی جب کہ آپ کو مشرک کا غیر مغفور ہونا معلوم نہ ہوا تھا جب آپ کو مشرک کے غیر مغفور ہونے کی اطلاع دے دی گئی تو اس وقت آپ نے دعا کی وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اور ان کو پھلوں سے رزق دے۔ اور اس (شہر) کے باشندوں میں سے ان لوگوں کو جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں کھانے کے لئے پھل عطا فرما۔ اس دعا میں صرف اہل ایمان کو رزق عطا کرنے کی دعا اس لئے کی کہ مشرک کے غیر مغفور ہونے کی صراحت سے آپ کو خیال پیدا ہو گیا کہ مشرک سے اللہ دنیا میں بھی انتقام لے گا اور اپنے پیدا کئے ہوئے پھلوں سے محروم رکھے گا۔ (چونکہ یہ خیال غلط تھا اس لئے اس کے جواب میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ اور جو کفر کرے گا اس کو تھوڑی مدت (بقدر مدت زندگی) میں بہرہ اندوز رکھوں گا پھر اس کو عذاب دوزخ کی طرف کھینچ کر لے جاؤں گا (یعنی کافروں کو دنیوی نعمتوں سے محروم نہیں رکھوں گا۔ ہاں آخرت میں اس کی مغفرت نہ ہو گی۔)

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي اے ہمارے رب میں نے اپنی کچھ اولاد کو باشندہ کر دیا۔ کچھ اولاد سے مراد ہیں اسمٰعیل اور آپ کی نسل۔ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو وادی مکہ میں رکھا تھا نسل اسماعیل اس کے ذیل میں آ گئی۔

بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ ایسے وادی میں جہاں کھیتی نہیں ہے لغت میں وادی پہاڑی نالے کو کہتے ہیں پھر (توسیع استعمال کے بعد) چند پہاڑوں یا ریت کے ٹیلوں کے درمیانی میدان پر اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا مکہ کی بستی بھی ایسے ہی میدان میں تھی جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ چونکہ یہ وادی پتھریلا علاقہ تھا قابل پیداوار نہ تھا اس لئے اس کو غیر ذی زرع فرمایا۔

عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ تیرے ممنوعہ گھر کے پاس۔ بیت اللہ سے مراد ہے بیت اللہ ہے جو طوفان نوح سے پہلے موجود تھا۔

فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جس روز آسمان و زمین بنائے (اسی روز) اس شہر کو باحرمت (ممنوعہ) قرار دے دیا۔ پس روز قیامت تک اللہ کی عطا کی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ شہر ممنوعہ (باحرمت) رہے گا یہاں کسی کے لئے لڑنا حلال نہیں اور ایک ساعت سے زیادہ میرے لئے بھی یہاں قتال جائز نہیں۔ روز قیامت تک خداداد حرمت کی وجہ سے یہ باحرمت (ممنوعہ) رہے گا۔ یہاں کے کانٹے بھی جھاڑیاں (بھی) نہ کاٹے جائیں نہ یہاں کے شکار کو (بھگا کر) باہر نکالا جائے نہ یہاں گری پڑی چیز کوئی اٹھائے ہوائے اس فرض کے کہ اس چیز کی شناخت کرائی جاوے (کہ شناخت کر کے اس کا مالک لے لے) نہ یہاں کی گھاس کاٹی جائے۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اذخر (مرچیا گند) کو اس سے مستثنیٰ کر دیجئے یہ لوہاروں کے اور مکہ والوں کے گھروں کے کام میں آتی ہے فرمایا اذخر مستثنیٰ ہے۔ متفق علیہ۔ روایت ابن عباسؓ۔

واقدی اور ابن عساکر نے عامر بن سعید کے سلسلہ میں حسب ذیل روایت کی ہے۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیم کی بی بی تھیں مدت تک حضرت کے پاس رہیں لیکن اولاد نہیں ہوئی جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہو گئے تو حضرت سارہ کو جذبۂ رقابت نے ابھارا اور آپ کے دل میں کچھ احساس کمتری کا اور انتقام پیدا ہو گیا اور انہوں نے قسم کھائی کہ ہاجرہ کے تینوں ناک کان کاٹیں گی (تاکہ بدصورت ہو جائیں اور حضرت ابراہیم کو ان سے نفرت ہو جائے) حضرت ابراہیم نے فرمایا تم اپنی قسم پوری کر لینا چاہتی ہو۔ حضرت سارہ نے عرض کیا میں کیا کروں (میری قسم پوری ہونے کی کیا صورت ہو) حضرت ابراہیم نے فرمایا ہاجرہ کے کانوں میں سوراخ کر دو اور اس کا ختنہ کر دو۔ حضرت سارہ نے ایسا ہی کیا حضرت ہاجرہ نے کانوں میں چھلے

کے بعد دو بالیاں کانوں میں پہن لیں۔ اس سے ان کا حسن اور بڑھ گیا۔ حضرت سارہ بولیں اس نے تو میں نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا۔ غرض حضرت سارہ نے پسند نہیں کیا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کے ساتھ رہیں۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہ سے بڑی محبت تھی۔ (بہرحال) آپ ہاجرہ کو مکہ لے گئے اور چونکہ آپ کو ہاجرہ سے بڑی محبت تھی اور بغیر ہاجرہ کے نہیں رہ سکتے تھے اس لئے روزانہ براق پر سوار ہو کر شام سے مکہ کو ہاجرہ سے ملنے آیا کرتے تھے۔

بخاری نے صحیح میں اور بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے نطاق حضرت ہاجرہ نے اس غرض سے پہنا کہ قدموں کے نشانوں کو پیچھے سے نطاق کا سرا مٹاتا چلے اور حضرت سارہ کو ان کا نشان قدم معلوم نہ ہو (عرب کی عورتوں نے نطاق کا استعمال حضرت ہاجرہ سے ہی سیکھا تھا)

غرض حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے لڑکے اسماعیلؑ کو لے کر بیت اللہ کے پاس پہنچے اور مسجد سے بالائی مقام پر زمزم کے اوپر ایک بڑے درخت کے پاس دونوں کو بٹھا دیا۔ حضرت اسماعیلؑ (ابن دنوں) شیر خوار تھے، حضرت ہاجرہ کا دودھ پیتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک خورجین جس میں چھوارے تھے اور ایک مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا حضرت ہاجرہ کے پاس رکھ دیا پھر لوٹ پڑے۔ حضرت ہاجرہ نے پیچھا کیا اور کہا اے ابراہیمؑ آپ ہم کو اس بے آب و گیاہ وادی میں (جہاں نہ کوئی آدمی ہے نہ کچھ اور چیز) چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت ہاجرہ نے یہ بات کئی بار کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے منہ پھیر کر نہیں دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں! اس پر ہاجرہ بولیں تو اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ پھر لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیمؑ چل دیئے جب ہاجرہ کی نظر سے غائب ہو گئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں دعا کی رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔۔۔۔يَشْكُرُوْنَ تک۔

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں اور بچے کو دودھ پلاتی رہیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا اور پیاس لگی اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا تو بلبلانے لگا۔ بچہ کی طرف نظر اٹھائی تو بچہ اپنی زبان منہ میں گھماتا ہوا نظر آیا۔ دیکھ کر (بے تاب ہو گئیں اور) نظر پھیر لی اور چل کر کوہ صفا پر پہنچ گئیں۔ وہاں سے قریب ترین پہاڑ صفا تھا۔ صفا پر چڑھ کر اوپر کھڑی ہو کر وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آ جائے جب کوئی نظر نہ آیا تو صفا سے اتر کر وادی میں پہنچیں اور قوت کے ساتھ دوڑنے والے آدمی کی طرح کرتے کا دامن اوپر کو اٹھا کر دوڑ کر وادی سے گذر کر مروہ پہاڑی پر پہنچیں اور ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کوئی نظر پڑ جائے لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس طرح سات بار کیا۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی لئے (حاجی لوگ صفا مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں)۔ آخر (مرتبہ) جب مروہ پر پہنچیں تو ایک آواز سنی اور خود اپنے آپ سے کہنے لگیں چپ۔ پھر کان لگا کر سنا تو پھر آواز سنائی دی۔ کہنے لگیں میں نے آواز تو سن لی اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہو (تو لا) اچانک زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ نمودار ہوا اور زمین کو ایڑی یا پر مار کر اس نے کھود دیا تو پانی نکل آیا حضرت ہاجرہ پانی کا گھیر بنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے چلو بھر بھر کر مشکیزہ میں بھرنے لگیں جو نہی چلو بھر کر اٹھاتیں پانی اور ابل پڑتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ پر اللہ کی رحمت ہو اگر وہ زمزم کو یوں ہی رہنے دیتیں یا یہ فرمایا کہ اگر وہ چلو بھر بھر کر نہ لیتیں تو زمزم ایک جاری چشمہ ہو جاتا۔ غرض حضرت ہاجرہ نے خود پانی پیا اور اپنے بچہ کو دودھ بھی پلایا۔ فرشتہ نے کہا ہلاکت کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے یہ لڑکا اور اس کے والد اللہ کے گھر کی تعمیر کریں گے اللہ اپنے گھر والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ کعبہ اس زمانہ میں ٹیلہ کی شکل میں زمین سے کچھ اونچا تھا۔ سیلاب آ کر اس کے دائیں بائیں کناروں کو کاٹ کر لے جاتا تھا۔ حضرت ہاجرہ اسی حالت میں رہتی رہیں تا آنکہ بنی جرہم کا ایک قافلہ ادھر سے گذرا اور آ کر مکہ کے نشیبی مقام پر اس نے پڑاؤ ڈالا۔ قافلہ والوں نے دیکھا کہ کچھ پرندے پانی کے اوپر منڈلا رہے ہیں کہنے لگے یہ پرندے یقیناً پانی پر گھوم رہے ہیں لیکن ہم تو اس وادی سے پہلے گذر چکے ہیں یہاں تو پہلے کوئی پانی نہ تھا کچھ لوگوں کو (تحقیق حال کے لئے) بھیجا انہوں نے جا کر دیکھا تو پانی موجود پایا لوٹ کر آئے اور ساتھیوں کو اطلاع دے دی اس کے بعد قافلہ والوں نے آ کر حضرت اسماعیلؑ کی والدہ سے گذارش کی کہ ہم کو اپنے پاس رہنے کی

اجازت دے دی۔ حضرت مجاہد نے فرمایا لیکن پانی پر تمہارا کوئی (مالکانہ) حق نہ ہوگا۔ قافلے والوں نے اس کا اقرار کرلیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسمٰعیل کی والدہ انس کی طالب تھیں (تنہائی کی وحشت دور کرنا چاہتی تھیں) پانی پر قبضہ نہیں کیا۔ قافلہ والوں نے اپنے متعلقین کو بھی بلوالیا اور سب وہیں مقیم ہوگئے رفتہ رفتہ بہت خاندان بن گئے اسمٰعیل بھی جوان ہوگئے بنی جرہم سے عربی بھی انہوں نے سیکھ لی اور جوان ہونے کے بعد سب کے محبوب بن گئے بنی جرہم نے اپنی ہی ایک عورت سے ان کا نکاح کردیا اور اسمٰعیل کی والدہ کی وفات بھی ہوگئی۔

حضرت اسمٰعیل کا نکاح ہوچکا تھا کہ حضرت ابراہیم (اپنی دعا کی) برکت کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لائے۔ باقی حصہ ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى کی تفسیر کے ذیل میں نقل کردیا ہے۔

رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں یعنی میں نے اپنی اولاد کو اس ویران وادی میں جہاں نہ کچھ کھانے کو ہے نہ آرام کا کوئی ذریعہ ہے صرف اس لئے رکھا ہے کہ وہ تیرے محترم گھر کے پاس نماز قائم کریں اپنا کو محترم ذکر کرنے سے اور درمیان میں لانے سے اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں اپنی اولاد کو رکھنے سے میرا مقصود صرف اقامت صلوٰۃ ہے اور میری دعا کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ ان کو نماز کی توفیق عطا فرمائے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ لیقیموا کا صیغہ ہے اس سے آپ کا مقصد تھا اولاد کے لئے اقامت صلوٰۃ کی دعا کرنا گویا آپ نے یہ لفظ کہہ کر اولاد کو اقامت نماز کا حکم بتا دیا اور اللہ سے دعا کی کہ ان کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ پس کچھ لوگوں کے دلوں کو بنا دے۔ من الناس میں من تبعیض کے لئے ہے یعنی کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف پھیر دے۔ مجاہد نے کہا اگر (بغیر من کے) اَفْئِدَةَ النَّاسِ فرماتے تو تمام فارس کا روم اور ترک کے ہم پر ہجوم کر آتے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا یہودی، عیسائی اور مجوسی بھی کعبہ کا حج کرنے لگتے مگر مِنَ النَّاسِ فرمایا اب صرف مسلمان ان کا حج کرتے ہیں۔

تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ کہ (شوق و محبت میں) ان کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھیں۔ سدی نے ترجمہ کیا کہ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف جھک جائیں۔

وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ اور کھانے کے لئے ان کو پھل عطا فرما امید ہے کہ وہ تیری نعمت کا شکر ادا کریں گے۔ یعنی باوجودیکہ یہ وادی ویران ہے جس میں کھیتی باڑی اور باغ نہیں ہیں مگر ان کو یہاں پھل عطا فرما جس طرح شاداب مقامات پر رہنے والوں کو تو عطا فرماتا ہے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمائی وادی کو پُرامن حرم بنا دیا یہاں ہر طرف سے پھل لائے جانے لگے یہاں تک کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں یہاں گرمی سردی اور ربیع و خریف کے پھل ملتے ہیں۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ اے ہمارے رب تو جو کچھ ہم چھپاتے رکھیں یا ظاہر کریں تو سب کو جانتا ہے یعنی ہمارے تمام احوال و مصالح سے واقف ہے اور ہم سے زیادہ ہم پر رحم کرنے والا ہے ہم کو دعا کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن ہم اپنی عبدیت و بندگی کا مظاہرہ کرنے کے لئے تجھ سے دعا کرتے ہیں اور اپنی احتیاج کا اظہار کرنے اور تیری رحمت کی طلب میں اور عجلت اختیار کرنے کی غرض سے تجھ سے سوال کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور مقاتلؒ کا قول ہے کہ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ سے مراد ہے حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑنے کا غم جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مَا نُعْلِنُ سے مراد ہے زاری اور تضرع اور مَا نُخْفِيْ سے مراد ہے غم جدائی۔

وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ اور اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے نہ زمین میں نہ آسمان میں وہ بالذات عالم ہے اس کے علم کی ہر چیز کی طرف نسبت برابر ہے۔ لہٰذا ہر چیز اس کو معلوم

ہے (ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کو معلوم ہو اور کوئی نامعلوم) اکثر علماء کے نزدیک یہ اللہ کا قول ہے بعض علماء اس کو حضرت ابراہیمؑ کے کلام کا جز قرار دیتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ تعریف ہے اس اللہ کو جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھ کو اسمٰعیل و اسحٰق (دونوں بیٹے) عطا فرمائے یعنی بڑھاپے کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا اس حالت میں اللہ نے اولاد عطا فرمائی یہ اللہ کی عظیم الشان نعمت اور شان قدرت ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب ابراہیمؑ کی عمر ننانوے سال کی تھی تو حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے اور ایک سو بارہ سال کی عمر میں حضرت اسحٰقؑ کی ولادت ہوئی۔ ابن جریر نے سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک سو سترہ سال کی عمر میں حضرت اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔

اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ میرا رب دعا کو خوب سننے والا ہے یعنی دعا قبول کرنے والا ہے۔ سَمِیْعٌ سَمِعَ الْمَلِكُ الْكَلَامَ بادشاہ نے بات سن لی یعنی بات کا اثر لے لیا۔ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب سے دعا کی تھی اور اولاد ہونے کی درخواست کی تھی اللہ نے وہ قبول فرمالی اور ناامیدی کی حالت میں نرینہ اولاد عطا کی۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖ اے میرے رب مجھے اور میری کچھ نسل کو نماز کا پابند بنا۔ اقامت صلوٰۃ نماز کو ارکان و آداب اور پابندی اوقات و شرائط کے ساتھ ہمیشہ ادا کرنا۔ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ میں مِنْ تبعیضی اس لئے ذکر کیا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آئندہ میری نسل میں کچھ کافر بھی ہوں گے کیونکہ اللہ نے فرما دیا تھا لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾ اے میرے رب اور میری دعا (یا عبادت) قبول فرما۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے امام احمد نے اور بخاری نے الادب میں اور چاروں اصحاب السنن نے اور ابن حبان نے اور حاکم نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے اور ابو یعلیٰ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے والدین کو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والدین مسلمان تھے آزر آپ کا چچا تھا اور تارخ آپ کے باپ کا نام تھا۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے چونکہ اَبٌ کا لفظ چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس لئے اگر وَالِدَیَّ کی جگہ اَبَوَیَّ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو خیال ہو سکتا کہ شاید حضرت نے آزر کے لئے بھی دعاء مغفرت کی تھی (باوجودیکہ آزر مشرک تھا اور مشرک نا قابل مغفرت ہے) اس خیال کو دفع کرنے کے لئے وَالِدَیَّ فرمایا یعنی حقیقی ماں اور حقیقی باپ۔ اور بالفرض اگر آزر کو (حقیقی) باپ مان بھی لیا جائے تو اس کے لئے دعاء مغفرت کی وجہ خود ہی اللہ نے بیان فرما دی ہے کہ ابراہیمؑ نے باپ کے لئے دعاء مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی کہ اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے اور بیزاری کا اظہار کر دیا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ۔

وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ اور (تمام) ایمان والوں کو جس روز حساب برپا ہو گا۔ برپا ہونے سے مراد ہے موجود ہونا یا ظاہر ہونا۔ یہ معنی قیام علی الرجل (پاؤں پر کھڑا ہونا) سے مستعار لیا گیا ہے محاورے میں بولا جاتا ہے قامت الحرب علی ساق "لڑائی اپنی پنڈلی پر کھڑی ہو گئی" (یعنی برپا ہو گئی) یا الحساب سے پہلے لفظ اہل محذوف ہے یعنی جس روز اہل حساب کھڑے ہوں گے جیسے آیت وَاسْئَلِ الْقَرْیَةَ اور بستی سے پوچھ لو یعنی بستی والوں سے بعض لوگوں نے کہا کہ کھڑے ہونے کی نسبت حساب کی طرف مجازی ہے (پہلی صورت میں مجاز فی الحذف ہو گا اور اس صورت میں مجاز فی الاسناد) یعنی لوگ

عذاب کے لئے تیار ہوں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۥ اور تم اللہ کو ظالموں کے عمل سے غافل نہ خیال کرنا۔ یعنی گو حقیقت سورہ کا ظاہر ہے خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے آپ تو اللہ کو غافل خیال ہی نہیں کر سکتے تھے یہ تو تم نہیں ہو سکتا تھا کہ معاذ اللہ کو غافل سمجھتے ہیں اس لئے آیت میں ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو اللہ کو واقف کل جانتے ہیں اسی خیال پر آپ جمے رہیں اور پختہ رہیں۔ اللہ ظالموں کے تمام احوال و افعال پر مطلع ہے اس سے ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں وہ ان کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی سزا دے گا۔

یا آیت میں خطاب عمومی ہے ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اللہ کی ذات و صفات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کو غافل خیال کرتا ہے جو اللہ کی طرف سے ڈھیل ملنے کو اللہ کی ناواقفیت پر محمول کرتا ہے بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں مظلوم کے لئے پیام تسلی اور ظالم کے لئے عذاب کی دھمکی ہے۔

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝ کیونکہ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی یعنی اس دن کے ہول سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی پلک نہ جھپکے گی یہ مطلب ہے کہ نظر اٹھی رہیں گی اور اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گی۔

مُهْطِعِيْنَ تیزی کے ساتھ بھاگ رہے ہوں گے یا ادھر ادھر منہ پھیر کر نہیں دیکھیں گے یہ جائیں گے کہ ان کے قدم سیدھے پڑ رہے ہیں۔ قتادہ نے کہا تیزی کے ساتھ بلانے والے کی طرف دوڑیں گے۔ مجاہد نے کہا ٹکٹکی باندھے ہوں گے برابر نظر جمائے ہوں گے۔ قاموس میں ہے ہَطَعَ (ماضی) هُطُوْعًا (مصدر) سامنے سے دوڑ کر آیا تیزی کے ساتھ آیا یا کسی چیز پر نظر جمائے رکھی نگاہ نہ ہٹائی۔ مُهْطِعٌ وہ شخص جو عاجزی کے ساتھ دیکھنے والا جو اپنی نظر کو نہ ہٹاتا ہو یا خاموشی کے ساتھ پکارنے والے کی آواز کی طرف جانے والا۔

مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ اپنے سر اوپر اٹھائے۔

قتیبی نے کہا مُقْنِع اس شخص کو کہتے ہیں جو سر اٹھائے اپنے سامنے دیکھ رہا ہو سامنے سے نظر نہ ہٹائے۔ حسن نے کہا قیامت کے دن لوگوں کے منہ آسمان کی طرف ہوں گے کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھے گا۔

لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ ان کی نظر ان کی طرف واپس نہیں آئے گی کہ اپنے آپ کو دیکھ سکیں بلکہ ٹکٹکی باندھے اوپر ہی کی طرف تکتے رہیں گے۔

وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝ اور ان کے دل بالکل بدحواس ہوں گے یعنی انتہائی دہشت اور حیرت کی وجہ سے ان کے دل علم و عقل سے خالی ہو جائیں گے۔ احمق آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے قلبُهٗ هواءٌ اس کا دل (فہم سمجھ اور قوت سے) خالی ہے (مطلب یہ کہ اس کا دماغ کھوکھلا ہے) قتادہ نے کہا ان کے دل سینوں سے نکلے نکلیں گے اور حلق میں آکر اٹک جائیں گے کہ نہ منہ سے باہر آئیں گے نہ اپنی جگہ پر لوٹیں گے۔ پس دل ہوا ہو جائیں گے یعنی ان کے اندر کچھ نہ ہوگا۔ آسمان و زمین کی درمیانی خلاء کو اسی وجہ سے ہوا کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا ان کے دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا بغوی نے لکھا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا۔ بغوی نے لکھا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ دل اپنی جگہ سے ہٹ چکے ہوں گے اور نظریں خیرہ اور اوپر کو اٹھی ہوئی ٹکٹکی باندھے تک رہی ہوں گی۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ اور (اے محمد ﷺ) لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس دن ان پر عذاب آجائے گا یعنی قیامت کے دن یا مرنے کے دن سے۔ مرنے کا دن بھی عذاب کا پہلا دن ہوگا مطلب یہ ہے کہ اس دن سے ڈراؤ جس روز ان کو مکمل تباہ کرنے اور جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے والا عذاب تباہی ہی آجائے گا۔

فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا پس ظالم یعنی وہ لوگ جنہوں نے شرک اور تکذیب رسول ﷺ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا تھا کہیں گے۔

رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اے ہمارے رب ہم کو (دنیا میں) مہلت دے دے یا یہ مطلب ہے کہ ہم کو دنیا میں لوٹا دے اور عذاب کو پیچھے کر دے۔

اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ تھوڑی مدت کے لئے، اور اتنی مدت ہم کو وہاں باقی رکھ کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں اور تیری دعوت کو قبول کر لیں۔

نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ ہم تیری دعوت قبول کر لیں اور تیرے پیغمبروں کی پیروی کریں۔ یہ امر کا جواب ہے اسی کی نظیر آیت لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ہے اس درخواست کا ان کو جواب دیا جائے گا۔

اَوَلَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۞ کیا اس سے پہلے (دنیا میں) تم نے قسمیں کھا کر یہ نہیں کہا تھا کہ ہم دنیا میں ہمیشہ رہیں گے ہم کو کبھی نہیں مرنا ہے شاید یہ الفاظ انہوں نے انتہائی غرور و تکبر کی حالت میں کہے ہوں یا قسم کھانے سے مراد ہے دلالت حال کی پختگی۔ انہوں نے مستحکم عمارتیں بنائی تھیں اور لمبی لمبی امیدیں باندھی تھیں جس سے (بدلالت التزامی) ثابت ہو رہا تھا کہ ان کو اپنے ہمیشہ رہنے کا یقین ہے۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ (زوال سے مراد ہے دار آخرت کی طرف منتقل ہو جانا) انہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ ہم کو دار آخرت کی طرف پہنچنا نہیں (قیامت نہیں ہوگی اور دوبارہ کوئی زندہ کر کے نہیں اٹھایا جائے گا) دوسری آیت میں یہی مضمون آیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ انہوں نے پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ جو مر جائے گا اس کو اللہ دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ اور جن لوگوں نے (کفر و معصیت کر کے) اپنے آپ پر خود ظلم کیا تھا (جیسے قوم نوح، عاد، ثمود وغیرہ) کیا ان کے گھروں میں ان کی جگہ پر تم نہیں رہ رہے تھے۔

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۞ اور (کیا ان کے آثار قدیمہ کا مشاہدہ کر کے اور ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی خبر سن کر) تم پر ظاہر نہ ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور (کیا) تمہاری عبرت کے لئے ہم نے (ان کے احوال کی) مثالیں (تم سے) بیان کر دی تھیں۔ یعنی کیا ہم نے پیغمبروں کی معرفت اور ان کی زبانی تم سے بیان کر دیا تھا کہ تم کفر یا استحقاق عذاب میں گزشتہ اقوام کی طرح ہو یا یہ مطلب کہ گزشتہ اقوام کے حالات، اعمال اور ان کے نتائج، وہ قدرت میں مشہور مثالوں کی طرح ہو گئے تھے تم سے بیان نہ کر دیئے تھے یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری سبق آموزی کے لئے ہم نے قرآن میں مثلیں تم سے بیان کر دی تھیں۔

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ اور انہوں نے اپنی سازشیں کیں یعنی کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو جلاوطن کرنے یا قید کر دینے یا قتل کر ڈالنے کی سازش کی۔ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک مکروا کی ضمیر فاعلی اور ضمیر هم دونوں کفار مکہ کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ یعنی کفار مکہ نے اپنی ہر تدبیر کر لی اور حق کو مٹانے اور باطل کو اٹھانے کی ہر کوشش جو کر سکتے تھے کر لی۔ اس تفسیر پر اس کلام کا سابق کلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ میرے نزدیک اس جملے کا عطف سَكَنْتُمْ پر ہے مَكَرُوْا کی ضمیر تو کفار مکہ کی طرف راجع ہے اور هم ضمیر الذین کی طرف لوٹ رہی ہے اور الذین سے مراد اقوام گزشتہ ہیں یعنی کفار مکہ نے بھی گزشتہ امتوں کے کافروں جیسے فریب کئے اور ان کی تدبیروں کی طرح سازشیں کیں۔

وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ اور اللہ کے پاس ان کا فریب (لکھا ہوا) موجود ہے وہ ان فریب کاریوں کی ان کو سزا دے گا یا یہ مطلب ہے کہ ان کی سازشوں اور مکاریوں کی سزا دینے کے لئے اللہ کے پاس بھی پوشیدہ تدبیر ہے جس سے ان

کی سازشوں کو بے حقیقت کر دے گا۔

وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۝ اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے
پہاڑ بھی ٹل جائیں۔ اِنْ نافیہ ہے اور لِتَزُولَ میں لام تاکید نفی کے لئے ہے اور "جبال" سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا معاملہ
اور قرآنی شریعت اور آیات خداوندی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر ایسا نہیں کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں یعنی نبوت محمدیہ اور احکام
الٰہیہ ان کی سازشوں سے باطل نہیں ہو سکتے، ان کی فریب کاریوں سے ان میں زوال آ سکتا ہے۔ یا اِنْ مخفف ہے مطلب یہ
ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور شریعت الٰہیہ اور احکام خداوندی جو پہاڑوں کی طرح پائیدار ہیں انہوں نے اپنی سازشوں سے
ان کو اکھاڑ دینا چاہا اور ارادہ کیا کہ فریب و مکر سے ان کی بیخ کنی کر دیں لیکن ایسا ناممکن ہے۔ حسن نے کہا ان کا مکر پہاڑوں کو ان کی جگہ
سے نہیں ہٹا سکتا۔ ابن جریج کی قرأت میں لِتَزُولَ کی جگہ لَتَزُولُ آیا ہے۔ اِنْ مخففہ ہے اور لام تاکید فصل کے لئے مطلب
یہ ہے کہ ان کا مکر بلاشبہ ایسا تھا کہ پہاڑ بھی اس کی وجہ سے اپنی جگہ چھوڑ کر ٹل جاتے۔ یہی مضمون ایک اور آیت میں آیا ہے۔
تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا۔

بغوی نے حضرت علیؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول نمرود کے حق میں ہوا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کی
ہستی کی بابت مناظرہ کیا تھا نمرود نے کہا اگر ابراہیمؑ کا قول سچا ہے تو میں آسمان تک پہنچ کر خود دیکھوں گا کہ وہاں کون ہے کیا ہے۔
چنانچہ آسمان تک چڑھنے کی یہ تدبیر کی، گدھ کے چار بچے لے کر ان کو پالا اور خوب فربہ کیا جب وہ جوان ہو گئے تو ایک
صندوق بنوایا اور جس کے دو دروازے قائم کئے۔ ایک بالائی جانب ایک نیچے کی طرف اور چار لکڑیاں لے کر صندوق کے ہر گوشہ
میں ایک ایک لکڑی کھڑی کر دی اور ہر لکڑی کی بالائی نوک پر گوشت کا ٹکڑا باندھ دیا پھر صندوق کو گدھوں کی ٹانگوں سے باندھ دیا
(صندوق نیچے گدھ اوپر اور لکڑیوں میں گوشت بندھا اور گدھوں کے اوپر) اس کے بعد نمرود ایک آدمی کو ساتھ لے کر صندوق میں
بیٹھ گیا اور گدھوں کو اڑایا، گدھ اڑے اور گوشت حاصل کرنے کے لئے اوپر اٹھتے گئے (جتنا اوپر اٹھتے تھے گوشت لکڑیوں میں بندھا
ہوا ان کے اوپر ہی رہتا تھا اور گدھوں کی رسائی گوشت تک نہیں ہوتی تھی) اس طرح اوپر چڑھتے رہے اور دور ہوا میں پہنچ گئے۔
ایک روز گزر گیا تو نمرود نے ساتھی سے کہا اوپر کا دروازہ کھول کر دیکھو آسمان قریب آگیا یا نہیں ساتھی نے دروازہ کھول کر دیکھا
اور بولا آسمان تو ویسا (ہی دور) ہے جیسا پہلے تھا۔ نمرود نے کہا اب نیچے کا دروازہ کھول کر دیکھو ساتھی نے نیچے کا دروازہ کھول کر
دیکھا اور کہا زمین ایک تالاب کی طرح اور پہاڑ دھوئیں کی مانند دکھائی دے رہے ہیں۔ غرض گدھ اڑتے اور اوپر کو اٹھتے رہے
یہاں تک کہ ایک دن اور گزر گیا اور اب خلا گدھوں کی اڑان میں رکاوٹ پیدا کرنے لگی نمرود نے ساتھی سے کہا اب دونوں
دروازے کھول کر دیکھو اوپر کا دروازہ کھولا تو آسمان ویسا ہی اپنی ہیئت پر نظر آیا اور نیچے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو زمین کی جگہ صرف
ایک تیرہ سیاہی نظر آئی اور (غیب سے) ندا آئی باغی تو کہاں جانا چاہتا ہے۔ عکرمہ کا بیان ہے نمرود کے ساتھ تابوت میں ایک
غلام بھی تیر کمان لئے موجود تھا غلام نے (اوپر کی جانب) تیر پھینکا تیر خون آلودہ ہو کر لوٹ آیا کوئی مچھلی (بحکم خداوندی)
سمندر سے تڑپ کر خلا میں پہنچ گئی تھی اسی کے خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ بعض نے کہا کسی پرندے کے خون سے آلودہ ہو گیا تھا
نمرود نے کہا آسمان والے خدا کے کام سے تو میں فارغ ہو گیا پھر ساتھی کو حکم دیا اب (ستون والی) لکڑیوں کو الٹ دو اوپر کا رخ
نیچے کی طرف کر دو۔ ساتھی نے حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح گوشت نیچے کی طرف ہو گیا اور گدھ گوشت کو نیچے کی طرف دیکھ کر
نیچے اترنے لگے۔ پہاڑوں نے صندوق اور گدھوں کی سرسراہٹ سنی تو خوف زدہ ہو گئے ان کا خیال ہوا کہ آسمان سے کوئی نئی
مصیبت آگئی اور قیامت برپا ہو گئی۔ خوف زدہ ہو کر قریب تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ یہی مفہوم ہے آیت وَإِنْ كَانَ
مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ کا (حضرت مفسر نے فرمایا کہ) یہ روایت عقل و درایت کے بھی خلاف ہے اور نقل صحیح کے
بھی۔

؎ آیت میں تو وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ ہے لیکن اس روایت میں "کان" کی جگہ "کاد" ہے یعنی نقل کا سہو قلم ہے

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۔ پس آپ یہ خیال بھی نہ کرنا کہ اللہ نے جو وعدہ اپنے پیغمبروں سے ان کی نصرت اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کا کیا ہے وہ اس کے خلاف کرنے والا ہے۔ اللہ نے اپنے پیغمبروں کی نصرت کا وعدہ ایک اور آیت میں بھی فرمایا ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا اور پیغمبروں کو غالب کرنے اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کے متعلق فرمایا ہے لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۔ وعدہ کو رُسُلَهٗ سے پہلے ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ وعدہ خلافی کرتا ہی نہیں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ اور جو کسی سے وعدہ خلافی نہیں کرتا تو پیغمبروں سے جو وعدہ کیا ہے اس کے خلاف کیسے کر سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ۔ بلاشبہ یہ بات ہے کہ اللہ غالب ہے اس کے مقابلے میں کوئی تدبیر نہیں کی جا سکتی وہ ایسا قادر ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

ذُو انْتِقَامٍ ۔ (اپنے دوستوں کی خاطر دشمنوں سے) انتقام لینے والا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ۔ جس روز دوسری زمین بدل دی جائے گی اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی۔ يَوْمَ تُبَدَّلُ، يَوْمَ يَأْتِيْهِمُ سے بدل ہے یا انتقام کا مفعول فیہ ہے یا اُذْكُرْ محذوف کا مفعول ہے اور السَّمٰوٰتُ کا عطف الْاَرْضُ پر ہے۔

تبدیل دو طرح کی ہوتی ہے ایک تبدیل ذاتی یعنی ایک شئ کی بجائے دوسری چیز لے آئی جائے جیسے میں نے درہم کو دینار سے بدل دیا اور درہم دے کر دینار لے لیا اللہ نے فرمایا ہے بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ہم ان کی کھالوں کی جگہ دوسری کھالیں دے دیں گے (۲) تبدیل وصفی (یعنی اصل شئ تو باقی رکھی جائے اس کی حالت شکل وغیرہ بدل دی جائے) جیسے بَدَّلْتُ الْحَلْقَةَ خَاتَمًا میں نے چھلا بدل کر انگوٹھی بنا دی یعنی چھلے کو پگھلا کر انگوٹھی کی شکل بنا دی۔ چھلے کی شکل کو انگوٹھی کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ کا قول اس آیت کی تشریح کے ذیل میں نقل کیا ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا زمین بدل کر ایسی زمین کر دی جائے گی جو چاندی کی طرح ہوگی جس پر نہ حرام خون بہایا گیا ہے نہ کوئی اور گناہ کیا گیا ہوگا۔ بیہقی نے یہ حدیث مرفوعاً بھی بیان کی ہے یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول نہیں ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں اور موقوفاً بھی یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول بھی قرار دیا ہے اور موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ میں کہتا ہوں اس جگہ موقوف حدیث بھی مرفوع کی طرح ہے۔ (واقعات قیامت کا بیان اجتہاد وفکر ورائے سے کوئی صحابی نہیں کر سکتا کہ جس میں غلطی کا امکان ہو سکے۔ مبدء و معاد اللہ کی ذات، نبوت، جنت، دوزخ اور مستقبل کے سلسلے میں جو اقوال کسی صحابی کی طرف منسوب ہیں وہ یقیناً صحابی کے خود ساختہ نہیں ضرور رسول اللہ ﷺ سے سنے ہوئے ہیں احتیاطاً کسی اور وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کی نسبت نہیں کی گئی پس تبدیل ارض و سماء کے سلسلے میں جو حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے وہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ مترجم)

ایک دوسری سند سے ابن جریر و حاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا یہ زمین بدل کر سفید زمین ہو جائے گی جیسے خالص چاندی۔ احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ایوبؓ کی روایت سے اور (صرف) ابن جریر نے حضرت انسؓ کی روایت سے (موقوفاً) بیان کیا، قیامت کے دن اللہ اس زمین کو چاندی کی ایسی زمین سے بدل دے گا جس پر گناہ نہیں کیا گیا ہوگا۔ ابن جریر نے ابو حمزہ کے سلسلے سے حضرت زید کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا یہ زمین چاندی کی طرح سفید ہو جائے گی۔ ابن ابی الدنیا نے صفۃ الجنۃ میں حضرت علیؓ کی روایت سے اس آیت کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا کہ (حضرت علیؓ نے فرمایا) زمین چاندی کی ہوگی اور آسمان سونے کا۔ ابن جریر نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ زمین ایسی ہوگی جیسے چاندی اور آسمان بھی ایسا ہی ہوگا۔ عبد بن حمید نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے، عکرمہ نے کہا ہم کو

بیہ (روایت) آئی ہے کہ یہ زمین لپیٹ دی جائے گی اور اس کے برابر ایک دوسری زمین ہوگی۔ اس زمین سے اس زمین کی طرف لوگوں کو لے جا کر جمع کیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت آئی ہے، حضرت سہلؓ نے فرمایا کہ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے: قیامت کے دن لوگوں کو ایک سفید زمین پر جمع کیا جائے گا جس کا رنگ خاکستری (سفیدی آمیز میالا) ہوگا اور چھنے ہوئے آٹے کی ٹکیہ کی طرح (ہموار و ہم رنگ) ہوگی جس میں کسی کی کوئی (علامت، منارہ، گنبد وغیرہ غرض کوئی) نشانی نہ ہوگی۔ بیہقی نے بسند سدی صغیر بحوالہ کلبی از ابوصالح اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس میں کمی بیشی کر دی جائے گی ٹیلے، پہاڑ، وادیاں، درخت اور جو کچھ اس زمین میں ہے ختم کر دیا جائے گا اور عکاظ کے چمڑے کی طرح اس کو کھینچ کر پھیلایا جائے گا وہ چاندی کی طرح ایک سفید زمین ہوگی جس پر کوئی خون نہیں بہایا جائے گا اور نہ کوئی گناہ کیا گیا ہوگا اور آسمانوں کے سورج چاند ستارے ختم کر دیئے جائیں گے۔

حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو چمڑے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور سب مخلوق کو (اس پر) جمع کیا جائے گا۔

حاکم نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن چمڑے کے کھینچنے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا پھر کسی آدمی کے لئے قدموں کے رکھنے سے زیادہ جگہ نہ ہوگی پھر سب سے پہلے مجھے پکارا جائے گا اور میں سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھے اجازت ملے گی تو اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں گا اور عرض کروں گا اے میرے رب! یہ جبرئیل ہیں (حضرت جبرئیل اس وقت رحمان کے داہنی جانب ہوں گے اور جبرئیل نے اس سے پہلے رحمٰن کو کبھی نہ دیکھا ہوگا) انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ آپ نے ان کو میرے پاس بھیجا تھا، جبرئیل خاموش ہوں گے کوئی بات نہیں کریں گے اللہ فرمائے گا اس نے سچ کہا تھا پھر اللہ مجھے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تیرے بندے زمین کے تمام اطراف میں ہیں۔ یہی مقام محمود ہوگا (اللہ کی حمد کرنے کا مقام جس پر قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کو فائز کیا جائے گا۔)

صحیحین میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن زمین ایک روٹی ہوگی جو اللہ اپنے ہاتھ سے اہل جنت کی مہمانی کے لئے تیار کرے گا جیسے تم لوگ سفر کے لئے اپنی روٹی تیار کرتے ہو (اس حدیث میں نُزُلًا لِأَهْلِ الْجَنَّةِ کا لفظ آیا ہم نے نزل کا ترجمہ مہمانی کیا ہے خواہ مہمان کے لئے تیار کیا ہوا کھانا یا کوئی اور چیز جو کھانے کے لئے کھانے سے پہلے پیش کی جائے) اور نووی نے کہا نزل اس چیز کو کہتے ہیں جو طعام مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کی جاتی ہے مراد یہ ہے کہ اہل جنت کو جنت میں پہنچنے تک مختلف مواقف و مقامات پر بطور نزل زمین کی روٹی پیش کی جائے گی اور آخر وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔

اسی طرح ابن مرجان نے الارشاد میں بیان کیا ہے کہ زمین بدل کر ایک روٹی کر دی جائے گی (جس کو) مؤمن اپنے قدموں کے درمیان سے اٹھا کر کھائے گا اور حوض (غالباً کوثر یا تسنیم) کا پانی پیے گا۔ ابن حجر نے لکھا ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ میدان حشر کے سارے مواقف کی پوری مدت میں مؤمنوں کو بھوک کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ اللہ اپنی قدرت سے زمین کی فطرت بدل دے گا کہ اللہ کی مشیت کے مطابق مؤمن اپنے قدموں کے نیچے سے بغیر کمائی اور تکلیف کے اٹھا کر روٹی کھائیں گے اسی کی تائید کرتا ہے سعید بن جبیرؒ کا وہ قول جو ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ زمین سفید روٹی ہو جائے گی جو مؤمن اپنے قدموں کے نیچے سے اٹھا کر کھائے گا اسی طرح کا محمد بن کعب کا قول بھی مروی ہے بیہقی نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین بدل کر سفید مثل روٹی کے ہو جائے گی جس کو اہل اسلام حساب سے فراغت کے وقت تک کھاتے رہیں گے۔ امام ابو جعفر یعنی امام باقر کا قول بھی روایت میں اسی طرح آیا ہے۔

خطیب نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر ایسی حالت میں ہوگا کہ بہت زیادہ

بھوکے ہوں گے ایسے بھوکے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بہت زیادہ پیاسے ہوں گے ایسے پیاسے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بالکل برہنہ ہوں گے کبھی ایسے ننگے نہ رہے ہوں گے اور ایسے تھکے ہوئے ہوں گے کہ کبھی ایسے نہ تھکے ہوں گے۔ پس جس نے دنیا میں اللہ کے لئے کھانا کھلایا ہوگا اللہ اس روز اس کو کھانا کھلائے گا اور جس نے اللہ کے لئے پانی پلایا ہوگا اللہ اس کو پانی پلائے گا اور جس نے اللہ کے واسطے لباس پہنایا ہوگا اللہ اس کو لباس پہنائے گا اور جس نے (اللہ کے لئے) کوئی عمل کیا ہوگا اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

ابن جریر نے محمد بن کعب کا قول اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ابن کعب نے کہا آسمان باغ ہو جائیں گے اور سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی اور زمین تبدیل کر کے کچھ اور کر دی جائے گی۔ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک قول آیا ہے کہ قیامت کے دن ساری زمین آگ ہو جائے گی۔ کعب احبار کا قول ہے کہ سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی۔

مسلم نے حضرت ثوبان کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک یہودی عالم نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر دریافت کیا جس روز زمین دوسری زمین میں تبدیل کر دی جائے گی اس روز لوگ کہاں ہوں گے حضور ﷺ نے فرمایا پل سے ورے تاریکی میں۔

مسلم نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے ام المؤمنین نے فرمایا، میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ بیان فرمایئے کہ جس روز زمین تبدیل کر دی جائے گی تو لوگ کہاں ہوں گے فرمایا صراط پر۔ بیہقی نے کہا اس حدیث میں صراط کا لفظ بطور مجاز استعمال کیا گیا ہے چونکہ لوگوں کو (اسکے بعد) صراط سے گزرنا ہوگا اس لئے بطور مجاز صراط پر ہونے کی صراحت فرمائی اب حضرت ثوبان کی روایت سے اس روایت کی مطابقت ہو جائے گی ثوبان کی روایت میں پل سے ورے تاریکی میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی ہے کہ تبدیل ارضی یعنی اس زمین سے منتقل ہو کر ارض موقف پر پہنچنا توجہ (جھڑکی یا جھنجوڑ) کے وقت ہو گا (تبدیل صراط پر پہنچنے سے پہلے ہوگا)

بیہقی نے حضرت ابی بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً کی تشریح میں آپ نے فرمایا دونوں خاک ہو جائیں گے جو کافروں کے چہروں پر پڑے گی مومنوں کے چہروں پر نہیں پڑے گی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ کا یہی مطلب ہے کافروں کے چہروں پر اس روز خاک ہوگی جن پر سیاہی چھا رہی ہو گی۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ قدماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ کیا تبدیلی ارض سے مراد صرف تبدیلی اوصاف (احوال، رنگ، ہیئت وغیرہ) ہے یا تبدیلی ذات بھی ہو جائے گی مؤخر الذکر قول کو ابن ابی حمزہ نے ترجیح دی ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ دنیا کی زمین نابود ہو جائے گی اور موقف قیامت کی نئی زمین پیدا کی جائے گی۔

شیخ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ تبدیلی ارض کی احادیث اور زمین کو کھینچ کر پھیلانے اور اس میں کمی بیشی کرنے کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ یہ سارے حوادث ارض دنیا پر واقع ہوں گے اور موقف کی زمین اس کے علاوہ ہوگی تو ایک جھڑکی سے سب لوگ یہاں سے نکل کر ارض محشر میں پہنچ جائیں گے۔

ابن حجرؒ نے لکھا ہے اسی طرح ان احادیث میں بھی باہم منافات نہیں جن میں سے کسی میں زمین کا روٹی ہو جانا اور کسی میں خاک ہو جانا اور کسی میں آگ ہو جانا آیا ہے کچھ زمین روٹی بن جائے گی کچھ خاک ہو جائے گی اور سمندر کی زمین آگ ہو جائے گی۔ حضرت ابی بن کعب کا اثر اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

(حضرت مفسر نے فرمایا) میں کہتا ہوں کہ مومنوں کے قدموں کے نیچے کی زمین روٹی بن جائے گی اور کافروں کے قدموں کے نیچے کی زمین خاک اور آگ ہو جائے گی۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ صاحب افصاح نے ان تمام متضاد احادیث کا تعارض دور کرنے کیلئے کہا ہے کہ زمین و آسمان کی تبدیلی دو مرتبہ ہوگی، پہلی مرتبہ نفخۂ صعق (پہلی مرتبہ صور پھونکنے) سے پہلے ہو گی کہ ستارے جھڑ جائیں گے چاند اور سورج بے نور ہو جائیں گے، آسمان تانبے کی طرح سرخ ہو جائے گا اس کا پوست اتار لیا جائے

گا، پہاڑ اڑتے اڑتے پھریں گے، سمندر آگ ہو جائیں گے، زمین میں لرزہ پیدا ہو جائے گا اور وہ پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اس کی ہیئت ہی بدل جائے گی پھر پہلا صور پھونکا جائے گا تو آسمان لپیٹ دیئے جائیں گے آسمان بدل کر دوسرا آسمان ہو جائے گا اور زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور بیابانی دوبارہ کر دیا جائے گا جیسے وہ پہلے تھی اس کے اندر قبریں ہوں گی جن کے اندر مردے ہوں گے۔

پھر (دوبارہ صور پھونکے جانے پر) زمین میں دوسری تبدیلی ہو گی یہ اس وقت ہو گا جب لوگ میدان حشر میں کھڑے ہوں گے اسی حالت میں وہ زمین جس کو ساہرہ کہا جائے گا اور اس پر حساب فہمی ہو گی بدل دیا جائے گا۔ اس وقت زمین چاندی کی ہو گی، سفید جاگستری رنگ ہو گا جس پر نہ خونریزی کی گئی ہو گی نہ کوئی گناہ کیا گیا ہو گا۔ اس تبدیلی کے وقت لوگ صراط پر کھڑے ہوں گے اور سب اس میں سما جائیں گے جو بچیں گے وہ جہنم کے پل پر کھڑے ہوں گے۔ دوزخ اس وقت مجسمہ ہو گی۔ حضرت عبداللہ کی روایت میں آیا ہے کہ زمین آگ ہو جائے گی اس سے یہی مراد ہے جب لوگ صراط سے گزر جائیں گے اور (مومن) انبیاء کے حوضوں پر پہنچ کر قیام کریں گے اور حیاض انبیاء کا پانی پئیں گے تو زمین روٹی کی ایک ٹکیہ بنا دی جائے گی جو جنت میں جانے والے ہوں گے وہ سب اس روٹی میں سے کھائیں گے۔ جنت کے بیل کے جگر یا مچھلی کی جگر ان کا کھانے کے لئے سالن ہو گا۔

طبرانی نے الاوسط میں اور ابن عدی نے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن سوائے مسجدوں کے سب زمین نابود ہو جائے گی مساجد کو باہم ملا دیا جائے گا (یعنی تمام مساجد یکجا جمع کر دی جائیں گی)

میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ثابت ہو جائے تو شاید سب مساجد کی زمین جنت کی زمین بنا دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین واحمد والنسائی عن عبداللہ بن زید فی الصحیحین والترمذی عن ابی ہریرۃ۔

وَبَرَزُوا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ اور (قبروں سے نکل کر حساب فہمی اور جزا و سزا پانے کے لئے) ایک غالب اللہ کے سامنے آئیں گے۔ واحد قہار دو صفتیں ذکر کرنے سے یہ بات بتانی ہے کہ معاملہ بہت سخت ہو گا۔ ایسے خدا کی پیشی ہو گی جو سب پر غالب ہے جس سے مقابلہ ممکن نہیں نہ اس کے سوا کہیں پناہ کی جگہ ہو گی نہ فریاد کا مقام۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝ اور اس روز تم مجرموں یعنی کافروں کو طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا دیکھو گے سب باہم ایک ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے عقائد و اعمال کی مشارکت کی وجہ سے ایک ساتھ زنجیروں میں گرفتار بھی ہوں گے۔ سعید بن منصور نے حضرت عمر بن خطابؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نیک آدمی کو نیک آدمی کے ساتھ جنت میں اور بد آدمی کو بد آدمی کے ساتھ دوزخ میں ملا دیا جائے گا یا یہ مراد ہے کہ شیطانوں کے ساتھ ان کو ملا دیا جائے گا یا یہ مطلب ہے کہ باطل عقائد اور بد پرست اعمال جو دنیا میں ان کے تھے انہی کے ساتھ ان کا جوڑ لگا دیا جائے گا یا ہاتھوں اور پاؤں کو گردنوں سے ملا کر زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا۔

اصفاد جمع صفد واحد بیڑیاں، ہتھکڑیاں اور طوق۔ صفدتہ میں نے اسکو خوب مضبوطی کے ساتھ زنجیروں میں جکڑ دیا۔

سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ ان کے کرتے قطران (تارکول وغیرہ) کے ہوں گے ابہل کا نچوڑا ہوا عرق جو آگ پر پکایا جائے قطران کہلاتا ہے یہ سیاہ بدبودار ہوتا ہے خارشی اونٹوں کے بدن پر ملا جاتا ہے یہ اتنا تیز ہوتا ہے کہ تیزی کی وجہ سے خارشت کو جلا دیتا ہے۔ یہ بہت جلد آگ پکڑ لیتا ہے دوزخیوں کے بدن پر اس کو ملا جائے گا اور اس کا دوزخیوں کے جسم پر لیپ بجائے کرتے کے ہو جائے گا۔

عکرمہ اور یعقوب کی روایت میں من قطر آن آیا ہے قطر کا معنی ہے پگھلا ہوا تانبا اور آن کا معنی انتہائی (اصل میں آنی تھا) کھولتا ابلتا ہوا۔

وَتَغْشٰى وُجُوهَهُمُ النَّارُ ۝ اور آگ ان کے چہروں پر چھائی ہو گی ظاہری اعضاء میں چہرہ مقدم حیثیت رکھتا

ہے اسی لئے خصوصیت کے ساتھ چہروں کا ذکر کیا جس طرح باطنی اعضاء میں دل کی حیثیت ممتاز ہے اور اسی لئے اتباع کی وجہ سے تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ فرمایا ہے یاں کہا جائے کہ جب انہوں نے حق کی طرف اپنا رخ نہیں کیا اور دماغی قوائے سے غور کا کام نہیں لیا باوجودیکہ آلات شعور وادراک کی تخلیق کی غرض ہی یہ تھی کہ حق پر غور کرنے کا کام ان سے لیا جائے اس لئے قیامت کے دن ان کے چہروں پر آگ چھا جائے گی اور چونکہ ان کے دل ایمان معرفت سے خالی اور جہالتوں سے پُر تھے اسی لئے آگ ان کے دلوں کو چھا لے گی۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ تاکہ جس شخص نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ اللہ اس کو دے دے۔ کُل نفس سے مراد ہے مجرم شخص یا عام آدمی یعنی مراد ہو سکتا ہے۔ فرماں بردار ہو یا نافرمان۔ کیونکہ مجرموں کو سزا دینے کا جب اظہار کر دیا گیا تو اطاعت گزاروں کو اطاعت کا ثواب دیا جانا معلوم ہی ہو گیا اول صورت میں لیجزی کا تعلق مقرنین یا تغشٰی وغیرہ سے ہو گا اور دوسری صورت میں اسکا تعلق فَبَرَزُوْا سے ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝ بے شک اللہ بہت تیز حساب لینے والا ہے۔ بیضاوی نے کہا یعنی ایک سے حساب فہمی اس کو دوسرے کی حساب فہمی سے نہیں روکتی (ایک ہی وقت میں سب کا حساب لے لے گا) بغوی نے جا لکھا ہے میں یہ بھی لکھا ہے کہ آدھے دن یعنی اس دنیوی دن کی نصف مدت میں سب کی حساب فہمی کرے گا اسکا ثبوت حدیث سے ملتا ہے یعنی کا بیان ہے وہ لوگ (غالباً صحابہؓ) خیال کرتے تھے کہ قیامت کے دن اللہ لوگوں کے حساب سے آدھے دن کی مدت میں فارغ ہو جائے گا یہاں تک کہ ایک فریق جنت اور دوسرا فریق دوزخ میں قیلولہ کرے گا (دوپہر گزارے گا) رواہ ابو نعیم وابن المبارک۔

ابن ابی حاتم اور ابن مبارک نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اس دن کا آدھا حصہ گزرنے نہ پائے گا کہ یہ (جنت والے جنت میں) اور وہ (دوزخ والے دوزخ میں) قیلولہ کریں گے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس کے بعد (قیلولہ کرنے کے ثبوت میں) یہ آیات تلاوت فرمائیں اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ثُمَّ اِنَّ مَقِيْلَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ (اول آیت میں اہل جنت کے قیلولہ کا بیان ہے اور دوسری آیت میں دوزخیوں کے قیلولہ کا۔)

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ صرف دوپہر تک کا وقت ہو گا پھر اولیاء اللہ (جنت کے اندر) آنکھوں والی حوروں کے ساتھ مسہریوں پر (دوپہر گزاریں گے یعنی) قیلولہ کریں گے اور اللہ کے دشمن شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے میں کہتا ہوں مذکورہ بالا اقوال صحابہؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھے دن سے مراد ہے آخرت کا آدھا دن (اس سے دنیوی دن کا آدھا حصہ مراد نہیں ہے)

هٰذَا یعنی قرآن یا سورت یا سورت کے اندر آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ سے جو مضامین درج ہے۔

بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ لوگوں کی نصیحت کے لئے کافی ہے (یعنی پوری نصیحت ہے)

وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝

اور تاکہ اس کے ذریعہ عذاب سے ڈرائے جائیں اور تاکہ اس بات کا یقین کر لیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانش مند لوگ نصیحت حاصل کریں جس عذاب قیامت سے ان کو ڈرایا جائے گا اور وہ ڈر جائیں گے تو یہ خوف ان کو غور و فکر کرنے پر آمادہ کرے گا اور غور و تامل کے بعد وہ آیات درخشاں ان کے سامنے آجائیں گی جو اللہ کی توحید کو ثابت کرنے والی ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اللہ کو واحد لاشریک مان لیں گے اور تسلیم توحید کے بعد اللہ کی نافرمانی سے رک جائیں گے۔

ان آیات میں اللہ نے بلاغ قرآنی کے تین فائدے بیان فرمائے تمام آسمانی کتابیں نازل ہونے کی یہی تین حکمتیں ہیں:

(۱) پیغمبروں کے ذریعہ سے لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرنا تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔

(۲) انسان کی قوت فکریہ کی تکمیل قوت فکریہ کا انتہائی کمال اعتراف توحید ہے۔

(۳) قوت عملیہ کی درستی جو نصیحت پذیری اور اختیار تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔

سورۃ الحجر

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ۹۹ آیات اور چھ ۶ رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ① الٓرٰ یہ آیتیں ہیں کامل کتاب اور واضح قرآن کی۔ تلک سے سورت کی آیات کی طرف اشارہ ہے الکتاب سے مراد سورت ہے یا قرآن۔ قرآنا کی تنوین اظہار عظمت کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب کی آیات ہیں جو کامل کتاب بھی ہے اور عربی قرآن بھی ہے حلال کو حرام سے جدا کرنے والا اور ہدایت و گمراہی کو کھول کر بیان کر دینے والا۔

﴿...... چودھواں پارہ شروع ......﴾

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ② کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے۔ لفظ رُبَّ اصل میں قلت کے لئے آتا ہے لیکن اس جگہ مجازاً اظہار کثرت کے لئے آیا ہے تقلیل و تکثیر میں علاقہ تضاد ہے یا اس بات پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اگر ان کو اسلام سے کچھ بھی مودت ہوتی خواہ ایک ہی بار ہوتی تو ضرور جلد از جلد اسلام کے دائرے میں آجاتے پس جب ان کو اسلام کی مودت بہت زیادہ ہے تو پھر کفر پر قائم رہنا تعجب انگیز ہے یا تکثیر سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کی مودت ان کے دلوں میں اتنی زیادہ ہو گئی ہے جو ناقابل بیان ہے پس قلت کا دعویٰ اس کے لئے کافی ہے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک رُبَّ اس جگہ اظہار قلت کے لئے ہی ہے کیونکہ قیامت کی ہولناکیاں ان کو دہشت زدہ بنا دینے والی ہوں گی اگر کسی وقت کچھ ہوش ہو گا تو مسلمان ہونے کی تمنا کریں گے۔

رُبَمَا میں ما کافہ ہے اس نے فعل پر داخل ہونا جائز کر دیا (ورنہ رُبَّ حرف جر ہے جو صرف اسم پر داخل ہوتا ہے) مناسب تو یہ تھا کہ اس کے بعد فعل ماضی آتا لیکن اللہ کے بیان میں آئندہ ہونے والا واقعہ بھی گزشتہ کی طرح یقینی ہوتا ہے اس لئے ماضی کی جگہ مضارع کو استعمال کیا ماضی ہی کی طرح۔ ابن جریر، ابن مبارک اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ سے متفق بیان کیا کہ ان دونوں حضرات نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ جب دوزخ کے اندر مشرک اور ان کے ساتھ مسلمانوں کو جمع کرے گا تو مشرک مسلمانوں سے کہیں گے تم کو بھی تمہارے اعمال کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے اس پر اللہ ناراض ہو کر مسلمانوں کو دوزخ سے باہر نکال دے گا (رہا کر دے گا بخش دے گا) ہناد، سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ شفاعت قبول فرما کر مسلمانوں کو جنت میں داخل فرمائے گا اور شفاعت کے بعد رحم فرمائے گا یہاں تک کہ فرمائے گا جو بھی مسلمان ہو جنت میں چلا جائے (اس وقت کافر تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے) آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کا یہی مطلب ہے۔

طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور وہ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے اور جتنی مدت اللہ چاہے گا وہاں رہیں گے پھر دوزخ کے اندر مشرک ان کو طعنہ دیں گے کہ تم جو تصدیق کرتے تھے اور ایمان لائے تھے اس سے تم کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس پر اللہ ان کو دوزخ سے نکال لے گا کوئی موحد آگ کے اندر نہیں رہے گا۔ یہ فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ تلاوت فرمائی۔ طبرانی، ابن عاصم اور بیہقی نے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دوزخی دوزخ میں جمع ہو جائیں گے اور حسب مشیت خداوندی ان کے ساتھ کچھ اہل قبلہ بھی ہوں گے تو کافر مسلمانوں سے کہیں گے کیا تم مسلمان نہ تھے۔ مسلمان کہیں گے تھے کیوں نہیں۔ کافر کہیں گے تو اسلام سے تم کو کیا فائدہ ہوا۔ تم بھی ہمارے ساتھ دوزخ میں آگئے تو مسلمان کہیں گے ہمارے کچھ گناہ تھے جن کی وجہ سے اللہ نے ہم کو پکڑ لیا۔ یہ سن کر اللہ حکم دے گا کہ اہل قبلہ میں سے جو بھی دوزخ کے اندر ہو اس کو نکال لیا جائے چنانچہ سب مسلمان نکال لئے جائیں گے دوزخی کافر جب یہ بات دیکھیں گے تو کہیں گے کاش ہم بھی مسلمان ہوتے تو ہم کو بھی ان (مسلمانوں) کی طرح نکال لیا جاتا پھر حضور ﷺ نے آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ تلاوت فرمائی۔

بغوی کی روایت میں اس حدیث میں اتنا زائد آیا ہے کہ اللہ ہر اہل قبلہ کے نکالنے کا حکم دے گا اور سب کو نکال لیا جائے گا اس وقت کافر تمنا کریں گے کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔

طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے دریافت کیا گیا۔ آپ نے کیا اس آیت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کو کچھ فرماتے سنا ہے۔ فرمایا میں نے سنا ہے حضور ﷺ فرما رہے تھے انتقام لینے کے بعد اللہ دوزخ سے اپنی مشیت کے موافق مومنوں کو نکال لے گا (لیکن شروع میں) جب مشرکوں کے ساتھ ان مسلمانوں کو دوزخ کے اندر اللہ داخل فرما دے گا تو مشرک کہیں گے تم تو دنیا میں دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ کے دوست ہیں پھر آج ہمارے ساتھ دوزخ میں کیوں ہو۔ یہ بات سماعت فرمانے کے بعد اللہ شفاعت کی اجازت دے دے گا اور فرشتے اور انبیاء اور مومن شفاعت کریں گے یہاں تک کہ ان گناہگار مسلمانوں کو دوزخ سے بحکم خدا نکال لیا جائے گا۔ مشرک یہ بات دیکھ کر کہیں گے کاش ہم بھی تمہاری طرح ہوتے اور تمہاری طرح ہماری بھی شفاعت ہو جاتی۔ ان (رہا شدہ) مسلمانوں کے چہرے چونکہ سیاہ ہوں گے اس لئے (مسلمان ان کو) جہنمی کہیں گے ان کا نام جہنمی پڑ جائے گا۔ لیکن وہ اللہ سے دعا کریں گے اے ہمارے رب ہم سے یہ نام الگ کر دے اللہ حکم دے گا تو نہر حیات میں غسل کریں گے۔ غسل کے بعد ان کے چہرے گورے چمکدار ہو جائیں گے اور یہ نام (یا خطاب) ان کا ختم ہو جائے گا۔

ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ (کافروں کی تمنا) اس وقت ہو گی جب گناہگار مسلمانوں کو دوزخ سے نکالا جا رہا ہو گا ہناد نے اس آیت کے ذیل میں مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اس وقت لا الٰہ الا اللہ کا ہر قائل (یعنی ہر مسلمان) دوزخ سے نکل آئے گا۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۳﴾ (اے محمد ﷺ) آپ ان (کافروں) کو رہنے دیجئے کہ کھائیں اور (دنیا کے) مزے اڑائیں اور (آخرت کی تیاری سے) ان کو (طول زندگی کی) امید روکے رہے (جب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو) اپنی بدانجامی ان کو خود معلوم ہو جائے گی۔

اس کلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ کافروں کے ایمان لانے سے آپ ناامید ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ اللہ کے علم میں ان کافروں کی شقاوت لکھی ہوئی ہے اگرچہ اللہ نے ان کو نصیحت کی ہے مگر یہ ایمان نہیں لائیں گے نصیحت سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ آیت میں اتمام حجت بھی ہے اور عیش پرستی سے بازداشت بھی اور طول امید کے نتیجہ سے تحذیر بھی۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ اور ہم نے جتنی بستیاں ہلاک کی ہیں ان کے لئے ایک معین وقت نوشتہ تھا۔ یعنی لوح محفوظ میں ان کی ہلاکت کا وقت لکھا ہوا تھا جو اللہ کو معلوم تھا۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝ کوئی قوم اپنے مقررہ وقت ہلاکت سے پہلے ہلاکت کی طرف بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے یعنی مقررہ وقت سے نہ پہلے ہلاکت ہو سکتی ہے نہ پیچھے۔

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ۝ اور ان کافروں نے (بطور استہزاء) کہا اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے تو بلاشبہ پاگل ہے یعنی دیوانوں کی سی باتیں کرتا ہے یہ کہتا ہے مجھ پر قرآن اتارا گیا ہے۔

لَوْ مَا تَأْتِينَا بِالْمَلَائِكَةِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ اگر تو (نبوت کے دعویٰ میں) سچا ہے تو ہمارے سامنے (شہادت دینے کے لئے) فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا جو تیرے دعویٰ کی صداقت کی شہادت دیں اور تیری تائید کریں یہی مطلب دوسری آیت میں بھی ادا کیا گیا ہے فرمایا ہے لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا یا یہ مطلب ہے کہ ہم جو تکذیب کر رہے ہیں ہم کو عذاب دینے کے لئے فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا جس طرح سابق امتوں کو ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کا نزول ہوا تھا۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُنْظَرِينَ ۝ ہم (عذاب کے) ملائکہ کو نہیں اتارتے ہیں مگر حق (عذاب) کے ساتھ (یعنی اس عذاب کے ساتھ جس کے نازل کرنے کا قطعی فیصلہ اللہ کے نزدیک ہو چکا ہوتا ہے) اور اس وقت (کافروں کو) مہلت نہیں دی جاتی۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ بلاشبہ ہم نے ہی قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس کلام سے پُرزور طور پر کافروں کے انکار اور استہزاء کی تردید کر دی گئی۔ "حفاظت کرنے" سے مراد ہے ہر قسم کی الفاظ کے تغیر رد و بدل اور کمی بیشی سے حفاظت اب کسی طور پر بگاڑ اور تغیر اس میں ممکن نہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس میں تحریف و تغیر کا امکان ہوتا اور دین کے دشمن تحریف کر سکتے۔ افسوس کہ رافضی گروہ اس آیت کے باوجود قرآن کو بگڑا ہوا (اور ناقص) قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (چالیس پارے تھے) حضرت عثمان نے دس پارے نکلوا دیئے۔

بعض اہل تفسیر کے نزدیک لَهُ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے۔ اسی کے ہم معنی یہ آیت وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یعنی رسول خدا کو کوئی بداندیش ضرر نہیں پہنچا سکے گا اللہ ان کا حافظ ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الْأَوَّلِينَ ۝ اور ہم نے آپ سے پہلے بھی پچھلی امتوں میں پیغمبر بھیجے تھے شیع جمع ہے شیعۃ مفرد۔ شیعہ وہ جماعت ہے جو متفق الرائے ہو اور کسی کی بات پر متحد ہو کر اس کا اتباع کیا اس کے پیچھے چلا۔ چھوٹی لکڑی جن کو آگ بنانے کے لئے بڑی لکڑیوں کو ان کے ذریعہ سے جلایا جاتا ہے شیاع کہلاتی ہے۔

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ اور جو پیغمبر بھی ان کے پاس پہنچا وہ اس سے تمسخر کرتے رہے۔ جیسا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرتے تھے اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی ہے۔

كَذَٰلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝ اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرموں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں المجرمین سے مراد ہیں مشرکین مکہ یعنی جس طرح گزشتہ کافر امتوں کے دلوں میں ہم نے کفر و استہزاء کو داخل کر دیا تھا اسی طرح اللہ نے ان مشرکوں کے دلوں میں بھی ہم کفر و استہزاء کو داخل کرتے ہیں سلک (یہ ہے) ایک چیز کا دوسری چیز میں داخل کرنا جیسے سوئی میں دھاگے کو اور نیزے کی نوک کو داخل کر دینا۔ اس آیت میں فرقہ قدریہ کے قول کو رد ہے (فرقہ قدریہ قائل ہے کہ وہ اپنے افعال کا خود خالق ہے) آیت بتا رہی ہے کہ کافروں کے دلوں میں کفر و استہزاء کو

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول لکھا ہے کہ پہلے آسمان تک پہنچنے سے شیطانوں کی روک ٹوک نہ تھی وہ جا کر آسمانوں کی خبریں لاتے اور کاہنوں کے دلوں میں القاء کرتے تھے جب حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو تین بالائی آسمانوں پر جانے سے شیطانوں کو روک دیا گیا لیکن رسول اللہ ﷺ کی میلاد مبارک ہوئی تو باقی چار آسمانوں تک جانے کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ جو کوئی شیطان چوری چھپے (اوپر جا کر) کوئی خبر سن پاتا تھا تو فوراً اس پر (ٹوٹنے والا ستارہ یعنی شعلہ) انگارہ مارا جاتا تھا ان شیطانوں کی جب کامل بندش ہو گئی تو انہوں نے ابلیس سے اس کی شکایت کی ابلیس نے کہا زمین میں یقیناً کوئی نیا حادثہ ہوا ہے جا کر دیکھو شیطان زمین پر آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی تلاوت کرتے پایا کہنے لگے واللہ یہی نئی بات پیدا ہوئی ہے۔

إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ۝ ہاں جو چوری سے سن پاتا ہے تو اس کے پیچھے روشن شعلہ آتشیں آپڑتا ہے۔ شہاب آتشیں شعلہ جو ستاروں سے نکلتا ہے۔ بغوی نے چوری سے سننے اور پیچھے سے شعلہ آتشیں پڑنے کی یہ تفصیل بتائی ہے کہ شیاطین نیچے سے آسمان دنیا تک ایک کے اوپر ایک سوار ہو کر (گویا) سیڑھیاں بنا لیتے ہیں اور چوری چھپے فرشتوں کی باتیں سن لیتے ہیں فرشتے (مطلع ہو کر) ان پر آتشیں شعلے مارتے ہیں کوئی انگارہ خطا نہیں جاتا انگارہ پڑنے سے کوئی تو مر جاتا ہے کسی کا چہرہ یا پہلو، ہاتھ کوئی اور حصہ حسب مشیت الٰہی جل جاتا ہے کوئی بدحواس اور پاگل ہو جاتا ہے اور بھوت بن جاتا ہے جو زمین پر آکر جنگلوں میں مسافروں کو سیدھے راستے سے بھٹکاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آسمان میں اللہ کسی کام کا کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اطاعت اور احترام کے زیر اثر فرشتے اپنے بازو پھڑپھڑاتے ہیں اور ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے پتھر کی چٹان پر کسی زنجیر کے لگنے سے ہوتی ہے جب دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو (آپس میں) پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا دوسرے فرشتے جواب دیتے ہیں جو کچھ فرمایا بلاشبہ حق ہے وہی (سب سے) بزرگ و بالا ہے چوری سے سننے والے ایک کے اوپر ایک لگے ہوتے ہیں چنانچہ (سب سے اوپر) چوری سے سننے والا کوئی بات سن پاتا ہے اور اپنے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اور نیچے والا اپنے سے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اس طرح سب سے نیچے والا جادوگر یا کاہن کی زبان پر وہ بات لے آتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیچے والے تک پہنچانے سے پہلے اوپر والے پر شعلہ آتشیں آپڑتا ہے اور کبھی آتشیں شعلہ پہنچنے سے پہلے وہ نیچے والے کو بتا چکتا ہے ساحر یا کاہن (اس ایک بات میں) سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے (جب وہ ایک بات جو کاہن کی زبان سے لوگ سنتے اور وہ واقع ہو جاتی ہے تو) کہا جاتا ہے کیا کاہن نے ہم سے ایسی ایسی بات پہلے ہی نہ کہہ دی تھی چنانچہ اس ایک آسمانی بات کی وجہ سے کاہن کی دوسری خرافات کی بھی تصدیق کی جاتی ہے۔ رواہ البخاری۔

بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور وہاں اس بات کا تذکرہ ہوتا ہے جس کا فیصلہ آسمان پر ہو چکا ہے کوئی شیطان اس کو چوری سے سن پاتا ہے اور جا کر کاہن کے دل میں ڈال دیتا ہے، کاہن اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر بیان کر دیتے ہیں، یہ روایت بخاری کی بھی ہے اور بغوی کی بھی۔ سند میں فرق ہے۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا اور ہم نے (پانی پر) زمین کو پھیلایا۔

وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ اور زمین میں ہم نے جمے ہوئے پہاڑ قائم کر دیئے پہلے زمین لرزتی تھی اللہ نے اس میں پہاڑوں کی میخیں قائم کر دیں۔

وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ۝ اور ہم نے زمین میں یا پہاڑوں میں یا دونوں میں ہر مناسب چیز پیدا کی۔

مَّوْزُونٍ سے مراد یا تو یہ ہے کہ حسب تقاضائے حکمت مقرر مقدار میں پیدا کیا یا مَّوْزُونٍ سے مراد مناسب جو ناز بیا نہ ہو جیسے کلام موزوں کہا جاتا ہے۔ یا موزون سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ایسی چیزیں پیدا کیں جو دوسری نعمتوں میں اپنا خصوصی وزن (اور مرتبہ) رکھتی ہیں یا قابل وزن معدنیات مراد ہیں جیسے سونا، چاندی، لوہا، تانبا، جرتال، سرمہ وغیرہ یا لعل، یاقوت، زبرجد

فیروزہ وغیرہ بھی پہاڑوں کی پیداوار ہے۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ اور زمین میں یا پہاڑوں میں ہم نے تمہارے لئے اسباب زندگانی پیدا کئے کھانے پینے کی چیزیں، لباس کی چیزیں وغیرہ۔ معایش معیشت کی جمع ہے دنیوی زندگی کے اسباب۔

وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ۝ اور ان (چوپایوں) کو بھی ہم نے پیدا کیا جن کو تم رزق دینے والے نہیں (ہم ہی رزق دیتے ہیں)

اس جگہ لفظ مَن (جو عربی زبان میں صرف عقل والی مخلوق کے لئے وضع کیا گیا ہے جیسے انسان فرشتہ، جن) بمعنی مَا کے ہے (کیونکہ اس جگہ چوپائے مراد ہیں اور چوپائے عقل والے نہیں قرار دیئے جاتے) اسی طرح آیت فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِي عَلٰى بَطْنِهٖ میں مَن سے مراد جانور ہیں اس آیت میں بھی مَن بمعنی مَا کے ہیں۔

بعض علماء نے کہا مَن سے مراد بال بچے غلام باندی اور چوپائے وغیرہ ہیں اہل کفر خیال کرتے تھے کہ ان سب کو ہم کھلاتے پلاتے اور پرورش کرتے ہیں آیت میں اس کی تردید کردی گئی اور فرمایا ہم ان کو رزق دیتے ہیں۔ بعض علماء نے اس طرح ترجمہ کیا ہے، ہم نے تمہارے اور ان کے لئے جن کے تم رازق نہیں ہو اسباب زندگانی پیدا کئے ہیں۔ اللہ نے مذکورہ بالا آیات میں اپنی ہستی کامل قدرت ہمہ گیر حکمت، استحقاق الوہیت اور توحید ذاتی و صفاتی کے لئے مذکورہ اشیاء کی تخلیق کو پیش کیا ہے اور بندوں کو اپنے انعامات کی یاد دہانی کی ہے تاکہ لوگ دوسروں کو اس کا شریک نہ بنائیں اور تنہا اسی کو معبود سمجھیں اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں، کفران نعمت نہ کریں۔

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں۔ یعنی ہماری قدرت ایسی ہمہ گیر ہے جتنی مخلوق ہم نے پیدا کی ہے اور جو چیز بنائی ہے اس سے کتنے ہی گنا زائد ہم پیدا کر سکتے ہیں۔ خزانے موجود ہونے سے مراد ہے قدرت کے اتھاہ ہونے کا بیان۔ یا اللہ نے اپنی مقدورات کو خزانوں سے تشبیہ دی جو جمع شدہ اور موجود ہوتے ہیں ان میں سے ہر وقت جو چاہو نکال سکتے ہو اللہ کے مقدورات بھی ایسے ہی ہیں اللہ جب چاہے اور جتنا حصہ چاہے اور مقدورات میں سے عالم ظہور میں لا سکتا ہے اور پیدا کر سکتا ہے اور آیت ذیل میں جو اتارنے کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد پیدا کرنا یا عالم خارجی میں بالفعل لے آنا ہے۔

وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝ اور ہم اس کو (یعنی ہر چیز کو) ایک معین مقدار سے ہی اتارتے ہیں (یعنی جس کو پیدا کرنا ازل میں مقدر ہو چکا ہو اور جس کی مقدار اللہ کو معلوم ہے۔

(مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا) میں کہتا ہوں، ممکن ہے کہ خزائن سے مراد اعیان ثابتہ ہوں (یعنی وہ حقائق امکانیہ جو اللہ کے علم میں ثابت ہوں۔ مترجم) اور اتارنے سے مراد ہو ان اعیان حقیقیہ کو وجود ظلی عطا کرنا (یعنی خارج میں موجود کر دینا خارجی وجود کو اہل تصوف وجود ظلی کہتے ہیں یعنی وجود اصلی کا پرتو ہے اور حقائق امکانیہ جو علم خداوندی میں ثابت ہیں وہ اصل ہیں۔ وجود خارجی انہی کا پرتو ہے مترجم) بغوی نے لکھا ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا خشکی اور سمندر میں اللہ نے جو کچھ پیدا کیا ہے سب کی تمثال (وجود مثالی یعنی حقیقت امکانیہ۔ مترجم) عرش میں ہے اور آیت وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُ کی یہی تفسیر ہے۔ میں کہتا ہوں شاید امام کی مراد عرش سے عالم مثال ہے جس طرح انسان کا محل خیال دماغ ہے (اور وجود خارجی وجود خیالی کے ظہور خارجی کا نام ہے) اسی طرح عالم کبیر (کے ظہور خارجی) کا محل عالم مثال ہے اور محل تمثال عرش ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ خزائن سے مراد بارش ہے۔ بارش ہر چیز کا خزانہ ہے اللہ نے فرمایا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ روایت میں آیا ہے کہ آسمان سے جو قطرہ اترتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ ضرور ہوتا ہے یہ فرشتہ اس بوند کو اس جگہ تک ضرور پہنچاتا ہے جہاں پہنچانے کا حکم ہوتا ہے۔

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ اور ہم ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں۔ لواقح لاقحۃ کی

جمع ہے لَاقِحَۃٌ حاملہ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملاقیح کی بیع کی ممانعت فرمائی ہے یعنی جو بچہ اونٹنی کے پیٹ کے اندر ہو تو اس کی بیع بغیر اس کی ماں کے جائز نہیں۔ یا لَوَاقِحَ لَقُوْحٌ کی جمع ہے یعنی دودھ دینے والی اونٹنی۔ بہر حال اس جگہ وہ ہوائیں مراد ہیں جو برسنے والے بادل کو لانے اور اٹھانے والی ہیں۔ بیضاوی نے لکھا ہے جو بادل کو اٹھانے والی ہو اس کو جس طرح لواقح کہتے ہیں اسی طرح عقیم (نا قابل تولید) اس ہوا کو کہتے ہیں جو برسنے والے بادل کی حامل نہ ہو۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اللہ ہوا کو بھیجتا ہے وہ پانی کو اٹھا کر لاتی ہے۔ بادل پانی کو لے کر ہوا کی وجہ سے چلتا ہے اور اونٹنی کے دودھ دینے کی طرح پانی برساتا ہے۔

ابو عبیدہ نے کہا لواقح کا معنی ہے ملاقح۔ ملاقح کا مفرد ملقحہ ہے جس کا ترجمہ ہو حاملہ کرنے والی ہوائیں یعنی وہ ہوائیں جو پھلوں کے تخم درختوں میں ڈالتی ہیں اور ان کو حاملہ کرتی ہیں۔ عبید بن عمیر نے کہا پہلے اللہ خوش خبری (یعنی بارش کی خوش خبری) دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو زمین کو صاف کر دیتی ہیں پھر بادلوں کو ابھار لانے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو بادلوں کو اٹھا کر لاتی ہیں۔ پھر منتشر بادلوں کو یکجا کرنے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو ابر کے مختلف ٹکڑوں کو یکجا کر کے تہ بہ تہ کر دیتی ہیں پھر حاملہ کرنے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو درختوں میں پھل پیدا کر دیتی ہیں (گویا درخت حاملہ ہو جاتے ہیں) ابو بکر بن عیاش نے کہا جب تک چاروں ہوائیں نہ چلیں بادل پورا نہیں کرتا کوئی قطرہ نہیں اترتا۔ پروا بادل کو اٹھا کر لاتی ہے، شمالی ہوا بادل کو جمع کرتی ہے جنوبی ہوا بادل کو برساتی ہے اور پچھمی ہوا بادل کو منتشر کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ لواقح جنوبی ہوائیں ہیں۔ بعض آثار صحابہ میں آیا ہے جب بھی جنوبی ہوا چلتی ہے انگور کے خوشے (ساتھ) ابھار لاتی ہے اور عقیم عذاب کو لاتی ہے پھل نہیں پیدا کرتی۔

بغوی نے امام شافعیؒ و طبرانی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب بھی کوئی تیز ہوا چلتی تھی رسول اللہ ﷺ دو زانو بیٹھ کر دعا کرتے تھے اے اللہ اس کو رحمت بنا دے عذاب نہ بنا۔ اے اللہ اس کو رحمت کی ہوائیں کر دے عذاب کی آندھی نہ کر دینا۔ (رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں رحمت کی ہواؤں کے لئے لفظ ریاح بصیغہ جمع اور عذاب کی آندھی کے لئے لفظ ریح استعمال فرمایا ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لفظ ریح سے مراد وہ ریح ہے جس کا ذکر آیت اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا۔ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ میں اللہ نے کیا ہے اور لفظ ریاح سے مراد وہ ریاح ہے جس کا ذکر آیت اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ۔ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ مُبَشِّرَاتٍ میں اللہ نے کیا ہے۔

فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ پھر ہم نے بادل سے پانی نازل کیا اور اس سے تم کو سیراب کیا یعنی پانی کو تمہارے لئے پینے کے قابل بنایا۔ عربی محاورہ میں سَقَیْتُہٗ کا ترجمہ ہوگا اس کو پانی پلا دیا اور اَسْقَیْتُہٗ کا معنی ہے میں نے اس کو پانی یا دودھ پلا کر سیراب کر دیا اَسْقَیْتُ الْاِبِلَ کا معنی ہے میں نے اس کو پانی سے دیا تاکہ اپنی زمین یا جانوروں کو سیراب کرے۔

وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ ﴿۲۲﴾ اور تم اس (پانی) کو اپنے پاس جمع رکھنے والے نہیں ہو یعنی بارش کا خزانہ ہمارے پاس ہے تمہارے پاس نہیں۔ یہ مطلب ہے کہ چشموں اور کنوؤں میں جو پانی جمع کر لیا جاتا ہے (یہ ہمارے قبضہ میں ہے) جس طرح تخلیق نباتات سے حرکت لوگوں کے فائدے کے لئے ہوتی ہے اسی طرح پانی کا زمین میں بھی محفوظ رہنا اور یہ سب قدرت حکیم کی تدبیر اور حکم کا نتیجہ ہے ورنہ پانی کی فطرت تو نیچے جانے کا تقاضا کرتی ہے مگر اس کو کسی حد پر روک لینا بغیر کسی خاص سبب کے نہیں ہو سکتا۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ اور بلاشبہ ہم ہی زندہ کرتے اور موت دیتے ہیں۔ یعنی روحوں کو معرفت سے اور اجسام کو حس و حیات کا تعلق پیدا کر کے زندہ کرتے ہیں اور ان سے تعلق کاٹ کر مردہ کر دیتے ہیں۔

وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ اور ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ ہمارے سوا کوئی زندہ باقی نہیں رہے گا مردہ کے بعد زندہ باقی رہتا ہے اور اس کا وارث ہوتا ہے بطور استعارہ فنائے مخلوق کے بعد ذات حق کے باقی رہنے کو وراثت سے تعبیر کیا۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿٢٤﴾ اور ہم تمہارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور ہم تمہارے پچھلوں سے بھی واقف ہیں۔ یعنی ہم سے تمہاری کوئی حالت پوشیدہ نہیں۔ سابق آیت میں اپنی قدرت کاملہ کی دلیل بیان کی تھی۔ اس آیت میں اپنے علم کی ہمہ گیری کا اظہار فرمایا۔ قدرت کی دلیل ہے اسی سے قدرت کا ثبوت ہو جاتا ہے (قدرت بغیر علم کے ناممکن ہے)۔ البغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مستقدمین سے مردے اور مستاخرین سے زندہ مراد ہیں۔ شعبی نے کہا اگلے پچھلے لوگ مراد ہیں۔ عکرمہ کا قول ہے مستقدمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں اور اپنے آباء کی پشت سے برآمد ہو گئے ہیں اور مستاخرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اپنے باپوں کی پشت سے باہر نہیں آئے۔ مجاہد کے نزدیک گزشتہ اقوام مستقدمین ہیں اور امت محمدیہ مستاخرین سے مراد ہے۔ حسن نے کہا طاعت و خیر میں آگے بڑھنے والے مستقدمین ہیں اور طاعت و خیر میں سستی کرنے اور پیچھے رہنے والے مستاخرین ہیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ مستقدمین و مستاخرین سے مراد نمازیوں کی اگلی پچھلی صفیں ہیں۔ ابن مردویہ کا بیان ہے کہ داؤد بن صالح نے حضرت سہل بن حنیف انصاری سے دریافت کیا کیا یہ آیت جہاد کے سلسلہ میں نازل ہوئی (یعنی مستقدمین و مستاخرین سے کیا مجاہدین مراد ہیں) حضرت سہل نے فرمایا نہیں اس کا نزول نمازیوں کی صفوں کے متعلق ہوا۔ قتادہ کے نزدیک جہاد کی صفوں میں آگے پیچھے رہنے والے مراد ہیں۔ ابن عیینہ کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو چکے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے۔ اوزاعی کے نزدیک اول وقت اور آخر وقت میں نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ایک خوبصورت عورت رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہی تھی کچھ لوگ اگلی صف میں بڑھ گئے تاکہ نماز میں (رکوع میں بھی) عورت پر نظر نہ پڑے اور کچھ لوگ اتنے پیچھے ہو گئے کہ آخری صف میں پہنچ گئے ان میں سے بعض لوگ رکوع میں گئے تو اپنی بغلوں کے نیچے سے عورت کو دیکھتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم۔ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے)

۲ ع ۲

وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥﴾ اور بے شک آپ کا رب (قیامت کے دن) ان سب کو محشور کرے گا وہ بلاشبہ بڑی حکمت اور علم والا ہے۔ یعنی سب کو جمع کر کے یا ٹھیک ٹھیک ہر ایک کو اس کے ہر عمل کا بدلہ دے گا۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر شخص جس چیز پر مرے گا اللہ اسی چیز پر اس کو اٹھائے گا (رواہ احمد والحاکم والترمذی) ضمیر ھو کا اضافہ بتا رہا ہے کہ اللہ ہی قادر اور سب لوگوں کو اٹھانے کا تنہا ذمہ دار ہے اس فعل میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ حکیم ہے یعنی اس کی حکمت نمایاں اور اس کی ہر صنعت محکم ہے۔ علیم ہے اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ﴿٢٦﴾ اور بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا کیا بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے تیار ہوئی تھی۔ الانسان (میں الف لام جنسی ہے اس) سے مراد ہے جنس بشر یعنی حضرت آدمؑ کو پیدا کیا۔ انسان کی وجہ تسمیہ متعدد ہیں اس کا معنی ہے ظہور۔ انسان ظاہر ہے آنکھ سے دکھائی دیتا ہے۔ انس کا معنی دل بستگی اور پریم بھی ہے انسان باہم مانوس ہوتے ہیں یا نسیان سے مشتق ہے۔ حضرت آدمؑ کو ایک حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس کو بھول گئے۔ نسیان کا معنی ہے بھولنا۔ صلصال خشک مٹی جو آگ میں نہ پکائی گئی ہو اور ٹن ٹن بولتی ہو (یعنی بجنے سے مشتق ہو) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا صلصال وہ عمدہ یا تر کیچڑ ہے جس میں سے پانی سوکھ جانے کی وجہ سے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں اور جب اس کو (اس کی جگہ سے) ہلایا جاتا ہے تو کھڑ کھڑ کی آواز دیتی ہے۔ مجاہد نے کہا بدبودار کیچڑ کو صلصال کہتے ہیں۔ جیسے صل اللحم اور اصل اللحم گوشت بدبودار ہو گیا۔ صلصال اصل میں صلال تھا۔ حمأ وہ کالی کیچڑ جو زیادہ پانی کے قریب ہونے سے کالی پڑ جاتی ہے۔ مسنون پتلا جس میں صورت بنائی گئی ہو۔ یہ لفظ سنت الوجہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں مٹی (تراب، خاک) پھر پانی میں گوندھے جانے کے بعد طین (کیچڑ) پھر ایک مدت تک پڑی رہنے کے بعد حمأ (سیاہ کیچڑ یا لدلدا) پھر اس کو خالص اور جوہر نکال لیا جائے تو اس کو سُلالہ (خلاصہ) کہا جاتا ہے۔ پھر اس میں نقوش بصورت بنا دیئے جائیں (پتلا بنا دیا جائے) تو اس کو مسنون کہتے ہیں اور

مسنون خشک ہو جائے تو اس کو صلصال کہتے ہیں۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا مسنون خراب بدبودار یہ لفظ سننت الحجر علی الحجر سے ماخوذ ہے ابوعبیدہ نے کہا مسنون (اسم مفعول) سن سے مشتق ہے سن کا معنی ہے بہانا۔ مسنون بہایا ہوا جیسے مختلف دھاتیں جن کو پگھلا کر سانچوں میں بھر کر ڈھالا جاتا ہے اسی طرح اس (پتلی سیال) کیچڑ کی حالت ہوتی ہے (جس کو مسنون کہا جاتا ہے) عرب کہتے ہیں سننت الماء میں نے پانی بہا دیا گویا (دلدلی کیچڑ سے ڈھال کر اول (قوام) تیار کیا گیا پھر انسانی صورت بنائی گئی اور مجسمہ تیار کیا گیا جو کھوکھلا تھا پھر وہ خشک ہو گیا اور بجانے سے کھن کھن بولنے لگا پھر رفتہ رفتہ اس پر تغیرات آتے رہے آخر جب وہ بالکل ہموار اور درست ہو گیا تو اس میں روح پھونک دی گئی۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اور جن کو ہم نے پیدا کیا اس سے پہلے آگ سے جو ایک گرم ہوا سے بنی تھی۔

اَلْجَآنَّ (میں لام جنسی ہے) انسان کی طرح جنس ہے جب ایک شخص سے نکلے ہوئے مختلف افراد اسی جنس کے ہوں اور اس شخص کو کسی خاص مادہ سے بنایا گیا ہو تو تمام افراد کا قوام اسی اصلی مادہ سے مانا جائے گا (پس ابوالجن کو جب آگ کے مادہ سے بنایا گیا تو اس کی ساری نسل کو بھی اسی مادہ سے بنا ہوا کہا جائے گا اگرچہ اولاد کا سلسلہ تناسلی ہو گا براہ راست آگ سے ان کو نہیں بنایا گیا ہو گا)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا الجان سے مراد ہے تمام جنات کا باپ جیسے آدم تمام انسانوں کے باپ تھے۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد ابلیس ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ الجان جنات کا باپ ہے اور شیاطین کا باپ ابلیس ہے جنات میں کچھ مسلمان ہیں کچھ کافر، مرتے بھی ہیں پیدا بھی ہوتے ہیں اور شیاطین میں سے کوئی بھی مسلم نہیں نہ کسی کو موت آتی ہے جب ابلیس مرے گا تو اسی کے ساتھ سب مریں گے۔

وہب نے کہا کچھ جنات تو آدمیوں کی طرح ہیں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور کچھ جنات ہوا کی طرح ہیں ان میں توالد و تناسل نہیں ہوتا نہ وہ کھاتے پیتے ہیں۔

مِنْ قَبْلُ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے آدم سے پہلے جان کو پیدا کیا۔

السَّمُوْمِ وہ سخت گرمی جو مسامات کے اندر گھس جائے۔ بغوی نے کہا سموم وہ گرم ہوا جو انسان کے بدن میں مسامات کے راستے سے گھس کر اس کو ہلاک کر دیتی ہے (یعنی لو) بعض کے نزدیک سموم دن کی اور حرور رات کی گرم ہوا (لو) کو کہتے ہیں۔ کلبی نے ابوصالح کا قول نقل کیا ہے السموم ایک آگ ہے جو آسمان اور (زیریں) حجاب کے درمیان ہے اس میں دھواں نہیں ہے صاعقہ کی پیداوار اسی سے ہوتی ہے (صاعقہ ٹوٹ کر گرنے والی بجلی) اللہ کا حکم ہوتا ہے تو سموم (یعنی صاعقہ زیریں حجاب کو پھاڑ کر حسب مشیت الٰہی کہیں گر جاتی ہے حجاب کو پھاڑنے کی آواز ہی کڑک کہلاتی ہے۔ بعض نے کہا نار السموم آگ کے شعلے لپیٹ۔ بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے آتش جہنم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابلیس بھی ملائکہ کی ایک خاص شاخ (قبیلہ یا گروہ) میں سے ہے اس شاخ کو جن کہا جاتا ہے اس صنف ملائکہ یعنی جنات کی تخلیق نار سموم سے ہوئی ہے دوسری آیت میں ان جنات کی تخلیق بھڑکتی آگ سے بتائی گئی ہے (گویا نار السموم اور بھڑکتی آگ ایک ہی چیز ہے) باقی جن کے علاوہ ملائکہ کی تخلیق نور سے کی گئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں آنے والا ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے بنی ہو گی پیدا کرنے والا ہوں سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں۔ نفخ کا معنی ہے کسی کھوکھلی چیز میں ہوا کو گزارنا (منہ سے یا کسی اور طریقہ سے پھر جسم کو روح کی دو قسمیں ہیں۔ علوی اور سفلی۔ روح علوی ایک خاص مخلوق ہے جو مادے سے خالی ہے (غیر مادی ہے) اہل کشف نے اس کو دیکھا

جا سکتا ہے جو نفس عرش سے بھی زیادہ لطیف ہے اسی لئے اس کا مقام عرش کے اوپر ہے فوقانی و تحتانی مراتب کے لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ ارواح علویہ پانچ ہوتی ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ انہی کو عالم امر کے لطائف (خمسہ) کہا جاتا ہے۔ روح سفلی اس بخار لطیف کو کہتے ہیں جو ان چاروں عناصر سے پیدا ہوتا ہے جن سے جسم انسانی کی ساخت ہوتی ہے۔ اسی کو نفس کہا جاتا ہے۔ اللہ نے اس کو روح سفلی یعنی نفس کو ارواح علویہ کا آئینہ بنایا ہے، آفتاب آسمان پر ہونے کے باوجود جب آئینہ پر عکس ریز ہوتا ہے تو آئینہ کے اندر اس کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں روشنی بھی اور حرارت بھی۔ آئینہ روشنی آفریں بھی ہو جاتا ہے اور جلانے والا بھی۔ ارواح علویہ تجرد کی انتہائی چوٹی پر ہونے کے باوجود نفس کے آئینہ پر پرتو انداز ہوتی ہیں اور انہی کی پرتو فگنی کا جو اثر ہوتا ہے وہ ہر فرد کی روح جزئی کہلاتی ہے۔ ارواح علویہ سے روح سفلی میں نمودار ہو جاتے ہیں سب سے پہلے روح سفلی ان آثار کو ساتھ لے کر دل (سینہ کے اندر جو گوشت کا لوتھڑا ہے یعنی لحمی قلب) سے متعلق ہوتی ہے پھر قوت حیوانیہ اور معارف انسانیہ کو ساتھ لئے ہوئے (قلب کے ذریعہ سے) شریانوں کی خلاؤں میں پہنچتی ہے اور اسی طرح بدن کے ہر حصہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ اسی کو نفخ روح کہا جاتا ہے۔ کھوکھلی چیز میں جس طرح نفخ (ہوا کا پھونکا جانا) ہوتا ہے اسی کے مشابہ (شریانوں کی خلاؤں میں) روح کا نفخ ہوتا ہے۔ روحی میں روح کی اضافت اپنی ذات کی طرف کرنے سے روح کی عظمت شان کی طرف اشارہ ہے روحی کا مطلب ہے میرے حکم سے براہ راست بغیر مادہ کے پیدا کی ہوئی روح۔ انسانی روح کو اپنی روح اس لئے قرار دیا کہ صرف انسانی روح میں ربانی تجلیات و انوار کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے دوسری مخلوق میں یہ استعداد نہیں۔ انسان کی ساخت میں اگرچہ مٹی کا عنصر غالب ہے اسی لئے انسان کی تخلیق کو مٹی سے قرار دیا ہے لیکن درحقیقت انسانی تقویم کے دس اجزاء ہیں، مٹی، پانی، ہوا، آگ اور وہ لطیف بخار جو ان چاروں کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے اسی کو نفس اور روح سفلی کہتے ہیں۔ ان پانچ اجزاء کے علاوہ پانچ اجزاء وہ ہیں جن کا تعلق عالم امر سے ہوتا ہے ان کا ذکر اوپر آچکا ہے (قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ) انسان اسی جامعیت کی وجہ سے مستحق خلافت ہوا۔ معرفت کے نور اور عشق و محبت کی آگ کا اہل قرار پایا۔ انسان کی یہی جامعیت اس بے کیف معیت کی مقتضی ہے جس کا ذکر حدیث المرء مع من احب میں آیا ہے اور اسی جامعیت کے باعث آدمی کو انوار ذاتیہ، صفاتیہ اور ظلیہ کا مہبط بنایا گیا پھر اسی معیت اور حامل تجلیات ہونے کے سبب سے ملائکہ کو اس کی جانب سجدہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ تو تم اس کی طرف رخ کر کے سجدے میں گر پڑنا۔

فَقَعُوْا امر ہے وقع وقوع سے۔ لَهٗ میں لام بمعنی الی ہے یعنی آدم کی جہت کو اور آدم کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنا۔ اللہ نے آدم کو ملائکہ کا قبلہ سجود بنایا جیسے کعبہ کو قبلہ عبادت انسانوں کے لئے قرار دیا۔ کعبہ کو سجدہ نہیں کیا جاتا بلکہ کعبہ کو تجلیات و انوار سے چونکہ ایک خصوصیت ہے (اس لئے اس کو جہت سجدہ بنایا) اسی طرح فرشتوں کے لئے آدم کو سجدہ کی جہت بنا دیا مسجود لہ نہیں بنایا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ پس (آدم کی طرف رخ کر کے) فرشتوں نے سجدہ کیا اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ فرشتوں نے آدم کے اندر معیت کا ادراک کر لیا یا محض تعمیل حکم غرض تھی (اختصاص سجود کی وجہ ان کو معلوم نہیں ہوئی)

كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ سب کے سب نے۔ تاکید مزید محض مبالغہ عموم کے لئے ہے یعنی کوئی بھی سجدہ سے الگ نہیں رہا سب ہی نے سجدہ کیا۔ مبرد کا قول ہے کہ كُلُّهُمْ کے لفظ سے تو عموم کی تاکید ہو گئی یعنی سب نے سجدہ کیا اور اَجْمَعُوْنَ کے لفظ سے یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے کہ بیک دم اجتماعی حالت میں سب نے سجدہ کیا۔ مگر یہ توجیہ غلط ہے اگر لفظ اجمعون سے اجتماعی حالت ظاہر کرنی مقصود ہوتی تو اجمعین (نصب کے ساتھ) کہا جاتا (کیونکہ حال منصوب ہوتا ہے)

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝ مگر ابلیس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے ابلیس معیت کو نہ سمجھ سکا اور نہ اس نے اس امر کا لحاظ کیا کہ حکیم کا حکم حکمت سے خالی

نہیں ہوتا۔

ابلیس چونکہ ملائکہ میں سے نہ تھا جنات میں سے تھا اللہ نے فرمایا کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ اس لئے بعض علماء نے کہا کہ استثناء منقطع ہے (متصل نہیں ہے استثناء متصل میں مابعد اِلَّا کا ماقبل اِلَّا میں داخل ہونا ضروری ہوتا ہے) اور اِلَّا بمعنی لکن کے ہے (اسی کے موافق آیت کا ترجمہ ہم نے کیا ہے) بعض علماء کے نزدیک استثناء متصل ہی ہے کیونکہ ابلیس ملائکہ کی اس صنف کا ایک فرد تھا جس کو جن کہا جاتا ہے اس صورت میں ترجمہ اس طرح ہوگا مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل رہنے سے انکار کر دیا۔

قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ۝ اللہ نے فرمایا اے ابلیس تیرے سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہونے کا کیا سبب ہے یعنی تو نے کیوں سجدہ نہیں کیا باوجودیکہ حاکم کے حکم کی تعمیل تجھ پر واجب تھی اور آدم کی فضیلت اور استحقاق سجدہ اللہ کے بیان کرنے سے تجھے معلوم ہو گیا تھا۔

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۝ ابلیس نے (اپنی بے وقوفی کی وجہ سے) کہا میں تو ایک ایسے کثیف انسان کو سجدہ کر ہی نہیں سکتا تھا جس کو تو نے کھنکھناتی ہوئی سڑی کیچڑ سے بنایا ہے، مٹی کا درجہ تو تمام عناصر سے نچلا ہے، مجھے تو نے آگ سے بنایا ہے اور آگ تمام عناصر سے لطیف اور سب سے اعلیٰ و اشرف ہے سورۂ اعراف میں اس کی مزید تشریح ہو چکی ہے۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ۝ (اللہ نے) فرمایا (جب تو نے میرا فرمان نہیں مانا) تو (جنت یا آسمان یا ملائکہ کے گروہ سے) نکل جا بلاشبہ تو مردود ہے یعنی بھلائی اور اعزاز سے نکالا اور دھتکارا ہوا ہے، رجیم سنگسار کیا ہوا پتھروں سے مارا ہوا جو (اللہ کی بارگاہ سے) مطرود ہو جائے گا وہ سنگسار کیا جائے گا یہ مطلب ہے کہ آئندہ اگر تو آسمان سے قریب گیا تو تجھ پر انگارے برسائے جائیں گے ٹوٹے ہوئے تارے تجھ پر (پتھروں کی طرح) پڑیں گے۔ شیطان کے لئے اس آیت میں وعید بھی اور اس کے اعتراض کا ذرپردہ جواب بھی ہے ابلیس کا اعتراض یہ تھا کہ میں تحقیقاً افضل ہوں آدم مجھ سے ادنیٰ ہے اور ادنیٰ کے سامنے افضل کو سربسجود ہو جانے کا حکم مناسب نہیں جواب یہ ہے کہ فضیلت اور برتری کا مدار اللہ کے حکم کی تعمیل پر ہے (اجزاء تخلیق پر نہیں) جو نافرمان ہو گا وہ بھلائی سے محروم ہو جائے گا اور نکالا جائے گا۔

وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۝ اور روز جزا تک تجھ پر لعنت یقینی ہے روز جزا پر پھٹکار اور لعنت کی انتہا ہے اس کے بعد اعمال کی (اخروی) سزا و جزا ہوگی اور لعنت اخروی کے عذاب کا وقت آ جائے گا یہ مطلب ہے کہ روز جزا تک تو لعنت ہوگی اور اس کے بعد ایسی سخت سزا دی جائے گی کہ اس کی موجودگی میں دنیوی لعنت بھول جائے گا۔

بعض نے کہا اللعنت کو یوم الدین تک جاری رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے بعد لعنت ختم ہو جائے گی بلکہ یہ ایک محاورہ کی بات ہے) طویل ترین مدت کے لئے کہا جاتا ہے کہ قیامت تک یہ بات ہوتی رہے گی یاد ہو گا (اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قیامت کے بعد اس کے خلاف ہو گا بلکہ کسی کام کے ہونے نہ ہونے کی ایک طویل ترین مدت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے)

بغوی نے کہا آسمان پر بھی ابلیس ملعون ہے اور زمین پر بھی، آسمان والے بھی اس پر اسی طرح لعنت کرتے ہیں جیسے زمین والے میں کہتا ہوں (آسمان اور زمین والے کیا) آسمان اور زمین کے مالک نے اس پر لعنت کی ہے اور فرمایا: وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ ابلیس نے کہا اے میرے رب (جب تو نے مجھے نکال دیا اور مجھ پر لعنت کر دی ہے) تو مجھے مہلت عطا کر (یعنی زندگی کی مدت باقی رکھ اور موت نہ دے)

اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۝ اس روز تک جب کہ لوگ (قبروں سے دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔ ابلیس نے اغواء کرنے کی مہلت مانگی اور بالکل موت سے محفوظ رہنے کی بھی درخواست کی کیونکہ (وہ جانتا تھا) کہ یوم بعث تک مہلت مل جائے

گی اور دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد تو موت آنے کی نہیں اس لئے موت سے بچھوٹ مل جائے گی اللہ نے اول درخواست تو قبول فرمالی اور یہ قبولیت دعا اس کی عزت افزائی کے لئے نہیں بلکہ بدبختی اور معصیت میں اضافہ کرنے کے لئے فرمائی۔ اور دوسری درخواست (الی یوم یبعثون) کو رد کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ تو مہلت یافتہ گروہ میں سے تو بے شک ہوگا (لیکن یہ مہلت زندگی) معلوم وقت کے دن تک ہوگی یعنی اس وقت تک مہلت زندگی ہوگی جو اللہ کو معلوم ہے مراد یہ ہے کہ پہلی مرتبہ صور پھونکنے تک جس سے سب مخلوق مرجائے گی تجھے مہلت ہے دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت تک جس سے لوگ اٹھائے جائیں گے مہلت نہیں دی جاسکتی بعض لوگوں نے کہا کہ دونوں مرتبہ صور پھونکے جانے کی درمیانی مدت چالیس سال ہوگی اسی مدت میں ابلیس کی موت ہوگی۔

قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾

ابلیس نے کہا اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر ہی دیا ہے اس لئے میں بھی ضرور ضرور دنیا میں (گناہوں کو) آراستہ کرکے ان کے سامنے لاؤں گا اور سب کو گمراہ بناؤں گا بِمَا میں ب قسمیہ اور ما مصدری ہے ترجمہ اس طرح ہوگا: اے رب (تو نے مجھے گمراہ کردیا) تیرے اس گمراہ کرنے کی قسم کہ میں ان انسانوں کی نظر میں دنیا کو آراستہ کروں گا (جواب قسم کردوں گا)

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ مگر ان میں سے تیرے جو چنے ہوئے بندے ہوں گے اور تو نے ان کو تمام کدورتوں سے پاک کردیا ہوگا (ان کو میں نہیں بہکا سکوں گا) جن کو تو نے ہدایت کردی ہوگی ان پر میری فریب کاری کوئی اثر نہ ڈال سکے گی۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اللہ نے فرمایا یہ (اخلاص ہی) مجھ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے۔ اس میں کوئی کجی نہیں۔ حسن نے کہا حق کا راستہ سیدھا ہے مجاہد نے کہا حق کا رجوع اللہ کی طرف ہے۔ راہ حق بھی اللہ تک پہنچتی ہے کسی اور طرف نہیں مڑتی۔ اخفش نے کہا سیدھا راستہ بتانا مجھ پر ہے (یعنی میرے ذمہ ہے اس مطلب پر علیٰ کو الیٰ کے معنی میں لینے کی ضرورت نہ ہوگی) اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ اپنے منتخب بندوں کو گمراہ نہیں ہونے دے گا۔ منتخب بندوں کو شیطانی اغواء سے بچانے کا ذمہ اللہ کا ہے اور براہ راست ان کو محفوظ رکھنا اللہ کا کام ہے۔

کسائی نے کہا هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ وعید آمیز تہدیدی کلام ہے جیسے کوئی شخص اپنے مخالف سے کہتا ہے کہ تیرا راستہ مجھ پر ہے یعنی تو میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ نے فرمایا اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ط تو آپ کا رب گھات میں ہے۔ کسائی کی تفسیر پر ہٰذا سے اشارہ ابلیس کے راستہ کی طرف ہوگا جو اس نے اپنے لئے اختیار کیا تھا یعنی اغواء اور گمراہ کرنے کا راستہ۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ بے شک میرے بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے۔

عبادی سے مراد عام بندے ہیں مومن ہوں یا کافر۔ عباد کی اضافت یا متکلم کی طرف استغراقی ہے اگر عبادی کو صرف ایمان کے ساتھ مخصوص کیا جائے تو من اتبعک کا استثناء صحیح نہ ہوگا (گمراہوں کو لفظ عباد میں داخل ہونا چاہئے اس کے بعد استثناء کرکے نکالا جاتا ہے) مقصود آیت یہ ہے کہ اللہ نے صرف گمراہوں پر تجھے تسلط عطا کیا ہے تو ان پر غلبہ پاسکتا ہے مومنوں تک تیری دسترس نہ ہوگی۔ ابلیس نے بھی مخلص بندوں کا استثناء اپنے قول میں کردیا تھا اللہ کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے دوسری آیت میں یہ مضمون آیا ہے فرمایا ہے اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ مخلص بندوں کو اللہ شیطان کے پنجہ سے محفوظ رکھے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ استثناء منقطع ہو (متصل نہ ہو اور مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل نہ ہو) اس صورت میں عبادی سے مراد ہوں گے خاص

بندے یعنی مؤمن۔ کافروں کو یہ لفظ شامل ہی نہ ہوگا اور اِلَّا استثنائیہ نہ ہو بلکہ لٰکِنْ کے معنی میں ہو اور خبر محذوف ہو مطلب اس طرح ہوگا ہاں جو گمراہ لوگ تیری پیروی کریں گے اللہ ان کو جہنم میں لے جائے گا۔ شیطان نے اپنے کلام سے یہ وہم پیدا کر دیا تھا کہ جو مخلص بندے نہ ہوں گے میں ان کو ضرور گمراہ کر دوں گا اللہ نے اس کی تکذیب کر دی یعنی تیرا تسلط گمراہوں پر بھی نہ ہوگا گمراہ کرنا بھی تیرے قبضہ میں نہیں زیادہ سے زیادہ تیرا کام گناہ کی ترغیب دینا اور بہکانا ہے۔ قیامت کے دن ابلیس خود کہے گا۔ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ میری تم پر کوئی زبردستی نہیں تھی بس اتنی بات تھی کہ میں نے دعوت دی تم نے میری دعوت مان لی (یعنی میرا تسلط اور جبر نہ تھا صرف ترغیب اور بہکاوا تھا)

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اور جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔ اَجْمَعِيْنَ، هُمْ کی تاکید ہے یا حال ہے موعد مصدر ہے اور اجمعین میں عامل ہے موعد اسم مکان بھی ہے (وعدۂ مقررہ کی جگہ) اس وقت موعد عامل نہ ہوگا۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ اس (جہنم) کے سات دروازے ہیں۔ ہناد، ابن المبارک اور امام احمد نے الزہد میں اور ابن جریر و ابن ابی الدنیا نے صفۃ النار (دوزخ کی حالت کا بیان) میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے اوپر اور انگلیوں کو الگ الگ کر کے فرمایا دوزخ کے دروازے اسی طرح ہوں گے یعنی ہر دروازہ کے اوپر دروازہ ہوگا (اس طرح دوزخ کی سات منزلیں اور درجات ہوں گے) اول پہلی منزل بھر دی جائے گی پھر دوسری پھر تیسری پھر چوتھی پھر پانچویں پھر چھٹی پھر ساتویں۔

بغوی نے حضرت علیؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اللہ نے جنت کو پھیلاؤ میں رکھا ہے (یعنی جنت کے اوپر جنت نہیں ہے) اور دوزخ کو ایک کو دوسرے کے اوپر بنایا ہے ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے صفۃ النار میں اسی آیت کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ اول دروازہ (یعنی طبقہ) جہنم ہے پھر لظیٰ پھر حطمہ پھر سعیر پھر سقر پھر جحیم پھر ہاویہ۔

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ ہر طبقے کے لئے گمراہوں کا ایک حصہ بانٹا ہوا ہوگا یعنی ہر درجہ میں گمراہوں کی ایک مقررہ جماعت ہوگی جو اس درجہ کے اندر رہے گی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ضحاک نے کہا پہلے درجہ میں وہ اہل توحید ہوں گے جن کو گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل کیا جائے گا اور گناہوں کے بقدر وہ دوزخ میں رہیں گے پھر نکال لئے جائیں گے دوسرے درجہ میں نصاریٰ تیسرے میں یہودی چوتھے میں صابی پانچویں میں مجوسی چھٹے میں مشرک اور ساتویں میں منافق ہوں گے۔ (یعنی دور عیسیٰ ختم ہونے کے بعد نصاریٰ عیسائیت پر قائم رہے اور کسی پیغمبر کا انکار کیا بعد کو آنے والے پیغمبر کی شریعت کا انکار کیا۔ اسی طرح شریعت موسوی کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جو یہودی یہودیت پر قائم رہے اور حضرت عیسیٰ یا رسول اللہ ﷺ کی اور پیغمبر کا انہوں نے انکار کیا۔ صابی جو اپنے کو موحد کہتے ہیں اور کسی پیغمبر کی شریعت کو نہیں مانتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صابی صرف حضرت نوحؑ کا نبی ہونے کو قرار دیتے ہیں۔ مجوسی آتش پرست اور ستارہ پرست) اللہ نے منافقوں کے متعلق فرمایا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کے سات دروازے (یعنی درجے) ہیں ان میں سے ایک ان لوگوں کے لئے جنہوں نے میری امت پر تلوار سونتی یا فرمایا محمد کی امت پر تلوار کھینچی۔ قرطبی نے کہا: طبقہ جہنم ہے یہ تمام دوسرے درجات سے سہل ترین عذاب کا درجہ ہے اس امت کے گناہگاروں کے لئے مخصوص ہے۔ جہنم کو جہنم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آگ مردوں اور عورتوں کے چہرے بگاڑ دے گی اور ان کے گوشت کو کھا لے گی۔

ہاویہ کا درجہ سب سے نچلا ہے یہ سب سے گہرا ہے بزار نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخ کا ایک ایسا درجہ ہے جس میں صرف وہی لوگ داخل ہوں گے جنہوں نے اللہ کا غضب لے کر اپنے غصہ کو تسکین دی

ہو گئی (اللہ کے غضب کی پرواہ نہیں کی اور اپنے قصر کی آگ بجھائی)

ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں سب سے زیادہ گرم آلیس کریہہ آفریں اور گندے آلود اور متعفن ترین دروازہ ان زناکاروں کے لئے ہو گا جنہوں نے جانتے ہوئے زنا کا ارتکاب کیا ہو گا۔ بیہقی نے خلیل بن مرہ کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بغیر تبارک الذی اور حم السجدہ پڑھے نہیں سوتے تھے اور فرماتے تھے حم والی سورتیں سات ہیں اور دوزخ کے بھی سات طبقات ہیں، جہنم، حطمہ، لظیٰ، سقر، سعیر، ہاویہ، جحیم۔ قیامت کے دن ان (حم والی سورتوں) میں سے ہر ایک آکر ان طبقات کے دروازہ پر کھڑی ہو جائے گی اور عرض کرے گی اے اللہ جو مجھ پر ایمان رکھتا اور مجھے پڑھتا تھا وہ اس میں داخل نہ ہو۔

ثعلبی کی روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے جب آیت وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ سنی تو بدحواس ہو کر بھاگے اور اسی حالت میں تین روز بھاگتے رہے آخر (پکڑ کر) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ حضور ﷺ نے (فرار کا سبب) دریافت فرمایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آیت وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ نازل ہوئی۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کا حامل بنا کر بھیجا ہے میرا دل اس سے پارہ پارہ ہو گیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝　　بے شک پرہیزگار لوگ (جنہوں نے شیطان کے اغوا میں آکر شرک نہیں کیا ہو گا۔ شرک سے پرہیز رکھا ہو گا) جنتوں اور (جنتی) چشموں میں ہوں گے (ہر شخص کی ایک جنت اور ایک چشمہ ہر ایک کی متعدد جنتیں اور متعدد چشمے ہوں گے ان سے کہا جائے گا) ان جنتوں اور چشموں کے اندر سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یعنی آئندہ موت ہر آفت اور یہاں سے نکالے جانے کے اندیشے سے تم محفوظ ہو۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا　　اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ بالکل دور کر دیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح ہو جائیں گے۔ یعنی دنیا میں ان کے آپس میں جو کینہ کشیدگی دلوں میں ہو گی (جنت میں داخل کرنے کے وقت) ہم دور کر دیں گے وہ بھائی بھائی ہو جائیں گے) غل کینہ چونکہ ایسا واقعہ آئندہ یقینی طور پر ہو گا اس لئے بصیغہ ماضی اس کو بیان فرمایا۔

ابو نعیم نے الفتن میں اور سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا، مجھے امید ہے کہ میں اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ انہی میں سے ہوں گے (یعنی جنت میں داخلہ سے پہلے اللہ ہماری آپس میں کشیدگیوں کو دور کر دے گا۔ میں کہتا ہوں یہ کشیدگی اس وقت ہوئی تھی جب حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنہ برپا کیا گیا یہاں تک کہ آپ شہید کر دیئے گئے اور حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں عبدالکریم بن رشید کی روایت نقل کی ہے کہ اہل جنت جنت کے دروازے تک پہنچیں گے تو ایک دوسرے کی طرف غصہ کی نظر سے دیکھتا ہو گا لیکن اندر داخل ہوتے ہی اللہ ان کے سینوں سے کینہ نکال دے گا اور وہ بھائی بھائی ہو جائیں گے۔

یا (غل سے مراد دنیوی کینہ نہیں بلکہ اس سے) مراد یہ ہے کہ اہل جنت کے اندر جو درجات اور مراتب قرب کے لحاظ سے تفاوت ہو گا اس پر کوئی کسی سے حسد نہیں کرے گا اللہ (جذبہ) حسد کو ان کے دلوں سے نکال دے گا۔

عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝　　مسہریوں پر (بیٹھے) ہوں گے آمنے سامنے۔ ہناد نے مجاہد کا قول اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ کسی کی پشت کسی کی طرف نہ ہو گی بغوی نے لکھا ہے بعض اخبار میں آیا ہے کہ جنتی جب جنت کے اندر اپنے مومن بھائی سے ملنا چاہے گا تو مسہری اس کو لے کر وہاں پہنچ جائے گی اس طرح دونوں کی ملاقات اور بات چیت ہو جائے گی۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۝ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ۭ فرشتوں نے کہا ہم کو مجرم لوگوں کو ہلاک کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو لوطؑ کے پیرو ہیں (ان کو ہلاک کرنے کا ہم کو حکم نہیں) یا اس طرح ترجمہ ہوگا کہ ہم کو تمام مجرموں یعنی مشرکوں کی طرف بھیجا گیا مگر آل لوطؑ کے پاس نہیں بھیجا گیا تاکہ ہم مجرموں کو ہلاک کر دیں اور آل لوطؑ کو ہلاک نہ کریں۔

اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ہم لوطؑ کی بیوی کے سوا باقی تمام آل لوطؑ کو بالکل بچا لیں گے۔

قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ ہم نے طے کر دیا ہے کہ وہ (عذاب میں) باقی رہنے والوں (یعنی کافروں) میں شامل ہوگی۔

قدرنا یعنی قضینا یعنی ہم نے طے کر دیا۔ لغت میں تقدیر کا معنی ہے کسی چیز کو دوسری چیز کے اندازہ کے موافق بنا دینا کر دینا۔ حقیقت میں یہ فعل اللہ کا ہے، لیکن فرشتوں کو اللہ سے خصوصی قرب حاصل تھا اس لئے فعل یا تقدیر کی نسبت فرشتوں کی طرف کر دی گئی یا ملائکہ کی طرف فعل یا تقدیر کی نسبت کرنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ تو محض قاصد جو بادشاہ کے تھے ان کا ہر قول و فعل اللہ کا قول و فعل تھا۔

فَلَمَّا جَاۗءَ اٰلَ لُوْطِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ جب لوطؑ کے گھر والوں کے پاس فرشتے پہنچے تو لوطؑ نے ان سے کہا بلاشبہ تم اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ یعنی میں نے تم کو نہیں پہچانا تم سے مجھے اندیشہ ہے نہ تو تم پر کوئی سفر کی علامت ہے کہ میں تم کو مسافر سمجھوں اور نہ تم اس بستی کے رہنے والے ہو کہیں تمہاری طرف سے مجھے کوئی دکھ نہ پہنچ جائے۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ فرشتوں نے کہا ہم آپ کے پاس (کافروں کے لئے) وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں ان کو شک رہتا تھا یعنی آپ کو دکھ پہنچانے والی کوئی چیز لے کر نہیں آئے بلکہ آپ کے لئے خوشی کی بات لائے ہیں، جس عذاب سے آپ ان کو ڈراتے تھے اور وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کو عذاب کا خوف ہی نہ تھا وہی عذاب ان کے لئے لائے ہیں۔

وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ اور آپ کے پاس عذاب کی یقینی اطلاع (یا وہ عذاب جو اللہ کے علم میں محقق ہو چکا ہے) لے کر آئے ہیں۔

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ اور ہم (اپنے اس قول میں) بالکل سچے ہیں۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ سو آپ رات کے کسی حصہ میں (یہاں سے) اپنے گھر والوں کو لے کر چلے جائیں اور آپ ان سب کے پیچھے پیچھے رہنا اور نہ دیکھے پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی۔

بقطع من الیل یعنی رات کا آخری پہر۔ بعض نے کہا آخر شب۔ سب کے پیچھے چلنے سے مراد یہ ہے کہ تم ان کو اپنے آگے آگے جلدی سے نکال لے جاؤ اور ان کے احوال پر مطلع رہو۔ پیچھے پھر کر دیکھنے کی ممانعت اس لئے کی گئی کہ ہولناک عذاب کا منظر نہ دیکھنا پڑے کہیں ایسا نہ ہو کہ قوم کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر ان کے دلوں میں نرمی اور رقت پیدا ہو جائے اور اسی لئے ہمدردی کی پاداش میں ان پر بھی وہی عذاب آ جائے۔

لا یلتفت کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کوئی کسی کام کے لئے ساتھ چلنے سے رہ نہ جائے ورنہ وہ بھی یقیناً عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ بعض نے کہا التفات کی ممانعت اس لئے کی گئی کہ دل سے جدائی کے ساتھ وہ ترک وطن کر سکیں (وطن اور احباب و اقارب کی طرف ان کی توجہ کسی طرح بھی پیدا نہ ہو پائے) بعض علماء کے نزدیک عدم التفات سے مراد لفظی ترجمہ نہیں بلکہ کنائی معنی مراد ہیں یعنی سرپٹ نکل جاؤ، سستی نہ کرو، جیسا کہ ہم دوڑتے ہوئے تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جاؤ التفات (رخ کرنے کو اور وقفہ اور توقف کر کے منہ موڑ کر دیکھنے) کو کہا جاتا ہے گویا عدم التفات سے مراد ہے وقفہ نہ کرو اور بلا توقف تیزی کے ساتھ بھاگ جانے

چلا جانا۔

وَامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ۝ اور جہاں جانے کا (اللہ کی طرف سے) تم کو حکم دیا جا رہا ہے وہاں چلے جاؤ یعنی شام کو چلے جاؤ۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ مقاتل کے نزدیک زغر مراد ہے۔ بعض نے اُردن کہا ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ۝ اور ہم نے لوطؑ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی ان کی جڑ بالکل کٹ جائے گی سب ہلاک کر دیئے جائیں گے یعنی لوطؑ کے پاس ہم نے یہ قطعی حکم بھیج دیا کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے بالکل کٹ جائے گی۔ دابر جڑ، یعنی ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا سب کے سب بالکل ہلاک کر دیئے جائیں گے۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ۝ اور شہر والے باہم خوش خبریاں سناتے آ گئے یعنی سدوم بستی کے رہنے والے نوارد خوب صورت لڑکوں کی آمد کی اطلاع پا کر خوشی خوشی باہم کہتے آئے۔ امرد پرست تھے خوب صورت نوارد لڑکوں کی آمد سے ان کا شیطانی جذبہ جوش میں آیا اور خوش خبریاں دینے لگے۔ فرشتے خوب صورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے گھر پہنچے تھے۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ۝ لوطؑ نے کہا یہ میرے مہمان ہیں مجھے رسوا نہ کرو۔ مہمان کی رسوائی میزبان کی رسوائی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ۝ اور اللہ سے ڈرو (اس بے حیائی کی حرکت نہ کرو) اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ تخزون، خزی سے ماخوذ ہے خزی کا معنی ہے ذلت یا خزایۃ سے ماخوذ ہے۔ خزایۃ کا معنی ہے شرمندگی یعنی مجھے شرمندہ نہ کرو۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۝ وہ کہنے لگے کیا ہم تم کو دنیا بھر کے لوگوں کی (وکالت داری لینے اور ہمارے معاملے میں) دخل دینے سے منع نہیں کر چکے تھے۔

اَوَلَمْ نَنْهَكَ کا عطف فعل محذوف پر ہے۔ پورا کلام اس طرح تھا کیا ہم ان کو تمہارے کہنے سے چھوڑ دیں باوجودیکہ ہم نے تم کو منع کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ تم ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان دخل نہ دو اور ہمارے خلاف کسی کو اپنے پاس پناہ نہ دو تاکہ ہم ان سے جو کچھ چاہتے ہیں کریں گے۔ قوم لوطؑ والے (علاوہ امرد پرست ہونے کے) راہزنی بھی کرتے تھے راہگیروں کو لوٹا کرتے تھے حضرت لوطؑ بقدر امکان اس فعل سے ان کو منع کرتے تھے۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۝ لوطؑ نے کہا یہ میری لڑکیاں (موجود) ہیں (تم اپنی خواہش ان سے پوری کر سکتے ہو ان سے نکاح کر لو) اگر خواہش پوری کرنی چاہتے ہو تو ایسا کر لو یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم میرے کہنے پر عمل کرنے والے ہو تو ان سے نکاح کر لو۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝ (اللہ نے فرمایا اے محمد ﷺ) تمہاری زندگی کی قسم یہ لوگ درحقیقت اپنے نشہ میں سرمست ہیں عُمر اور عَمر ہم معنی ہیں۔ عَمر کا لفظ خفیف بھی ہے اور قسم کے موقع پر یہی لفظ بولا جاتا ہے (عُمر کا لفظ قسم کے موقع پر نہیں آتا) بغوی نے ابوالجوزاء کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ محمد ﷺ کی جان سے زیادہ عزیز اللہ نے کسی اور کی جان نہیں پیدا کی اور آپ کی زندگی کے علاوہ کسی اور کی زندگی کی قسم نہیں کھائی۔ عزیز ترین چیز ہی کی قسم کھائی جاتی ہے تمام جانوں میں حضورؐ کی جان اللہ کے نزدیک عزیز تھی اسی کی قسم کھائی۔ يَعْمَهُوْنَ کا معنی ہے سرگرداں ہیں، متحیر ہیں یعنی جب یہ کافر اپنے نشے میں سرمست ہیں تو آپ کی نصیحت کیسے سن سکتے ہیں یا یہ کلام ملائکہ کا ہے جو حضرت لوطؑ کو خطاب کر کے انہوں نے کہا تھا مطلب یہ ہے کہ اے لوطؑ تمہاری زندگی کی قسم یہ لوگ اپنے نشہ میں سرمست ہیں (تمہاری نصیحت نہیں سنیں گے) یا اللہ کا قول ہے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہی ہے اور اللہ نے قوم لوطؑ کی حالت بیان کی ہے مطلب اس طرح ہو گا کہ اے محمد ﷺ آپ کی زندگی کی قسم قوم لوطؑ درحقیقت اپنے نشہ میں مست تھی اور لوطؑ کی نصیحت نہیں

کیا ہے کہ ارادہ سے تغیر کو اپنا راہ اندازہ کرتا ہے اور راستے پر بھی کبھی لوگ چلتے ہیں یہ داوسب کے لئے راہ نما ہوتی ہے۔)

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾ اور حجر والوں نے بلاشبہ پیغمبروں کو جھوٹا قرار دیا

یعنی حضرت صالح کی اور ان پیغمبروں کی تکذیب کی جن کو حضرت صالح نے سچا بتایا تھا۔ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ سے مراد ہے قوم ثمود، حجر ایک وادی کا نام ہے جو مدینہ اور شام کے درمیان تھی۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٨١﴾ اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں لیکن وہ نشانیوں سے منہ پھیرتے رہے۔ آیات سے مراد وہ کتاب ہے جو ان کے نبی پر اتاری گئی تھی (یعنی حضرت صالح کے صحیفے) یا پیغمبر کے معجزات مراد ہیں پتھر سے اونٹنی اور اس کے بچے کا برآمد کرنا، اس اونٹنی کا دودھ بکثرت ہونا اور تالابوں کا سیرابی پی جانا۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿٨٢﴾ وہ لوگ پہاڑ تراش تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ امن میں رہیں۔ یعنی نہایت مضبوط مکان بناتے تھے نہ ان کے گرنے کا اندیشہ ہوتا تھا نہ نقب زنی کا خوف نہ دشمنوں کی طرف سے ویرانی کا اندیشہ تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ انتہائی غفلت کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی طرف سے بے خوف تھے ان کا خیال تھا کہ ہر طرح کے عذاب سے پہاڑوں کے اندر وہ اپنی حفاظت کر سکیں گے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ پھر انکو بھی (عذاب کی) ایک سخت آواز نے صبح ہوتے ہی پکڑ لیا (یعنی صبح شروع ہوتے ہی عذاب آگیا)

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٤﴾ سو ان کے (دنیوی) ہنر ان کے کچھ بھی کام نہیں آئے یعنی مضبوط مکانوں کی تعمیر ہوروں کی فراوانی اور تعداد کی کثرت ان کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکی۔ ہم نے سورۂ توبہ میں غزوۂ تبوک کے بیان کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تبوک کو جاتے ہوئے حجر میں سے گزرے، صحابہ سے فرمایا تھا جن لوگوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا ان کے گھروں اور بستی میں داخل نہ ہو، خدا جانے کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آ جائے جو ان پر آیا تھا حضور ﷺ اس وقت اونٹنی پر سوار تھے چادر سے منہ چھپا کر تیزی کے ساتھ اونٹنی کو دوڑاتے ہوئے وادی سے گزر گئے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے نہیں پیدا کیا۔ یعنی ہم نے آسمان و زمین کی تخلیق حق کے ساتھ کی ہے تاکہ صانع اور اس کی صفات پر اس سے استدلال کیا جا سکے اور منکروں کے خلاف دلیل قائم ہو سکے اور ان کی جہالت کے عذر کا ازالہ ہو جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ یہ کائنات (ہم نے اس طرح) صحیح بنائی ہے کہ یہ شر اور فساد کی مقتضی نہیں ہے بلکہ حکمت تخلیق کا تقاضا ہے کہ ایسے مفسد اور بربادی آفریں لوگوں کو ہلاک کر دیا جائے اور ان کی فساد انگیزی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ اور بلاشبہ قیامت آنے والی ہے۔ اس روز اللہ مشرکوں اور پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے والوں سے انتقام لے گا۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿٨٥﴾ سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کریں۔ یعنی آپ ان سے کوئی تعرض نہ کریں اور ان سے انتقام لینے کی جلدی نہ کریں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ کوئی شبہ نہیں کہ آپ کا رب ہی بہت بڑا خالق ہے اسی نے آپ کو بھی پیدا کیا اور آپ کے دشمنوں کو بھی، سب اسی کے ہاتھ میں تمام امور ہیں۔

الْعَلِيْمُ ﴿٨٦﴾ وہی (نیک و بد اور نیکوکار و بدکار کو) خوب جاننے والا ہے پس ہر ایک کو اس کے اعمال کے موافق جزا و سزا دے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کے مخالفوں کو خوب جانتا ہے لہٰذا آپ کو اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کر دینا چاہئے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسی نے آپ کو پیدا کیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ آپ کے لئے کیا مناسب اور مفید ہے پس اس

وقت در گزر کرنا ہی مناسب ہے آپ در گزر کیجئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دی ہیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔

اَلْمَثَانِيْ مَثْنَاةٌ کی جمع ہے اور مَثْنَاةٌ اسم ظرف ہے یا مُثْنِيَةٌ کی جمع ہے اور مُثْنِيَةٌ اسم فاعل ہے بہر حال اس کا موصوف محذوف ہے یعنی آیات یا سُوَر (سورتیں)

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا سات مثانی سے مراد ہے سورۂ فاتحہ جس کی سات آیات ہیں۔ قتادہ، حسن بصری، عطا اور سعید بن جبیرؓ کا بھی یہی قول ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اُمّ القرآن (سورۂ فاتحہ) سات (آیات) ہیں مثانی (نماز میں بار بار پڑھی جانے والی) اور یہی قرآن عظیم ہے۔ مثانی کہنے کی وجوہ متعدد بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ، حسن اور قتادہ کے نزدیک نماز میں بار بار یعنی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے اس لئے مثانی کہا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورت فاتحہ کے دو حصے ہیں نصف تو اللہ کے لئے جس میں اللہ کی ثنا کی گئی ہے اور نصف دعا ہے جو بندہ کے لئے ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ فرماتا ہے، میں نے (سورۂ) صلوٰۃ (یعنی سورۂ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے لئے آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے الیٰ آخر الحدیث۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

حسین بن فضل نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی ایک بار مکہ شریف میں اور دوسری بار مدینہ پاک میں اور ہر مرتبہ ستر ہزار فرشتے سورۂ فاتحہ کے جلو میں تھے۔ مجاہد نے کہا مثانی کا معنی ہے منتخب چھانٹی ہوئی۔ اللہ نے یہ سورۃ اس امت کے لئے چھانٹ کر رکھ لی تھی کسی دوسری امت کو عطا نہیں فرمائی۔ ابو زید بلخی نے کہا ثَنَيْتُ الْعِنَانَ کا معنی ہے میں نے لگام کو پھیر دیا، موڑ دیا۔ یہ سورۃ بھی شریروں اور بدکاروں کو بدکاری سے پھیر دیتی ہے۔ بعض نے کہا مثانی ثناء سے ہے اس سورۃ میں اللہ کی ثناء کی گئی ہے یعنی اللہ کی عظیم صفات کا بیان ہے۔

سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ سَبْعًا سے مراد ہیں سات سورتیں اور مِنَ الْمَثَانِيْ میں مِنْ بیانیہ ہے (سات سورتیں یعنی مثانی) اور سات سورتوں سے مراد سبع طوال ہیں جن میں سب سے اول سورۂ بقرہ ہے اور انفال و توبہ کا مجموعہ ہے یہ دونوں سورتیں ایک سورت کے حکم میں ہیں اسی لئے دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی جاتی، سطر خالی چھوڑ دی جاتی ہے۔ بعض نے کہا سبع طوال میں آخری سورہ صرف سورۂ توبہ ہے۔ بعض کے نزدیک آخری سورت یونس ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے مثانی کہنے کی یہ وجہ بیان کی کہ ان ساتوں سورتوں میں فرائض، حدود، امثال، خیر و شر اور عبرت آفریں الفاظ (و قصص) کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔[1]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ مثانی ثناء سے مشتق ہے قرآن بلاغت اور اعجاز کے لحاظ سے ثناء کردہ بھی ہے اور اللہ کی صفات کو اس نے بیان بھی کیا ہے۔ اس لئے ثناء کرنے والا بھی ہے۔

محمد بن نصر نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے توریت کی جگہ مجھے سبع طوال

---

[1] حضرت عمر بن خطابؓ نے آیت لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کے ذیل میں فرمایا یعنی سبع مثانی سبع طوال و سات طویل سورتیں ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور سفیانؒ وغیرہ ہم کی طرف بھی یہ قول منسوب ہے مثانی کہنے کی (یہی معنی) تو سارا قرآن ہے پورے قرآن میں ایک ہی قصہ بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ مظہری۔

عطا فرمائی ہے اور انجیل کی جگہ مئین والی سورتیں (سو آیتوں والی سورتیں) عطا فرمائی ہیں اور زبور کی جگہ مثانی سے مفصل والی سورتوں تک عنایت کی ہیں اور مفصل والی سورتیں مزید عطا فرمائی ہیں اور مفصلات کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا (یعنی مجھے خاص طور پر مفصلات عطا فرمائی ہیں) سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سبع طوال عطا کی گئیں (سات طویل سورتیں عطا کی گئیں) اور حضرت موسیٰؑ کو چھ عطا کی گئیں پھر جب حضرت موسیٰؑ نے تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں تو دو سورتیں اٹھا لی گئیں چار باقی رہ گئیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبع مثانی سے حم والی سورتیں مراد ہیں بغوی نے اپنی سند سے حضرت ثوبانؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے توریت کی جگہ مجھے سبع طوال عطا فرمائی اور انجیل کی جگہ مئین عطا فرمائی اور زبور کی جگہ مثانی اور میرے رب نے مفصلات مزید عنایت کیں۔

طاؤس کا قول ہے کہ مثانی سے مراد پورا قرآن ہے آیت میں آیا ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ قرآن کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں واقعات و قصص کا بیان لوٹ لوٹ کر بار بار کیا گیا ہے۔ اس قول پر من المثانی میں من تبعیض کے لئے نہ ہوگا اور سبع سے مراد سات سورتیں ہوں گی (یعنی قرآن کی سات سورتیں ہم نے تم کو دیں)

بعض کے نزدیک مثانی سے مراد پورا قرآن ہے اور سبع سے مراد ہیں ساتوں اجزاء (یعنی قرآن کو سات حصوں پر تقسیم کیا جائے تو ساتوں حصے یعنی پورا قرآن مراد ہے) اس قول پر والقرآن العظیم کا عطف صرف الفاظ صفت کی وجہ سے ہوگا (جیسے کہا جاتا ہے یہ عالم ہے اور شریف الدار ہے اور شریف النسب ہے)

بہر حال اقوال مذکورہ بالا کے لحاظ سے القرآن العظیم کا عطف ایسا ہوگا جیسے کل کا اس کے جزء پر کیا جاتا ہے یا ایسا ہوگا جیسا عام کا خاص پر عطف ہوتا ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ۔ آپ اس چیز کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو برتنے کے لئے دی ہے۔ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے آنکھیں اٹھانے سے مراد ہے لالچ اور رغبت کے ساتھ نظر اٹھا کر دیکھنا۔ ازواج کا معنی ہے اصناف یعنی قسم قسم کے کافروں کو جو ہم نے دنیاوی نعمتیں عطا کی ہیں آپ ان کی طرف رغبت اور پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھیں کیونکہ آپ کو جو قرآن دیا گیا ہے اس کے مقابلے میں یہ ساری نعمتیں حقیر ہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے مسند میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر اللہ نے کسی کو قرآن عطا فرمایا ہو اور کسی دوسرے شخص کو دنیا عطا کی ہو اور حامل قرآن اللہ کی دی ہوئی اس نعمت سے بہتر خیال کرے جو اس کو دی گئی تو اس نے بڑی نعمت کو چھوٹی اور چھوٹی کو بڑی قرار دے دیا (یعنی نعمت قرآن اعلیٰ ہے اور نعمت دنیا ادنیٰ۔ جو شخص نعمت دنیا کو نعمت قرآن پر ترجیح دے اس نے ادنیٰ کو اعلیٰ اور اعلیٰ کو ادنیٰ بنا دیا)

بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ کا مطلب سفیان بن عیینہ نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص قرآن کی نعمت پا کر (ساری دنیا کی دولت سے) بے نیاز نہ ہو جائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

بخاری اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور امام احمد و ابوداؤد و ابن حبان و حاکم نے حضرت سعدؓ کی روایت سے اور ابوداؤد نے ابو لبابہ کی وساطت سے عبدالجبار کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ و حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کرو اللہ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو (کبھی) نہیں مرے گا۔ بغوی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں، کسی فاجر پر (اس کی) نعمت کی وجہ سے رشک نہ کرو تم کو نہیں معلوم کہ مرنے کے بعد اس کو کیا پیش آنے والا ہے اللہ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو (کبھی) نہیں مرے گا۔ وہب بن منبہ کو جب اس حدیث کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے ابوداؤد اعور کو بھیج کر دریافت کرایا کہ نہ مرنے والے قاتل کا کیا مطلب ہے۔ عبداللہ بن مریم نے کہا اس سے مراد ہے دوزخ کی آگ۔ مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اپنے سے نیچے والے کو دیکھو اوپر والے کو نہ دیکھو اللہ کی جو نعمت تم کو حاصل ہے اس کو حقیر نہ سمجھنے کے لئے یہی (تدبیر) زیادہ مناسب ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ اور کافروں کا کچھ غم نہ کیجئے کہ یہ ایمان نہیں لائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم کو جو کافروں کی طرح دنیا نہیں ملی اس کی وجہ سے کافروں کی نعمت پر کچھ دل تنگ نہ کرو۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۸﴾ اور مسلمانوں پر شفقت رکھیے۔ یعنی مومنوں سے نرمی کیجئے ان کے ساتھ رہ کر تم ان کا بازو ہو کیجیے۔

وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿۸۹﴾ اور (کافروں سے) کہہ دو کہ میں واضح طور پر (تم کو اللہ کی نافرمانی اور عذاب سے) ڈرانے والا ہوں (کھول کھول کر واضح دلائل کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ تم ایمان نہ لائے تو اللہ کا عذاب تم پر آجائے گا)۔

كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿۹۰﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِينَ ﴿۹۱﴾ (ایسا ہی عذاب) جیسا عذاب ہم نے ان لوگوں پر نازل کیا جنہوں نے حصے مقرر کر رکھے تھے یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دے رکھے تھے (بعض حصوں کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں مانتے تھے تم پر بھی نازل کریں گے)۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد ہیں یہودی اور عیسائی۔ طبرانی نے اوسط میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا آیت كَمَا أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ (میں مقتسمین) سے مراد کیا ہے۔ فرمایا یہودی اور عیسائی۔ سائل نے دریافت کیا عِضِينَ کا کیا مطلب ہے فرمایا بعض حصہ پر ایمان لائے بعض کا انکار کر دیا۔

عضین عِضَةٌ کی جمع ہے۔ عضہ کا معنی ہے ٹکڑا، ایک پارہ (قاموس) عِضَةٌ کی اصل عِضْوَةٌ تھی۔ عَضَّى الشَّاةَ یعنی اس نے بکری کے اعضاء جدا جدا کر دیئے یہود و نصاریٰ نے بھی قرآن کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے ایک کو حق اور دوسرے کو باطل کہتے تھے۔ جس کو حق کہتے تھے اس کے متعلق کہتے تھے یہ توریت و انجیل کے موافق ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور جس حصہ کو باطل قرار دیتے تھے اس کے متعلق کہتے تھے یہ توریت و انجیل کے خلاف ہے اس لئے غلط ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض اہل کتاب بطور استہزاء کہتے تھے سورۂ بقرہ میری ہے، دوسرا کہتا تھا آل عمران میری ہے۔

مجاہد نے کہا الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور قرآن سے مراد وہ (عیسائی مذہب کی) کتابیں ہیں جو اہل کتاب پڑھتے تھے یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتاب کو بانٹ لیا تھا (یعنی اقرار تو کرتے تھے) مگر اس کو چھوڑ دیا تھا۔

بعض علماء نے کہا الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد ہیں قرآن کے متعلق مختلف خیالات رکھنے والے کافر کوئی قرآن کو جادو کہتا تھا کوئی شاعری کوئی کہانت اور کوئی داستان پارینہ۔

بعض علماء کا قول ہے کہ الْمُقْتَسِمِينَ سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ان کے اقوال بٹے ہوئے تھے کوئی آپ کو جادوگر کہتا تھا، کوئی شاعر کوئی کاہن۔

مقاتل کی روایت ہے کہ حج کے زمانہ میں ولید بن مغیرہ نے سولہ آدمی مکہ کی گھاٹیوں، مختلف راستوں اور موڑوں پر اس غرض سے مقرر کر دیئے تھے کہ جو کوئی باہر سے محمد ﷺ کے پاس آئے اس سے کہہ دیں کہ تم اس کے قریب بھی نہ آنا مقرر کردہ لوگوں میں سے کچھ لوگ تو کہیں یہ شخص دیوانہ ہے کچھ کہیں کاہن ہے کچھ کہیں شاعر ہے۔ خود ولید کعبہ کے دروازے پر جا کر بیٹھ گیا جب اس سے دریافت کیا گیا کہ کچھ لوگ ساحر کچھ شاعر کچھ مجنون کہتے ہیں تمہارا کیا فیصلہ ہے ولید نے کہا سب باتیں ٹھیک ہیں سب لوگ سچ کہتے ہیں۔

اب اگر مقتسمین سے مراد یہودی لئے جائیں تو اللہ کی طرف سے جو عذاب ان پر آیا وہ بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر

کے ملک بدر کئے جانے کی صورت میں نمودار ہوا اور اگر مُقتسمین سے مراد قریش (ولید کے مقرر کئے ہوئے اشخاص) ہوں تو بدر کی شکست کی شکل میں ان پر اللہ کا عذاب آیا۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک مُقتسمین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت صالح کو رات میں قتل کر دینے کا مشورہ کیا تھا اور اس پر قسمیں کھائی تھیں (اس صورت میں الْمُقْتَسِمِيْن کا ترجمہ ہوگا قسمیں کھانے والے)

بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ عِضِيْن عِضَةٌ کی جمع ہے اور عِضَةٌ کی اصل عِضْهَةٌ تھی جیسے شَفَةٌ اصل میں شَفْهَةٌ تھا عِضْهَةٌ جھوٹ اور بہتان کو کہتے ہیں۔ صاحب قاموس نے عِضَةٌ کا معنی کذب لکھا ہے۔ حدیث بیعت میں آیا ہے کہ اِيَّاكُمْ وَالْعِضْهَةَ بہتان تراشی سے بچو۔ زمخشری نے کہا کہ عِضَةٌ اصل میں عِضْهَةٌ بروزن فِعْلَةٌ تھا اور عِضْهَةٌ کا معنی ہے بہتان۔ کذا فی النہایۃ للجزری۔

بعض اہل لغت کا قول ہے کہ اَلْعِضَةُ کا معنی ہے جادو۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ العضون بمعنی جادو ہے عِضْهَةٌ کی جمع ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے لَعَنَ اللّٰهُ الْعَاضِهَةَ وَالْمُسْتَعْضِهَةَ جادو کرنے والی اور جادو کرانے والی پر اللہ کی لعنت (النہایہ)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کَمَا اَنْزَلْنَا کا تعلق وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سے ہو اور اٰتَيْنَا کا معنی ہو اَنْزَلْنَا اور اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْن سے مراد (عذاب نازل کرنا نہ ہو بلکہ) توریت و انجیل نازل کرنا ہو۔ مطلب اس طرح ہوگا ہم نے آپ پر سبع مثانی نازل کیں جیسے یہود و نصاریٰ پر توریت و انجیل اتاری۔

اس صورت میں آیت لَا تَمُدَّنَّ سے آخر آیت تک جملہ معترضہ ہوگی۔ اور الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ الْمُقْتَسِمِيْن کی صفت ہوگی۔ لیکن اگر الْمُقْتَسِمِيْن سے مراد وہ لوگ ہوں جنہوں نے صالح کو قتل کرنے کا باہم مشورہ کیا تھا تو اَلَّذِيْنَ جَعَلُوا مبتدا ہوگا اور آئندہ آیت خبر۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ پس قسم ہے آپ کے رب کی (یعنی ہم کو اپنی ذات کی) کہ ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور باز پرس کریں گے۔ اعمال میں گناہ بھی داخل ہیں اور کفر بھی اور قرآن کی تکذیب بھی اور اس کو جادو قرار دینا بھی سوال کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم ان سے باز پرس کریں گے اور ان کو ان کے کئے کی سزا بھی دیں گے۔

بغوی نے محمد بن اسماعیل بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ متعدد علماء کے نزدیک عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ سے مراد ہے لا الٰہ الا اللّٰہ (یعنی لا الٰہ الا اللّٰہ کی بابت ہم ان سے باز پرس کریں گے)

ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم ان سے باز پرس کریں گے کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ کے متعلق۔

مسلم نے حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (پل) صراط سے کسی بندہ کے قدم اس وقت تک ہٹیں گے (یعنی کوئی شخص اس وقت تک پل صراط سے پار نہیں ہوگا) جب تک اس سے چار باتوں کی پوچھ نہ ہو جائے گی۔ اس وقت سوال کیا جائے گا عمر کے متعلق کہ کس کام میں ختم کی اور (سوال ہوگا) جسم کے متعلق کہ کس کام میں اس کو گھسایا (یعنی جسمانی طاقتیں کس کس کام میں صرف کیں) اور (سوال ہوگا) علم کے متعلق کہ علم کے بعد کیا عمل کیا اور (سوال ہوگا) مال کے متعلق کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ ترمذی اور ابن مردویہ نے حدیث اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

اصبہانی نے ترغیب میں اور طبرانی نے (الاوسط میں) حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم (سکھانے) میں باہم خیر خواہی سے کام لو، کوئی کسی سے علم پوشیدہ نہ رکھے، علم میں خیانت کرنا مال میں خیانت کرنے

سے زیادہ سخت ہے۔ اللہ کسی کی بھی قسم سے ضرور بازپرس کرے گا۔

ابونعیم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ جو قدم بھی (کسی مقصد کے لئے) اٹھاتا ہے اللہ اس مقصد کی اس سے ضرور بازپرس کرے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص لوگوں کی امامت کرے اس کو اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور یہ جان لینا چاہئے کہ وہ (مقتدیوں کا) کفیل ذمہ دار ہے۔ اس کی ذمہ داری کے متعلق اس سے بازپرس ہوگی اگر اس نے امامت اچھی (طرح، صحیح) کی ہوگی تو اس کو پیچھے والوں کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا اور اگر کوئی کمی ہوگی (یعنی نماز میں کچھ نقص ہوا ہوگا) تو اس کا گناہ بھی امام پر پڑے گا۔ ابونعیم نے حلیہ میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا معاذ مؤمن سے قیامت کے دن اس کے تمام کاموں کی بازپرس ہوگی یہاں تک کہ آنکھوں میں سرمہ (لگانے) کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔

بیہقی اور ابن ابی الدنیا نے حسن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ کوئی خطبہ دیتا ہے اللہ اس سے اس خطبہ اور خطبہ کی اصلی مراد کے متعلق ضرور بازپرس کرے گا۔ یہ حدیث مرسل ہے (حسن بصری تابعی ہیں صحابی کا نام روایت میں نہیں ہے)

ابن ابی حاتم نے ابن عبداللہ کلاعی کا قول نقل کیا ہے کہ جہنم کے سات پل ہیں اور صراط ان کے اوپر ہے۔ تمام مخلوق کو پہلے پل پر روک لیا جائے گا حکم ہوگا ان کو قصر الوالان سے بازپرس کی جائے گی یعنی نماز کی حساب فہمی اور بازپرس ہوگی ہلاک ہونے والا ہلاک ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا دوسرے پل پر پہنچیں گے تو امانت کی بابت سوال ہوگا کہ کیسے ادا کی اور کیسے اس میں خیانت کی یہاں بھی تباہ ہونے والا تباہ ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا۔ پھر تیسرے پل پر پہنچیں گے تو رشتہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ سلسلہ قرابت کو جوڑا یا توڑا، یہاں بھی مرنے والا مرے گا اور بچنے والا بچ جائے گا رحم اس روز نیچے کی طرف آویختہ ہوگا اور عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملائے رکھا ہو تو بھی اس کو اپنے سے ملائے اور جس نے مجھے توڑا ہو تو بھی اس سے قطع تعلق کر لے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے قیامت کے دن اللہ بندہ سے سوالات کرے گا یہاں تک کہ فرمائے گا جب تو نے بری بات دیکھی تو اس کا رد کیوں نہیں کیا اس وقت اللہ خود اس کے دل میں صحیح جواب ڈال دے گا بندہ عرض کرے گا میرے رب میں تجھ سے امید لگائے ہوئے تھا اور لوگوں سے مجھے ڈر تھا (اس لئے خاموش رہا اور اس کام کو دل سے برا جانتا رہا)

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک (ذمہ دار) نگراں ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق بازپرس اس سے کی جائے گی حاکم سب لوگوں کا ذمہ دار اور نگراں ہے اس سے اس کی رعیت کی بازپرس کی جائے گی۔ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے۔ اس سے گھر والوں کے متعلق بازپرس ہوگی عورت اپنے شوہر کے گھر والوں کی اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہوگی اس سے (اس کے ماتحتوں کے متعلق بازپرس ہوگی۔ غلام (یعنی خادم) اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے اس سے آقا کے مال کے متعلق بازپرس ہوگی غرض تم میں سے ہر ایک نگراں (یعنی ذمہ دار) ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق اس سے بازپرس ہوگی اس موضوع کی احادیث حضرت انسؓ کی روایت سے ابن حبان، ابونعیم اور طبرانی نے بھی بیان کی ہیں۔

طبرانی نے الکبیر میں حضرت مقدامؓ کی روایت سے نقل کیا ہے حضرت مقدامؓ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے جو شخص بھی کسی قوم پر (مسلط، پیشوا، حاکم، لیڈر وغیرہ) ہوگا قیامت کے دن وہ اس قوم کے آگے آگے جھنڈا اٹھائے ہوگا اور وہ لوگ اس کے پیچھے ہوں گے۔ قوم کے متعلق اس سے بازپرس کی جائے گی اور قوم والوں سے اس

کی بابت نہ پوچھا جائے گا۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو امیر دس آدمیوں کا بھی حاکم ہو گا قیامت کے دن اس سے ان کے ماتحتوں کے متعلق باز پرس ہو گی (سوال کے سلسلہ کی احادیث بکثرت آئی ہیں)

ایک شبہ: آیت لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ اور اس کے ہم معنی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک سے اس کے اعمال کی باز پرس ضرور ہو گی لیکن آیت فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ سے سوال کی نفی ہوتی ہے بظاہر دونوں میں تضاد ہے۔

ازالہ

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سوال نہ ہو گا کہ تم نے یہ عمل کیا تھا۔ اللہ کو اس سوال کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر کسی کے عمل کا اس کو علم ہے بلکہ باز پرس اس بات کی ہو گی کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔

بیہقی نے ابو طلحہ کی سند سے بھی حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قطرب نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ سوال کی دو قسمیں ہیں:

(۱) علم حاصل کرنے کے لئے جس کو استفہام یہ سوال کہا جاتا ہے۔

(۲) زجر و توبیخ کے لئے۔ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖ میں استفہامیہ سوال کی نفی کی گئی ہے اور لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ میں زجر و توبیخ کے لئے سوال کرنے کی صراحت کی ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، قیامت کا دن بہت طویل ہو گا اس میں متعدد موقف اور کھڑے ہونے کے مقامات ہوں گے بعض مقامات پر اعمال کی باز پرس ہو گی بعض مقامات پر کوئی سوال نہ ہو گا۔ یہی تاویل ان آیات کی ہے جن میں بولنے اور نہ بولنے کا تضاد معلوم ہوتا ہے ایک آیت ہے ھٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ یہ ایسا دن ہو گا کہ لوگ کچھ نہ بول سکیں گے دوسری آیت ہے يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ قیامت کے دن تم رب کے پاس جھگڑا کرو گے (کذا اخرج الحاکم)

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ جو آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اس کو علی الاعلان بیان کر دیجئے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اِصْدَعْ کا ترجمہ کیا ہے ظاہر کرو، اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اظہار دعوت کا حکم دیا ہے۔ عبداللہ بن عبیدہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے رسول اللہ ﷺ اسلام و ایمان کی دعوت پوشیدہ طور پر دیا کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی کھل کر سامنے آ گئے۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ اِصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا ترجمہ ہے "دعوت جاری رکھو" ضحاک نے ترجمہ کیا "اطلاع دے دو اعلان کر دو"۔ اخفش نے کہا قرآن کے ذریعہ سے حق کو باطل سے جدا کر دو۔ سیبویہ نے کہا جیسا تم کو حکم دیا جا رہا ہے اسی کے موافق فیصلہ کرو۔ لغت میں صَدْعٌ کا معنی ہے الگ الگ کر دینا (پھاڑ دینا) جدا جدا کر دینا۔ منقل کر دینا (لغوی معنی کی مناسبت سے علماء نے مراد کی معنی جدا جدا بیان کیے ہیں)

وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

اور مشرکوں کی طرف کوئی توجہ نہ کرو (یعنی مشرکوں کی پرواہ نہ کرو۔ مترجم) بعض علماء نے کہا آیت قتال سے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝ یہ لوگ (جو آپ پر) استہزاء کرتے ہیں ان سے نمٹنے کے لئے ہم کافی ہیں یعنی ان کی جڑ کاٹ دیں گے ان کو تباہ کر دیں گے۔ بغوی نے لکھا ہے اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم اللہ کا حکم پکار کر سناؤ۔ اللہ کے سوا کسی سے مت ڈرو۔ تمہارے لئے اللہ کافی ہے مذاق اڑانے والوں اور تم سے تمسخر کرنے والوں کے مقابلے میں بھی اللہ نے تمہاری مدد کی۔ رسول اللہ ﷺ سے استہزاء کرنے والے اور آپ کی ہنسی اڑانے والے قریش کے پانچ سردار تھے۔ (۱) ولید بن مغیرہ مخزومی یہ سب کا سرگروہ تھا۔ (۲) عاص بن وائل سہمی۔ (۳) اسود بن مطلب بن حارث بن اسد بن عبدالعزیٰ رسول

تیر نہیں نکالا آخر تیر کی پوری کسی رگ میں لگ گئی اور اسی زخم سے وہ مر گیا۔ حضرت جبرئیلؑ نے عاص کے تلوے کی طرف اشارہ کیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تلوے میں کوئی کانٹا چبھ گیا پاؤں سوج کر چکی کی طرح ہو گیا اور وہ مر گیا۔ عدی بن قیس کی ناک کی طرف اشارہ کیا ناک سے پیپ بہنے لگی اور اسی سے اس کا انتقال ہو گیا۔ اسود بن عبد یغوث کے سر کی طرف اشارہ کیا تھا ایک روز یہ شخص کسی درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سر کو درخت سے ٹکرانے اور منہ کو کانٹوں (والی ٹہنی) سے پیٹنے لگا آخر مر گیا۔ اسود بن مطلب کی آنکھوں کی جانب اشارہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اندھا ہو گیا۔

بزار اور طبرانی نے حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کچھ لوگوں کی طرف سے گذرے ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی پشت کی طرف طعن آمیز اشارہ کر کے کہا یہی وہ شخص ہے جو اپنے کو نبی کہتا ہے اس وقت جبرئیلؑ حضور ﷺ کے ساتھ تھے جبرئیلؑ نے ان کی طرف اشارہ کیا جس کی وجہ سے ناخن کے نشان کی طرح ان کے جسموں پر نشان ہو گیا آخر وہ نشان پھوڑا بن گیا اور سڑ گیا اور ایسا سڑ گیا کہ کوئی پاس بھی نہیں جاتا تھا انہیں لوگوں کے متعلق آیت اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ نازل فرمائی۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود (کو شریک) قرار دیتے ہیں یقیناً ان کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا انجام کار کیا ہوا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ اور ہم یقیناً واقف ہیں کہ ان کے قول سے آپ کے دل کو کوفت ہوتی ہے یعنی آپ کے سینہ میں غصہ کا ابال ہوتا ہے اور آپ اس کو پورا نہیں کر سکتے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ آپ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیں۔ یعنی ہر چیز سے دل کو خالی کر کے اللہ کی حمد و تسبیح (اللہ کی پاکی کے اعتراف و اظہار) میں مشغول ہو جائیے اللہ آپ کی کارسازی کرے گا۔ حمد و تسبیح میں مشغول ہونے سے دل کو کوفت اور سینہ کی بندش دور ہو جائے گی اور شدت غضب فرو ہو جائے گی یا یہ مطلب ہے کہ ان کے (مشرکانہ اور کافرانہ) اقوال سے اللہ کے پاک ہونے کا اظہار کیجئے اور اس کے ساتھ اللہ کا شکر کیجئے کہ اللہ نے حق کا راستہ آپ کو دکھا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے (تسبیح و حمد سے مراد لی ہے نماز اور آیت کی تشریح میں) فرمایا آپ اپنے رب کے حکم کے موافق نماز پڑھئے۔

وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ اور نماز پڑھنے والوں میں رہیں۔ ساجدین سے مراد ہیں تواضع اور اظہار فروتنی کرنے والے۔ ضحاک کے نزدیک نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔ امام احمد، ابوداؤد، ابن جریر نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کے بھائی حضرت عبدالعزیز کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی امر مشکل پیش آتا تھا تو آپ (فوراً) نماز کی طرف رجوع کرتے تھے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ اور وقت موت آنے تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں۔ یقین سے مراد ہے موت۔ ہر زندہ کے لئے موت کا آنا یقینی ہے یعنی جب تک آپ زندہ ہیں۔ رب کی عبادت میں مشغول رہیں، عبادت کو ترک نہ کریں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کا قول بھی اسی مضمون کا نقل فرمایا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا: اَوْصَانِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا۔

بغوی وغیرہ نے حضرت جبیر بن نفیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے مال جمع کرنے اور تاجر بن جانے کا حکم بذریعہ وحی نہیں دیا گیا بلکہ میرے پاس تو وحی بھیجی گئی کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مینڈھے کی کھال اوڑھے اور اسی کا نطاق باندھے سامنے سے آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا اس کو دیکھو اللہ نے اس کے دل کو نورانی کر دیا میں نے وہ وقت بھی اس کا دیکھا تھا کہ اس کے ماں باپ اس کو اعلیٰ قسم کی غذا کھلاتے پلاتے تھے ایک جوڑا اس کے بدن پر دو سو درہم کا تھا۔ لیکن اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نے اس کی یہ حالت کر دی جو تمہارے سامنے ہے۔

(۲۹ ربیع الاول ۱۴۰۰ھ ... [illegible])
(... [illegible])

سُوْرَةُ النَّحْلِ

اس سورۃ کی ١٢٨ آیات ہیں اور آخری تین آیات کو چھوڑ کر باقی سورت مکی ہے ابن اسحاق و ابن جریر نے عطاء بن یسار کا قول نقل کیا ہے کہ اس سورت کے آخری تین آیات تو مدینہ میں جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھیں باقی سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ جنگ احد میں حضرت حمزہؓ شہید ہو گئے تھے اور کافروں نے آپ کو مُثلہ بھی کیا تھا اور (شدت غضب میں) حضور ﷺ نے فرمایا تھا اگر ہم ان پر غالب آئے تو ہم بھی ان کو ایسا مُثلہ کریں گے کہ کسی عرب نے کسی عرب کو نہیں کیا ہو گا۔ اسی پر اللہ نے آیت وَاِنْ عَاقَبْتُمْ نازل فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ اللہ کا حکم آپہنچا۔ یعنی قریب آگیا ابن عرفہ نے کہا جس چیز کی (یقینی) توقع ہو عرب اس کے لئے کہتے ہیں وہ چیز ہو گئی آیت میں امر الٰہی کے قریب الوقوع یا یقینی الوقوع ہونے کی وجہ سے اَتٰى ماضی کا صیغہ استعمال کیا جو بات آئندہ یقینی طور پر ہونے والی ہو اور اسکا ہونا لازم ہو اس کو بصیغہ ماضی بیان کر دیتے ہیں (صیغہ ماضی سے شاید اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کام ضرور ہو گا اور عنقریب ہو گا مترجم) امر اللہ سے مراد ہے قیامت کا آنا (کلبی وغیرہ) مراد یہ ہے کہ قیامت کا آنا ضروری ہے تم اس کا یقین رکھو اور یہ سمجھو کہ گویا آگئی اس لئے تیاری کرو۔

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ اس کے جلد آجانے کی مانگ نہ کرو (وہ تو بہر حال آئے گی اور تمہارے لئے اس کے آنے میں کوئی منفعت ہو گی اس لئے جلد آنے کی خواہش تمہارے لئے ضرر رساں ہے)

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ نازل ہوئی تو بعض کافروں نے کہا یہ شخص کہتا ہے کہ قیامت کی گھڑی قریب آگئی اچھا تم (کچھ دنوں کے لئے) اپنے موجودہ مشاغل و اعمال ترک کر دو ہم بھی تو دیکھیں کہ آخر کیا ہونے والا ہے لیکن جب کچھ مدت تک انتظار کرنے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا (اور قیامت نہ آئی) تو کہنے لگے تم جس چیز سے ہم کو ڈراتے ہو اس کا تو نام و نشان بھی نہیں پیدا ہوا اس پر آیت اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ نازل ہوئی۔ یہ آیت سن کر کافر خوف زدہ ہو گئے اور کچھ مدت تک مزید انتظار کیا لیکن طویل انتظار کے بعد بھی جب کچھ نہ ہوا تو کہنے لگے محمد ﷺ! تم ہم کو ڈراتے ہو اور ہوا کچھ بھی نہیں ہے اس وقت اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ نازل ہوا۔ اس جملہ کے نزول پر رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے اچھل پڑے اور لوگوں نے اپنے سر اوپر اٹھا کر دیکھا اور خیال کیا کہ قیامت حقیقت میں آہی گئی اس پر (آخری فقرہ) فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوا اس وقت لوگوں کو اطمینان ہوا اور (گھبراہٹ رفع ہوئی)

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ نازل ہوا تو صحابہ خوف زدہ ہو گئے اس پر فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوا استعجال کا معنی ہے وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل

ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (سبابہ اور وسطیٰ) سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا میں اور قیامت ان دونوں کی طرح (متصل) بھیجے گئے ہیں (شاید حضور ﷺ کی یہ مراد ہو کہ میرے بعد قیامت تک اور کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور میری نبوت کا دور قیامت تک باقی رہے گا۔ مترجم)

ترمذی نے حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے عین قیامت کے وقت میں ہی بھیجا گیا مگر میں قیامت سے آگے آ گیا جیسے یہ (انگلی) اس (انگلی) سے پہلے ہے (اگرچہ دونوں ساتھ ہی ساتھ ہیں) حضور ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں سبابہ اور وسطیٰ سے اشارہ کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت قیامت کی علامات میں سے ہے جب رسول اللہ ﷺ کے پاس جب (پیام بعثت لے کر) حضرت جبرئیل کو بھیجا گیا اور اثناء راہ میں آپ آسمان والوں کی طرف سے گذرے تو اہل سماوات نے کہا اللہ اکبر قیامت بپا ہو گئی۔

بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ اَمْرُ اللّٰہِ سے مراد ہے سزا اور عذاب یعنی قتل۔ واقعہ یہ ہوا کہ نضر بن حارث نے کہا تھا اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے پس کافروں نے وقت سے پہلے عذاب کی مانگ کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ نضر کو بدر کے دن قتل کیا گیا۔

سُبْحٰنَهٗ میں اللہ کی پاکی کا اظہار کرتا ہوں (جیسی پاکی اس کے لائق ہے۔ مترجم)

وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اور وہ اپنی (صفات قدسیہ میں) ان کے شرک سے بزرگ و بالا ہے یعنی یہ جو خیال کرتے ہیں کہ اللہ کا کوئی شریک ہے اور وہ ان کو اللہ کے عذاب سے بچا لے گا اللہ اس سے اعلیٰ اور بالا ہے یا یہ مراد ہے کہ اللہ ان کے شرکیہ بیان سے بالا ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ وہ روح دے کر فرشتوں کو اتارتا ہے۔ روح سے مراد ہے وحی یا قرآن۔ قرآن سے مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں (جیسے روح کے تعلق سے بے جان جسم زندہ ہوتے ہیں)

مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے یعنی جس کو رسول بنانا چاہتا ہے۔

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ کہ خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں سو مجھ سے ڈرتے رہو۔

اَنْذِرُوْا (ثلاثی مزید متعدی) بتا دو، اطلاع دے دو۔ نَذِرْتُ بِهٖ کذا (ثلاثی مجرد لازم) میں نے ایسا بات کا علم لیا اور اَنْ تفسیر یہ ہے کیونکہ روح سے مراد وحی ہے یعنی ملائکہ کو ہم نے منتخب بندوں کے پاس وحی دے کر بھیجتے ہیں کہ لوگوں کو بتا دو۔ اَنْ مصدریہ ہے اور حرف جر محذوف ہے بِاَنْ اَنْذِرُوْا تھا اَنْذِرُوْا کا ترجمہ ڈراؤ خوف دلاؤ بھی ہو سکتا ہے یعنی مشرکوں اور کافروں کو عذاب سے ڈراؤ اور یہ بتاؤ کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں لہٰذا مجھ سے ڈرو۔

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ وحی کا تعلق دو چیزوں سے ہے ایک تو توحید جو علمی قوت کے کمال کا انتہائی درجہ ہے دوسرا تقویٰ جو عملی قوت کا آخری تکمیلی مرتبہ ہے توحید کو ثابت کرنے کے لئے اللہ نے ذیل کی آیات میں اپنی خود مختارانہ حکمت، مصلحت آگیں خلاقیت کو بیان کیا ہے اگر کوئی دوسرا شریک ہوتا تو اس میں بھی خلاقیت اور ایجاد کی قدرت ہوتی اور دو خود مختار کامل قدرت رکھنے والوں میں ٹکراؤ ممکن ہوتا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا۔ یعنی خاص مقدار، خاص شکل و وضع اور مختلف صفات کے ساتھ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے درست کیا۔ اس کی ایجاد بتا رہی ہے کہ اس کو بنانے والا واحد، بے مثال، قادر مطلق اور حکیم کامل ہے۔

تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝ اللہ بالا ہے ان کے شرک سے۔ یعنی زمین و آسمان میں سے کسی کو اللہ کا شریک قرار دیا جائے اس سے اللہ بزرگ و برتر ہے یہ مطلب ہے کہ اللہ برتر ہے اس بات سے کہ وہ اپنی ہستی یا بقاء ہستی میں زمین و آسمان میں سے کسی چیز کا محتاج ہو زمین و آسمان تو خود اپنی تخلیق پر بھی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ کے غیر جسمانی ہونے پر تنبیہ ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اللہ نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا یعنی ایک سیال بے جان بوند سے انسان کو پیدا کیا جس میں نہ حس ہے نہ حرکت نہ وہ اپنی ہیئت و وضع کو محفوظ رکھ سکتی ہے نہ شکل کو۔ (رفتہ رفتہ انسان) جب خوب طاقتور ہو گیا تو

فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ۝ پھر یکدم وہ کھلم کھلا جھگڑنے لگا۔

خَصِيْمٌ تیز زبان جھگڑالو۔ مُبِيْنٌ یعنی نفی قیامت کی دلیل بیان کرنے والا جو بطور دلیل کہتا ہے مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ بوسیدہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ سے مراد ہے ذات سے قول کر جھگڑا کرنے والا۔

بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول ابی بن خلف جمحی کے متعلق ہوا ابی بن خلف منکر قیامت تھا ایک روز وہ ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور بولا کیا تم کہتے ہو کہ خدا اس کو زندہ کرے گا یہ تو بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو گئی (یہ کیسے زندہ ہو گی) اسی کی بابت آیت وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ بھی نازل ہوئی تھی۔

سدی نے آیت اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ کا نزول بھی اسی قصہ کے متعلق بیان کیا ہے (رواہ ابن ابی حاتم) آیت کا نزول کسی خاص شخص کے متعلق ہوا ہو لیکن الفاظ میں عموم ہے (ہر منکر قیامت جو دوسری زندگی کا قائل نہ ہو اسی حکم میں داخل ہے) مطلب یہ ہے کہ منکر قیامت اتنا نہیں سمجھتا کہ جب اللہ نے بے جان نطفہ سے اس کو پیدا کر دیا تو بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اس کے لئے کیا دشوار ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ اور اسی نے چوپایوں کو پیدا کیا ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ الانعام سے مراد ہیں اونٹ، گائے، بھینس، بکری، بھیڑ وغیرہ۔ لَكُمْ تمہارے فائدے کے لئے جس کی تفصیل فِيْهَا دِفْءٌ میں بیان کی ہے گویا لَكُمْ میں اجمالی منفعت ہے اور اس کے بعد تفصیل کی گئی ہے۔ دِفْءٌ سردی کی شدت کا دور ہو جانا (قاموس) یعنی جانوروں کے بالوں اور اون سے تم سردی کی سختی دور کرتے ہو کوئی لباس اور کمبل وغیرہ استعمال کرتے ہو۔ منافع سے دوسرے فائدے مراد ہیں۔ افزائش نسل، دودھ، سواری، بار برداری، کھیتی باڑی، خرید و فروخت وغیرہ۔

وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۝ اور انہی سے تم کھاتے بھی ہو گوشت، چربی، گھی، دودھ، پنیر، مکھن وغیرہ کھاتے ہو۔ معمولاً غذا زیادہ تر انہی جانوروں سے حاصل کی جاتی ہے اس لئے مِنْهَا کو تَاْكُلُوْنَ سے پہلے ذکر کیا دوسرے جانوروں کا گوشت تو محض لذت یا دوائی خاطر کھایا جاتا ہے۔

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ۝ اور جب شام کو (جنگل سے جانوروں کو) واپس لاتے ہو اور (صبح کو) چرانے کے لئے لے کر جاتے ہو تو ان سے تمہاری ایک شان بنتی ہے۔ کیونکہ دونوں وقت گھر سے باہر صحن میں ان کے جمع ہونے سے ایک رونق پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کی نظروں میں تمہاری عزت اور مالداری ظاہر ہوتی ہے۔

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اور (جانور) اس سے کہ سفر میں تم اپنے سامان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلو یہ چوپائے تمہارے سامان کے بوجھ اپنے اوپر لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک لے جاتے ہیں کہ بغیر سخت تکلیف اٹھانے کے تم وہاں تک خود پہنچ بھی نہیں سکتے ہو (بوجھ اٹھانے کا تو ذکر ہی

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ⑩

وہ ایسا ہے جس نے تمہارے واسطے بادل سے پانی برسایا جس سے (کچھ) تم کو پینے کو ملتا ہے اور کچھ حصے سے درخت (پیدا) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشی (چرنے) چھوڑتے ہو۔

مِنْهُ شَرَابٌ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ آدمیوں کو پینے کا پانی بارش سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ چشموں اور کنوؤں (اور دریاؤں) میں لوٹ پھر کر بارش ہی کا پانی آتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ۔ دوسری آیت ہے فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ۔ مِنْهُ شَجَرٌ کا یہ مطلب ہے کہ درختوں کی زندگی بھی پانی سے ہے۔ درخت بھی بارش کا پانی پیتے ہیں۔

تُسِيْمُوْنَ کا ترجمہ ہے تم جانوروں کو چراتے ہو۔ سَامَتِ الْمَاشِيَةُ (چرندہ) مویشی چرے۔ اَسَامَهَا صَاحِبُهَا (چرایا) مالک نے جانوروں کو چرایا۔ مصدر سومۃ تسومہ کا اصل لغوی معنی ہے علامت۔

يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ

اللہ پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور تمام پھل پیدا کرتا ہے۔

مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی تمام قسم کے پھلوں میں سے بعض پیدا کرتا ہے۔ کل پھل تو صرف جنت میں ہوں گے یہاں تو جنت کے پھلوں کی یاد دہانی کے لئے بعض پھل پیدا کئے گئے ہیں۔ مویشیوں سے پہلے ان کی چراگاہوں کا ذکر اور مویشیوں کے بعد کھیتی اور پھلوں کا تذکرہ ترتیب واقعی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سب سے پہلے درخت ہی حیوانات کی غذا بنتے ہیں اور حیوانات سے پیدا ہونے والی غذا سب سے اعلیٰ غذا ہے۔ پس درختوں کی پیدائش کا ذکر پہلے پھر حیوانات اور ان کی پیداوار کا تذکرہ اور پھر کھیتی کا بیان ہونا مناسب تھا اور ایسا ہی کیا گیا)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے صانع کے وجود، علم اور حکمت کا اس میں کھلا ہوا ثبوت ہے۔

لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ⑪ غور کرنے والوں کے لئے۔ ایک دانہ زمین میں گرتا ہے زمین سے کچھ نمی اس میں کھینچ کر آتی ہے پھر دانہ کا بالائی حصہ پھٹ کر اس میں سوئی جیسا تنا نکلتا ہے اور نچلا حصہ پھٹ کر نیچے کی طرف جڑوں کے سوتے نکلتے ہیں پھر یونہی نمو ہوتا رہتا ہے۔ تنا بڑھتا ہے اس میں شاخیں پتیاں پھول شگوفے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پھول پھل کی بھی ایک خاص شکل ہوتی ہے ہر پھل کا ایک مخصوص موسم ہوتا ہے۔ سفلی طبیعت (یعنی زمین اور پانی کی طبیعت) اور علوی موثرات (دھوپ ہوا اور روشنی تاثیر کواکب وغیرہ) ہر طرح کے درختوں کے لئے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن ہر درخت اپنی جدا جسمانیت، شکل، طبیعت و خاصیت رکھتا ہے۔ مبادی کا اتحاد اور نتائج کا اختلاف بتا رہا ہے کہ یہ سب کرشمہ سازی کسی فاعل مختار کی ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے اور وہی جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ اور اس نے تمہارے فائدے کے لئے رات اور دن سورج اور چاند کو مسخر بنایا۔ یعنی تمہارے منافع کے لئے اس نے رات دن بنائے ہیں۔

وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ اور ستارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔

بِاَمْرِهٖ میں امر سے مراد ہے ایجاد اور اندازہ مقرر کرنا یا حکم مراد ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ جو لوگ تخلیق نبات کو صرف تاثیر کواکب سے وابستہ قرار دیتے ہیں اور ستاروں کی حرکات و اتصالات کو موثر حقیقی جانتے ہیں ان کا خیال غلط ہے اگر ایسا فرض بھی کر لیا جائے تب بھی کیا جواب ہے اس بات کا کہ تمام متعدد اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے ممکن ہیں (اور ممکن وہ ہوتا ہے جس کا اپنا وجود بھی اپنا نہیں ہوتا وہ اپنی ذات و صفات میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے) تو لامحالہ ان کا اپنا وجود بھی کسی ایسی قوت کا ممنون کرم ہے جو واجب الوجود ہے اور کسی کا محتاج نہیں ایسے ممکنات کو بہت سے بہت کیا کر دو لیکن واجب الوجود آخری درجہ پر نہ مانی جائے تو جانب مبدأ میں تسلسل لازم آئے گا یا پھر گھوم کر لوٹنا پڑے گا اور ہر ممکن بلا واسطہ یا بالواسطہ خود اپنے نفس کی علت ہو جائے گا گویا انکار واجب الوجود سے تسلسل یا دور لازم آجائے گا اور چونکہ تسلسل بھی محال ہے اور دور بھی۔ اس لئے تمام ممکنات

کی تحقیق کے لئے ذات واجب الوجود کا ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کواکب کی تاثیرات ہوں یا عناصر کی اپنی حیثیت ایک ضابطہ اور دستور کی ہے اللہ کا ضابطہ اور عادت یہی ہے کہ اس نے بعض نتائج کو بعض اسباب سے وابستہ کر دیا ہے خود اسباب کو علت نتائج نہیں بنایا ہے خود یہ اسباب نتائج کے موجد نہیں ہیں۔ اسباب کا اپنا وجود ہی اپنا نہیں خداداد ہے۔ جو چیز معدوم الذات ہو وہ دوسرے کو وجود کیسے دے سکتی ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ بے شک اس میں سمجھ والوں کے لئے بکثرت (توحید و قدرت کی) نشانیاں ہیں۔ سلیم اور سود مند عقل والوں کو ہر چیز میں اللہ کی تخلیق و حکمت کی گوناگوں نشانیاں نظر آتی ہیں یہ واضح نشانیاں ہیں اسی لئے آیات بصیغہ جمع ذکر فرمایا اور اصحاب عقل کے ساتھ آیات عقلی کو وابستہ کیا۔

وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ اور ان چیزوں کو بھی تمہارے لئے اس طور پر پیدا کیا کہ ان کے اقسام مختلف ہیں الوان سے اقسام و اصناف مراد ہیں رنگ کے اختلاف سے اکثر صنف بدل جاتی ہے۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ۝ بلاشبہ نصیحت اندوز لوگوں کے لئے اس میں بڑی نشانی ہے۔ طبیعت، ہیئت اور صورت کا اختلاف دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ محض ایک صانع حکیم کی کرشمہ سازی ہے۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ اور اسی نے سمندر کو تمہاری خدمت پر لگا دیا ہے یعنی ایسا بنایا ہے کہ تم اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل کرتے ہو۔ اس میں جہاز اور کشتیاں چلاتے ہو مچھلیاں پکڑتے ہو اور موتی مونگے حاصل کرتے ہو۔

لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا اس میں سے تازہ تازہ گوشت کھاؤ۔ طَرِيًّا تر و تازہ یعنی مچھلی۔ مچھلی میں ہر گوشت سے زیادہ رطوبت ہے اس لئے مچھلی کا گوشت بہت جلد خراب ہو جاتا ہے چونکہ (نمکینیت کی وجہ سے) مچھلی کا گوشت آنتوں سے چپاں ہو جاتا ہے اس لئے اس کو کھانے کے بعد پیاس زیادہ لگتی ہے۔ گوشت کی گرمی یا خشکی موجب تشنگی نہیں ہوتی۔ اللہ کی عجیب حکمت ہے کہ تلخ، نمکین اور غلیظ پانی سے ایسی تر و تازہ شیریں لطیف چیز اس نے پیدا کی۔

امام مالک و امام ثوری نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مچھلی پر شرعاً گوشت کا اطلاق ہوتا ہے اگر کسی نے قسم کھائی کہ گوشت نہیں کھاؤں گا تو مچھلی کھانے سے بھی اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ احناف کہتے ہیں قسم میں عرف عام کا اعتبار کیا جاتا ہے اور عرف عام میں مچھلی پر گوشت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دیکھو اللہ نے کافروں کو شَرَّ الدَّوَابِّ (بدترین چوپایہ) قرار دیا ہے لیکن اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں چوپایہ پر سوار نہ ہوں گا اور کسی کافر کے اوپر سوار ہو گیا تو کیا اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔

وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا اور اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جس کو تم پہنتے ہو تَلْبَسُونَ (جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے لیکن اس) سے مراد یہ ہے کہ تمہاری عورتیں یہ زیور پہنتی ہیں۔ حِلْيَةً یعنی زیور مثلاً موتی مونگا وغیرہ۔

وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ اور تم کشتیوں کو دیکھو کہ اس میں پانی کو چیرتی چلی جا رہی ہیں۔ مَوَاخِرَ فِيهِ سمندر میں چلنے والی۔ قتادہ نے ترجمہ کیا ہے آنے جانے والیاں ایک جاتی ہے دوسری آتی ہے باوجودیکہ ہوا کی رفتار ایک ہی ہے۔ حسن نے کہا بھری ہوئی۔ فراء اور اخفش نے کہا پانی کو اپنے دونوں پہلوؤں سے پھاڑنے والیاں۔ مخر کا معنی ہے پانی کو پھاڑنا یا کشتی کی رفتار کی آواز۔ ابو عبیدہ نے کہا تیز ہوا چلنے کے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو مخر کہا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا ہواؤں کی رفتار کے سامنے سے کشتیاں آتی ہیں اور ہواؤں کو پھاڑتی ہیں۔ قاموس میں مخر اور مخور کا معنی بیان کیا گیا ہے کشتی کا چلنا اور ہوا کی رفتار کے سامنے آنا۔ مخرت السفینۃ کا یہی مطلب ہے۔ مخر السابح تیرنے والے نے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا۔ مواخر کشتیاں وہ ہوتی ہیں جن کی رفتار کی آواز سنی جائے یا وہ کشتیاں جو اپنے سینہ کے زور سے پانی کو چیرتی ہیں یا ایک ہی ہوا سے آنے جانے والی

کشتیاں۔ حدیث میں ہے: اذا اراد احدکم البول فلیستمخر الریح ایک اور روایت میں آیا ہے کہ استمخروا الریح جب کسی کا پیشاب کرنے کا ارادہ ہو تو ہوا کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے۔ ہوا کی طرف پشت کرو۔ گویا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی پشت ہوا کے مقابل کر دو تاکہ ہوا پھٹ کر دائیں بائیں سے نکل جائے۔

وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ اور تاکہ تم خدا کی دی ہوئی روزی تلاش کرو یعنی جہازوں اور کشتیوں پر سوار ہو کر اللہ کے فضل یعنی وسیع رزق کو تلاش کرو۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۴﴾ اور تاکہ (ان چیزوں کو اپنا تابع دیکھ کر اور اپنے کام پر لگا ہوا پا کر) تم اللہ کا شکر کرو۔ جو مقام ہلاکت تھیں انہی کو اللہ نے تحصیل معاش کا ذریعہ بنایا ہے یہ اس کا عظیم الشان احسان ہے جس کا شکر ادا کرنا لازم ہے اسی لئے آیت کے آخر میں تشکرون فرمایا۔ میں کہتا ہوں مذکورہ بالا اشیاء کو دیکھ کر اور ان کے فوائد پر غور کر کے شکر نعمت کے درجہ تک پہنچایا جائے تو بڑا انعام ہے اس سے دنیا میں مزید نعمت اور آخرت میں ثواب عظیم حاصل ہوتا ہے گویا شکر تمام نعمتوں کی تحصیل کا در ہے۔

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیئے تاکہ تم کو لے کر زمین ڈگمگانے نہ لگے۔

رواسی یعنی ایک جگہ قائم رہنے والے پہاڑ۔ اَلْمَيْدُ: لرزہ، اضطراب۔ پہاڑوں کی تخلیق سے زمین بالکل گول تھی اور اسی سبب سے اس میں لرزہ آ جاتا تھا جب پہاڑوں کو پیدا کر دیا گیا تو ان کا دباؤ مرکز ثقل کی طرف پڑا اور زمین کا بوجھ ادھر ادھر ملنا بند ہو گیا۔ گویا پہاڑوں کی میخیں ٹھونک دی گئیں جو زمین کو حرکت و اضطراب سے روک رہی ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے اللہ نے جب زمین کو پیدا کیا تو وہ لرزاں تھی۔ فرشتے کہنے لگے یہ اپنی پشت پر کسی کو ٹھہرنے نہ دے گی پھر اللہ نے اس میں پہاڑ گاڑ دیئے اور فرشتوں کو معلوم نہ ہوا کہ پہاڑ کس چیز سے بنائے گئے۔ عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، اور ابن ابی حاتم نے بوساطت قتادہ بروایت حسین، قیس بن عبادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ (گول ہونے کی وجہ سے) لرزاں تھی فرشتے کہتے تھے یہ تو اپنی پشت پر کسی کو قرار نہیں پکڑنے دے گی لیکن جونہی صبح ہوئی تو (رات بیچ میں) زمین کے اندر پہاڑ قائم ہو گئے اور فرشتوں کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کہاں سے پیدا ہو گئے۔ کہنے لگے اے ہمارے رب کیا تیری مخلوق میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو ان سے زیادہ سخت ہو۔ اللہ نے فرمایا ہاں لوہا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا لوہے سے بھی سخت تیری کوئی اور مخلوق ہے فرمایا ہاں آگ ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا اے رب کیا آگ سے بھی زیادہ سخت کوئی اور چیز ہے فرمایا ہاں پانی ہے پھر فرشتوں نے عرض کیا اے رب کیا تو نے پانی سے بھی زیادہ سخت کوئی اور چیز پیدا کی ہے۔ فرمایا ہاں ہوا ہے فرشتوں نے عرض کیا ہوا سے بھی سخت کوئی چیز تو نے بنائی ہے فرمایا ہاں مرد (ہوا سے زیادہ سخت ہے) عرض کیا کیا تیری کوئی مخلوق مرد سے بھی زیادہ سخت ہے فرمایا عورت ہے۔ انتہی۔

اگر دریافت کیا جائے کہ یہ سوال کبھی جا کر ختم بھی ہو سکتا ہے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ قوی اور بڑی طاقت والا ہے اور تمام ممکنات اس کے مقابلہ میں عاجز بلکہ ہیچ ہیں۔ اللہ کی قوت کا جس پر پرتو پڑ جاتا ہے وہ چیز دوسروں کے مقابلہ میں قوی ہو جاتی ہے یا کسی پر قوت کا پرتو پڑ گیا تو وہ چیونٹی سے قوی ہو گئی لیکن اگر اللہ چاہے تو چیونٹی پر اپنی قوت کا پرتو ڈال کر ہاتھی سے زیادہ قوی بنا دے، کسی کی قوت شدت بجمیع جہات دوسروں سے زائد نہیں بلکہ بعض اعتبارات سے ہے (ایک چیز دوسری چیز سے ایک اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور وہ دوسری چیز پہلی چیز سے کسی دوسرے اعتبار سے قوی ہے بجمیع جہات تو اللہ ہی سب سے قوی ہے)

وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ اور زمین میں دریا اور (حصول مقصد کے) راستے بنائے تاکہ تم (اپنے مقصد یا اللہ کی معرفت کے) راستہ پر چلو۔ یعنی اللہ کی معرفت حاصل کرو۔

وَعَلٰمٰتٍ ۚ اور (راستوں پر) اللہ نے کچھ نشانیاں بنائیں۔ درخت، پہاڑ، غار، ستارے وغیرہ علامات رکھی ہیں، تاکہ ان سے اپنے راستوں کی شناخت کرتے ہیں۔ شرعی اسباب و علل بھی (احکام کے لئے) رہنما ہیں وجوب صلوٰۃ صوم و زکوٰۃ کے لئے وقت سبب ہے۔ اشیاء ماکولہ و مشروبہ کی حرمت کی علت نشہ ہے۔ حسی اور عقلی دلائل بھی رہنمائی کرتی ہیں۔ نبض کی تیزی بخار کو ظاہر کرتی ہے اس عالم کا وجود اس کے بنانے والے کی ہستی کو ثابت کر رہا ہے۔ معجزہ پیغمبر کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں یعنی رات کی تاریکی میں جنگلوں اور سمندروں میں ستاروں سے راستوں کی شناخت کرتے ہیں۔ "نجم" سے مراد ہے عام ستارے۔ محمد بن کعب نے کہا علامات سے مراد پہاڑ ہیں۔ دن کے وقت پہاڑوں سے راستہ معلوم ہوتا ہے اور رات کے وقت ستاروں سے (کلبی۔ نے کہا سب (علامات) سے مراد ستارے ہیں، کچھ ستارے علامات اور نشانات ہیں اور کچھ ستاروں سے لوگ راستے معلوم کرتے ہیں سدی نے کہا النجم سے مراد ہے ثریا اور بنات النعش اور دونوں فرقد اور جدی ان سے لوگ راہ بھی معلوم کر لیتے ہیں اور جہت قبلہ بھی۔ میں کہتا ہوں اس (مراد کی) تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ ستارے قطب شمالی کے قریب ہیں ان کے دائرے چھوٹے ہیں اس لئے اپنی جگہ سے بہت ہی کم حرکت کرتے ہیں۔

یَہْتَدُوْنَ کی فاعلی ضمیر "قریش" کی طرف لوٹ رہی ہے قریش عام طور پر تجارت کے لئے رات کو سفر کرتے تھے اور رات میں چلتے تھے اور ستاروں سے جہت سفر کو معلوم کرنے میں بہت مشہور تھے۔ علامات کے لفظ کے بعد النجم کا ذکر خصوصیت کو ظاہر کر رہا ہے گویا) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نجم سے خاص طور پر راستہ کی شناخت کرتے اور راہ پر چلتے ہیں اس لئے ان پر اللہ کا شکر لازم ہے کہ اس نے ستاروں کو ان کے لئے دلیل راہ بنا دیا۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ۚ سو کیا جو پیدا کرتا ہے اس کی طرح ہو جائے گا جو پیدا نہیں کرتا مَنْ لَّا يَخْلُقُ سے مراد ہیں معبودان باطل (خواہ اہل عقل ہوں یا بے عقل) اہل عقل کو بے عقل پر تغلیب دے کر (بجائے ما کے) مَنْ استعمال کیا ہے یا صرف بت مراد ہیں چونکہ مشرک بتوں کو اپنا (اپنے معبود) مانتے تھے اور ان کو اہل علم ہونا ہی چاہئے (تو گویا مشرکوں کے مفروضے کے مطابق بتوں کے لئے مَنْ کا صیغہ استعمال کیا) اَفَمَنْ میں ہمزہ انکاریہ اور فاء تعقیبیہ ہے یعنی جب روشن و کثیر دلائل سے اللہ کے علمی کمال اور قدرت کا احاطہ اور حکمت کی ہمہ گیری ثابت ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تنہا اللہ ہی خالق بالذات ہے کوئی دوسرا اس لائق نہیں ہے یہاں تک کہ کوئی بھی نہ مکھی کو گرا سکتا ہے نہ روک سکتا ہے اگر مکھی ان بتوں سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ واپس نہیں لے سکتے تو پھر کیا خلاق کل اس چیز کی طرح کیسے ہو سکتا ہے جو خلقت سے بالکل بے بہرہ ہے۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تو کیا (ان مشاہدات بدیہی کے بعد بھی) نصیحت پذیر نہیں ہو گے یعنی جب ایسی چیزیں تمہارے سامنے ہیں جو نصیحت اندوزی کی مقتضی ہیں تو پھر عبرت اندوز نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۚ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کی گنتی کرو تو گن بھی نہیں سکتے۔ تمام نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ان نعمتوں کی کوئی حد ہی نہیں ہے کہ گن سکو لہٰذا اس کے معبود ہونے کا حق بھی محدود نہیں ہے (ہر نعمت اس کو مستحق عبودیت بنا رہی ہے) پس تم پورا حق عبادت تو ادا نہیں کر سکتے یہی کافی ہے کہ تم اپنی عاجزی کا اقرار کرو اور ظاہر باطن ہر طور پر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ (تمہارے قصور اور پورے شکر کو ادا کرنے سے عاجزی کو) معاف کرنے والا ہے۔

رَّحِيْمٌ ۝ (تم پر) مہربان ہے کہ تمہارے استحقاق کے بغیر اس نے اپنی وسیع نعمتیں تم کو عطا فرمائی ہیں اور تمہارے گناہوں کی پاداش میں اپنے انعامات کا سلسلہ منقطع نہیں کیا اور نہ ناشکری کی سزا تم کو فوراً دی۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝ اور اللہ تمہارے سب پوشیدہ اور ظاہر احوال کو جانتا ہے پوشیدہ احوال سے مراد ہیں عقائد اور ارادے دل کا شکر کامل طور پر حقوق عبدیت کو ادا کرنے سے قاصر ہونے کا علم، غفلت، غرور وغیرہ اور ظاہری احوال سے اچھے برے اعمال مراد ہیں اللہ کے واقف ہونے کے اظہار کا یہ مقصد ہے کہ اللہ تم کو تمہارے اندرونی و بیرونی احوال کی سزا و جزا دے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝

اور اللہ کے سوا مشرک جن کو پکارتے (یعنی عبادت کرتے) ہیں وہ کوئی چیز نہیں پیدا کرتے بلکہ خود (دوسرے کے ہاتھوں سے) پیدا کئے جاتے ہیں یعنی آسمان و زمین تو بڑی چیزیں ہیں ان کے معبود تو ادنیٰ اور حقیر ترین چیز کے بھی خالق نہیں۔ کوئی چیز پیدا کرنے کی انہیں قدرت ہی نہیں بلکہ خود اپنی ہستی بھی ان کی اپنی نہیں نہ بذات خود ہی ہے نہ وجود اپنا بلکہ ان کی ہستی دوسرے کی ممنون کرم اور عطا کردہ ہے پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ شریک خدا ہوں اور کیسے جائز ہے کہ ان کو الٰہ قرار دیا جائے۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وہ (بت) بے جان ہیں زندہ نہیں (ان میں کبھی زندگی پیدا ہی نہیں ہوئی) کیا یہ مطلب ہے کہ وہ (معبود) بذات خود مردے ہیں زندہ نہیں ہیں ان کی زندگی خود بخود نہیں بلکہ ایک تو قوم کی عطا کردہ ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ اور ان کو خبر ہی نہیں کہ وہ مردے کب اٹھائے جائیں گے۔ یعنی ان کا دوبارہ اٹھایا جانا نہ ان کے اختیار میں ہے نہ ان کے پرستاروں کا دوبارہ زندہ کیا جانا ان کے بس میں ہے نہ اپنا اور نہ اپنے پجاریوں کا زندہ کر کے اٹھایا جانا ان کو معلوم ہے پھر اپنے پرستاروں کو وہ جزا کیسے دے سکتے ہیں اور ان کی پرستش کا کیا فائدہ ہے اور کس طرح وہ معبودیت کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ تمہارا معبود ایک معبود ہے یعنی دلائل سے ثابت ہو گیا کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ پس جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے دل (اللہ کی ان کی نعمتوں کا) انکار کرتے ہیں باوجودیکہ خدا اور نعمتیں بالکل ظاہر ہیں بات یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں کو نور معرفت سے محروم کر دیا ہے اسی کی وجہ سے وہ کور بصیرت اور نابینا ہو گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ اللہ نے مخلوق کو تاریکی (کثیف مادیت اور حیوانی جہالت) میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور (یعنی اس کا ایک چھینٹا) ڈال دیا۔ جس شخص پر نور کا کچھ حصہ (کوئی چھینٹا) پڑ گیا اس کو راستہ مل گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جس پر نہ پڑا وہ بھٹکتا رہا ہدایت یاب نہ ہوا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ قلم (الٰہی) علم خداوندی پر خشک ہو گیا (یعنی اللہ کے علم میں جس کا ہدایت یاب ہونا تھا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور اللہ کے علم میں جس کا گمراہ ہونا تھا وہ گمراہ ہو گیا اس فیصلہ کی تحریر ہو چکی فیصلہ لکھنے والا قلم خشک ہو گیا۔ تحریر کردہ فیصلہ میں تغیر ممکن نہیں۔ مترجم) (رواہ احمد والترمذی)

وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ اور وہ (قبول حق سے) تکبر کرتے ہیں یعنی اللہ کی عبادت سے غرور کرتے ہیں اللہ کی نعمتوں ہی کا انکار کرتے ہیں اس لئے اللہ کو مستحق عبادت نہیں جانتے اور اتباع رسول سے بھی غرور کرتے ہیں اگر ان کو اللہ کی نعمتوں کا اقرار ہوتا اور اللہ کو مستحق عبادت جانتے تو آخرت پر ایمان رکھتے اور آخرت کی جزا و سزا کا ماننے اور رسول اللہ ﷺ کے اتباع سے سرتابی نہ کرتے۔

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ ضروری بات ہے کہ اللہ ان سب کے پوشیدہ اور ظاہر احوال سے واقف ہے یعنی اللہ کی ربوبیت اور معبودیت سے انکار دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور اللہ کی عبادت اور اللہ کے رسول کے اتباع سے تکبر جو وہ ظاہر کرتے ہیں اللہ سب سے واقف ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ۝ (اور) یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چھوٹی سرخ چیونٹی کے برابر غرور (والا) جنت میں نہیں جائے گا اور چھوٹی سرخ چیونٹی کے برابر ایمان (والا) دوزخ میں نہ داخل ہوگا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا لباس خوب صورت ہو (اور یہ غرور کی علامت ہے پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا) فرمایا اللہ جمیل و زیبا ہے جمال کو پسند کرتا ہے (عمدہ کپڑوں کی پسندیدگی کا نام نہیں۔ خوش لباسی کی خواہش تکبر نہیں بلکہ) تکبر حق سے تکبر کرنے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے سے ہوتا ہے۔ اس حدیث میں الکبر من بطر الحق آیا ہے جس کا مطلب علماء نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ نہایہ میں ہے بطر الحق کا یہ معنی ہے کہ اللہ کی توحید اور عبادت کو باطل سمجھے باوجودیکہ اللہ نے اس کو حق قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ بطر الحق کا معنی ہے حق کے مقابلہ میں مغرور ہو جانا حق کو حق نہ ماننا۔ بعض نے کہا حق کو قبول نہ کرنے کا نام ہے بطر الحق۔ ان تمام اقوال کا حاصل ایک ہی بات ہے وہ یہ کہ بندگی عبادت کو لازم نہ سمجھے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کا احسان اور مہربانی نہ قرار دے بلکہ خدا پر اپنا حق سمجھے۔ میں کہتا ہوں حدیث مذکورہ میں جو تکبر کے مقابلہ میں ایمان کا ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤمن اپنے وجود اور تمام کمالات کو خداداد سمجھتا ہے یہاں تک کہ اپنی ذات کو بھی اللہ کی امانت اور عاریت جانتا ہے اس لئے اپنے کمالات پر غرور نہیں کرتا اور کافر اپنی ہستی اور اپنے کمالات کو خود اور وجاناتا ہے اور اللہ کو بھول جاتا ہے تصوف میں جو لفظ فنا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے وجود کو بجائے خود معدوم سمجھے خود اپنی ہستی کو اپنی نہ سمجھے بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ایک عاریت جانے (اور ہر چیز میں ہر کمال مادی و عقلی میں یہاں تک کہ اپنی وجود وقت کے لحاظ سے بھی اپنے کو اللہ کا محتاج سمجھے۔ (مترجم)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۝ اور جب ان (منکرین آخرت) سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا تو انہوں نے جواب دیا (رب نے کچھ نہیں اتارا) یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کی لکھی ہوئی (داستانیں) ہیں۔ قبائل عرب کو جب پتہ چلا کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو انہوں نے ایام حج میں تحقیق احوال کے لئے کچھ آدمیوں کو مکہ بھیجا۔ یہ نمائندے آئے اور مکہ کی گھاٹیوں میں جو مشرک بیرونی لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے سے روکنے کے لئے مقرر تھے ان سے مل کر دریافت کیا کہ اللہ نے کیا کلام اتارا ہے ان لوگوں نے جواب دیا یہ اللہ کا بھیجا ہوا کلام نہیں ہے بلکہ وہی حکایتیں ہیں جو پچھلوں نے لکھوا دی ہیں۔
سطر لائن کتاب کی ہو یا درختوں کی یا آدمیوں کی سطر کی جمع سطر بفتحہ اور اسطر آتی ہے اور جمع الجمع اساطیر اور اسطار۔

لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ نتیجہ اس کہنے کا یہ ہوگا کہ قیامت کے دن اپنے گناہوں کا بھی بوجھ اٹھائیں گے یعنی یہ مشرک ایسا جواب اس لئے دیتے تھے کہ لوگوں کو گمراہ کر دیں اور قیامت کے دن اپنی گمراہی کے گناہوں کا بار پورا پورا اپنے اوپر اٹھائیں۔ کیونکہ گمراہ کی علامت ہے کامل گمراہی کی دوسروں کو گمراہ بنانے سے معلوم ہوتا ہے کہ گمراہ کرنے والوں میں گمراہی جم گئی ہے (اسی وجہ سے تو وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔

وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ اور ان لوگوں کا بار (گناہ) بھی جن کو گمراہ کرتے ہیں یعنی کچھ گناہ ان لوگوں کا بھی اپنے اوپر اٹھائیں جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ (مِنْ) کہنے کی یہ وجہ ہے کہ گمراہ کرنے والوں کے گمراہ کرنے کی وجہ سے جو لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں ان کے کچھ گناہ تو وہ ہوں گے جو گمراہ کرنے والوں کی گمراہی کا نتیجہ ہوں گے اور کچھ اپنے خصوصی گناہ ہوں گے۔ اول الذکر گناہوں کا پورا گناہ کرنے والوں کے برابر گمراہ کرنے والے پر بھی پڑے گا اور مؤخر الذکر گناہوں کے مجرم صرف گناہگار ہی ہوں گے گمراہ کرنے والوں کا ان میں کوئی دخل نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گمراہ کرنے والوں کے گناہوں کا کچھ بار گمراہ کرنے والے بھی اٹھائیں گے۔ امام احمد، مسلم اور اصحاب السنن نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے

بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہدایت کی طرف بلائے گا اس کو بھی نیکی کرنے والے کی نیکی کے برابر اجر ملے گا اور نیکی کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی کی طرف بلائے گا اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہو گا جتنا گناہ کرنے والے پر اور گناہ کرنے والے کے (یہاں) گناہ میں اس سے کوئی کمی نہیں آئے گی۔

بِغَيْرِ عِلْمٍ بغیر جانے کے یعنی وہ گمراہ کرتے ہیں بغیر دلیل کے یا یہ مطلب ہے کہ گمراہ ہونے والے نادانستگی کی حالت میں گمراہ ہو جاتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ گمراہ کرنے والے ان کو گمراہ کر رہے ہیں۔

آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ نہ جاننے کی وجہ سے گمراہ ہونے والوں کے لئے کوئی عذر نہیں ہو سکتا ان کے لئے خود حق و باطل میں تمیز کرنا اور تحقیقات کرنا لازم تھا۔ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ۝ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ برا بوجھ ہے۔ جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں انہوں نے بڑی بڑی تدبیریں کیں۔ یعنی اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ فریب کرنے کی بڑی تدبیریں کیں۔

فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُم مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِن فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ۝ پس اللہ نے ان کا بنا بنایا گھر جڑ بنیاد سے ڈھا دیا پھر اوپر سے ان پر چھت آپڑی اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر اللہ کا عذاب ایسی طرح آیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا۔ یعنی ان کی تدبیروں کی جڑیں اکھاڑ دینے کے لئے اللہ کا حکم آگیا اور ہلاکت آفریں عذاب ایسے راستوں پر ان پر آپڑا جن کا ان کو گمان بھی نہ تھا ان کی تدبیریں ہی اسباب ہلاکت بن گئیں جیسے کوئی قوم اپنے بچاؤ اور دشمنوں کو روکنے کے لئے اگر کوئی عمارت بنائے پھر عمارت میں زلزلہ آجائے بنیادیں ہلنے لگیں اور ستون نیچے گر جائیں اور چھت اوپر سے آجائے اور سب دب کر مر جائیں یہی حالت ان لوگوں کی ہوئی ان کی تدبیریں خود ان ہی کے لئے تباہ کن ہو گئیں آیت مذکورہ بالا میں کافروں کی حالت کی تصویر کشی بطور تمثیل کی گئی ہے (یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی کوئی عمارت انہوں نے بنائی تھی اور وہ ڈھ گئی اور سب اس کے نیچے دب گئے)

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نیز بغوی نے وہب (بن منبہ) کا بیان نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں نمرود بن کنعان مراد ہے جس نے حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کے متعلق مناظرہ کیا تھا اور آسمان کی طرف چڑھنے کے لئے بابل میں ایک اونچی عمارت بنوائی تھی اس عمارت کی بلندی پانچ ہزار ہاتھ تھی کعب کا اور مقاتل کا قول ہے کہ اس کی بلندی دو فرسخ تھی لیکن تیز آندھی کی وجہ سے وہ عمارت گر کر سمندر میں جا پڑی اور اس کا کچھ حصہ ان لوگوں پر گر پڑا جس کی وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ پھر قیامت کے دن اللہ ان کو رسوا کرے گا۔ یعنی ان کو ذلیل کرے گا اور دنیوی عذاب کے علاوہ ان کو رسوائی کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ دوسری آیت میں آیا ہے رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ

وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ اور فرمائے گا (آج) میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کی بابت تم (رسول خدا اور مسلمانوں کی) مخالفت کرتے تھے

قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ اہل علم کہیں گے۔ یعنی انبیاء اور ملائکہ اور مومن نعمت ہدایت کا شکر ادا کرتے اور مشرکین کی توہین میں اضافہ کرتے اور کافروں کے دکھ پر مسرت ظاہر کرنے کے لئے کہیں گے۔ اللہ نے قیامت میں ہونے والے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس میں سننے والوں کے لئے ایک خاص مہربانی کا اظہار ہے۔

إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ آج پوری ذلت اور عذاب کافروں پر ہو گا۔ الْيَوْمَ سے مراد ہے روز قیامت الْخِزْيَ ذلت و توہین۔ السُّوءَ عذاب۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ جن کی جان فرشتوں نے حالت کفر پر قبض کی

تھی (یعنی آخر وقت تک کافر تھے) اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے۔ نفسوں پر ظلم کرنے سے مراد کفر کرنا۔ نفس کو دوامی عذاب میں مبتلا کرنے کا سامان کرنا نفس پر ظلم ہے۔

فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ ۚ پھر کافر لوگ صلح کا پیغام ڈالیں گے (اور کہیں گے) ہم تو کوئی برا کام نہیں کرتے تھے

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوءٍ ۔ السَّلَمَ کی تشریح ہے اور استسلام سے مراد ہے پیغام صلح (ترجمہ میں اسی تفسیر کو لحاظ کیا گیا ہے) یا أَلْقَوُا السَّلَمَ کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کافر مطیع ہو جائیں گے۔ اطاعت کا اظہار کریں گے سُوءٍ سے مراد ہے کفر اور سرکشی۔

بَلَىٰ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ (فرشتے کہیں گے) کیوں نہیں (تم برے کام کرتے تھے) بے شک اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے پس وہ تم کو تمہارے عملوں کی پاداش ضرور دے گا۔ انکار سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ عکرمہ نے کہا اس سے مراد وہ کفار ہیں جو بدر کی لڑائی میں مارے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بلیٰ سے آخر تک اللہ کا قول ہو۔ (فرشتوں کا نہ ہو)

فَادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ۝ پس جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہو جاؤ اور اس میں ہمیشہ کے لئے رہو۔ غرض تکبر کرنے والوں کے لئے جہنم برا ٹھکانا ہے۔ یعنی تم میں سے ہر صنف جہنم میں اس مخصوص دروازہ میں داخل ہو جو اس صنف کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے کہا ابواب جہنم سے مراد ہیں عذاب جہنم کی مختلف قسمیں۔

ضروری توضیح از مترجم

بظاہر خالدین فیہا ادخلوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور حال و ذوالحال کا زمانہ حسب قاعدۂ نحو ایک ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت خلود نہیں ہو سکتا۔ داخل ہونا تو دو وقت میں ہوگا اور اندر رہنا ہمیشہ ہوگا اور اسی لئے حضرت مفسر نے خالدین کی تفسیر میں مقدرین الخلود فرمایا یعنی خالدین سے مراد یہ ہے کہ داخلہ کے وقت تمہارے لئے خلود مقرر کر دیا گیا ہے اور حکم دے دیا گیا ہے کہ دوزخ کے اندر ہمیشہ رہو گے۔ ترجمہ میں مفسر کی اس توجیہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ اور جو لوگ (گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے سے) بچے رہے ان سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا تو انہوں نے کہا بڑی بہتر چیز نازل کی۔ یعنی ایسا کلام نازل کیا جس میں دنیا و دین کی بھلائی ہے۔

لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام (افکار و اعمال) کئے ان کے لئے (اس دنیا میں بھی) بھلائی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک حسنۃ سے مراد ہے ثواب کو دس گنا تک بڑھا دینا۔ ضحاک نے کہا اس سے فتح و نصرت مراد ہے۔ مجاہد نے اچھی روزی مراد لی۔ میں کہتا ہوں حسنۃ سے مراد ایسی پاکیزہ زندگی ہے جو خالق کی نظر میں بھی پسندیدہ ہو اور دانشمند صحیح ذوق رکھنے والے آدمیوں کی نظر میں بھی یعنی مخلوق کی پرستش نہ کرے صرف اللہ واحد بے نیاز کی عبادت کرے اور اسی کی معرفت و قرب کا طلب گار ہو پاکیزہ (حلال) چیزوں کو حلال سمجھے اور گندی (حرام) چیزوں کو حرام جانے کسی کو ناحق دکھ نہ دے اور ایسے عمل کرے جن کا اچھا پھل اس کو آخرت میں ملے۔

وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ اور بلا شبہ آخرت (کی زندگی) کا گھر دنیا (کی زندگی) کے گھر سے زیادہ تقوی کے لئے بہتر ہے یعنی دنیوی زندگی میں جو نیک اعمال انہوں نے کئے ہوں گے ان کا اچھا پھل ان کو آخرت میں ملے گا اور ہمیشہ ہمیشہ ان کو اللہ

کی طرف سے عزت حاصل رہے گی۔

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ اور بے شک (دار آخرت) متقیوں کے لئے بہت اچھا مکان ہے حسن نے کہا دار المتقین سے مراد دنیا ہے اہل تقویٰ یہیں سے آخرت کا سامان لے کر جاتے ہیں اکثر اہل تفسیر کے نزدیک دار المتقین سے مراد دار آخرت ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ ان کے لئے عدن کی جنتیں ہیں یا آخرت میں ان کا مسکن جنات عدن ہے۔

يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۭ جن کے اندر متقی داخل ہوں گے (اور) جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی (اور) جو کچھ اہل جنت چاہیں گے ان کو وہاں ملے گا۔

مَا يَشَآءُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ اقسام مرغوبات میں سے جو کچھ چاہیں گے ان کو جنت میں ملے گا۔ فِيْهَا کو مَا يَشَآءُوْنَ سے پہلے ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے تمام مرغوبات صرف جنت میں ہی مل سکیں گے (دنیا میں تمام مقاصد کی تکمیل نہیں ہے)۔

كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ اسی طرح اللہ متقیوں کو جزا دے گا یعنی جو لوگ شرک اور بد اعمال سے پرہیز رکھیں گے ان کو اللہ ایسی ہی جزا دے گا جس کا اوپر ذکر کر دیا گیا۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ جن کی روح فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (شرک سے) پاک ہوتے ہیں وہ فرشتے ان سے کہتے جاتے ہیں تم پر سلامتی ہو (اللہ تم کو عذاب اور دکھ سے محفوظ رکھے) اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ۔

طیبین یعنی کفر اور بد اعمالی سے پاک ہونے کی حالت میں۔ پچھلی آیت میں بیان کیا تھا کہ کافر جب کفر کی وجہ سے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہوں گے ایسی حالت میں فرشتے ان کی روح قبض کریں گے۔ ان کے مقابلے میں متقیوں کا ذکر اس آیت میں کیا اور فرمایا متقی پاک زندگی والے ہوں گے اسی پاکیزگی کی حالت میں فرشتے ان کی جانیں قبض کریں گے مجاہد نے طیبین کا معنی بیان کیا پاک قول و عمل والے۔ بعض نے طیبین کا ترجمہ کیا ہے خوش یعنی فرشتوں کی بشارت جنت سے خوش ہونے والے یا یہ مطلب ہے کہ چونکہ ان کی کامل توجہ بارگاہ قدس کی طرف ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی روحیں بطیب خاطر خوشی خوشی دیتے ہیں۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ فرشتوں کا قول ہے۔ بعض کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ فرشتے ان کو اللہ کا سلام پہنچاتے ہیں۔

ادْخُلُوا الْجَنَّةَ یعنی جنت تمہارے اعمال کے سبب تمہارے لئے تیار ہے جب تم اٹھائے جاؤ گے تو فرشتے کہیں گے "سلام علیکم" جنت میں داخل ہو جاؤ۔ یہ مطلب ہے کہ مرتے وقت فرشتے ان سے "سلام علیکم" کہتے ہیں اور جب قیامت کے دن ان کو اٹھایا جائے گا تو حکم ہوگا جنت میں داخل ہو جاؤ۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ کیا یہ کافر صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کی روحیں قبض کرنے کو فرشتے آجائیں (اور اس وقت یہ ایمان لائیں) یا اللہ کا حکم (یعنی قیامت یا عذاب مستاصل) آجائے (تو ایمان لائیں)۔

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ (جیسے ان کافروں نے شرک و تکذیب کو اختیار کیا) اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کیا تھا اور جو عذاب ان پر آنا تھا آگیا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ اور (عذاب دے کر) اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔ کہ کفر اور معاصی کا ارتکاب کرتے تھے جو ان کے عذاب کا موجب بن گئے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

آخر ان کے اعمالِ بد کی سزائیں ملیں اور جس عذاب (کے بیان) پر وہ ہنستے تھے ان کو اسی نے آگھیرا۔ سَیِّئَات سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی برے اعمال کی سزا ان پر آ گئی یا سَیِّئَات سے مراد ہیں سزائیں اور مَا عَمِلُوْا سے مراد ہے کفر و معصیت یعنی کفر و معصیت کی سزائیں ان کو ملیں۔ حَاقَ بِهِمْ ان پر نازل ہو گیا یا ان کو گھیر لیا۔ مَا كَانُوْا میں مَا مصدری ہے یعنی استہزاء (کی سزا) نے ان کو گھیر لیا (اس وقت مضاف محذوف ہو گا) یا مَا موصول ہے اور اس سے مراد عذاب ہے کفار بطور مذاق کہتے تھے لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ہمارے کہنے پر اللہ ہم کو عذاب کیوں نہیں دیتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ ہم کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے (حکم کے) بغیر ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے پھر بعثتِ پیغمبر اور احکامِ تکلیفیہ کا فائدہ ہی کیا ہے۔ یا یہ کلام سنجیدگی سے کہتے تھے اور مرضی و مشیت میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہ تھا ہر کام چونکہ اللہ کی مشیت سے ہوتا، مسلّمہ حقیقت ہے اس لئے وہ سمجھے کہ ہمارا اور ہمارے باپ دادا کا شرک کرنا اور حلال کو حرام خود بنا لینا بھی اللہ کی مرضی ہے اور ہمارا یہ فعل اللہ کو ناپسند نہیں ہے۔

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ شرک کرنے اور حلال کو از خود حرام بنانے کی یہی علت بیان کی تھی۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾ سو پیغمبروں کا فریضہ تو واضح طور پر اللہ کا پیام پہنچا دینا ہے۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی کام نہیں ہدایت یاب کرنا تو اللہ کے قبضہ میں ہے اور اسی کی مشیت پر موقوف ہے البتہ اللہ کی خوشنودی کا راستہ بتا دینا پیغمبروں کا فریضہ ہے۔ اس سے آگے کی آیت ذیل میں بیان فرمایا ہے کہ پیغمبر بھیجے ہیں اور بعثتِ انبیاء کو ذریعہ ہدایت اور سبب ضلالت قرار دیا ہے جس کو اللہ نے ہدایت یاب بنانا چاہا تو پیغمبر کی بعثت اس کے لئے سببِ ہدایت بن گئی اور جس کو اللہ نے گمراہ بنا دینا چاہا تو پیغمبر کی بعثت سے اس کی گمراہی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ پیغمبر کی بعثت تو اصلی غذا کی طرح ہے۔ مناسب مزاج والے کو تو غذا طاقت پہنچاتی ہے اور بگڑے ہوئے مزاج والے کے مزاج میں مزید بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ اور ہم نے ہر امت میں یہ پیام پہنچانے کے لئے پیغمبر کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچتے رہو یعنی شیطان کی پیروی نہ کرو۔ وہ طاغوت ہے اللہ کی عبادت سے بہت بڑا باغی (سرکش)

فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ پس ان میں سے بعض کو تو اللہ نے ہدایت یاب کر دیا جس کو ہدایت یاب کرنا چاہا اس کو پیغمبروں کی رہنمائی سے ایمان کی توفیق دے دی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ اور ان میں سے بعض لوگوں کے لئے (بتقاضائے ازلی حسب مشیتِ الٰہی) گمراہی محقق ہو گئی (ضبط ہو گئی) اللہ نے ان کو ایمان کی توفیق نہیں دی اور ان کو ہدایت یاب کرنا نہیں چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفر ہی کی حالت میں ان کو ہلاک کر دیا۔ ان کی بستیوں کو اجاڑ دیا ان کے محل ویران ہو گئے خود ان کے (جاگیری) آنگن بغیر انسانوں کے خالی پڑے رہ گئے۔

فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾ (اے گروہ قریش) ذرا ملک میں چل پھر کر دیکھو کہ پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا (برا) انجام ہوا۔ عاد، ثمود، قومِ لوط اور ایکہ والوں (یعنی قوم شعیب) کی بستیاں دیکھو۔ کافروں نے اللہ کی مشیت اور مرضی کو ایک سمجھ رکھا تھا۔ اس خیال کا ازالہ اس آیت میں کر دیا کیونکہ ان اقوام کی طرف سے تکذیب کا ارتکاب تو مشیتِ خداوندی سے ہوا اگر تکذیب ان کی مرضی ہوتی تو ان پر عذاب نازل نہ فرماتا۔

ان سے آگے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کفار قریش پر گمراہی کی مہر اللہ کی طرف سے ثبت ہو چکی ہے آپ اپنے جی کو ہلاکت نہ کریں اور ان کو ہدایت یاب بنانے کی جدوجہد نہ کریں۔ فرمایا ہے۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

ان کے راہ راست پر آنے کی آپ کتنی ہی تمنا کریں اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت یاب نہیں کرتا جن کو گمراہ کرنا اس کو مقصود ہوتا ہے اور ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

یعنی اللہ جس کو گمراہ رکھنا ہی چاہتا ہے اس کو پھر ہدایت یاب نہیں کرتا۔ آیت نَعُوْذُ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ کا جو مفہوم ہے وہی مَنْ يُّضِلُّ کا مفہوم ہے۔

مِنْ نّٰصِرِيْنَ یعنی کوئی مدد گار نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو خدا ہی گمراہ کر دے ان کی مدد کرنے والا اور حکم خدا کو نافذ ہونے سے روکنے والا اور ان کے مقرر کردہ عذاب کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ محمد اگر آپ ان کو ہدایت یاب بنانے کی کتنی ہی حرص کریں اور ان کو ہدایت کرنے میں کتنی ہی تکلیف اٹھائیں جب ان کو خدا نے ہی گمراہ کر دیا ہے تو آپ کی اس حرص سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور ان کو ہدایت یافتہ بنانے کی آپ کو قدرت نہ ہوگی۔ اللہ سب پر غالب اور قوی ہے جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو نہ کوئی ہدایت کرنے والا ہے نہ مددگار نہ عذاب کو دفع کرنے والا۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک مسلمان کا کسی مشرک پر کچھ قرض تھا۔ مسلمان مشرک کے پاس تقاضا کرنے گیا اور اپنے قرض کے متعلق کچھ گفتگو کی اثنائے کلام میں یہ بات بھی مسلمان نے کہہ دی کہ مرنے کے بعد مجھے اللہ سے یہ امیدیں ہیں مشرک بولا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا یقین ہے میں اللہ کی پختہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو مر گیا اللہ اس کو دوبارہ زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ اور انہوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہا جو مر جائے گا اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا۔ اس جملہ کا عطف وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا پر ہے اور یہ جتا دینا مقصود ہے کہ جس طرح یہ توحید کے منکر ہیں اسی طرح مضبوط قسمیں کھا کر مرنے کے بعد جی اٹھنے کا بھی انکار کرتے ہیں ان کی تردید میں اللہ نے فرمایا۔

بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ کیوں نہیں (اٹھائے گا) اس نے اس کا پختہ وعدہ کر لیا ہے اس پر (وعدہ پورا کرنا) ضروری ہے (کیونکہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا اس کی حکمت کا تقاضا ہے اور تقاضائے حکمت کے خلاف ہونا ممکن نہیں اور اس کے وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے) اس نے (قیامت برپا کرنے کا) وعدہ پختہ کر لیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (کہ اللہ کے وعدہ کے خلاف ہونا ناممکن ہے) یا یہ مطلب ہے کہ اکثر لوگ قیامت کا یقین نہیں رکھتے کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ قیامت کا برپا ہونا اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے اس کے علاوہ ان کی نظریں تو فقط محسوسات کی عادی ہیں۔ غیر معمولی حادثہ کے واقع ہونے کو محال جانتے ہیں۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (وہ قیامت قائم کرے گا) تاکہ ان پر وہ امر (حق) واضح کر دے جس کے متعلق وہ (دنیا میں) اختلاف کرتے تھے۔

لَهُمْ کی ضمیر مرنے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے خواہ کافر ہوں یا مومن۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ۝ اور تاکہ (قیامت کے دن) کافر جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

کافر کہتے تھے کہ جو مر گیا اللہ دوبارہ اس کو زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا۔

لِیُبَیِّنَ اور لِیَعْلَمَ میں قیامت قائم کرنے کی علت اور حکمت بیان فرمائی ہے حق و باطل اور حق پرست و باطل پرست میں تمیز کر دینا اور ہر فریق کو سزا یا جزا دینا تقاضائے حکمت ہے جس کا ظہور قیامت کے دن ہوگا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لِیُبَیِّنَ کا تعلق آیت وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا سے ہو یعنی ہر امت میں ہم نے پیغمبر بھیجا تاکہ پیغمبر وہ امر حق ظاہر کر دے جس کی بابت اس امت میں اختلاف تھا اور لوگوں کو بتا دے کہ وہ گمراہی پر ہیں اللہ پر بہتان تراشی اور دروغ بندی کرتے ہیں (اللہ نے ان کو بت پرستی اور حلال کو حرام بنانے کا حکم نہیں دیا)

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ ہم جس چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا بس وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

اِذَآ اَرَدْنٰهُ یعنی جب ہم کسی چیز کو موجود کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ پہلی بار یا دوبارہ اس آیت میں دوسری زندگی کا امکان ثابت کیا گیا ہے۔ خلاصہ بیان یہ ہے کہ اللہ مخلوق کو محض اپنی قدرت سے پیدا کرتا ہے کسی اور چیز پر کسی مخلوق کی ہستی موقوف نہیں ورنہ نتائج و اسباب کا تسلسل کبھی ختم نہ ہوگا اور کسی چیز کا وجود ہی نہ ہو سکے گا پھر کسی چیز کی تخلیق و تکوین سے اللہ کو کوئی تھکان یا تکلیف نہیں ہوتی ورنہ خدا کا عاجز ہونا لازم آئے گا۔ اور عجز تقاضائے الوہیت کے خلاف ہے پس جب کہ کوئی مادہ نہ تھا نہ سابق میں کوئی نظیر اور مثال تھی بلکہ اللہ نے تمام چیزوں (یہاں تک کہ خود مادہ) کو بغیر مادہ اور مثال کے پہلی مرتبہ پیدا کر دیا تو (اب جبکہ ایک مثال موجود ہو چکی ہے) دوبارہ پیدا کرنا نا ممکن نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا میرے بندے نے میری تکذیب کی اور اس کے لئے یہ زیبا نہ تھا اور میرے بندے نے مجھے گالی دی اور یہ اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ تکذیب تو یہ کی کہ اس نے کہا اللہ نے جیسا شروع میں مجھے پیدا کر دیا تھا دوبارہ ہرگز مجھے پیدا نہیں کرے گا۔ حالانکہ ابتدائی تخلیق میرے لئے دوبارہ تخلیق سے آسان نہ تھی اور گالی یہ دی کہ اس نے کہا اللہ نے اپنے لئے اولاد اختیار کر لی ہے حالانکہ میں ایک ہوں بے نیاز ہوں نہ میں کسی کا باپ ہوں نہ کسی کا بیٹا اور میری مثل کوئی بھی نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں اس کا گالی دینا تو یہ ہے کہ اس نے کہا میری اولاد ہے حالانکہ میں پاک ہوں بیوی یا اولاد اختیار کرنے سے۔ رواہ البخاری۔

وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن چھوڑ دیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

فِی اللّٰهِ یعنی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے معاملہ میں اللہ (کو ماننے) کی وجہ سے ظُلِمُوْا بعد اس کے کہ ان کو سخت دکھ دیئے گئے اور ایذائیں پہنچائی گئیں۔ عبدالرزاق اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ اور داؤد بن ہند کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابو جندل بن سہیل کے متعلق ہوا۔ مشرکوں نے مکہ میں آپ کو قید کر رکھا تھا اور دکھ پہنچاتے تھے۔ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اور عبد بن حمید نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول چند صحابہؓ کے متعلق ہوا جن پر مکہ والوں نے مظالم کئے تھے اور گھروں سے نکال باہر کر دیا تھا انہی مظلوموں میں سے ایک گروہ ملک حبش کو چلا گیا تھا پھر اللہ نے ان کو مدینہ میں ٹھکانہ دے دیا مدینہ کو ان کے لئے دار الہجرت بنا دیا اور کچھ مومنوں کو (یعنی مدینہ والوں) کو ان کا مددگار کر دیا۔

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ۗ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ہم ضرور دنیا میں ان کا ٹھکانہ (دین کے) اچھی طرح اور آخرت کا اجر تو بہت ہی بڑا ہے اچھے ٹھکانے سے مراد ہے مدینہ۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ جب کسی مہاجر کو کچھ عطا فرماتے تھے تو کہتے تھے یہ لے لو اللہ تم کو مبارک کرے یہ چیز تو وہ ہے جس کے دینے کا اللہ نے تم سے دنیا میں وعدہ کیا تھا اور آخرت میں جو تمہارے لئے رکھ چھوڑا ہے وہ بہت بہتر ہے پھر آپ یہ آیت تلاوت فرماتے تھے۔

بعض علماء کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کریں گے بعض نے کہا، دنیا میں بھلائی سے مراد ہے ایمان کی توفیق اور نیکی کی ہدایت۔

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝　اگر (کفار) جانتے ہوتے (کہ اللہ ان مہاجروں کو دونوں جہان کی بھلائی عطا فرمائے گا تو ان پر ظلم نہ کرتے اور انکی تائید کرتے) یا یہ مطلب ہے کہ اگر مہاجروں کو معلوم ہوتا (کہ ہمارے لئے اس دکھ پانے کا یہ اجر ہے) تو وہ اور زیادہ کوشش کرتے اور مزید صبر سے کام لیتے۔

الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝　وہ ایسے ہیں کہ صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

صَبَرُوا کا مفعول محذوف ہے یعنی کافروں کی طرف سے ایذا پانے اور وطن چھوڑنے اور دوسرے مصائب پر صبر کرتے ہیں۔

يَتَوَكَّلُونَ یعنی اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور سب سے (دل کا) تعلق توڑ کر اللہ سے اپنا رابطہ جوڑ لیتے ہیں۔ جب کافروں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا انکار کر دیا اور کہنے لگے کوئی آدمی اللہ کا پیغامبر نہیں ہو سکتا، اللہ نے ہماری ہدایت کے لئے کسی فرشتے کو کیوں نہیں بھیجا۔ اس پر آیت کا نزول ہوا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ　اور آپ سے پہلے بھی ہم نے (آدمیوں کے پاس) مردوں ہی پیغمبر بنا کر بھیجے (ملائکہ کو نہیں بھیجا) ہم ان کے پاس (ملائکہ کے ذریعہ سے) وحی بھیجتے رہے۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝　پس اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم سے پوچھ لو۔ یعنی اگر آدمیوں کے پیغمبر ہونے میں تم کو شک ہے تو جن کو کتب سابق کا علم ہے یہودی ہوں یا عیسائی ان سے دریافت کرلو کہ اللہ نے بنی اسرائیل کے پاس موسیٰ اور عیسیٰ وغیرہ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا اور ان سے پہلے آدم اور نوح وغیرہ کو ان کی امتوں کو ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔

آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ جن لوگوں کو علم نہ ہو ان کو علماء سے دریافت کرنا چاہئے اور اگر بتانے والا ثقہ ہو تو اس کی خبر مفید علم ہوتی ہے اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ　(ہم نے مردوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا) کھلے معجزات اور کتابوں کے ساتھ۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ　اور ہم نے آپ پر بھی ایک نصیحت نامہ (یعنی قرآن مجید) اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے کھول کر اسکا اظہار کر دیں جو (آپ کے ذریعہ سے) ان کے پاس بھیجا گیا ہے۔ مَا نُزِّلَ سے مراد ہے ثواب کا وعدہ، عذاب کی وعید، احکام اور مجمل قوانین بیان (جس کا رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے) قولی بھی ہے عملی بھی اور تقریری بھی اس کو تو بیان صریح کہا جاتا ہے بیان کی دوسری قسم غیر صریحی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے قیاس کرنے کا حکم دیا ہے (پس مقیس علیہ میں تو صریحی بیان ہوتا ہے اور مقیس میں غیر صریحی)

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝　اور تاکہ وہ غور کریں۔ غور کرنے سے مراد ہے رفتار عبارت اور اقسام دلالت پر غور کرنا اس طرح کہ شارح کی طرف سے کسی بیان کی ضرورت نہ ہو مثلاً آیت فَأْتُوا حَرْثَكُمْ میں لفظ حرث بتا رہا ہے کہ اس سے مراد زنانہ شرمگاہ ہے مبرز مراد نہیں ہے کیونکہ مبرز کھیتی (تخم آفرینی) کا مقام نہیں ہے (مبرز میں تخم ریزی ضیاع تخم ہے یا آیت ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ میں قروء سے مراد حیض ہے۔ طہر مراد نہیں ہے کیونکہ طلاق مسنون طہر کے زمانہ میں ہی ہوتی ہے اب اگر جس طہر کے زمانہ میں طلاق دی ہو اس کو پورا طہر محسوب کرلیا جائے تو تین طہر سے مدت کم ہو جائے گی اور محسوب نہ کیا جائے تو مدت تین سے بڑھ جائے گی بہر حال پورے تین طہر نہ ہوں گے اس سے ثابت ہوا کہ قروء سے مراد طہر نہیں ہے بلکہ حیض مراد ہے۔

أَفَأَمِنَ الَّذِينَ مَكَرُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ يَخْسِفَ اللَّهُ بِهِمُ الْأَرْضَ جو لوگ بڑی بڑی تدبیریں کرتے ہیں کیا وہ اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے۔

مشرکوں نے بڑی بڑی تدبیریں کی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دینے یا بند رکھنے یا جلا وطن کرنے کے مشورے کئے تھے اور لوگوں کو ایمان سے روکنے کی بھی منصوبہ بندی کی تھی۔

أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ یا (اچانک آ جانے سے کوئی بھی) عذاب ان پر ایسے طریقے سے آ جائے کہ ان کے گمان میں بھی نہ ہو۔ جیسے قوم لوط اور قوم شعیب پر آیا تھا۔

أَوْ يَأْخُذَهُمْ فِي تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِينَ یا (سفر میں) آتے جاتے اللہ ان کو عذاب میں دھر پکڑے سو وہ لوگ خدا کو عاجز نہیں کر سکتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے تقلب کا ترجمہ کیا ہے "اختلاف" اور ابن جریج نے ترجمہ کیا ہے "اقبال و ادبار" (دونوں ترجمے ہم معنی ہیں یعنی آمد و رفت)

أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ یا گھٹاتے گھٹاتے سب کو پکڑ لے۔ تخوف کا معنی ہے گھٹانا۔ تخوفتہ میں نے اس کو کم کر دیا۔ تخوفہ الدہر زمانے نے اس کو جسمانی و مالی تنقیص پہنچائی۔ بغوی نے لکھا ہے تخوف کا یہ معنی قبیلہ بنی ہذیل کے محاورہ میں آیا ہے۔ گھٹانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آج کسی کو کل کسی کو پرسوں اللہ ہلاک کر دے اور اسی طرح سب کو ختم کر دے۔

مجاہد اور کلبی نے کہا تخوف کا معنی خوف ہی ہے۔ میں کہتا ہوں اس صورت میں آیت کا مقصد یہ ہوگا کہ جب دوسرے ہلاک کر دیئے جائیں تو ان کی ہلاکت کو دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو جائیں اور اسی خوف کی حالت میں ان پر بھی ہلاکت آ جائے یا یہ مطلب ہے کہ پہلے ہلاکت کی نشانیاں ظاہر کر دی جائیں جن سے وہ لوگ خوف زدہ ہو جائیں ان کو ہلاک کر دیا جائے جیسے قوم ثمود کو ہلاک کیا گیا تھا پہلے روز ان کے چہرے زرد پڑ گئے تھے دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ ہو گئے اس کے بعد ان کو ہلاک کر دیا گیا۔

فَإِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ پس بلاشبہ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحیم ہے اسی وجہ سے وہ فوراً عذاب میں جلدی نہیں کرتا اور فوری سزا نہ دینے کی وجہ سے لوگ بے خوف ہو گئے ہیں، حالانکہ یہ بے باکی اور عذاب نہ ہونے کا یقین کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ رحیم ہونے کے باوجود اللہ سخت قہر بھی ہے اس کا انتقام بہت سخت ہے کسی میں بھی اس کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔

افامن کا عطف آیت وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا پر ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے یعنی جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے آدمیوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا تو پھر محمد ﷺ کا انکار اور آپ ﷺ کو مغلوب کرنے کی تدبیریں اور ان بری تدبیروں کے برے نتیجہ سے بے خوف ہو جانا بالکل نازیبا اور ناروا ہے۔ یہ رسول بھی گزشتہ رسولوں کی طرح ہیں جن کی مخالفت گزشتہ امتوں کے لئے تباہ کن ثابت ہو چکی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ کیا انہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا ہے تو اللہ کی قدرت کاملہ اور ہمہ گیر علم کا ادراک ان کو کیوں نہیں ہوا اور کیوں اس کے عذاب سے بے خوف ہو گئے۔

يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ

جن کے سائے کبھی ایک طرف کو کبھی دوسری طرف کو جھکتے جاتے ہیں کہ (بالکل) خدا کے حکم کے تابع ہیں اور وہ (چیزیں) بھی عاجز ہیں۔ یعنی کیا انہوں نے ان چیزوں کو نہیں دیکھا جن کے سائے سورج کے چڑھنے اترنے یا مشرق و مغرب کے اختلاف کی وجہ سے دائیں بائیں یعنی دونوں طرف بحکم الٰہی جھکتے ہیں۔ سُجَّدًا میں سجدے سے مراد ہے اطاعت اختیاری ہو یا فطری سَجَدَتِ النَّخْلَةُ کھجور کا درخت سجدہ کرنے لگا۔ یعنی پھلوں کا زیادہ بار پڑنے سے جھک گیا۔ سَجَدَ الْبَعِيرُ اونٹ نے اپنے اوپر سوار کرنے کے لئے گردن جھکا دی۔ مطلب یہ ہے کہ سائے اللہ کے ضابطۂ فطرت کے تابع ہیں یا یہ مطلب ہے کہ سجدہ کی

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے اور جو کچھ میں سنتا ہوں تم نہیں سنتے۔ آسمان خوب چرچرایا اور اس کو خوب چرچرانا چاہئے ہی تھا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آسمان میں کہیں بھی چار انگل کی جگہ ایسی نہیں کہ اس میں کوئی فرشتہ سجدہ میں پیشانی رکھے ہوئے نہ ہو۔ خدا کی قسم جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو کم ہنستے اور زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت اندوز نہ ہوتے اور میدانوں میں نکل کر اللہ کے سامنے چیختے چلاتے (یہ سن کر) حضرت ابوذرؓ بولے کاش میں درخت ہوتا کہ اس کو کاٹ دیا جاتا۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والبغوی۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ اور اللہ نے فرمایا ہے کہ دو معبود نہ قرار دو بس اللہ ہی ایک معبود ہے یعنی دوئی الوہیت کے منافی ہے (دو اللہ ہو ہی نہیں سکتے) آخری آیت دلالت کر رہی ہے کہ اس جگہ وحدانیت کو ثابت کرنا مقصود ہے الوہیت کا اثبات مقصود نہیں۔ الوہیت کے لوازم میں سے وحدانیت ہے۔

فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ لہٰذا خصوصیت کے ساتھ مجھ ہی سے ڈرا کرو۔ (اِيَّايَ فعل محذوف کا مفعول ہے اور فَارْهَبُوْنِ کا مفعول محذوف ہے اصل کلام اس طرح تھا اِيَّايَ ارْهَبُوْا فَارْهَبُوْنِ تکرار جملہ تاکیدی حکم کو ظاہر کر رہی ہے)

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ یعنی اللہ ہی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اس کی شان میں ظلم کا تصور بھی نہیں ہو سکتا وہ اپنی ملک میں ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے اس کے لئے کسی قسم کا تصرف ظلم نہیں ہو سکتا) ظلم تو دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا نام ہے بغیر اجازت کے دوسرے کی چیز میں تصرف جائز نہیں (اپنی ملک میں تصرف تو کسی صورت میں اور کسی بھی حالت میں ظلم ہو ہی نہیں سکتا) فرقہ معتزلہ انسان کو اپنے افعال کا خالق کہتا ہے اس کے مسلک کی تردید اس آیت سے ہو رہی ہے۔

وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اور اسی کو حق ہے کہ اس کی اطاعت لازمی طور پر اور ہمیشہ کی جائے اس کی اطاعت کا حکم کبھی ساقط نہیں ہو سکتا۔ وہی خدا واحد ہے اور اسی سے خوف کرنا ضروری ہے فرشتوں کی طرح انسانوں کو بھی ہمیشہ ہر حال میں اسی کی اطاعت کرنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔ رواہ احمد والحاکم بسند صحیح عن عمران والحکم بن عمرو الغفاری۔

صحیحین اور نسائی اور سنن ابوداؤد میں حضرت علیؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں اطاعت (کا حکم) تو نیکی میں ہے (امر ممنوع کا ارتکاب کسی کے حکم سے درست نہیں) لہ الدین واصبًا کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی مالک نہیں۔ مالک اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرف کر سکتا ہے غیر مالک مالک کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتا۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اس جگہ دین سے مراد ہے بدلہ یعنی سزا و جزا۔ مطلب یہ ہے کہ دوامی سزا و جزا اسی کو زیبا ہے وہی مومنوں کو دوامی ثواب دے گا اور کافروں کو لازوال عذاب۔

بعض نے کہا دین سے مراد عذاب ہے یعنی کافروں کو دوامی عذاب دینے کا اسی کو حق ہے اصل میں واصب بیماری کو کہتے ہیں وصب یوصب زید ذکی بیمار ہو گیا اللہ نے عذاب کی صفت واصب فرمائی ہے۔ ایک آیت میں فرمایا ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا: اَنَا وَصَّبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ میں نے رسول اللہ کی تیمارداری کی تھی نہایہ میں ہے وصب دوامی دکھ ہونا، توصیب تیمارداری۔ قاموس میں ہے وصب یعنی مرض او صبہ اللہ اس کو اللہ نے بیمار کر دیا وصب یوصب وصوبا مرض جم گیا۔ لازم ہو گیا وصب کا بھی یہی معنی آتا ہے وصب علی الامر کسی کام کی پابندی سے نگرانی کی اور اسی طرح اس کا انتظام کیا ہے آیت میں دو معبود ماننے والوں کے لئے اللہ کی طرف سے سخت اور دوامی عذاب کی وعید ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝ کیا تم اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو یعنی کسی دوسرے سے نہ ڈرو سوائے اللہ

سے کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ — اور تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے نعمت سے مراد ہے صحت، عافیت، دولت، خوشحالی، فرزند وغیرہ۔

ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ۝ — پھر جب تم پر (بیماری، ناداری، قحط وغیرہ کی کوئی) مصیبت آتی ہے تو عاجزی اور زاری کے ساتھ اللہ ہی کی طرف تم رجوع کرتے ہو۔ یعنی سوائے اس کے کسی سے دفع مصیبت کے لئے زاری نہیں کرتے چلا چلا کر اونچی آواز سے دعا کرتے اور فریاد کرتے ہو۔

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝

پھر جب اللہ مصیبت کو تم سے دور کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ یکدم (اللہ کی عبادت میں) دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں اگر خطاب تمام انسانوں کو مانا جائے مؤمنوں یا کافروں (فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ (تم میں کچھ) سے مراد ہوگا فریق کفار اور اگر خطاب صرف کافروں کو قرار دیا جائے تب کافروں میں سے بعض لوگوں کا مشرک ہو جانا صحیح ہے کیونکہ مصیبت دور ہونے کے بعد بعض کافر بھی نصیحت پذیر ہو جاتے ہیں۔ دوسری آیت میں آیا ہے: فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ پھر جب سمندری طوفان سے بچا کر خدا ان کو خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ سیدھی چال اختیار کر لیتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ — جس کا حاصل یہ ہے کہ جو نعمتیں ہم نے ان کو دی ہیں ان کی ناشکری کرتے ہیں قصداً و نیت معصیت کی نعمت لِيَكْفُرُوْا میں لام نتیجہ کا ہے یعنی ان کے شرک کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کی، دوسروں کی عبادت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خدا داد نعمتوں کا منعم دوسروں کو قرار دے دیا۔

فَتَمَتَّعُوْا ۗ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ — تم (چند روز) عیش کر لو پھر جلد ہی خبر ہو جائے گی۔ تَمَتَّعُوْا امر کا صیغہ ہے لیکن مراد ڈراوا ہے (حکم دینا مقصود نہیں ہے) فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ سے تہدید کی مزید شدت ہو گئی۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ — اور یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان (جھوٹے معبودوں) کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں۔ یعنی جن معبودوں کا حصہ لگایا جا رہا ہے وہ عبادت کے مستحق ہیں اور نفع یا ضرر پہنچانے والے ہیں یہ کافر ان کو ایسا نہیں خیال کرتے تھے اپنی نادانی کی وجہ سے ان کو معبود اور نفع و نقصان پہنچانے والے کہہ دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ کافر ان معبودوں کا حق نہیں سمجھتے پھر بھی حصہ لگا دیتے ہیں یا لَا يَعْلَمُوْنَ سے مراد بت ہیں اور يَعْلَمُوْنَ کا فاعل بت ہیں یعنی بت بے علم ہیں جماد ہیں اور کافر ایسی چیزوں کا حصہ لگا دیتے ہیں۔ مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ سے مراد ہے کھیتی، مویشی، جیسے مشرک کہا کرتے تھے هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا۔

تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝ — خدا کی قسم تم سے تمہاری ان دروغ تراشیوں کی ضرور باز پرس ہوگی۔ یعنی تم جو ان کو معبود بنا رہے ہو قیامت کے دن اس کی باز پرس ہونی تم سے ضرور ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝ — اور اللہ کے لئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں سبحان اللہ اور اپنے لئے چاہتی چیز (یعنی بیٹے) بنی خزاعہ اور بنی کنانہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ سبحانہ، تنزیہ ذات ہے یعنی اللہ ہر نسبت اولاد سے پاک، میں اس کو سمجھتا ہوں اور اس کی پاکی کا اقرار کرتا ہوں یا سبحانہ صرف اظہار تعجب کے لئے ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝

اور ان میں سے کسی کو بیٹی ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو سارے دن اس کا چہرہ بے رونق رہتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا ہے۔ مُسْوَدًّا یا تو بے رونق یعنی شرم، رنج اور غم کی وجہ سے اس کا چہرہ بے رونق ہو جاتا ہے اور دن بھر بے رونق رہتا ہے باوجودیکہ جننا ایسی چیز ہے کہ اس میں خوشی بھی ہوتی ہے اور غم بھی مگر اس پر رنج ہی سوار رہتا ہے۔ کظیم دل میں غم و رنج گھونٹ کر اس کو اندر ہی اندر روکے رکھتا ہے ظاہر نہیں کرتا۔

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اور جس چیز (لڑکی) کی اس کو اطلاع دی جاتی ہے اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ القوم سے مراد ہے اپنے لوگ۔

اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ (تردد میں پڑ جاتا ہے) کہ اس کو ذلت کی حالت میں (اپنے پاس) ہونے دے رکھے یا مٹی میں اس کو زندہ گاڑ دے۔

یدسہ چھپا دے، دفن کر دے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قبیلۂ مضر اور بنی خزاعہ اور بنی تمیم لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے ایک تو ان کو ناداری کا اندیشہ ہوتا تھا کہ لڑکیاں تو صرف کھانے پینے کی ہیں لوٹ مار کر کے کہیں سے کچھ لا نہیں سکتیں۔ دوسرے یہ کہ (ناداری کو دیکھ کر) غیر کفو کہیں ان سے نکاح کرنے کا لالچ نہ کرنے لگیں۔ عرب کے بعض لوگوں کا دستور تھا کہ جب لڑکی پیدا ہوتی اور وہ اس کو زندہ رکھنا چاہتا تو اس کو اون کا یا بالوں کا کرتہ پہنا کر جانور چرانے کی خدمت پر لگا دیتا تھا اور اگر اس کو قتل کر دینا چاہتا تو چھ سال کی عمر تک اس کو چھوڑے رکھتا جب وہ چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں سے کہتا اس کو بنا سنوار کر تیار کر دے پھر اس کو کہیں جنگل میں لے جاتا وہاں پہلے ایک گہرا گڑھا کھود کر تیار رکھتا جب لڑکی کو لے کر وہاں پہنچتا تو لڑکی سے کہتا: دیکھ تو اس گڑھے میں کیا ہے لڑکی دیکھنے کو جونہی جھکتی یہ سنگدل باپ پیچھے سے اس کو دھکا دے دیتا اور اوپر سے مٹی ڈال کر زندہ دفن کر دیتا اور گڑھے کو ہموار کر دیتا۔

فرزدق کے دادا صعصعہ کو اگر کہیں اس کی بھنک مل جاتی تو لڑکی کے باپ کے پاس لڑکی کے عوض کچھ اونٹ بھیج دیتا اور اس طرح لڑکی کی گلو خلاصی ہو جاتی فرزدق نے بطور فخر اسی واقعہ کی طرف ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے۔

میرا دادا وہ تھا جس نے زندہ دفن کرنے والوں کو زندہ دفن کرنے سے روکا اور زندہ درگور ہونے والی کو زندگی عطا کی۔

اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ خوب سن لو ان کی یہ تجویز بہت ہی بری ہے اللہ جو ہر طرح کی اولاد سے پاک ہے اس کے لئے تو ایسی اولاد تجویز کرتے ہیں جو صنف ادنیٰ ہے اور اپنے لئے لڑکوں کو پسند کرتے ہیں دوسری آیت میں اس کو ناانصافی کی تقسیم قرار دیتے فرمایا ہے، اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۔

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کی بُری حالت ہے مرنے کے بعد بقاءِ نسل کے محتاج ہیں اپنی قوت بڑھانے کے لئے لڑکوں کے ضرورت مند ہیں لڑکیاں ہونے کو برا جانتے ہیں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے ہیں یہ سب ان کی بری حالت ہے۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ

اور اللہ کی شان سب سے اونچی ہے وہ واجب الوجود ہے ہر چیز سے بے نیاز ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں علم قدرت بقاء اور تمام جلالی و جمالی صفات سے متصف ہے مخلوق کی صفات سے پاک ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَثَلُ السَّوْءِ دوزخ ہے اور مثل اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اور وہ (سب پر) غالب اور (اس کا ہر کام) پر حکمت ہے۔ یعنی قدرت و حکمت میں یگانہ و بے مثال ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ اگر اللہ لوگوں کی بے جا حرکتوں کے سبب ان کی فوری گرفت کرتا تو زمین پر کسی حرکت کرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

مؤاخذہ کرنے سے مراد ہے فوری سزا دینا۔ الناس سے مراد گنہگار ہیں۔ لفظ مؤاخذہ اور ظلم اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے ظلم سے مراد ہے کفر اور معصیت۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ الناس سے مراد سب لوگ ہیں (مؤمن ہوں یا کافر) عبارت کی رفتار اسی کی غمازی کر رہی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ سب ہی لوگ یہاں تک کہ انبیاء بھی ظالم قرار پا جائیں گے کیونکہ گروہ انسانی کے اکثر افراد سے چونکہ کفر و معصیت کا صدور ہو رہا ہے اس لئے جماعت کی طرف ظلم کی نسبت کر دی گئی اور جماعت کی طرف نسبت کرنے سے ہر ہر شخص کی طرف نسبت ضروری نہیں۔ (حضرت مفسرؒ نے کہا) میں کہتا ہوں (اس صورت

کیوں نہیں۔

میں کہتا ہوں اس ترجمہ کی بناء اس امر پر ہے کہ لا جَرَمَ کے لا کو نافیہ قرار دیا جائے اور اس سے گزشتہ خیال کی تردید مقصود ہو پہلے بیان کیا تھا کہ کافروں کا خیال ہے کہ ان کے لئے جنت ہوگی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے اللہ نے اس کی تردید فرمادی اور پھر ان کے دوزخی ہونے کی صراحت فرمادی۔

مُّفْرَطُوْنَ (افراط سے اسم مفعول) قاموس میں ہے دوزخ میں چھوڑے ہوئے گویا دوزخ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے یا سب سے پہلے دوزخ میں بھیجے گئے (ہم نے یہی ترجمہ کیا ہے) مترجم۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا ہے دوزخ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے مقاتل نے کہا دوزخ میں چھوڑ دیئے گئے۔ قتادہ نے کہا دوزخ میں جلد بھیج دیئے گئے فراء نے کہا دوزخ میں سب سے پہلے بھیجے گئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا أنَا فَرَطُكُمْ میں تمہارا پیش رو ہوں گا اور حوض پر سب سے پہلے پہنچوں گا سعید بن جبیرؒ نے ترجمہ کیا وہ (نجات ورحمت سے) دور کر دیئے جائیں گے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ　　آپ سے پہلے جو امتیں ہو گذری ہیں ان کے پاس بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا تھا سو ان کو بھی شیطان نے ان کے (کفریہ) اعمال خوبصورت (پسندیدہ) بنا کر دکھائے یعنی اکثر امتوں کو۔ اعمال سے مراد ہیں کفریہ اعمال، شرک باللہ اور پیغمبروں کی تکذیب۔ شیطان نے اعمال کفر کو ان کی نظر میں پسندیدہ بنایا اس لئے وہ اپنے برے اعمال پر جمے رہے۔

فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝　　پس وہی شیطان آج (اس دنیا میں) ان (کفار قریش) کا بھی رفیق ہے اور قیامت کے دن ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ وَلِيُّهُمْ کی ضمیر کفار قریش کی طرف لوٹ رہی ہے کلام کی رفتار کا بھی تقاضا ہے کفار قریش کے متعلق کلام کیا جارہا ہے۔ "ولی" کا معنی ہے مددگار، رفیق، ساتھی، جو قریش کے برے اعمال کو اچھی شکل میں بنا کر دکھا رہا ہے۔ مسلمانوں کی دشمنی میں ان کا ساتھی اور مددگار ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَلِيُّهُمْ کی ضمیر اُمم سابقہ کی طرف لوٹائی جائے اور گزشتہ حال کی حکایت قرار دی جائے یعنی شیطان اُمم سابقہ کا اس دنیا میں رفیق تھا اعمال کفریہ کو پسندیدہ بنا کر دکھاتا تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اَلْيَوْمَ سے مراد قیامت کا دن ہو اور آنے والے واقعہ کا بیان یعنی قیامت کے دن شیطان ان کافروں کا ساتھی ہوگا اور طوق و زنجیر میں ان کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن بس شیطان ہی ان کا رفیق ہوگا کوئی اور رفیق نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ شیطان اس روز خود اپنی مدد نہیں کر سکے گا تو ان کی مدد کیا کرے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مضاف محذوف ہو یعنی گزشتہ اقوام جیسے لوگوں کا رفیق یہاں شیطان ہی ہے مطلب یہ کہ کفار قریش گزشتہ امتوں کی طرح ہیں اور ان کا رفیق شیطان ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

اور ہم نے یہ کتاب آپ پر صرف اس لئے نازل کی ہے کہ جن امور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ عام لوگوں پر اس کو ظاہر فرمادیں اور خاص طور پر ایمان والوں کے لئے ہدایت اور رحمت (بنا کر ہم نے یہ قرآن نازل کیا ہے)۔

اِخْتَلَفُوْا فِيْهِ یعنی توحید، اللہ کی صفات، تقدیر، احوال قیامت، انسانی افعال (کی تخلیق) اور اللہ کے احکام کے بارے میں لوگوں کے جو مختلف خیالات ہیں۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا　　اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا۔ الارض سے مراد ہے زمین کا سبزہ زمین کو زندہ کیا یعنی اس کو سرسبز اور نامی بنایا۔ زمین کی موت سے مراد ہے زمین کا خشک ہو جانا روح نباتی سے خالی ہو جانا۔

کھانا پڑے گا۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ

اور (نیز) کھجور اور انگوروں کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو (حضرت مفسرؒ نے لکھا ہے) نُسْقِيْكُمْ فعل محذوف ہے اور ثمرات سے مراد ہے کھجور و انگور کا شیرہ وغیرہ۔ یعنی ہم تم کو پینے کے لئے شیرہ کھجور و انگور دیتے ہیں۔ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سے جملہ علیحدہ ہے یا مِنْ ثَمَرٰتِ کا تعلق تَتَّخِذُوْنَ سے ہے (اسی کے موافق ترجمہ کیا گیا ہے) سَكَر۔ نشہ آور چیز یا مصدر ہے بمعنی صفت یعنی شراب۔ قاموس میں ہے سَكِرَ (بے ہوش ہو گیا) ہوش کی ضد ہے سُكْرٌ، سُكُرٌ، سَكَرٌ، سُكْرَانٌ یہ سب مصدر ہیں۔ سَكَر بفتحتین شراب اور اس نبیذ کو بھی کہتے ہیں جو کھجوروں اور کشمش سے اور ہر نشہ آور چیز سے بنایا جاتا ہے۔ اور سرکہ اور طعام کو بھی سکر کہا جاتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ سُکر وہ ہوتا ہے جو کھجوروں کے عرق سے بنایا جاتا ہے شریک بن عبداللہ نے کہا اس آیت کی وجہ سے سکر کی اباحت ثابت ہو رہی ہے کیونکہ اللہ نے بطور احسان و منت ہی سکر تیار کرنے کا ذکر کیا ہے اور حرام چیز کا ذکر بطور احسان نہیں کیا جا سکتا ہماری دلیل یہ ہے کہ سکر کی حرمت پر صحابہؓ کا اجماع ہے رہا آیت کا جواب تو (یہ آیت مکی ہے) اس کا نزول اس وقت ہوا جب ہر طرح کی پینے کی چیز حلال تھی۔ نہی کا امر۔

بغوی نے لکھا ہے کچھ لوگوں کا قول ہے کہ سَکَر شراب ہے اور رزق حسن سرکہ رب چھوہارے اور کشمش۔ اور یہ حکم تحریم خمر سے پہلے کا ہے (یعنی اس آیت کا نزول حرمت شراب سے پہلے ہوا تھا) یہ قول حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ، سعید بن جبیرؒ، حسن اور مجاہد کا ہے بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ سکر وہ پھل ہیں جو حرام کر دیئے گئے اور رزق حسن سے مراد حلال پھل ہیں (شاید حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جو عرق و نبیذ پھلوں کا حرام کر دیا گیا ہے وہ سکر ہے اور جو عرق یا نبیذ حلال رکھا گیا وہ رزق حسن ہے۔ مترجم) ابوعبیدہ نے کہا سکر سے مراد ہے کھانا عرب بولتے ہیں جُعل لک سکراً یہ آپ کا کھانا ہے۔ شعبی، سکر سے پینے کی چیز مراد ہے اور رزق حسن سے کھانے کی چیز۔ عوفی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حبشی زبان میں سکر سرکہ کو کہتے ہیں ضحاک اور نخعی کا قول ہے کہ حبشی زبان میں نشہ آور نبیذ کو سکر کہتے ہیں اور سکر چھوہاروں اور کشمش کے گاڑھے خیسانیدہ اور پکائے ہوئے عرق کا نام تھا سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ آیت تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا منسوخ ہے انتہی کلام البغوی۔

ایک اور مقام پر بغوی نے لکھا ہے کہ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شراب کے متعلق چار آیات نازل ہوئی تھیں۔ آیت وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کے نزول کے بعد مسلمان شراب پیتے تھے۔ شراب اس زمانہ میں حلال رہی اس کے بعد مدینہ میں آیت يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ نازل ہوئی اس کے کچھ زمانہ کے بعد آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى نازل ہوئی اور سب سے آخر میں سورۂ مائدہ والی آیت نازل ہوئی (جس میں شراب کی قطعی ابدی حرمت ہو گئی) چاروں آیات کے نزول کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے ذکر کر دی ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۞ بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں یعنی آیات میں غور و فکر کرنے کا کام اپنی عقلوں سے لیتے ہیں۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۞

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈال دی کہ تو بعض پہاڑوں میں گھر بنالے اور بعض درختوں میں بھی اور لوگ جو چھتیں بناتے ہیں ان میں بھی۔ وحی کرنے سے مراد ہے الہام کرنا اور دل میں ڈالنا۔ یعرشون سایہ کے گھروں کی چھتیں بناتے ہیں یا عرش سے مراد ہے انگوروں کی ٹٹیاں۔ عرش کا لغوی معنی ہے چھت۔ مِنَ الْجِبَالِ اور مِنَ الشَّجَرِ اور

مما یعرشون میں مِن تبعیضیہ ہے کیونکہ سب پہاڑوں میں اور سب درختوں میں اور سب چھتوں اور انگوروں کی بیلوں میں شہد کی مکھیوں کے چھتے نہیں لگتے ہیں نہ ہر جگہ چھتا ہوتا ہے بعض پہاڑوں اور بعض درختوں وغیرہ میں بعض جگہ چھتے لگتے ہیں شہد کی مکھی کے چھتے کو مکان کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ انسانی مکان کی طرح مکھیوں کے چھتوں میں بھی تمام ضروری حصے ہوتے ہیں ان میں بھی متعدد کمرے، چھتیں اور دروازے ہوتے ہیں اور وہ بھی حسن صنعت کا ایسا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں کہ سوائے کسی ماہر انجینئر کے اور کوئی انسان بھی ایسا نقشہ بنا سکتا ہے نہ ایسی تعمیر کر سکتا ہے۔

ثُمَّ كُلِي مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا — پھر ہر قسم (یعنی ہر ضروری اور مناسب قسم) کے پھلوں کو چوس اور پھر اپنے رب کے راستوں پر چل جو آسان ہیں۔

الثمرات میں الف لام جنسی ہے اور لفظ کل استغراقی نہیں ہے بلکہ ہر مرغوب اور مناسب پھل مراد ہے یعنی ہر قسم کے مناسب پسندیدہ اور میسر آجانے والے پھلوں کا عرق چوس لے خواہ میٹھے ہوں یا کڑوے۔

سُبُلَ رَبِّكِ یعنی ان راستوں پر چل کر شہد تیار کر جو تیرے رب نے تجھے بتا دیئے ہیں اور فطری طور پر تجھے سکھا دیئے ہیں اور جب دور دور کے پھولوں کا رس چوس کر اپنے گھر کو لوٹے تو اپنے رب کے بتائے ہوئے راستوں پر لوٹ تاکہ راستہ بھول نہ جائے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے ایسے راستوں پر چل تاکہ تیرے پیٹ کے اندر پھلوں اور پھولوں سے چوسا ہوا عرق شہد بن جائے۔

ذُلُلًا یعنی وہ راستے اللہ نے تیرے لئے آسان کر دیئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت میں لگی رہ اور حکم کے زیر اثر راستوں پر چلا کر۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ مکھیوں کے سردار تمام مکھیوں کو ساتھ لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہو جاتے ہیں اور سب مکھیوں کا ایک بادشاہ ہوتا ہے جس کو یعسوب کہا جاتا ہے جب وہ کہیں سے چل دیتا ہے تو سب مکھیاں چل دیتی ہیں اور جہاں کہیں وہ رک جاتا ہے تو سب ٹھہر جاتی ہیں۔

يَخْرُجُ مِن بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ — اس کے پیٹ میں سے ایک پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں یعنی سرخ بھی ہوتا ہے سفید بھی زرد بھی اور سبز بھی۔

فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ — کہ اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ مجاہد نے فیہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع کی ہے یعنی قرآن میں لوگوں کے لئے شفاء ہے لیکن آیت کی رفتار بتا رہی ہے کہ شہد کی طرف ضمیر راجع ہے یعنی شہد میں شفاء ہے یعنی بعض امراض کے لئے۔ بعض حالات میں شہد کے اندر شفاء ہے شفاء نکرہ ہے جو کلام موجب ہے اس لئے عموم کی نفی ہے یعنی بعض امراض کے بعض حالات میں شفاء ہے۔

ایک شبہ

بعض حالات میں بعض امراض کے لئے شفاء تو ہر چیز میں ہے یہاں تک کہ زہر میں بھی بعض امراض کے لئے شفاء ہے شہد ہی کی کیا خصوصیت ہے۔

ازالہ

جملہ میں تنوین عظمت کو ظاہر کر رہی ہے یعنی شہد میں اکثر امراض کے لئے شفاء عظیم ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو شفاؤں کو لازم پکڑو۔ شہد اور قرآن (اول میں شفاء جسمانی ہے اور دوسرے میں شفاء روحانی) رواہ ابن ماجہ والحاکم بسند صحیح۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ شہد میں شفاء غالب ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض امراض کے لئے تو شہد تنہا شفاء ہے اکثر بلغمی امراض میں مفید ہے اور بعض امراض کے علاج میں دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر شہد مفید صحت ہے اور معجونوں کا جزء اعظم شہد ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور

عرض کیا میرے بھائی کو اسہال کی شکایت ہے۔ فرمایا شہد پلاؤ۔ حسب الحکم اس شخص نے شہد پلایا (مگر کچھ فائدہ نہ ہوا) اور پھر خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضور میں نے شہد پلایا تھا، شہد سے اور اسہال میں اضافہ ہو گیا۔ فرمایا اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا۔ اس نے جا کر پھر شہد پلایا اور مریض اچھا ہو گیا۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ (پیٹ کے) بعض امراض کے لیے تنہا شہد شفا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خلوص اور حسن نیت سے جو شخص تنہا شہد کا استعمال کرے گا اللہ اس کو شفا دے گا خواہ کوئی مرض ہو۔ کذا قال البیہقی۔

تحقیق یہ ہے کہ یہ کہنا کہ شہد ہر مرض کے لئے شفا ہے قرآن میں مذکور ہے نہ حدیث میں۔ ہر فصل کے شہد کی خاصیت جداگانہ ہے کس قسم کے پھلوں اور پھولوں کے عرق سے شہد تیار ہوا ہے اس کا لحاظ بھی موسم کے مطابق ضروری ہے۔ شہد کے علاوہ کوئی شفا بخش دوا نہیں ہے کہ ہر قسم کے پھلوں اور پھولوں کا خلاصہ کھینچ کر اس میں آگیا ہو ہر دوا کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے شہد ہی ایک ایسی چیز ہے جو فصل کے اختلاف اور پھلوں پھولوں کے تنوع کے لحاظ سے اپنے اندر مختلف مزاج رکھتا ہے۔ یہ کہنا کہ شہد ہر مرض کے لئے شفا ہے خود صحیح ہے لیکن مرض کی نوعیت کے لحاظ سے شہد کی نوعیت اور جس فصل کا شہد مطلوب ہو۔ شہد کی ان کی دریافت لازم ہے پھر شہد کے طریق استعمال اور مقدار استعمال کا بھی بڑا فرق ہے اگر طریق استعمال اور مقدار ضروری کا علم نہ ہو تو اس سے شہد کے شفا بخش ہونے کی نفی نہیں کی جا سکتی ہر شہد ایک کیفیت کا بھی حامل نہیں ہوتا کسی میں گرمی زیادہ ہوتی ہے کسی میں کم، بعض شہد فالج، لقوہ، اور بڑے بڑے اعصابی امراض میں بہت مفید ہوتے ہیں اور بعض کم مفید اور بعض بالکل فائدہ نہیں دیتے۔ اسہال کو روکنے کے لئے بھی شہد مفید ہوتا ہے اور جاری کرنے کے لئے بھی۔ فاسد مادہ کو باہر نکال کر پھینک دیتا ہے اور فاسد غذائی مادہ کو نکال پھینکنے کے بعد قبض بھی کر دیتا ہے۔ غرض شہد مقوی بھی ہے مفرح بھی اچھی غذا بھی ہے اور عمدہ دوا بھی۔ جو اور جتنے فوائد شہد کے اندر ہیں وہ دنیا کی کسی چیز کے اندر نہیں ہیں۔ حقیقت میں شہد مجمع الاضداد ہے)

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿٦٩﴾ اس میں بھی ان لوگوں کے لئے (اللہ کی قدرت، حکمت اور وحدانیت وربوبیت کی) بڑی دلیل ہے جو غور کرتے ہیں جو شخص مکھیوں کی ان صنعتی مہارت اور عجیب پختہ نظم پر غور کرے گا اس کو صاف نظر آجائے گا کہ یہ سب کار فرمائی اس مدبر ذات کی ہے جس کا تدبر مخفی ہے وہی مکھیوں کے دل میں یہ تدبیریں ڈالتا ہے اور ترکیبیں بتاتا ہے۔

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ ۚ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴿٧٠﴾

۹ ع ۱۵

اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہی تمہاری جانیں قبض کرتا ہے (بچپن میں یا جوانی میں یا متوسط عمر میں یا بڑھاپے میں) اور بعض تم میں سے وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہونے کے بعد پھر بے خبر ہو جاتا ہے بے شک اللہ بڑے علم اور بڑی قدرت والا ہے۔

أَرْذَلِ الْعُمُرِ بدترین عمر، ناکارہ عمر، انتہائی بڑھاپا۔ قتادہ نے کہا ارذل العمر نوے سال ہے حضرت علیؓ نے فرمایا پچھتر برس ارذل عمر ہے۔ بعض نے اسی برس کی عمر کو رذیل عمر کہا ہے رسول اللہ ﷺ یہ دعا میں فرماتے تھے اے اللہ! میں بڑی عمر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اے اللہ میں تیری پناہ کا طالب ہوں کہ مجھے ارذل عمر تک پہنچایا جائے۔ صحیحین وغیرہ میں بھی ایسی ہی روایت آئی ہے باخبر ہونے کے بعد بے خبر ہو جانے کا یہ مطلب ہے کہ تمام معلومات کو بھول جائے اور بچوں کی طرح نادان اور ضعیف الفہم ہو جائے۔ عکرمہ نے کہا جو قرآن (ہمیشہ) پڑھتا ہے وہ اس حالت پر نہیں پہنچتا۔ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ یعنی اللہ لوگوں کی عمروں کی مقداروں سے خوب واقف ہے اور ہر چیز پر قادر ہے پیر فرتوت کو بھی باقی چھوڑتا اور جوان قوی کی جان بھی قبض کر لیتا ہے۔ اس آیت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں کے احوال کا اختلاف وتفاوت اللہ علیم وحکیم کے اندازے کے مطابق اور اس کی مشیت کے موافق ہے طبعی اور خود بخود نہیں ہے اگر طبعی تقاضا ہوتا تو اس حد تک نہ

کسی صفت کے ساتھ اللہ کا متصف ہونا محال ہے ایسی حالت میں اللہ کو کسی چیز پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے غائب کو حاضر کے ساتھ تم نے (خیال) کس طرح کر لیا ہے۔ کوئی بات چاہئے اور وصف مشترک موجود۔ ان الله يعلم وانتم لا تعلمون کا یہ مطلب ہے کہ اللہ حقائق اشیاء سے واقف ہے اور تم ناواقف ہو یا یہ مطلب ہے کہ تم جو اللہ کی مثالیں بیان کرتے ہو اور قیاس چلاتے ہو اللہ کو ان کی غلطی کا علم ہے وہ جانتا ہے تمہاری تمثیلات فاسد ہیں اور تم کو اس کا علم نہیں اگر تم کو اپنے قول کی غلطی کا علم ہوتا تو تمثیلات بیان کرنے کی جرأت ہی نہ کرتے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ　اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے (فرض کرو)

ایک شخص غلام ہے دوسرے کا مملوک ہے خود کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔

اللہ نے یہ مثال اپنی ذات اور دوسرے باطل معبودوں (کا فرق واضح کرنے) کے لئے بیان کی ہے۔ مملوکاً سے مراد یہ ہے کہ وہ غلام آزاد نہیں۔ یوں تو تمام لوگ آزاد ہوں یا غلام اللہ کے بندے ہیں لا یقدر علی شیء کہنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ غلام مکاتب نہیں ہے ورنہ اس کو لین دین کی آقا کی طرف سے اجازت دی گئی ہے (مکاتب اس غلام کو کہتے ہیں جس نے آقا سے معاہدہ کر لیا ہو کہ اتنا روپیہ کما کر جب میں تم کو دے دوں گا تو آزاد ہو جاؤں گا اور آقا نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا ہو)۔

وَمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ

اور ایک شخص وہ ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی ہے سو وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح اور جتنا چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں۔

اللہ نے اس مثال میں باطل معبودوں کو اس غلام سے تشبیہ دی جو بے بس اور ہر قسم کا تصرف کرنے سے عاجز ہے جس کو کسی امر کا اختیار نہیں۔ اور اپنی ذات کو آزاد مالدار کی آزادی سے تمثیل دی جو جیسا اور جتنا چاہتا ہے خرچ کرتا ہے ظاہر ہے کہ صرف اس کو توفیق نہیں ہے وہ کھلا اور پوشیدہ خرچ ہے کوئی مانع نہیں ہے غرض اس تمثیل سے شرک کے باطل ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ جن بتوں کو اللہ کی الوہیت میں شریک قرار دیا تھا وہ تو بے اختیار غلام سے زیادہ عاجز ہیں اور اللہ ہر آزاد غنی سے زیادہ مالک مال اور عطا کنندہ اور قوی مختار ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ　ساری تعریفیں اللہ کے لائق ہیں۔ (لیکن یہ لوگ اس کے منکر ہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ہیں۔ یعنی اللہ ہی تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اللہ ہی ہر ستائش کا مستحق ہے اس کے سوا اور کوئی نعمت دینے والا نہیں اس لئے کوئی دوسرا قابل ستائش نہیں۔ معبودیت کا مستحق تو تنہا خود وہ ہے۔

اکثر لوگ چونکہ جانتے نہیں نادانی کی وجہ سے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی طرف سے منسوب کر دیتے ہیں اور غلط نسبت کی وجہ سے باطل معبودوں کی عبادت کرتے ہیں بعض اہل تفسیر کا خیال ہے کہ عبداً مملوکاً کافر کی مثال ہے اللہ نے اس کو توفیق ہی نہیں دی کہ کوئی بھلائی کر سکے پس وہ اپنے مال کو اچھے مصرف میں خرچ کرنے سے عاجز ہے اور من رزقناه منا رزقا حسنا مومن کی مثال ہے جو اللہ کی راہ میں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

ابن جریج نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ عبد مملوک سے مراد ابو جہل ہے اور من رزقناه سے مراد حضرت ابو بکر صدیق ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ

اور اللہ ایک (اور) مثال بیان کرتا ہے دو آدمی ہیں ایک تو ان میں گونگا ہے کوئی کام نہیں کر سکتا اپنے سرپرست کے لئے وبال جان ہے اس کو جہاں بھی بھیجتا ہے کوئی کام ٹھیک کر کے نہیں لاتا۔

اَبْکَمُ پیدائشی گونگا جو نہ کچھ سمجھتا ہے نہ بول سکتا ہے لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ گونگے پن کی وجہ سے وہ کسی صنعت پر قادر نہیں نہ کسی کام کی تدبیر پر۔ کَلٌّ بار ہے یعنی وبال ہے مَوْلٰہُ یعنی اپنے سرپرست کے لئے (آقا پر بوجھ ہے) لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ یعنی کسی مفوضہ کام کو بھی ٹھیک کر کے نہیں لاتا۔ یہ تشبیہ بتوں کی ہے جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں نہ کچھ سمجھتے ہیں پوجنے والوں پر خواہ مخواہ کا بار ہیں، پجاری خود ان کو اٹھاتے اور رکھتے ہیں اور سب بے سود ہے بت ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

ہَلْ یَسْتَوِیْ ہُوَ وَمَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَہُوَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۞ کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہو اور خود بھی سیدھے راستے پر چلتا ہو۔ یعنی جو شخص سالم النطق اور سمجھدار ہو خوب رواں سلیس گفتگو کر سکتا ہو وہ ہر کام ٹھیک اور پورا پورا کرتا ہو، لوگوں کو تمام اچھی باتیں سکھاتا ہو۔ غرض یہ کہ عدل (جو عفت، شجاعت اور حکمت کا مجموعہ ہے) کی تعلیم دیتا ہو اس گونگے ناکارہ بے وقوف کی طرح ہو سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ صراط مستقیم پر ہونے کا یہ معنی ہے کہ ہر مقصد کو سیدھے راستے پر چل کر حاصل کر لیتا ہو۔ مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے اللہ نے اپنی ذات کی تمثیل دی ہے بعض علماء نے کہا اس سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مراد ہے۔ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اَبْکَمُ سے کافر اور مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مومن مراد ہے۔ یہ تمثیل کافر و مومن کی ہے۔

عطاء نے اس آیت کے (سبب نزول) کے ذیل میں بیان کیا کہ اَبْکَمُ سے مراد اُبی بن خلف ہے اور مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مراد حضرت حمزہؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ ہیں۔ مقاتل نے کہا قبیلہ ربیعہ کا ایک شخص تھا جس کا نام ہاشم بن عمرو بن حارث تھا یہ رسول اللہ ﷺ کا سخت دشمن تھا اور بہت ہی شریر تھا اسی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آیت ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا ایک قریشی آدمی اور اسکے غلام کے متعلق نازل ہوئی اور آیت رَجُلَیْنِ اَحَدُہُمَا اَبْکَمُ حضرت عثمانؓ اور ان کے کافر غلام اُسید بن ابوالعیص کے متعلق نازل ہوئی۔ اُسید کو اسلام سے سخت نفرت تھی خود بھی کافر تھا اور دوسروں کو بھی اسلام سے اور ہر بھلائی، حسن سلوک اور خیر خیرات سے روکتا تھا۔

وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یعنی ان سے واقف اللہ ہی ہے بغیر اس کے بتائے ہوئے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتیں۔ غیب و شہادت کے معنی کی تشریح ہم نے سورۃ حجر میں ذکر کی ہے۔

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَۃِ اِلَّا کَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ ہُوَ اَقْرَبُ اور قیامت کا معاملہ بس پلک جھپکنے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی جلدی۔ یعنی بوقوع قیامت کی سرعت اور سہولت پلک جھپکنے کی طرح ہے۔ قاموس میں لمح کا معنی نظر جھپکنا بیان کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت بس ایسی ہے جیسے کوئی نظر کو جھپک لے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ لمح کا معنی ہے نظر کا صدق، چشم کے بالائی حصہ سے نیچے حصہ کی طرف لوٹنا۔ پلک جھپکنے سے کم وقت کو ظاہر کرنے کے لئے عرف عام میں کوئی لفظ نہیں اس لئے قیامت کے جلد اور بسہولت آنے کی تشبیہ پلک جھپکنے سے دی گئی۔ اَوْ ہُوَ اَقْرَبُ کا یہ مطلب ہے کہ قرب قیامت اس سے بھی جلدی ہے اللہ مردہ مخلوق کو یکدم زندہ کرنے کے ارادے کا بعد دم کیے بغیر ہر چیز موجود ہو جائے گی دم کی کوئی مدت نہیں بیان کی جا سکتی۔ بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول منکرین کے متعلق ہوا جو قیامت کے منکر تھے اور قیامت کا مذاق اڑاتے ہوئے جلد سے جلد آجانے کے خواہش مند تھے۔

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۞ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ دنیا میں اس نے مخلوق کو رفتہ رفتہ وجود عطا فرمایا اور قیامت کے دن سب کو یکدم زندہ کر دے گا۔ یہ بھی اس کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّہٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَۃَ اللہ نے ہی تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم (بے جان جمادات کی طرح) کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور اسی نے تم کو کان دیئے اور آنکھیں اور دل۔

کے اندر پتھروں کو تراش کر بنائے ہوئے مکان بنائے۔ اکنان کِنّ کی جمع ہے کِنّ چھپنے کا مقام۔ مکان وغیرہ۔

وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُمْ بَأْسَكُمْ اور تمہارے لئے (سوت، اون، کتان اور ریشم وغیرہ کے کچھ) ایسے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے محفوظ رکھتے ہیں اور (لوہے، ریشم وغیرہ کے کچھ) ایسے کرتے بنائے جو لڑائی میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔

صرف گرمی سے بچانے کا ذکر کیا اور سردی گرمی دونوں میں ایک ضد کو ذکر کرنے کے بعد دوسرے کا ذکر ضروری نہ تھا (خود ہی سمجھ میں آسکتا تھا اس لئے ذکر نہیں کیا گیا)

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ اللہ تعالیٰ اسی طرح (کی) نعمتیں تم کو پوری پوری عطا فرماتا ہے تاکہ تم فرماں بردار رہو۔ یعنی جس طرح اس نے مذکورہ نعمتیں تم کو عطا فرمائی اسی طرح تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تمہارے لئے اس نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو بھیجا اور رسول ﷺ کی تصدیق کے لئے ان کو معجزات عطا کئے اور اپنی کتاب نازل کی اور واضح دلائل قائم کیں اور اسلام کو عزت دی یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ اکثر لوگ فرماں بردار ہو جائیں اور خالص اللہ کی اطاعت کریں۔ عطاء خراسانی نے کہا اللہ نے انسانوں کی سمجھ کے موافق قرآن نازل فرمایا۔ (دیکھو پہاڑوں میں جائے پناہ پیدا کرنے کا ذکر کیا اور میدان اور صحرا جو پہاڑوں سے بڑے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا وجہ یہ ہے کہ ان کے چاروں طرف پہاڑ تھے پہاڑ ان کے سامنے تھے اسی طرح اون، روئیں اور بالوں کے خیموں اور پوشاکوں کا تذکرہ اس لئے کیا کہ وہ مویشی پالا کرتے تھے ان کے پاس اون بال وغیرہ ہی تھے۔ اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ اللہ تعالیٰ آسمانی پہاڑوں سے اولے اتارتا ہے (آسمانی برف کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ژالہ باری سے برف باری کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ برف باری سے واقف ہی نہ تھے اسی طرح عرب والے گرمی سے حفاظت کو لباس کا فائدہ فرما دیا ہے سردی کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ان لوگوں کو گرمی سے ہی زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ پھر بھی یہ لوگ اگر (ایمان سے) منہ پھیریں (تو آپ سے ان کا کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا کوئی پرواہ نہ کیجئے) آپ کے ذمے تو صاف صاف اللہ کا پیام پہنچا دینا ہے۔

یعنی ایسے دلائل اور نشانات قدرت کے بعد بھی اگر یہ ایمان سے گریز کریں تو آپ ان کی پرواہ نہ کریں نہ رنجیدہ اور تنگ دل نہ ہوں، آپ کا کام صرف پیام پہنچا دینا ہے (ان کے ماننے نہ ماننے سے آپ کا کچھ تعلق نہیں ہے) ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا حضور ﷺ نے اس کے سامنے پڑھا وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا اس نے کہا جی ہاں پھر حضور ﷺ نے پڑھا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ اعرابی نے کہا جی ہاں، اس کے بعد اگلی آیات پڑھیں اور اعرابی ہر آیت پر کہتا رہا ٹھیک ہے۔ جی ہاں۔ آخر میں جب حضور ﷺ نے پڑھا كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ یہ سنتے ہی اعرابی منہ پھیر کر چل دیا اس پر اللہ نے نازل فرمایا فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ یہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے تو ہیں پھر انجان ہو جاتے ہیں (منکر ہو جاتے ہیں) اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔ یعنی اللہ کی نعمتوں کو دیکھ کر ان کا اقرار کرتے ہیں اور ان کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ جانتے ہیں پھر اللہ کی خالص عبادت سے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو منعم سمجھتے ہیں اللہ کو منعم نہیں سمجھتے یا اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی منعم جانتے ہیں۔ یہ حقیقت میں اللہ کی نعمت کا انکار ہے۔ سدی کے نزدیک اللہ کی نعمت سے رسول اللہ ﷺ کی نبوت مراد ہے یعنی وہ نبوت محمدیہ کو سب جانتے پہچانتے ہیں پھر محض ضد و عناد سے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿۸۶﴾ سو وہ (بت) ان (مشرکوں) کی طرف کلام کا رخ کریں گے اور کہیں گے تم قطعاً جھوٹے ہو یعنی اللہ بتوں کو گویائی دے گا اور کلام کرنے کی قدرت عطا کر دے گا اور بت اپنے کلام کا رخ مشرکوں کی طرف کر کے کہیں گے تم جھوٹے ہو کہ ہم کو اللہ کا شریک کہتے تھے، اس دعوے میں جھوٹے ہو کہ حقیقت میں تم ہماری پوجا کرتے تھے واقع میں تم اپنی خواہشات کے پجاری تھے (تم نے خود ہی اپنی خواہشات کے مطابق ہماری پوجا کی تھی) ہم نے تم کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ دوسری آیت سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے فرمایا سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وہ بت مشرکوں کے معبود ہونے کا انکار کریں گے (اور کہیں گے تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے) یا یہ مطلب ہے کہ تم اس دعویٰ میں جھوٹے ہو کہ ہم نے تم کو پوجا پر آمادہ کیا تھا اور کفر کی ترغیب دی تھی اور تم پر اپنی عبادت کرانے پر زبردستی کی تھی (ابلیس کہے گا) وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي یعنی میری تم پر کوئی زبردستی نہ تھی صرف اتنی بات تھی کہ میں نے تم کو دعوت دی تھی تم نے میری دعوت مان لی۔

وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۸۷﴾ اور مشرک لوگ اس روز اللہ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ (دنیا میں) بہتان بندیاں کرتے تھے سب گم ہو جائیں گی یعنی دنیا میں تو اللہ کی اطاعت سے تکبر کرتے تھے مگر قیامت کے دن اطاعت کا اظہار کریں گے اور جو جو دروغ تراشیاں کرتے اور کہتے تھے کہ ان کے معبود اللہ کے دربار میں سفارش کریں گے وہ سب افترا پردازیاں بیکار ثابت ہوں گی۔

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ﴿۸۸﴾
جو لوگ کفر کرتے تھے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے ہم ان کی فساد انگیزی کی پاداش میں سزا پر سزا کا اضافہ کر دیں گے۔

اللہ کی راہ یعنی اسلام سے لوگوں کو روکتے اور کفر پر آمادہ کرتے تھے۔ عذاب کی زیادتی کا یہ مطلب ہے کہ کفر کی جس سزا کے مستحق ہوں گے اس میں کافر گری اور راہ خدا سے روکنے کا مزید اضافہ ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عذاب کی تشریح میں فرمایا بچھو ہوں گے جن کے ڈنک کھجور کے لمبے درختوں کے برابر ہوں گے۔ ابن مردویہ نے حضرت براءؓ کی روایت سے اسی معنی کی حدیث مرفوع بھی نقل کی ہے۔ سعید بن جبیرؓ نے کہا سانپ ہوں گے بختی اونٹوں کی طرح اور بچھو ہوں گے خچروں کی شکل جن کے ایک مرتبہ کاٹنے کا اثر چالیس (خریف) سال تک ڈسا ہوا آدمی محسوس کرتا رہے گا۔ حضرت ابن عباسؓ اور مقاتل کا قول ہے عرش کے نیچے سے پگھلے ہوئے تانبے کے پانچ دریا نکلتے ہیں جو آگ کی طرح ہیں ان دریاؤں میں دنیا کی مدت کے برابر (ہمیشہ) سزا پاتے رہیں گے۔ بعض نے کہا کہ گرمی کے عذاب سے سردی کے عذاب کی طرف ان کو نکال کر لایا جائے گا سردی کی شدت کی وجہ سے وہ چیخیں گے فریاد کریں گے اور دوزخ کی گرمی میں جانا چاہیں گے۔

فساد انگیزی سے مراد ہے دنیا میں کفر کرنا اور راہ خدا سے روکنا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ أَنفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ﴿۸۹﴾

اور جس دن ہم ہر ہر امت میں ایک ایک گواہ جو ان ہی میں کا ہو گا ان کے مقابلہ میں قائم کر دیں گے اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام (دین کی ضروری) باتوں کو بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوشخبری سنانے والا ہے۔ شہید سے مراد ہے ہر امت کا پیغمبر۔ ہر امت کی ہدایت کے لئے اللہ نے اسی کا پیغمبر مبعوث فرمایا۔ ہؤلاء سے مراد ہے امت اسلامیہ۔ تبیاناً یعنی واضح بلیغ بیان لکل شیء یعنی ہر دینی ضروری مسئلہ کا واضح بیان مفصل ہو یا مجمل۔ جس طرح کہ ان آیات میں آیا ہے مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ۔ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي

الاکشار
ھُدًی یعنی گمراہی سے نکال کر سیدھا راستہ دکھانے والا ہے وَّرَحْمَةً یعنی سب لوگوں کے لئے رحمت ہے اگر کوئی اس رحمت سے محروم رہا تو اپنی کوتاہی کی وجہ سے (حضرت مفسرؒ کی یہ تفسیر ہمارے ذکر کئے ہوئے ترجمہ کے خلاف ہے۔ ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ سے ماخوذ ہے جس میں قرآن کی ہدایت اور رحمت اور خوش خبری کی خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے بتایا گیا ہے۔ اور حضرت مفسرؒ نے ہدایت و رحمت کو عمومی قرار دیا ہے اور بشارت کو صرف مسلمانوں کے لئے بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔ مترجم)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ　　بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ عدل کا لفظ مساوات کا مقتضی ہے۔ اللہ نے اسی لئے فرمایا ہے اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا یا اس کے برابر روزے۔ وَلَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ اور یہ کہ عورتوں میں ہر طرح سے برابری رکھو۔ فدیہ اور بدلہ کو عدل اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ عدل کا حکم دیتا یعنی بدلے میں مساوات رکھنے کا۔ خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ شر اور اللہ حکم دیتا ہے کہ حاکم مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان مساوات کا سلوک کرے کسی ایک کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ جو کچھ فیصلہ کرے اللہ کے حکم کے مطابق کرے۔

اگر عدل کا معنی بدلہ دینے میں مساوات لیا جائے گا تو احسان کا یہ مطلب ہوگا کہ خیر کا بدلہ زیادہ اور بہتر بھلائی کی شکل میں دے اور شر کا بدلہ کم شر سے دے۔ خیر کے مقابلہ میں زیادہ بھلائی کرے اور بدی کے مقابلے میں کم برائی۔

(اور اگر عدل سے مراد مدعی و مدعی علیہ کے درمیان مساوات ہو تو احسان کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے) میں کہتا ہوں۔ عدل سے مراد استقامت علی الحق بھی ہو سکتی ہے یعنی کج روی اور جور کا خلاف مفہوم بھی مراد ہو سکتا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے عدل بجور (کج روی) کی ضد ہے اور طبیعت کے اندر کسی چیز کے مستقیم ہونے کے خیال کے جماؤ کو بھی کہتے ہیں بعض علماء نے عدل کو بمعنی اعتدال کہا ہے یعنی ہر چیز میں توسط جیسے تعطل (اللہ کا تمام صفات سے خالی ہونا) اور شرک (اللہ کی صفات میں مخلوق کو شریک قرار دینا) کے درمیان توحید (صفاتی) کا درجہ ہے (یعنی اللہ صفات سے خالی ہے نہ اس کی صفات مخلوق میں پائی جاتی ہیں بلکہ ذاتی صفات کے لحاظ سے واحد لاشریک ہے) یا جیسے جبر و قدر کے درمیان کسب کا درجہ ہے (بندہ بالکل نہ مجبور ہے نہ اپنے افعال کا خود خالق اور قادر بلکہ کاسب ہے۔ خالق افعال اللہ ہے اور افعال کو کرنے والا بندہ) یا جیسے اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرنے کا درمیانی درجہ کہ نہ عبادت خداوندی میں اتنا غرق ہو جائے کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی ترک کر دے اور دنیا کو چھوڑ بیٹھے نہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جائے کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی چھوڑ دے۔ واجب نفل کچھ ادا نہ کرے۔ یا جیسے سخاوت کہ بخل و فضول خرچی کے درمیانی درجہ کا نام ہے یا شجاعت کا جو اعتدالی بہادری اور بزدلی کے درمیانی وصف کا نام ہے یا جیسے عفت کہ پاکدامنی کو کہتے ہیں زناکاری بے حیائی اور جائز قربت صنفی کے ترک کے درمیان عفت کا درجہ ہے۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (عدل سے مراد) توحید ہے اور احسان سے مراد ادائے فرائض۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے خالص توحید کا نام احسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی اس طرح عبادت کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھتا ہے (یعنی عبادت میں مشاہدہ رب کا درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم اتنا تو سمجھتے رہنا ہی چاہئے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے) رواہ عمر بن الخطاب کذا فی الصحیحین

مقاتل نے کہا عدل توحید ہے اور لوگوں سے درگذر کرنا احسان ہے بعض علماء نے کہا عدل سے مراد فرض ہے اور احسان سے مراد نفل اگر فرض میں کوئی قصور آ جاتا ہے تو نفل سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے (گویا نفل فرض ناقص کو حسین یعنی کامل بنا دینے والی چیز ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اللہ اس کے صرف کو قبول فرمائے گا نہ عدل کو یعنی نہ نفل کو نہ فرض کو۔

وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ　　اور (حکم دیتا ہے) قرابتداروں کو دینے کا اور بے حیائی سے اور بری باتوں سے اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

قرابتداروں کو دینے سے مراد ہے حاجت روائی کرنا، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا یعنی کنبہ پروری کرنا۔ فحشاء حد سے بڑھی ہوئی برائی (کھلی برائی) قولی ہو یا فعلی (سخت بری بات، سخت برا کام) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا الفحشاء یعنی زنا المنکر ہر برا کام جس کو شریعت نے برا قرار دیا ہو اور عقل سلیم بھی اس کو برا جانتی ہو۔ البغی تکبر اور ظلم۔ بیضاوی نے لکھا ہے فحشاء سے مراد ہے قوت شہوانیہ کے استعمال میں حد (اعتدال) سے آگے بڑھ جانا جیسے زنا انسانی احوال میں حد سے بڑھی ہوئی شہوانیت یعنی زنا بہت ہی بری عادت ہے منکر قوت غضبیہ کے ہیجان سے مغلوب ہو کر ایسا کام کرنا جو (عقلاً و نقلاً) برا ہے۔ البغی غرور، تکبر لوگوں پر جبر اور زبردستی، سب سے اونچا ہو جانا۔ یہ شیطنت قوت وہمیہ کا کرشمہ ہے انسان کی ہر برائی اور شر انہی تینوں اقسام میں سے کسی نہ کسی قسم کے ذیل میں داخل ہے اسی لئے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا قرآن مجید میں سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول سعید بن منصور نے الادب میں بخاری نے اس سے محمد بن منصور اور ابن جریر نے ابن منذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ الادب میں بخاری نے اور امام احمد (ابن ابی حاتم) طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہی آیت حضرت عثمان بن مظعونؓ کے مسلمان ہو جانے کا سبب ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے کہا ظاہر و باطن برابر ہو جانا عدل ہے باطن کا ظاہر سے اچھا ہونا احسان ہے اور ظاہر بہ نسبت باطن کے اچھا ہو تو یہ فحشاء اور منکر ہے۔

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ اللہ تم کو اس لئے نصیحت کرتا ہے کہ تم نصیحت قبول کرو۔ یعنی امر و نہی (کی پابندی) اور اچھائی برائی میں تمیز کرنے کی نصیحت اللہ تم کو کرتا ہے تاکہ تم اس کو یاد رکھو اور اس پر کاربند ہو۔ بیضاوی نے لکھا ہے اگر قرآن میں اس آیت کے سوا کوئی اور آیت نہ ہوتی تب بھی قرآن کو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ کہنا صحیح ہوتا۔

بغوی نے ایوب کا قول نقل کیا ہے کہ عکرمہؒ نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت ولید کو سنائی تو ولید بولا بھتیجے ذرا اس کو دوبارہ پڑھو۔ حضور ﷺ نے دوبارہ تلاوت فرمائی ولید کہنے لگا خدا کی قسم اس میں عجیب شیرینی اور ایک خاص حسن ہے (یہ کھجور کے درخت کی طرح ہے) اس کا بالائی حصہ (یعنی ظاہر) ثمر آفریں اور نچلا حصہ (یعنی باطن) خوشوں سے بھرا ہوا ہے یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا

اور تم اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم اس عہد کو (خصوصاً قسموں) اپنے ذمے لے لو اور قسموں کو مضبوط کرنے کے بعد توڑو نہیں تم تو خود (اپنی قسموں) پر اللہ کو گواہ بنا چکے ہو۔ عہد پختہ اقرار۔ ابن جریر نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے بیعت لینے اور رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے کے متعلق نازل ہوئی۔ بغوی نے لکھا ہے عہد اس جگہ یمین قسم ہے۔ شعبی نے کہا (اس جگہ) عہد یعنی قسم ہے اور اس کو توڑنے کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ الایمان یعنی بیعت کے عہد یا عام قسمیں بعد توکیدھا یعنی اللہ کا نام لے کر قسموں کو پختہ کرنے کے بعد کفیلا یعنی بیعت کا گواہ۔ کفیل جس چیز کی کفالت کرتا ہے اس کی نگرانی رکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے یقیناً واقف ہے یعنی عہد پورا کرنا اور توڑنا اللہ سب سے واقف ہے۔ مجاہد نے کہا اس آیت کا نزول حلف جاہلیت کے متعلق ہوا (یعنی اسلام کے دور سے پہلے جو لوگ باہم حلف کرتے تھے اس کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی) اس کے بعد آیت ذیل میں عہد شکنی کی مثال دے کر سمجھایا ہے فرمایا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ اور تم (مکہ کی) اس (بیوقوف) عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد ریزہ ریزہ کر کے توڑ ڈالا۔

سے تمہارے اعمال کی ضرور باز پرس ہوگی۔

ایک ہی طریقہ کا بنا دینے کا مطلب یہ ہے کہ سب کو اسلام پر متفق کر دیتا اور سب موافقت کرنے والے ہو جاتے آپس میں اختلاف نہ رہتا۔ بے راہ کر دینے کا یہ مطلب ہے کہ اس کو بے مدد چھوڑ دیتا۔ مدد نہ کرتا اور راہ پر ڈالنے کا معنی یہ ہے کہ اس کو ایمان و خیر کی توفیق دے دیتا۔ ہر شخص سے باز پرس لاجواب بنانے اور سزا دینے کے لئے ہوگی۔

وَلَا تَتَّخِذُوٓا اَيۡمَانَكُمۡ دَخَلًاۢ بَيۡنَكُمۡ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعۡدَ ثُبُوۡتِهَا وَتَذُوۡقُوا السُّوۡٓءَ بِمَا صَدَدۡتُّمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ۚ وَلَـكُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۞

اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ۔ کہیں (اس کو دیکھ کر کسی اور کا) قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے اور اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے پھر تم کو تکلیف بھگتنا پڑ جائے اور (آخرت میں) تمہارے لئے بڑا عذاب ہو جائے۔

"دَخَل" فساد و مکر۔ یعنی قسموں کو فریب دہی اور فساد انگیزی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ لوگ تمہارے معاہدات پر اعتماد کر لیں اور تمہاری طرف سے مطمئن ہو جائیں اور تم ان کو فریب دے کر قسمیں اور معاہدے توڑ دو۔

قدم جمنے کے بعد پھسل جانے کا مطلب یہ ہے کہ بے خوف اور مطمئن ہو جانے کے بعد تم ہلاک ہو جاؤ۔ عرب کا محاورہ ہے کہ عافیت کے بعد اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے یا سلامتی کے بعد کسی گڑھے میں گر پڑتا ہے تو کہتے ہیں اس کا قدم پھسل گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی بیعت اسلام کی شاہراہ تھی۔ بیعت پر قائم رہنا اور اس کو نہ توڑنا گویا اسلام پر برابر چلتے رہنے اور استقامت رکھنے کا نام تھا اور بیعت توڑ دینا لغزشِ قدم تھی تکلیف کا مزہ چکھنے سے مراد ہے دنیا میں تکلیف بھگتنا اور عذاب عظیم سے مراد ہے آخرت کا بڑا عذاب۔

وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا‌ؕ اور تم لوگ عہد خداوندی (اور بیعت رسول) کے عوض (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مت حاصل کرو۔ یعنی اللہ سے کیا ہوا عہد اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کی ہوئی بیعت اور معاہدات اس لالچ میں نہ توڑ دو کہ دنیا کا کچھ مال تم کو مل جائے۔

اِنَّمَا عِنۡدَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۞ مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ‌ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ‌ؕ

جو کچھ (دنیوی اور اخروی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ (اس دنیا سے جس کے تم طلب گار ہو) تمہارے لئے بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھو جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا۔ یعنی جو کچھ دنیوی مال و متاع تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور اللہ کی رحمت کے خزانے کبھی فنا نہیں ہوں گے۔ یہ جملہ لَا تَشۡتَرُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ کی علت ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دنیا کو پسند کرتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے اور جو آخرت کو پسند کرتا ہے وہ اپنی دنیا کا ضرر کرتا ہے تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی (دنیا) پر ترجیح دو (آخرت کو پسند کرو دنیا کی پرواہ مت کرو) رواہ احمد بسند صحیح والحاکم۔

وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۞

اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ہم ان کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔ یعنی جن لوگوں نے پابندی اقرار پر، مشقت کی ادا، پابندی احکام کی مشقت اور جہاد میں ڈٹے رہنے کی مصیبتوں پر صبر کیا اللہ ان کے صبر کا ثواب عطا فرمائے گا اور ثواب دے گا ان کے اعمال کے مقررہ اجر سے بہت زیادہ جو بہتر نیکی کو سات سو گنا تک بڑھا دے گا اور اس سے بھی زیادہ جتنی اللہ کی مشیت ہوگی۔ بعض علماء نے کہا اَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ سے مراد فرائض اور مستحبات ہیں۔ مکروہات اور مباحات سے فرائض و مستحبات بہر حال بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً‌ ۚ

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) بالطف زندگی عطا کریں گے

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۷﴾ اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے عوض ان کا اجر عطا کریں گے۔

وَهُوَ مُؤْمِنٌ بشرطیکہ وہ مومن ہو۔ ایمان کی شرط اس لئے لگائی کہ کافر کسی ثواب کے مستحق نہیں خواہ کیسے ہی اچھے اعمال کریں زیادہ سے زیادہ عذاب کی تخفیف کی امید کی جاسکتی ہے کیونکہ اللہ کے نزدیک ثواب کا مدار خلوص اور حسن نیت پر ہے (یعنی محض خوشنودی خدا کے لئے ہونا ضروری ہے) اور کافروں کی نیکیوں میں یہ چیز مفقود ہے۔

حیات طیبہ سے مراد سعید بن جبیرؒ کے نزدیک رزق حلال ہے اور حسنؒ کے نزدیک قناعت۔ مقاتل بن حیان نے کہا طاعت میں زندگی گزارنا حیات طیبہ ہے۔ ابو بکر وراق نے کہا طاعت کی شیرینی پاکیزہ زندگی ہے۔ بیضاوی نے کہا پاکیزہ زندگی گزارنے والا اگر مالدار اور فراخ حال ہے تو ظاہر ہے اس کی دنیوی زندگی پاکیزہ ہوگی اور اگر تنگدست ہے تو ظاہر ہے کہ قناعت کرے گا۔ تقسیم خداوندی پر راضی ہوگا اور آخرت میں اجر عظیم ملنے کا امیدوار ہوگا اس طرح اس کی زندگی خوش عیشی کے ساتھ گزرے گی۔ کافر کی زندگی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ تنگدست ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے اور مالدار ہے تب بھی اس کو موجودہ دولت کے زوال کا اندیشہ رہتا ہے اور ہر وقت حرص میں گرفتار رہتا ہے اور اس کی وجہ سے خوش عیشی زندگی اطمینان کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ میں کہتا ہوں آیت اِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا کا بھی یہی مطلب ہے۔ میں کہتا ہوں بندے کو جب اللہ سے محبت ہوتی ہے تو جو کچھ محبوب کی طرف سے اس کو پہنچتا ہے، تنگی ہو یا ترشی وہ سب سے لذت اندوز ہوتا ہے حضرت مجددؒ نے فرمایا ہے، محبوب کی طرف سے جو دکھ پہنچتا ہے وہ محبوب کی طرف سے ملنے والے سکھ سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ دکھ تو صرف رضائے محبوب ہوتی ہے اور سکھ میں کچھ ذاتی مقصد بھی ہوتا ہے اور خالص رضائے محبوب زیادہ لذت آفریں ہوتی ہے اور محبت کو محبوب کی مرضی ہی سب سے پیاری ہوتی ہے۔ شیخ عارف رومی قدس سرہٗ نے فرمایا:

عاشقم بر لطف و بر قہرش بجد — اے عجب من عاشقم بر ہر دو ضد

ناخوش او خوش بود در جان من — جان فدائے یار جان رنجان من

میں کہتا ہوں حیات طیبہ کی تشریح میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے دوستوں کے حق میں فرمایا ہے لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ان کے لئے دنیوی زندگی میں بشارت ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ یونس میں گزر چکی ہے جب مومن کو اس زندگی میں اللہ کی خوشنودی کے حصول اور بارگاہ قدس میں مرتبۂ قرب پر پہنچنے اور درجات بلند ہونے کی بشارت مل جاتی ہے تو دنیا میں ہی اس کو وہ مسرت و راحت مل جاتی ہے جس کی جنت کے اندر ملنے کی اس کو امید ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ اہل جنت سے فرمائے گا کیا تم راضی ہوگئے جنتی عرض کریں گے (اے ہمارے رب) ہم راضی نہ ہونے کی وجہ بھی کیا ہو سکتی ہے تو نے تو ہم کو وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو کسی شخص کو نہیں دیں۔ اللہ فرمائے گا کیا ان نعمتوں سے بھی بڑی نعمت تم کو دوں۔ پھر فرمائے گا (وہ سب سے اعلیٰ نعمت یہ ہے کہ) میں تم کو اپنی خوشنودی عطا کرتا ہوں آئندہ کبھی میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے۔ اور حضرت جابرؓ کی روایت سے طبرانی نے اوسط میں بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ اسی حدیث کے مضمون کو پڑھ کر ایک عارف نے کہا ہے:

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است — در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

شیخ محمد [illegible] بغدادیؒ فرماتے تھے، جو لذت و راحت دنیا میں اہل فقر کو حاصل ہے اگر بادشاہوں اور امیروں کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ اہل فقر پر رشک کرنے لگتے اور جل جاتے۔

ایک شبہ

اگر دنیا میں حسب بیان مذکور لذت و راحت کی وہ حالت حاصل ہو جاتی ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے تو پھر ایمان کہاں جاتا۔ دنیا میں تو خوف و امید دونوں ایمان کے لوازم میں سے ہیں۔ (ایمان بیم و رجاء کی درمیانی حالت کا نام ہے)

ازالہ

حالت مذکورہ تو نتیجہ ہے اُنس و محبت کا۔ یہ خوف کے خلاف نہیں۔ کیونکہ خوف ہوتا ہے اللہ کی عظمت و کبریائی کو دیکھ کر مومن کے دل سے خوف کبھی دور نہیں ہوتا۔ وہ انبیاء جن کو اللہ کی خوشنودی حاصل ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ اور اپنے حسن خاتمہ میں کوئی شک نہیں ہوتا ان کو دوسروں کے مقابلے میں اللہ کی عظمت و بزرگی کا زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے اسی لئے دوسرے مومنوں کے مقابلے میں ان کو اللہ کا خوف بھی زیادہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ کو جاننے والا اور تم سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہوں۔ صحابہؓ کو قطعی وحی کے ذریعہ سے حصول رضائے خداوندی اور داخلۂ جنت کی بشارت دے دی گئی تھی اللہ نے صحابہ کرامؓ کے متعلق فرمایا ہے۔ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ اس قطعی بشارت کے باوجود وہ کامل طور پر اللہ سے ڈرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کی یہ حالت تھی تو صحابہؓ کے بعد ان مومنوں کو کشف ظنی کے طور پر بشارت دے دی جاتی ہے ان کا تاثر بشارت، خوف کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیات طیبہ سے مراد ایسی زندگی ہو جو ہر حال خیر و برکات سے پُر ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے۔ سوائے مومن کے اور کسی کو یہ بات حاصل نہیں۔ مومن پر اگر راحت آتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر بن جاتا ہے اگر اس پر کوئی بدحالی اور دکھ آتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ صبر اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔ رواہ احمد فی المسند و مسلم فی الصحیح عن صہیبؓ واحمد و ابن حبان عن انسؓ والبیہقی بسند صحیح عن سعید۔

مجاہد و قتادہ کے نزدیک حیات طیبہ سے جنت کی زندگی مراد ہے عوف نے حسن بصری کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ حسن نے فرمایا جنت کے علاوہ دنیا میں کسی کی زندگی طیب نہیں ہوتی۔

قول اوّل کی تفسیر (یعنی دنیا میں پاکیزہ زندگی مراد لینا) ظاہر ہے کلام کی رفتار سے یہی ظاہر ہو رہا ہے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝ جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطان مردود سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کریں یعنی جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو شروع کرنے سے پہلے اللہ سے پناہ کی دعا کریں تاکہ شیطان مردود قرأت میں وسوسہ پیدا کر سکے اور عبادت میں کوئی غیر لفظ شامل نہ کرے۔ کیونکہ شیطان کی عادت ہے کہ اللہ نے جو بھی پیغمبر و نبی بھیجا اور اس نے اللہ کا کلام پڑھا تو شیطان نے اس کی قرأت میں مداخلت ضرور کی۔ اس آیت میں قرأت کرنے سے مراد ہے ارادۂ قرأت کرنا چونکہ فعل کے لئے ارادہ کی تعبیر فعل سے کی۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو شخص عبادت کا ارادہ کرلے تو اس کے بعد عبادت ضرور کرے (ایسا نہ ہو کہ ارادہ کرلے اور عبادت نہ کرے) نخعی اور ابن سیرین نے ظاہر لفظ کو دیکھ کر (یعنی لفظ قرأت کا ظاہری مطلب لے کر) صراحت کی ہے۔ کہ تلاوت کرنے کے بعد اعوذ باللہ پڑھی جائے۔ میرے علاوہ تاخیر تعوذ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عبادت اقرب الی الاجابت ہو جانے کی وجہ سے شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ کی طلب تو ہمیشہ ہی کرتا رہے۔ (اختتام قرأت پر ہی موقوف نہیں ہے)

صحیح روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرأت سے پہلے دعا کرتے (یعنی اعوذ باللہ پڑھا کرتے) تھے جمہور سلف و خلف کا اسی پر عمل ہے۔ لیکن جمہور کے نزدیک قرأت سے پہلے تعوذ سنت ہے اور عطاء نے اسی آیت کو استدلال میں پیش کرتے ہوئے واجب ہونے کی صراحت کی ہے کیونکہ اِسْتَعِذْ امر کا صیغہ ہے اور امر کا حقیقی مفہوم وجوب ہے اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم شیطانی وسوسہ کو دفع کرنے کے لئے دیا گیا ہے جو مسنون ہونے کی علامت ہے (اگر خواہ شیطانی کا اندیشہ نہ ہو تو ترک تعوذ جائز ہے) یہ دلیل کمزور ہے وجوب تعوذ اس کے باوجود بھی ہو سکتا ہے۔

جمہور علماء تعوذ کے واجب ہونے کے قائل نہیں کیونکہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے قرأت سے پہلے تعوذ کو ترک کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور کے نزدیک بعض وقت ترک تعوذ جائز ہے مگر بعض وقت تعوذ کو ترک کرنا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت نہ ہوتا تو علماء بھی ترک تعوذ کو جائز قرار دیتے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعوذ پڑھے بغیر بھی قرآن کی تلاوت فرمائی۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ آخری تہائی رات کو اٹھ بیٹھے اور سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ سے پڑھیں پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھی الی آخرہ۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا ہم ایک روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے اچانک آپ کو غفلت سی ہو گئی پھر کچھ دیر کے بعد مسکراتے ہوئے سر اٹھایا ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! حضور ﷺ کے مسکرانے کی کیا وجہ ہے فرمایا ابھی مجھ پر ایک سورت اتری ہے اس کے بعد آپ نے تلاوت کی بسم اللہ الرحمن الرحیم اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔

مسئلہ: کیا نماز کے اندر ہر رکعت میں قرأت سے پہلے اعوذ پڑھنا چاہئے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد قائل ہیں کہ نماز کی صرف پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے اعوذ پڑھی جائے امام شافعی ہر رکعت میں تعوذ کے قائل ہیں۔ شیخ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حسن اور عطاء اور ابن سیرین کے نزدیک ہر رکعت میں اعوذ پڑھنی مستحب ہے امام مالک نے کہا فرض نماز میں تعوذ نہ کیا جائے۔ بیضاوی نے امام شافعیؒ کے قول کی تائید میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ جو حکم کسی شرط پر مرتب ہو تو قیاس کا تقاضا ہے کہ تکرار شرط سے تکرار حکم ہو گی پس جب بھی کسی رکعت میں کوئی شخص قرأت کرے گا اعوذ پڑھنا ہو گی۔ خواہ پہلی رکعت ہو یا دوسری۔ امام مالکؒ نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت انسؓ کی روایت پیش کی ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے پیچھے بھی اور سب جہری قرأت سورۂ فاتحہ سے شروع کرتے تھے۔ صحیحین کی دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ یہ حضرات نماز کو الحمد للہ رب العٰلمین سے شروع کرتے تھے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں جہراً اعوذ نہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ پوشیدہ چپکے سے بھی نہ پڑھتے ہوں ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت میں ثناء (سبحانک اللھم) پڑھنے کے بعد اعوذ پڑھا کرتے تھے پہلی رکعت کے علاوہ کسی دوسری رکعت میں اعوذ پڑھنا کسی روایت میں نہیں آیا۔ ابن السنی اور ابن ماجہ نے حضرت جبیر بن مطعمؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہو جاتے تھے تو تین بار اللہ اکبر کبیراً اور تین بار الحمد للہ کثیراً اور تین بار سبحان اللہ بکرۃً واصیلاً کہنے کے بعد اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھتے تھے۔ امام احمد اور امام ابن حبان اور ابو داؤد کی روایت میں من الشیطٰن الرجیم کے بعد من نفخه ونفثه وهمزه کے الفاظ بھی آئے ہیں (میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں شیطان مردود سے اس کی پھونک سے اور اس کے دم کرنے سے اور اس کے وسوسے سے) حاکم نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

امام احمد اور حاکم اور اہل السنن نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات میں نماز کو کھڑے ہوتے تھے تو تکبیر کے بعد سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُکَ پھر تین بار لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور تین بار اللہ اکبر کہنے کے بعد پڑھتے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ نَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ وَهَمْزِهٖ امام احمد نے حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم آیا ہے مگر اس کی اسناد میں بعض راویوں کے نام ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔

ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اعوذبک من الشیطان الرجیم من همزه ونفخه ونفثه۔ حاکم اور بیہقی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں جب نماز میں داخل ہوتے تھے۔ حضرت انسؓ کی روایت سے دار قطنی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اس اسناد میں ایک راوی حسین بن علی بن اسود ہے اس

اور جب ہم ایک آیت کو بدل کر دوسری آیت کو اس کی جگہ پر رکھ دیتے ہیں اور اللہ
جو حکم بھیجتا ہے اس کو وہی خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ تو خود تراش لیتے ہیں (اور اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں) آپ
مفتری نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر جاہل ہیں۔ تبدیل آیت سے مراد کسی آیت کی تلاوت کو منسوخ کرنا ہے یا کسی حکم کو
منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دینا۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ یعنی مطلب ہے کہ اللہ جو کچھ نازل کرتا ہے وہی خوب جانتا ہے کہ پہلی آیت اس سے قبل جو حکم
اس زمانہ کی مصلحت تھی لیکن اس کا باقی رکھنا خلاف مصلحت تھا اس سے پہلے وہ حکم بجا تھا جب ہی کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس کو بدل کر ایسا حکم نازل
کر دیا جو اصلاح خلق کرنے والا ہے خلاصہ یہ کہ لوگوں کے لئے کب اور کون سا حکم مناسب ہے اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

مُفْتَرٍ (اللہ پر) دروغ بندی کرنے والا۔ بغوی نے لکھا ہے مشرکوں نے کہا محمد اپنے ساتھیوں سے مذاق کرتے ہیں۔
آج ایک حکم دیتے ہیں اور کل اس کی ممانعت کر دیتے ہیں یہ خود تراش کر اللہ پر دروغ بندی کر دیتے ہیں۔

اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اکثر کافر احکام کی مصلحت نہیں جانتے یا یہ مطلب ہے کہ اکثر کافر اہل علم و تمیز نہیں ہیں اگر
ان کو تمیز ہوتی تو پہچان لیتے کہ قرآن ایسا کلام نہیں کہ کوئی انسان خود بنا سکے اور محمد ایسے آدمی نہیں ہیں کہ ان کو دروغ باف اور
بہتان تراش کہا جائے۔

تبارک اللہ ما وحی بمکتسب ولا نبی علی غیب بمتہم

اللہ برکت والا ہے کوئی وحی کمائی ہوئی (ساختہ) نہیں ہوتی اور نہ کوئی نبی ایسا ہوتا ہے کہ وحی کے معاملہ میں اس پر الزام لگایا
جائے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝
آپ کہہ دیجئے کہ اس کو جبرئیل میرے رب کی طرف سے حکمت کے مطابق لے کر آئے ہیں
تاکہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری (کا ذریعہ) ہو۔ رُوْحُ الْقُدُسِ سے مراد
جبرئیل ہیں قدس کا معنی ہے پاکی یعنی پاکی والی روح۔ نَزَّلَہٗ تنزیل مصدر (تفعیل) کا معنی ہے تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کرنا یعنی اللہ تعالیٰ حسب
ضرورت قرآن مصالح کے مطابق تدریجاً نزول، تبدیل کو مستلزم ہے (اگر کلام کا بدلنا نہ ہوتا تو یکدم سب قرآن نازل کر
دیا جاتا) بِالْحَقِّ حکمت کاملہ۔ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی تدریجاً اس لئے نزول ہوا کہ جو لوگ اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان
رکھتے ہیں ان کے ایمان میں مزید استحکام ہو جائے اور ناسخ کو سننے کے بعد جب وہ غور کریں اور سمجھیں کہ حکمت و مصلحت کا تقاضا
یہی تھا کہ پچھلا حکم اس وقت منسوخ کر کے یہ نیا حکم نازل کر دیا جائے تو ان کے عقائد میں مزید پختگی پیدا ہو جائے اور اطمینان
قلب حاصل ہو جائے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ناسخ کو نازل کر کے ایمانداروں کی جانچ کرنی مقصود ہے جب وہ قدیم حکم کی جگہ جدید حکم کو برحق یقین
کر لیں اور سمجھ جائیں کہ اللہ حکمت والا ہے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں تو اس سے ان کو مزید استحکام ایمانی حاصل ہو
جائے۔ لِلْمُسْلِمِیْنَ مسلمین سے مراد ہیں فرمانبردار۔ مطلب یہ کہ یہ حکم صرف مسلمانوں کے لئے ہدایت و بشارت کا ذریعہ قرار دینے
سے درپردہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ غیر مسلموں کے لئے یہ باعث ہدایت و بشارت نہیں ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں
کہ ان کو یہ کلام آدمی سکھا جاتا ہے یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ بغوی نے لکھا ہے جس شخص کے متعلق وہ قرآن سکھا
جانے کی جھوٹی نسبت کرتے تھے وہ کون آدمی تھا اس کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے ابن جریر نے مسند میں ضعیف سند سے
حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ میں ایک عیسائی عجمی غلام تھا جو لوہار تھا اس کا نام بلعام تھا رسول اللہ ﷺ اس کے پاس
آتے جاتے تھے مشرکوں نے آپ کو بلعام کے پاس آتا جاتا دیکھ کر کہا ان کو بلعام سکھا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا بنی مغیرہ کا ایک غلام

تھا جس کا نام یعیش تھا، وہ کتابیں پڑھتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو قرآن سکھاتے تھے قریش کہنے لگے اس کو یعیش سکھاتا ہے۔ فراء نے کہا حویطب بن عبدالعزیٰ کا ایک غلام تھا جس کی زبان عجمی تھی اس کا نام عائش تھا۔ مشرک کہنے لگے یہ عائش سے سیکھ لیتے ہیں۔ آخر میں عائش مسلمان ہو گیا تھا اور اسلام میں پختہ رہا۔ ابن اسحاق نے بیان کیا رسول اللہ مروہ پہاڑ کے قریب ایک رومی عیسائی غلام کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اس کا نام جبر تھا جبر بنی الحضرمی قبیلہ میں سے کسی کا غلام تھا، اور کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ عبداللہ بن مسلم حضرمی کا بیان ہے ہمارے دو غلام تھے جو یمن کے تھے۔ ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا۔ یسار کی کنیت ابو فکیہہ تھی۔ دونوں مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور توریت و انجیل پڑھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ ان کی طرف سے گزرتے اور وہ (انجیل یا توریت) پڑھتے ہوتے تو حضور ﷺ ٹھہر جاتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے حصین بن عبداللہ کے طریق سے بیان کیا ہے ضحاک کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کفار دکھ دیتے تو آپ ان دونوں غلاموں کے پاس جا کر بیٹھ جاتے اور ان کے کلام سے کچھ تسکین محسوس کرتے۔ مشرک کہنے لگے محمد ﷺ ان دونوں سے سیکھ لیتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مشرکوں کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا۔

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ۝

جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے قاموس میں ہے لَحَدَ إِلَيْهِ اس کی طرف مائل ہوا اَلْحَدَ کا بھی یہی معنی ہے اَلْحَدَ کا معنی ہے "مائل ہونا" مراد ہے جس کی طرف مائل ہوتے ہیں یعنی اشارہ کرتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ سچے قول کی سچائی اور استقامت سے موڑ کر اس شخص کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

اَعْجَمِيٌّ صاف عربی نہ بولنے والا۔ قاموس میں ہے لفظ عجم قوم عرب کی ضد ہے دونوں کی صفت میں آتا ہے اعجم اور اعجمی گونگا اور وہ شخص جو صاف (عربی) نہ بول سکے۔ عجمی عجم کا بچہ والا عجمی قسم سے ہو خواہ فصیح البیان ہو۔ غیر عرب کو عجم کہتے ہیں۔ بعض محققین لغت کا قول ہے کہ عجمہ کا معنی بانت کے معنی سے متقابل ہے یعنی صاف زبان میں بات نہ کرنا ابہام کا معنی ہے ابہام۔ استعجمت الدار کو کہا جاتا ہے یعنی سب گھر والے مر گئے کوئی جواب دینے والا بھی باقی نہیں رہا۔

وَهٰذَا یعنی یہ قرآن عَرَبِيٌّ واضح صاف مُّبِينٌ۔ کافروں کی بہتان تراشی کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے جس کی تقریر دو طرح سے ہو سکتی ہے (۱) وہ شخص جس کی طرف قرآن کی نسبت کی جاتی ہے اس کی بولی عجمی ہے جس کو نہ رسول اللہ ﷺ سمجھتے ہیں نہ تم لوگ سمجھتے ہو اور قرآن کی زبان عربی فصیح ہے جس کو تم لوگ سمجھتے ہو پھر یہ قرآن اس شخص کا بنایا ہوا کیسے ہو سکتا ہے۔ (۲) قرآن کے معانی معجزہ ہیں اور معانی کی طرح عبارتی ترکیب بھی معجزہ ہے وہ عجمی شخص یعنی توریت و انجیل پڑھتا تھا توریت و انجیل کے معانی سے قرآن کے معانی مطابقت ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن ان معانی کو معجز عربی عبارت میں ادا کرنا بھی تو معجزہ ہے جو کسی انسان کی قدرت میں نہیں ہے آیت فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ میں جو دعوت مقابلہ دی گئی ہے اس کے مقابلہ سے سب کا عاجز رہنا خود بتا رہا ہے کہ قرآن کا مقابلہ بشری طاقت سے باہر ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آسمانی کتابوں سے علوم حاصل کرنا آسان نہیں جب تک کوئی ماہر اور قابل معلم نہ ہو جو تمام علوم مذہبیہ میں پوری دستگاہ رکھتا ہو اور ایک طویل مدت تک درس دیتا رہے اس وقت تک ان علوم کا حصول ناممکن ہے۔ ایک معمولی غلام جو آسمانی علوم کا خود ہی ماہر نہ ہو بلکہ شد بد رکھتا ہو اور اس کی زبان بھی عجمی ہو اس کے پاس کبھی کبھی کسی عربی شخص کا آ بیٹھنا کس طرح عربی شخص کو علوم میں اس حد تک ماہر بنا سکتا ہے کہ وہ عربی زبان میں تمام کتابوں کے علوم کو اعجازی طور پر منتقل کر دے جبکہ استاد کی زبان سے شاگرد واقف بھی نہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۙ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے (یعنی ان کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں مانتے) یقیناً اللہ ان کو کبھی راہ پر نہیں لائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہوگی یعنی راہ حق پر نہیں لائے گا یعنی نجات اور جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا اور آخرت میں ان کو دکھ

کی سزا دی جائے گی۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۝

بس جھوٹ تراشنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ پورے جھوٹے ہیں یعنی حقیقت میں یہی جھوٹے ہیں ایمان لانے والے جھوٹے نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں تمام صحابہؓ سچے اور عادل تھے۔ یہ مطلب ہے کہ کامل جھوٹے اور پورے پورے کاذب یہی لوگ ہیں کیونکہ حضور ﷺ کے معجزات کے بعد اللہ کے معصوم نبی اور اللہ کی آیات کا انکار اور اللہ کے رسول ﷺ پر تہمت تراشی سب سے بڑا جھوٹ ہے یا ھُمُ الْكَاذِبُونَ سے یہ مراد ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بولنے کے عادی ہیں ان کو جھوٹ سے کوئی چیز نہیں روک سکتی نہ شرافت نہ دین یا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ جو آپ ﷺ کو مفتری قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی آدمی آپ کو سکھا جاتا ہے اس قول میں یہی جھوٹے ہیں اِنَّمَا يَفْتَرِي جملہ فعلیہ ہے جو بتا رہا ہے کہ افترا کرنے والے صرف یہی لوگ ہیں اور اُولٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ جملہ اسمیہ ہے جو بتا رہا ہے کہ جھوٹ بولنا ان کی عادت مستمرہ ہے۔ بغوی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن جراد نے فرمایا میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا مؤمن زنا کر سکتا ہے۔ فرمایا کبھی ایسا ہو سکتا ہے میں نے عرض کیا کیا مؤمن چوری کر سکتا ہے فرمایا کبھی ایسا ہو سکتا ہے میں نے عرض کیا کیا مؤمن جھوٹ بول سکتا ہے۔ فرمایا نہیں۔ اللہ نے فرما دیا ہے اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ۔

امام احمد نے حضرت ابو امامہؓ کی روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے خیانت اور جھوٹ کے مؤمن کی سرشت میں تمام (اچھی بری) باتیں ہو سکتی ہیں۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور امام مالکؒ نے مرسلاً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کیا مؤمن ڈرپوک ہو سکتا ہے۔ فرمایا ہاں۔ عرض کیا گیا کیا مؤمن بخیل ہو سکتا ہے فرمایا ہاں۔ پوچھا گیا کیا مؤمن بڑا جھوٹا ہو سکتا ہے۔ فرمایا نہیں۔ میں کہتا ہوں ان احادیث میں جو مؤمن کا ذکر آیا ہے بظاہر اس سے مراد وہ مؤمن ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے (ورنہ بعد کے زمانہ میں تو بکثرت مؤمن جھوٹے تھے اور اب بھی ہیں) اسی لئے تمام صحابہؓ کے سچے اور عادل ہونے پر علماء کا اجماع ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی صحابی کی روایت قابل جرح نہیں ہے (بشرطیکہ صحابیؓ تک روایت کا سلسلہ غیر مجروح ہو) یا احادیث میں جس مؤمن کا ذکر کیا ہے اس سے مراد کامل مؤمن ہے یعنی صوفی صافی عارف خدا فانی فی اللہ باقی باللہ۔

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَٰكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

جو لوگ ایمان لانے کے بعد (لوٹ کر) اللہ کے (یعنی اس کی ذات، صفات یا قیامت و نبوت کے) ساتھ کفر کرنے لگیں اور جی کھول کر (دل کی خوشی کے ساتھ) کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہو گا اور ان کو بڑے دکھ کی سزا ہو گی۔ ہاں جو لوگ کفر کرنے پر مجبور کئے گئے ہیں اور ان کا دل ایمان پر مطمئن ہو (اور زبان سے کلمات کفر مجبوری کہہ گزریں) وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول عمار بن یاسرؓ کے حق میں ہوا۔ مشرکوں نے عمارؓ کو ان کے باپ یاسرؓ کو ان کی ماں سمیہؓ کو اور صہیب کو بلال، خبیب و سالم کو پکڑ کر سخت ترین جسمانی دکھ دیئے حضرت سمیہؓ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ دیا گیا (ایک ٹانگ ایک اونٹ سے دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے) اور شرمگاہ میں خنجر ڈال کر چیر دیا گیا۔ حضرت یاسرؓ کو بھی قتل کر دیا گیا اسلام میں سب سے اول یہی دونوں شہید ہوئے عمارؓ نے مجبوری وہ بات زبان سے نکال دی جو مشرک چاہتے تھے۔ قتادہ نے کہا بنی مغیرہ نے عمارؓ کو پکڑ کر چاہ میمون میں غوطے دیئے اور کہا محمد ﷺ کا انکار کر حضرت عمارؓ نے وہی بات کہہ دی جو مشرک چاہتے تھے۔ مگر آپ کا دل اس بات سے نفرت کرتا تھا دل کو انکار رسالت گوارا نہ تھا۔ کسی نے جا کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دے دی کہ عمارؓ کافر ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں عمارؓ کے اندر تو چوٹی سے قدم تک ایمان بھرا ہوا

ہے اس کے خون اور گوشت میں ایمان سرایت کر گیا ہے۔ آخر حضرت عمارؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے؟ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بہت بری ہے، میں نے آپ کو برا کہہ دیا اور (انکار کے طور پر) آپ کا ذکر کیا فرمایا اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت تم کو محسوس ہو رہی تھی۔ عرض کیا دل تو ایمان پر مطمئن تھا۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے عمارؓ کے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا اگر وہ دوبارہ تمہارے ساتھ ایسی حرکت کریں تو تم دوبارہ (بھی یہی کفریہ الفاظ) لوٹا سکتے ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ثعلبی اور واحدی نے بھی اسی طرح یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کو ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو مشرکوں نے بلالؓ، خبابؓ اور عمارؓ کو پکڑ لیا۔ عمارؓ نے تقیہ کر کے وہ بات کہہ دی جو مشرکوں کو پسند تھی پھر جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا (کلمات کفر) کہنے کے وقت تمہارے دل کی کیا حالت تھی۔ عرض کیا دل تو آپ کے قول پر مطمئن تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول مکہ کے چند مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا۔ بعض صحابہؓ نے (مدینہ سے) ان کو لکھا تھا کہ مکہ چھوڑ کر جب تک ہجرت کر کے ہمارے پاس نہ آجاؤ گے ہم تم کو اپنے میں شمار نہیں کریں گے۔ اس تحریر پر وہ لوگ مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چل دیئے راستہ میں ان کو قریش نے پکڑ لیا اور سخت دکھ دیئے۔ مجبوراً بغرض خاطر ناگواری کے ساتھ کلمات کفر کہہ دیئے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مقاتل نے بیان کیا کہ عامر بن حضرمی کے غلام جبر کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا ان کے آقا نے ان پر زبردستی کی تھی مجبوراً جبر نے کلمات کفر کہہ دیئے تھے۔ بغوی نے لکھا ہے پھر جبر کا آقا بھی مسلمان ہو گیا اور اسلام میں پختہ رہا اور جبر کو ساتھ لے کر اس نے بھی مدینہ کو ہجرت کر لی۔

ایمان پر دل کے مطمئن ہونے کا یہ مطلب ہے کہ عقیدہ میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ دل ایمان پر قائم رہا یہ جملہ بتا رہا ہے کہ دل سے سچا جاننا ایمان کا رکن ضروری ہے (خالی شہادت ایمان بغیر دلی عقیدہ کے اللہ کے نزدیک ناقابل اعتبار ہے)

کفر کے لئے سینہ کے کشادہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ دل نے کفر کو پسند کر لیا اور بخوشی کفر کو قبول کر لیا۔

اکراہ کی تحقیق

کسی کو ایسے کام پر آمادہ کرنا جس کو وہ دل سے کرنا نہ چاہتا ہو اکراہ ہے۔ اکراہ کی دو صورتیں ہیں (۱) کسی کو کسی ناگوار کام کے کرنے پر اس طرح آمادہ کرنا کہ اگر وہ انکار کرے تو اس کو اذیت اور دکھ اٹھانا پڑ جائے لیکن یہ ایذا اور دکھ اس کو بے اختیار نہ بنا دے مثلاً انکار کی صورت میں پٹائی کر دینا، قید کر دینا۔ ظاہر ہے کہ پٹنے اور قید ہو جانے کے بعد بھی مضروب اور قیدی بے اختیار نہیں ہو جاتا صرف جسمانی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (۲) انکار کی صورت میں مجبور آدمی بے اختیار کالعدم ہو سکتا ہے مثلاً ہاتھ پاؤں کا کاٹنا یا قتل کر دینا۔ ان دونوں صورتوں میں اکراہ کا حکم اسی وقت جاری ہوگا کہ مجبور کرنے والا اس اذیت دینے پر قدرت رکھتا ہو جس کی دھمکی دے رہا ہے اور جس کو مجبور کیا جا رہا ہو اس کا بھی غالب خیال ہو کہ اگر میں انکار کر دوں گا تو اس شخص کی طرف سے مجھے یہ دکھ پہنچ جائے گا۔ آیت میں اکراہ کی اول صورت مراد نہیں۔ پہلی قسم کا اکراہ تو صرف خرید و فروخت، اقرار، قرض، کسی چیز کے تملیک کے لین دین وغیرہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پہلی صورت میں جب خوف ختم ہو جائے اور ایذا رسانی طاقت سے آزادی مل جائے تو مجبوری کی حالت میں جو عقد، اقرار، خرید و فروخت کا لین دین کیا ہو اس کو فسخ کر دیا جانا جائز ہو جاتا ہے قائم رکھے چاہے منسوخ کر دے۔ تجارت، لین دین وغیرہ ایسے عقود ہیں جن کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ اور اکراہی شکل میں مجبور شخص کی رضامندی نہیں ہوتی اس لئے جبر ختم ہونے کے بعد اس کو اختیار ہے چاہے معاملے کو فسخ کر دے چاہے قائم رکھے۔ اگر قیمت پر بخوشی قبضہ کر لیا تو بیع کو نافذ قرار دیا جائے گا قبول قیمت علامت رضامندی ہے۔

آیت مذکورہ میں اکراہ کی دوسری قسم مراد ہے علماء کا اجماع ہے کہ جس شخص کو کفر پر مجبور کیا گیا ہو اور وہ بے بس ہو جائے تو ظاہری طور پر کفر اختیار کر لینا جائز ہے بشرطیکہ دل میں اطمینان ایمانی ہو۔ حضرت عمارؓ کے متعلق اس آیت کا نزول اس مسئلے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ حضرت عمارؓ کو کافر نہیں قرار دیا گیا ایسے ظاہری کافر کا نکاح بھی فسخ نہیں ہو گا لیکن اگر کلمۂ کفر زبان پر لانے سے انکار کر دے اور جان کی قربانی دے دے تو افضل ہے جیسے حضرت عمارؓ کے والدین نے کیا۔ حضرت خبیبؓ، حضرت زید بن دثنہؓ اور حضرت عبداللہ بن طارقؓ نے بھی مرتد ہونا پسند نہیں کیا اور شہادت کو اختیار کر لیا۔ صاحب سیر نے سریۂ رجیع کے بیان میں لکھا ہے کہ حضرت خبیبؓ کو جب قتل کیا جانے لگا تو آپ نے قتل سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ خبیبؓ ہی نے سب سے پہلے قتل کے وقت دو رکعت پڑھنے کا طریقہ قائم کیا۔ جب آپ نماز پڑھ چکے تو آپ کو ایک تختے سے باندھ دیا پھر مدینہ کی طرف منہ کر دیا اور بندش مضبوط کر دی پھر کہنے لگے اسلام سے لوٹ جاؤ ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ حضرت خبیبؓ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ اسلام سے مرتد ہونے کی شرط پر مجھے ساری دنیا کی دولت مل جائے کافر کہنے لگے اب تو چاہتے ہو گے کہ محمد میری جگہ ہوتے اور میں اپنے گھر بیٹھا چین کرتا۔ حضرت خبیبؓ نے فرمایا نہیں خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ محمد ﷺ کے کوئی کانٹا چبھ جائے اور میں گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں کافر برابر کہتے رہے خبیبؓ اسلام سے لوٹ جاؤ حضرت خبیبؓ نے فرمایا نہیں میں کبھی اسلام سے نہیں پھروں گا کہنے لگے اگر اسلام سے نہ پھرو گے تو ہم تم کو قتل کر دیں گے بولے اللہ کی راہ میں مارا جانا ایک حقیر چیز ہے۔

بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت خبیبؓ نے شہادت سے پہلے چند اشعار پڑھے تھے جن میں سے دو شعر یہ تھے۔

"اگر مسلمان ہونے کی حالت میں مارا جاؤں تو مجھے پرواہ نہیں کہ کس پہلو سے اللہ کی راہ میں زمین پر گرتا ہوں میرا یہ قتل ہونا اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے اگر اللہ چاہے گا تو پارہ پارہ جسم کے جوڑ جوڑ میں برکت عطا فرمائے گا"

ابن عقبہ کا بیان ہے کہ حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ دونوں ایک ہی دن شہید کئے گئے اور جس روز ان کی شہادت ہوئی اسی روز لوگوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے وعلیکما السلام۔

ابن ابی شیبہ نے حسن بصری کی مرسل روایت سے بیان کیا ہے اور عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو مسلمانوں کو گرفتار کر لیا اور ایک سے کہا محمد ﷺ کے متعلق تیرا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں مسیلمہ نے کہا میرے متعلق تیرا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا آپ بھی۔ مسیلمہ نے دوسرے سے پوچھا محمد ﷺ کے متعلق تو کیا کہتا ہے اس نے جواب دیا وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ مسیلمہ نے پوچھا میرے متعلق تو کیا کہتا ہے اس نے جواب دیا میں بہرا ہوں۔ مسیلمہ نے یہی بات تین بار دہرائی اور اس شخص نے بھی تین بار جواب دہرا دیا آخر مسیلمہ نے اس کو قتل کر دیا رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچی تو اول شخص کے متعلق فرمایا اس نے اللہ کی دی ہوئی اجازت کو اختیار کر لیا اور دوسرے نے بلند آواز سے اعلان حق کیا اس کو مبارک ہو۔

مسئلہ: اگر کسی مسلمان کا مال تلف کرنے پر کسی کو مجبور کیا جائے تو اس کا مال تلف کرنا اس کے لئے جائز ہے ضرورت کے وقت غیر کا مال مباح ہو جاتا ہے جیسے سخت بھوک کے وقت کسی کا مال کھا لینا جائز ہے۔ لیکن صاحب مال مجبور کرنے والے سے اپنے مال کا تاوان وصول کرے گا کیونکہ مجبور شخص تو اس جبر کا آلہ کار ہے اور جس صورت میں آلہ کار بننا درست ہے اس میں تاوان آلہ کار بنانے والے سے لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اگر شراب پینے یا مردار کو کھانے پر مجبور کیا جائے تو ایسا کرنا باتفاق علماء جائز ہے لیکن کیا نہ کھانا اور جان دے دینا جائز ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک حرام کو کھا پی لینا واجب ہے انکار کر کے جان دے دینا جائز نہیں۔ جیسے حلال چیز (یعنی پرائی حلال چیز کو) جان بچانے کے لئے کھا پی لینا واجب ہے ویسے ہی شراب اور مردار کا حکم ہے۔ اگر کھانے پینے سے انکار کرے

جان دے دے گا تو گناہ گار ہوگا اور بلا ضرورت اپنی جان کھو دینے میں اس جابر کا مددگار مانا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر کھانے پینے سے انکار کر کے جان دے دے گا تو گناہ گار نہ ہوگا۔ امام شافعیؒ کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں شراب پینے کی اجازت اور رخصت ہے اباحت نہیں ہے۔ شراب مباح نہیں ہو جاتی۔ اب اگر اس نے عزیمت کو اختیار کیا اور شراب کی حرمت پر قائم رہ کر جان دے دی تو گناہ گار نہیں ہو سکتا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا یہ رخصت نہیں اباحت ہے۔ اضطرار کی حالت میں مردار بھی ذبیحہ کی طرح حلال ہو جاتا ہے۔ آیت میں حالت اضطرار مستثنیٰ ہے فرمایا ہے اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ استثناء کر کے حالت اضطرار کو عدم اضطرار کی حالت سے حکم میں علیحدہ کر لیا گیا ہے (اور ظاہر ہے کہ عدم اضطرار کی حالت میں حرمت کا حکم ہے تو اضطرار کی حالت میں اباحت ہوگی، رخصت نہ ہوگی) ہاں اگر غیر کا مال کھانے پر مجبور کیا گیا اور انکار کرنے کی صورت میں مارا گیا تو باتفاق علماء ماجور ہوگا، کیونکہ غیر کے مال کی حرمت ہر حال میں قائم ہے (کھا لینے کی صرف رخصت ہے) یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اکراہ سے خطاب نہیں بدلا کرتا کہ ایک ہی چیز ایک مرتبہ مباح اور فرض ہو جائے اور پھر کبھی وہی چیز حرام ہو جائے اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے ایک عام ضابطہ قائم کر دیا ہے کہ جس تصرف کا حکم الفاظ پر جاری ہوتا ہو دل کی رضا پر موقوف نہ ہو وہ حکم اس وقت بھی مرتب ہوگا جب وہ تصرف جبر کی حالت میں کیا جائے۔ اس قسم کے تصرفات (جو الفاظ پر مبنی ہوں اور ان میں دل کی رضامندی ضروری نہیں) کوئی ہیں۔ نکاح، طلاق، طلاق سے رجوع، ایلاء، ظہار، غلام کی آزادی، قصاص کی معافی، قسم، نذر (ان سب کے احکام صرف زبان سے کہنے سے نافذ ہو جائیں گے مذاق ایجاب و قبول سے نکاح ہو جائے گا۔ زبان سے لفظ طلاق کہہ دینے سے طلاق ہو جائے گی۔ صرف زبان سے آزاد کرنے سے غلام آزاد ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ ان احکام کے مرتب ہونے کے لئے دل کی رضامندی ضروری نہیں پس کسی نے جبراً اگر طلاق یا نکاح میں ایجاب و قبول یا معافی یا قسم وغیرہ کے الفاظ کہلوا لئے تو احکام مرتب ہو جائیں گے) شعبی، نخعی اور ثوری کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمدؒ کے نزدیک کوئی جبری تصرف جاری نہیں ہو سکتا جبر سے احکام مرتب نہیں ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے اغلاق و جبر کی صورت میں نہ طلاق ہے نہ باندی غلام کی آزادی۔ رواہ احمد وابو داؤد وابن ماجہ والحاکم وابن الجوزی وابو یعلی والبیہقی من طریق صفیہ بنت عثمان عن شیبہ۔ اس سلسلے کو حاکم نے صحیح کہا ہے لیکن اس سند میں ایک راوی محمد بن عبید بھی ہے جس کو ابو حاتم رازی نے ضعیف کہا ہے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ قتادہ نے کہا اغلاق کا معنی ہے اکراہ (جبر کرنا) یہ لفظ اَغْلَقْتُ الْبَابَ سے ماخوذ ہے۔ گویا مجبور آدمی کو جابر کی مرضی کے خلاف کرنے سے بند کر دیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اغلاق کا ترجمہ شدت غصہ کیا ہے۔ سنن ابو داؤد میں یہ ترجمہ آیا ہے اور امام احمد نے بھی اس لفظ کی یہی تشریح کی ہے لیکن یہ تشریح اچھی نہیں ہے۔ ابن السید نے اس کو پسند نہیں کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اگر اغلاق کا ترجمہ غضب کیا جائے گا تو کوئی طلاق ہی نہیں پڑے گی کیونکہ ہر شخص تحت غصہ کی حالت میں ہی طلاق دیتا ہے۔ حسن بصریؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے تمہارے لئے بھول چوک کو معاف کر دیا اور اس کو بھی جس پر تم کو مجبور کیا گیا ہو۔ رواہ ابن الجوزی اس حدیث سے اصل مدعا کا ثبوت نہیں ہوتا کیونکہ اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو گناہ کا کام جبراً کسی سے کرایا گیا ہو اللہ اس کا مواخذہ نہیں کرے گا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی احکام بھی مرتب نہ ہوں گے۔ اسی حدیث کی ہم معنی وہ حدیث بھی ہے جو طبرانی نے از روایت ثوبان نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت سے بھول چوک (کی سزا) اٹھا لی گئی ہے اور وہ کام بھی جس پر لوگوں کو مجبور کیا گیا ہو۔ حضرت ابو الدرداءؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی آیا ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کی سند میں ضعف ہے اس مضمون کی حدیث مختلف روایات سے ابن ماجہ وابن حبان، دار قطنی، بیہقی اور حاکم وغیرہ نے بحوالہ اوزاعی بواسطہ عطاء از ابن عباسؓ بیان کی ہے لیکن اہل روایت نے ان روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ یہی حدیث حضرت ابو ذرؓ کی روایت سے ابن ماجہ نے بیان کی ہے اس کے سلسلہ میں شہر بن حوشب واقع ہے اور سند میں انقطاع ہے لیکن اگر حدیث کو صحیح مان لیا جائے تب بھی امام شافعیؒ وغیرہ کا اس سے استدلال غلط ہے۔

بھول چوک اٹھا لیے جانے کا یہ معنی تو ہر گز نہیں کہ بھول چوک واقع نہ ہو گی، یہ تو واقعہ کے خلاف ہے اس لئے تین ہی معنی ہو سکتے ہیں۔
(۱) بھول چوک کا مواخذۂ اخروی اٹھا لیا گیا ہے یعنی اللہ نے بھول چوک کی سزا معاف کر دی ہے یہی مطلب صحیح ہے (۲) بھول چوک کا عمومی مطلب اٹھا لیا گیا ہے (نہ حکم دنیا بھول چوک پر مرتب ہوتا ہے نہ آخرت کا حکم یعنی سزا) یہ مطلب غلط ہے عموم حکم کسی لفظ سے نہیں معلوم ہوتا۔ مقتضی النص میں عموم نہیں ہوتا۔ (۳) دونوں کا ہو جانا اٹھا لیے گئے ہیں یہ مطلب اجماع کے خلاف ہے بالاتفاق حکم آخرت یعنی مواخذہ کا اٹھایا جانا اس جگہ مراد ہے اس لئے حکم دنیا مع حکم آخرت کے مراد نہیں ہو سکتا ورنہ عموم مقتضی لازم آئیگا کذا قال ابن ہمام۔
ابن جوزی نے شافعیہ کے مسلک کی تائید میں حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ نقل کیا ہے عہد فاروقی میں کوئی شخص کسی پہاڑ پر چڑھ گیا اس کی بیوی اوپر بلندی پر جا بیٹھی بیوی نے کہا تو مجھے تین طلاقیں دے دے ورنہ میں اوپر سے پتھر لڑھکا کر تجھے قتل کر دوں گی اس شخص نے عورت کو ہر چند اللہ اور اسلام کا واسطہ دیا اور اللہ سے ڈرایا لیکن وہ نہ مانی۔ مجبوراً اس شخص نے تین طلاقیں دے دیں پھر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا آپ نے فرمایا لوٹ کر اپنی بیوی کے پاس چلا جا یہ طلاق نہیں ہے۔
امام ابو حنیفہؒ نے بھی اپنے مسلک کی تائید میں چند احادیث نقل کی ہیں جن میں سے ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ہیں جن میں سنجیدگی تو سنجیدگی ہی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجیدگی (کا حکم رکھتی) ہے نکاح، طلاق، رجعت رواہ ابو داؤد والترمذی وابن ماجہ واحمد والحاکم والدارقطنی۔ ترمذی نے اس کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔
ابن جوزیؒ نے کہا اس کی سند میں ایک راوی عطاء بن عجلان ہے جو متروک الحدیث ہے حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے ابن جوزی سے غلطی ہو گئی انہوں نے عطاء کو عطاء بن عجلان سمجھ لیا حالانکہ عطاء بن عجلان نہیں عطاء بن ابی رباح ہے (جو قوی راوی ہے) ابو داؤد کی روایت میں اس کی صراحت آئی ہے اور حاکم نے بھی اس کی صراحت کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک شخص عبدالرحمن بن حبیب آیا ہے اور اس شخص کے متعلق اختلاف ہے نسائی نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے اور دوسرے علماء نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہم اس حدیث کو حسن کہتے ہیں۔

ایک شبہ......

تصرف شرعی کے لئے صاحب تصرف کا با اختیار ہونا ضروری ہے اگر بطور ہزل (یعنی مذاق کے طور پر) کوئی طلاق دے دے تو اس کا یہ کلام بھی اپنے اختیار سے ہی ہوتا ہے البتہ وہ کلام کے حکم (یعنی طلاق پر) راضی نہیں ہوتا مگر رضا قلب کو وقوع طلاق میں کوئی دخل نہیں ہے لہٰذا وہ شخص جس نے اپنے اختیار سے بطور ہزل طلاق دے دی ہو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی لیکن اکراہ میں تو متکلم کا اختیار نہیں ہوتا اس سے سرزد ہونے والی طلاق کو ہزل کی طلاق سے کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

ازالہ......

ہم کہتے ہیں جس شخص پر جبر کیا گیا وہ بھی تو با اختیار ہوتا ہے اس کا کلام بھی اختیار ہی کے ساتھ ہوتا ہے اور کامل اختیار کے ساتھ ہوتا ہے اور ہزل کے طور پر طلاق دینے والے کی طرح وہ بھی حکم کلام (یعنی طلاق) کو پسند نہیں کرتا وہ خوب واقف ہوتا ہے کہ جبر کرنے والے کی مخالفت بھی تکلیف دہ ہے اور وقوع طلاق بھی دکھ دینے والا ہے مگر دونوں میں آسان مصیبت کو وہ جان کر اختیار کرتا ہے لہٰذا مکرہ (مجبور) کی طلاق کا واقع ہونا ضروری ہے۔

ابن ہمام نے لکھا ہے، حنفی ختم طلاق میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں جب حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد سے کفار نے قسم لے لی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے دونوں حضرات سے فرمایا ہم کافروں کی طرف سے لئے ہوئے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ان کے خلاف مدد چاہیں گے۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے بتادیا کہ قسم اپنی خوشی سے کھائی جائے یا کسی کے جبر سے دونوں برابر ہیں محض لفظ پر جو حکم مرتب ہوتا ہے اس کی نفی میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں (انعقاد سے اس لفظ کا مقصد ہو یا اکراہ سے دونوں برابر ہیں) بیع کی حالت اس سے جدا ہے بیع کی صحت کا تعلق الفاظ یا قائم مقام الفاظ سے ضرور ہے مگر دل سے رضامندی ضروری ہے اور اکراہ کی صورت میں یہ رضامندی نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں (حضور ﷺ نے فرمایا) ہر طلاق نافذ ہے سوائے پاگل مغلوب العقل کی طلاق کے۔ ترمذی نے کہا ہم کو یہ حدیث صرف عکرمہ بن خالد کی وساطت سے بروایت ابو ہریرہؓ معلوم ہوئی ہے عطاء بن عجلان از عکرمہ کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے مگر عطاء ضعیف اور منکر الحدیث ہے (اس لئے عطاء کی وساطت سے اس حدیث کی روایت ناقابل اعتبار ہے)

امام شافعیؒ کے قول کی تائید میں صفوان بن اصم کی روایت کردہ حدیث بھی آئی ہے صفوان نے ایک صحابی کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ سو رہا تھا بیوی یکدم اٹھی اور چھری لے کر مرد کے سینہ پر بیٹھ گئی اور چھری اس کے حلق پر رکھ کر بولی مجھے طلاق دے دے ورنہ تجھے ذبح کر دوں گی۔ مرد نے اس کو اللہ کا واسطہ دیا مگر وہ نہ مانی آخر مرد نے اس کو تین طلاقیں دے دیں اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا طلاق میں قیلولہ نہیں۔

ابن جوزی کا بیان ہے کہ بخاری نے مطلاق مکرہ کے بارے میں صفوان بن اصم کی روایت کردہ حدیث منکر ہے اس کو نہیں مانا جائے گا۔

ابن ہمام نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ چند مسئلے حکم ناقابل حل ہیں جن کی کوئی واپسی نہیں نکاح، طلاق، غلاموں کی آزادی اور صدقہ (یعنی ان چاروں میں اکراہ اور جبر سے بھی حکم مرتب ہو جاتا ہے)

میں کہتا ہوں بظاہر امام ابو حنیفہؒ کا استدلال قوی ہے اور اگر احادیث میں تعارض تسلیم بھی کر لیا جائے تو قیاس کی طرف رجوع لازم ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ (مکرہ کی) طلاق، عتاق وغیرہ کا وقوع ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

یہ (ایمان کے بعد کفر یا شدید عقوبت) اس سبب سے ہے کہ انہوں نے دنیوی زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دے رکھی ہے اور یہ (سبب بھی ہے) کہ اللہ ان لوگوں کو راہ پر نہیں لاتا جو (اس کے علم میں) کافر ہیں یعنی ایمان نہیں لائیں گے جن کا کفر پر مرنا مقدر ہو چکا ہے اللہ ان کو ایمان کی توفیق نہیں دیتا۔ اس آیت میں کافروں کے کفر کے دو سبب بیان فرمائے۔ ایک ظاہری اور دوسرا حقیقی ظاہری سبب تو یہ تھا کہ انہوں نے خود کفر کو پسند کر رکھا تھا اور آیات الٰہی میں غور نہیں کرتے تھے اور حقیقی سبب یہ تھا کہ اللہ ان کو ہدایت یاب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اعمال جبر اور قدر کے درمیان ہیں (نہ انسان بالکل قادر ہے نہ محض مجبور و بے اختیار)

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگا دی ہے اور یہی لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں۔

دلوں پر مہر لگنے کی وجہ سے حق کو نہیں سمجھتے اور کانوں پر مہر لگنے کی وجہ سے حق کو گوش قبول سے نہیں سنتے اور آنکھوں پر مہر لگنے کی وجہ سے چشم عبرت نگاہ سے آیات خداوندی کو نہیں دیکھتے یہ بالکل غافل ہیں کہ عاقبت کی طرف سے غافل ہیں باوجودیکہ جو خوفناک بے عقل پتھر بھی اپنے انجام سے بے خبر نہیں ہیں۔

لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿١٠٩﴾ (اس لئے) لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہی لوگ گھاٹے میں رہیں گے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگیاں بالکل بے کار کھو دیں ایسے کاموں میں عمریں ضائع کیں جو دوامی عذاب میں ان کو لے جائیں گے اور کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو عذاب سے بچاتے اور منزل کامیابی تک پہنچا دیتے۔ برخلاف گنہگار مسلمانوں کے یہ بھی اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ نفسانی خواہشات اور گناہوں میں برباد کرتے ہیں لیکن انہوں نے چونکہ توحید کا دامن پکڑ لیا ہے اس لئے کبھی نہ کبھی عذاب الٰہی سے ان کو نجات مل جائے گی اور توحید کا عقیدہ ان کو جنت میں لے جائے گا۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١١٠﴾

پھر بے شک آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے مبتلائے کفر ہونے کے بعد (ایمان لا کر) ہجرت کی پھر جہاد کیا اور (ایمان پر) قائم رہے تو آپ کا رب ان اعمال کے بعد ان کی بڑی مغفرت کرنے والا اور (ان پر) بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

چونکہ مسلمانوں کے اور کفر پر قائم رہنے والوں کے حالات میں بڑا بُعد تھا اس لئے لفظ ثُمَّ استعمال کیا۔ فُتِنُوا یعنی دین و اسلام سے روکا گیا اور بڑے بڑے دکھ دیئے گئے۔ ابن سعد نے طبقات کبیری میں عمر بن حکم کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ کو ایسے سخت دکھ دیئے جاتے تھے کہ وہ بالکل بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں (اور کیا کریں) حضرت صہیبؓ، حضرت ابوفکیہہؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عامر بن فہیرہؓ اور کچھ دوسرے مسلمانوں کی بھی یہی حالت تھی اور ایسے ایسے سخت دکھ ان کو دیئے جاتے تھے کہ وہ ہوش باختہ ہو جاتے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں (اور کیا کریں) انہی حضرات کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول ابوجہل کے رضاعی بھائی عیاش بن ابی ربیعہؓ، ابوجندل بن سہیل بن عمروؓ، ولید بن ولید بن مغیرہؓ، سلمہ بن ہشامؓ اور عبداللہ بن اسید ثقفیؓ کے متعلق ہوا مشرکوں نے ان کو سخت اذیتیں دی تھیں انہوں نے مشرکوں کی اذیت سے بچنے کے لئے کچھ ایسے الفاظ کہہ دیئے جو مشرک کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چلے گئے۔

پھر انہوں نے جہاد کیا یعنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو کر کافروں سے لڑے اور صبر کیا یعنی ایمان، اطاعت، جہاد اور برداشت مصائب پر ثابت قدم رہے اور گناہوں سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ (صبر کے بعد اگر علیٰ لفظ آتا ہے تو جمے رہنے اور ثابت قدم رہنے کا معنی ہوتا ہے اور اگر صبر کے بعد عَنْ آتا ہے تو بچنے، گریز کرنے اور باز رہنے کا معنی ہوتا ہے اور چونکہ آیت میں صَبَرُوْا کے بعد علیٰ ہے نہ عَنْ اس لئے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، اسی لئے تفسیر میں ثابت قدم رہنے اور گناہوں سے باز رہنے کے الفاظ سے مرادی مطلب بیان کیا گیا ہے۔ (مترجم)

حسن بصریؒ اور عکرمہ نے کہا اس آیت کا نزول عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق ہوا۔ عبداللہ رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا پھر مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا اور کافروں سے جا ملا۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے اس کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا۔ عبداللہ چونکہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا اخیافی بھائی تھا اس لئے اس نے حضرت عثمانؓ سے پناہ کی درخواست کی۔ حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی سفارش کر دی اور حضور ﷺ نے اس کو پناہ دے دی (اور قتل کا حکم واپس لے لیا) اس کے بعد عبداللہ پکا مسلمان ہو گیا اور اس کی اسلامی حالت بہت اچھی رہی۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن عامر کی قرأت میں فَتَنُوْا آیا ہے، یعنی کافر ہونے اور مسلمانوں کو دکھ پہنچانے کے بعد ایمان لا کر انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا (اس صورت میں) اس آیت کا نزول عامر حضرمی اور ان کے غلام جبر کے متعلق قرار دیا جائے گا۔ جبر مسلمان ہو گئے تھے۔ عامر ان کو طرح طرح کے دکھ دیتے تھے یہاں تک کہ جبر (بظاہر) مرتد ہو گئے تھے کچھ مدت کے بعد عامر خود مسلمان اور پکے مسلمان ہو گئے اور جبر کو جس کو زبردستی مرتد بنایا گیا تھا ساتھ لے کر ہجرت کر کے مدینہ میں آ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب ہو کر کافروں سے جہاد کیا اور مصائب پر صبر کیا۔

مِنْ بَعْدِهَا یعنی ہجرت، جہاد اور صبر کے بعد، پچھلے گناہوں کو اللہ معاف کرنے والا اور آئندہ دنیا و آخرت میں ان کے اعمال کے موافق نعمت و راحت عطا کرنے والا ہے۔

مکرر اِنَّ رَبَّکَ کا ذکر محض لفظی تاکید ہے۔

یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جس روز ہر شخص اپنی ہی طرف داری میں بات کریگا اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یَوْمَ کا تعلق رَحِیْمٌ سے ہے یعنی اس روز اللہ تم پر مہربان ہوگا جس روز، یا اُذْکُرْ محذوف سے تعلق ہے یعنی یاد کرو اس دن کو جس دن......

تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا یعنی ہر شخص کو اپنی ہی پڑی ہوگی ہر شخص کو اپنے ہی بچاؤ کی فکر اور کوشش ہوگی، دوسرے کا خیال بھی نہ ہوگا۔ کافر کہے گا اے ہمارے مالک! انہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا، اے ہمارے مالک ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کا کہا مانا، ہم اپنے رب کی قسم کھا کر کہتے ہیں جو معبود برحق ہے کہ ہم (خود) مشرک نہیں تھے۔ ہم کو دوبارہ دنیا میں لوٹا دے ہم نیک عمل کریں گے۔ مؤمن کہے گا اے رب میں تجھ سے اپنی جان کی امان مانگتا ہوں مجھے کافر لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر دینا۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا، قیامت کے دن جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا۔ فرمایا: ساتویں زمین سے لایا جائے گا اس کی ایک ہزار سال کی مسافت پر رہ جائے گی تو ایک سانس کھینچے گی جس کی وجہ سے ہر مقرب فرشتہ اور ہر نبی مرسل دوزانو بیٹھ کر عرض کرے گا اے میرے مالک! میری جان (بچا دے)

بغوی نے لکھا ہے، حضرت عمر بن خطابؓ نے کعب احبارؓ سے فرمایا (کچھ آخرت کا تذکرہ کر کے) ہمارے اندر (اللہ کا) خوف پیدا کردو۔ کعب احبارؓ نے عرض کیا: امیر المؤمنین! اگر ستر پیغمبروں کے برابر عمل کر کے آپ قیامت کا دن پائیں گے تب بھی قیامت آپ پر بار بار ایسے حالات لائے گی کہ اس وقت آپ کو اپنی جان کے علاوہ کسی دوسرے کا خیال ہی نہیں رہے گا جہنم ایک ایسا دم کھینچے گی کہ ہر مقرب فرشتہ اور ہر برگزیدہ نبی دوزانو بیٹھ جائے گا یہاں تک کہ حضرت ابراہیم بھی کہہ اٹھیں گے میں تجھ سے صرف اپنی جان کی امان مانگتا ہوں اس کی تصدیق اللہ کی بھیجی ہوئی آیت میں موجود ہے ارشاد فرمایا ہے یَوْمَ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا۔

عکرمہ نے اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں میں باہم جھگڑا برابر ہوتا رہے گا یہاں تک کہ روح و بدن میں بھی باہم جھگڑا ہوگا، روح کہے گی اے میرے رب! نہ میرے ہاتھ تھے جن سے میں پکڑتی نہ میرے پاؤں تھے جن سے میں چلتی نہ میری آنکھ تھی کہ میں دیکھتی (جو کچھ برا عمل ہے وہ اس بدن کی ہے) بدن کہے گا تو نے مجھے لکڑی کی طرح (بے حس، بے شعور، بے جان) پیدا کیا تھا میرے ہاتھ نہ تھے کہ میں پکڑتا میرے پاؤں نہ تھے کہ میں ان سے چلتا میری آنکھیں نہ تھیں کہ ان سے دیکھتا۔ جب یہ روح اندر نور کی شعاع کی طرح آئی تو میری زبان بولنے لگی، میری آنکھ بینا ہو گئی اور میرے پاؤں رواں ہو گئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ روح اور جسم کو اس طرح سمجھائے گا جیسے ایک اندھا اور ایک اپاہج کسی کے باغ میں پہنچ گئے باغ میں درختوں پر پھل لگے ہوئے تھے اندھا تو پھلوں کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا اور اپاہج (دیکھتا تو تھا) پھلوں تک پہنچ نہ سکتا تھا آخر اندھے نے اپاہج کو اپنے اوپر سوار کر لیا اس طرح دونوں نے پھل حاصل کر لئے (اور دونوں چوری کے مجرم قرار پائے) روح اور بدن بھی دونوں اسی طرح عذاب میں پکڑے جائیں گے۔

تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا میں نفس سے مراد ذات ہے۔ عین شیٔ اور ذات شیٔ کو نفس شیٔ کہا جاتا ہے اور جو شیٔ زائد از ذات ہو اس کو غیر کہتے ہیں یعنی ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے دفاع کرے گا۔

لَا یُظْلَمُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ کسی کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا، کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ

اور اللہ ایک بستی والوں کی حالت عجیب بیان فرماتا ہے کہ وہ بڑے امن اور اطمینان سے رہتے تھے ان کے کھانے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں۔ پس انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی۔ یعنی اللہ نے ایک بستی کو جس کے اوصاف مندرجہ آیات تھے۔ ہر اس قوم کو مثال کے طور پر بیان فرمایا جس کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا، پھر بجائے شکر کرنے کے وہ مغرور ہوگئے اور کفر کرنے لگے۔ آخر اللہ نے ان کو عذاب میں گرفتار کر دیا۔ قریۃ سے مراد ایک معروف بستی ہے جس کو بطور مثال ذکر کیا گیا ہے اور ممکن ہے کوئی ایسی بستی نہ ہو جس کا ذکر اللہ نے مکہ کی تنبیہ دینے کے لئے کیا ہے تاکہ اہل مکہ کو ان کے برے انجام کا تذکرہ پڑھ کر عبرت حاصل ہو۔

بغوی نے لکھا ہے قریۃ سے مراد مکہ ہی ہے۔ اس تفسیر پر مثال کا ذکر دوسری بستیوں کو سبق سکھانے کے لئے ہوگا۔ ؎

اٰمِنَةً یعنی چین سے۔ دشمنوں کا خوف نہ کسی کے حملے کا اندیشہ۔

مُّطْمَئِنَّةً اپنی جگہ برقرار سکون سے رہنے والے تنگ دستی یا دشمن کے خوف کی وجہ سے ترک سکونت نہ کرنے والے۔ عام عرب آبادی کو ہر وقت دشمنوں کے حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا اور غذائی اشیاء کی بھی کمی تھی اس لئے بہت زیادہ خانہ بدوش رہتے تھے۔ لیکن مکہ والوں کی یہ کیفیت نہ تھی ان کو کھانے پینے کی رسد بے تکلف بآسانی ہر طرف اور ہر جگہ سے پہنچتی تھی خشکی کے راستے بھی اور سمندر کے ذریعے سے بھی۔

فَكَفَرَتْ اس بستی نے یعنی اس کے باشندوں نے ناشکری کی۔

بِاَنْعُمِ اللّٰهِ اللہ کی نعمتوں کی۔ انعم نعمت کی جمع ہے یا نُعم کی جیسے دِرع کی جمع اَدرُع اور بُؤس کی جمع اَبؤس آتی ہے۔

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ اس پر اللہ نے ان کو ان کی حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔

مزہ چکھانے سے مراد ہے بھوک اور خوف کے ضرر کے اثر کا محسوس کرانا اور لباس سے مراد ہے وہ اثر جو بھوک اور خوف کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے یعنی لاغری اور رنگ کا تغیر۔

بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ سے مراد ہے کفر اور ناشکری۔

بغوی نے لکھا ہے اہل مکہ سات برس تک کال میں مبتلا رہے۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے تمام عرب نے مکہ کو کھانے پینے کا سامان بھیجنا بند کر دیا ہر طرف سے رسد کی بندش ہوگئی اور اس قدر فاقوں کی نوبت آگئی کہ لوگوں نے جلی ہوئی ہڈیاں مردار جانور مردہ کتے اور علہز یعنی اونٹوں کے اون اور خون کا پکا ہوا ملغوبہ تک کھا لیا۔ فاقوں کی وجہ سے نظر کی یہ حالت ہوگئی کہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ اس حالت سے مجبور ہو کر سرداران مکہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا دشمنی تو مردوں سے ہے عورتوں اور بچوں کا کیا قصور ہے آخر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو غلہ کی رسد پہنچانے کی اجازت دے دی اور عرب مکہ کو خوردنی جنس بھیجنے لگے۔ اہل مکہ اس زمانہ میں مشرک تھے۔

میں کہتا ہوں یہ سورت تو مکی ہے اور مکہ والوں پر جو ہفت سالہ قحط پڑا اور رسول اللہ ﷺ کے فوجی دستوں کے حملہ کرنے کا خوف ہوا وہ ہجرت کے بعد ہوا اس لئے ان آیات کو یا تو مدنی تسلیم کیا جائے گا یا قریۃ سے مراد مکہ نہ ہوگا کوئی اور بستی ہوگی جس کا ذکر اللہ نے بطور تمثیل کیا ہے تاکہ اس کی بد انجامی کو سن کر اہل مکہ کو بھی خوف پیدا ہو اور چونکہ اہل مکہ اس ذکر کے بعد بھی

؎ سلیم بن عمر کا بیان ہے میں ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے ساتھ تھا۔ آپ مکہ سے نکل کر مدینہ کو جا رہی تھیں راستہ میں اطلاع ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے آپ فوراً لوٹ پڑیں اور فرمایا تم بھی میرے ساتھ لوٹ آؤ قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ وہی بستی ہے جس کا ذکر اللہ نے آیت قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً میں کیا ہے۔ ازالۃ الخفاء۔

اللہ نے صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی تمام درندے کیڑے مکوڑے حلال کر دیے ہیں بلکہ یہ حصر اضافی ہے یعنی کافروں نے جن چیزوں کو از خود حرام بنا رکھا ہے وہ خدا کی حرام کردہ نہیں ہیں اللہ نے تو صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں۔ چونکہ حصر اضافی ہے اس لئے صحیح احادیث سے ان چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی جو حرمت ثابت ہے وہ قرآنی عبارت کے خلاف نہیں ہے اس کی پوری تفصیل سورۂ مائدہ میں کر چکے ہیں۔ ۱؎

اَلْكَذِبَ لَا تَقُوْلُوْا کا مفعول ہے۔ یعنی تم جو اپنی زبانوں سے جھوٹ کہتے ہو اور کسی کو از خود حلال اور کسی کو حرام بنا دیتے ہو اس کی حلت و حرمت کو اللہ پر تہمت نہ جوڑو اس کی تحریم و تحلیل کو اللہ کا حکم مت قرار دو اور صرف اپنی زبانوں سے اشیاء کی حرمت و حلت کا فیصلہ بغیر دلیل کے نہ کرو۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ (دنیا میں ان کے لئے یہ) چند روزہ عیش ہے اور (آخرت میں) دردناک سزا ہے۔ یعنی جس عیش کے لئے یہ افترا بندی کرتے ہیں وہ بہت ہی حقیر اور زوال پذیر ہے۔ عنقریب فنا ہو جائے گا اور اس افترا بندی کی سزا مرنے کے بعد بڑی دردناک ہو گی۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں۔ جن کا بیان ہم آپ سے اس سے پہلے کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر زیادتی کیا کرتے تھے

سورۂ انعام میں پہلے اللہ بیان کر چکا تھا وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ الخ

مَا ظَلَمْنٰهُمْ یعنی بعض حلال چیزوں کو یہودیوں کے لئے ہم نے حرام کر کے ان پر زیادتی نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر زیادتی کی تھی اس کی سزا میں ان کے لئے بعض حلال چیزیں حرام کر دی گئی تھیں۔

آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ کسی چیز کی حرمت کبھی تو اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے کرنے میں ضرر اور نہ کرنے میں فائدہ ہوتا ہے اور کبھی محض سزا کے طور پر بھی حلال چیزوں کو حرام کر دیا جاتا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے نادانی کے سبب گناہ کر لیا ہو پھر اس کے بعد توبہ کر کے اعمال درست کر لئے ہوں بلاشبہ توبہ کے بعد آپ کا رب (ان کو) معاف کر دینے والا بڑا مہربان ہے۔

عَمِلُوا السُّوْٓءَ بدی کفر ہو یا گناہ۔ بِجَهَالَةٍ نتیجہ نہ جاننے کے سبب جہالت کی حالت میں یعنی اللہ کو اور اس کے عذاب کو نہ جاننے کی حالت میں اور نتیجہ پر غور نہ کرنے کے سبب محض خواہش نفس کے زیر اثر کوئی گناہ کر لیا ہو۔ لَغَفُوْرٌ اس گناہ کو معاف کر دینے والا ہے۔ رَّحِيْمٌ بڑا مہربان ہے توبہ کرنے اور اللہ کی طرف رجوع ہو جانے کا ثواب عطا فرمائے گا۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾

بے شک ابراہیم بڑے مقتدا تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے۔ بالکل ایک طرف کے (یعنی اللہ کی طرف کے) ہو رہے تھے شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے اللہ نے ان کو منتخب کر لیا تھا اور ان کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا۔

۱؎ حضرت ابو نضرہ نے فرمایا میں نے جب سورۂ نحل کی آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ پڑھی ہے اس وقت سے آج تک (کسی چیز کی حرمت و حلت کا) فتویٰ دینے سے ڈرتا ہوں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا آئندہ لوگ (آخر دور) کہیں گے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور اس کی ممانعت کی ہے اور اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے یا بعض لوگ کہیں گے اس کو اللہ نے حلال کر دیا ہے اور اس کو حرام کر دیا ہے اور اللہ اس سے فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ [illegible] (مترجم)

تھی اور مانا اٰتَيْنٰهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیم کے طریقہ پر چلیں جو اللہ ہی کی طرف یکسو ہو گئے تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔

یعنی توحید میں نرمی کے ساتھ اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے میں پے درپے دلیلیں پیش کرنے میں ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق مناظرہ کرنے میں، قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں، دین ابراہیمی کے اصول و شرائع اختیار کرنے میں ابراہیم کے طریقے پر چلو۔ یہ تمام چیزیں وہ نعمتیں تھیں جو اللہ نے ابراہیم کو عطا فرمائی تھیں اور حضرت ابراہیم نے اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کیا تھا اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم اور طریق ابراہیم کی پیروی میں یہ تمام امور داخل ہیں۔

فائدہ

رسول اللہ ﷺ کو ملت ابراہیم پر چلنے کا حکم دیا کیونکہ حضور ﷺ مرتبۂ خلت پر پہنچنے کے بڑے مشتاق تھے اور آپ کو حضرت ابراہیم سے بہت زیادہ محبت تھی آیت قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ اس محبت پر دلالت کر رہی ہے۔

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ جملہ دوبارہ ذکر کرنے سے یہودیوں اور اہل مکہ اور عیسائیوں کی تردید مقصود ہے کیونکہ یہ سب ملت ابراہیمی پر چلنے کے مدعی تھے (مگر ان کے مسلک شرک آمیز تھے)

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

ہفتہ (کے دن کی تعظیم و عبادت اور حرمت کا پابند) تو صرف ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جنہوں نے اس میں خلاف کیا تھا اور آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

جُعِلَ السَّبْتُ یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم اور دنیا کے تمام مشاغل کی حرمت اور محض عبادت لازم کر دی گئی تھی۔

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ یعنی سنیچر کے معاملہ میں انہوں نے اپنے پیغمبر کی مخالفت کی۔ بغوی کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ نے حکم دیا تھا کہ ہر سات دن میں ایک روز یعنی جمعہ کے دن کوئی کام اور پیشہ نہ کریں صرف عبادت کیا کریں یہ دن اپنے لئے پسند کیا کریں۔ بنی اسرائیل نے کہا ہم تو (عبادت کے لئے مخصوص) وہ دن چاہتے ہیں جس روز اللہ سارے عالم کی پیدائش سے فارغ ہو گیا تھا یعنی سنیچر کا دن۔ اللہ نے سنیچر کا دن مقرر کر دیا اور سختی کر دی (کہ ان کے پابند رہیں) پھر حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے جمعہ کے دن کو پیش کیا (یعنی جمعہ کا دن عیسائیوں کے لئے مقرر کیا) کہنے لگے ہم کو تو یہ بات پسند نہیں کہ ہماری عید کے بعد ان (یہودیوں) کی عید ہو جائے غرض عیسائیوں نے (عبادت کے لئے) اتوار کا دن پسند کر لیا آخر اللہ نے جمعہ کا دن اس امت کو دے دیا اس امت نے عطاء الٰہی کو قبول کر لیا اور اللہ نے امت اسلامیہ کو اس دن کی برکات بھی عطا فرما دیں۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم (دنیا میں) پیچھے ہیں قیامت کے دن آگے ہوں گے باوجودیکہ ان کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہم کو ان کے پیچھے پھر یہ ان کا دن تھا جو ان پر فرض کیا گیا تھا یعنی جمعہ کا دن یہ انہوں نے اس کی مخالفت کی لیکن اللہ نے ہم کو اس کی ہدایت کر دی سب لوگ اس روز عبادت میں ہمارے پیچھے ہیں یہودیوں کے لئے کل کا دن ہے (یعنی سنیچر) اور عیسائیوں کے کل کے بعد کا دن (یعنی اتوار)

بغوی کی روایت میں اس حدیث کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت حذیفہؓ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے، جس کے آخر میں الفاظ ہیں ہم دنیا والوں سے پیچھے ہیں اور قیامت کے دن اوّل ہوں گے ہمارا فیصلہ اور لوگوں سے پہلے کر دیا جائے گا۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے سنیچر کے دن کی تعظیم اور حرمت صرف ان لوگوں کے لیے لازم کی تھی جنہوں نے اس کے سلسلے میں اختلاف کیا تھا یعنی یہودیوں پر سنیچر کی تعظیم لازم کی تھی مگر لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا سنیچر کا دن سب سے بڑی عظمت کا دن ہے۔ اللہ تمام چیزوں کو پیدا کر کے جمعہ کے دن فارغ ہو گیا اور سنیچر کے دن آرام کیا۔

بعض لوگوں نے کہا اتوار کا دن سب سے زیادہ عظمت والا ہے۔ اللہ نے اسی روز مخلوق کو پیدا کرنے کا افتتاح کیا تھا۔ غرض یہ کہ اللہ نے ان کے لیے جمعہ کی تعظیم فرض کی تھی مگر خدا کے فرض کردہ دن کے علاوہ انہوں نے دوسرے ایام کی تعظیم کو اختیار کیا۔

بعض اہل تفسیر نے آیت مذکورہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ نے سنیچر کے دن کو لعنت اور صورت بگاڑ دینے کا سبب بنا دیا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس کے حکم کی مخالفت کی یعنی یہودیوں کے لئے لعنت اور ان کی صورتیں مسخ ہو جانے کا سبب سنیچر کا دن ہوا بعض یہودیوں نے سنیچر کے دن مچھلی کا شکار حلال بنا لیا تھا اور کچھ دوسرے لوگ اس کو حرام کہتے تھے۔

لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ یعنی اختلاف کے مطابق ہر تو جزا دے گا ہر فریق کو وہی بدلہ دے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بلائیں اور (اگر بحث آ پڑے تو) ان کے ساتھ اچھی طرح بحث کریں (کہ تنگ مزاجی اور سخت کلامی نہ ہو) یعنی اے محمد! آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اَلْحِكْمَة سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن ایک مُحکم مضبوط قول کلام ہے جس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی (گویا حِکْمَة بمعنی مُحْکَم کے ہے اور اس سے مراد قرآن ہے) اور اَلْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ سے مراد موعظہ ہے۔ موعظہ ایسی دلیل کو کہتے ہیں جس سے حق واضح ہو جائے اور شبہات دور ہو جائیں۔ اس کا حسن یہ ہے کہ دلیل کے ساتھ ترہیب اور ترغیب بھی ہو (یعنی نہ ماننے پر سخت عذاب کا ڈراوا اور ماننے کے بعد بہترین نتیجہ کی بشارت) بعض علماء نے کہا کہ مَوْعِظَةٍ حَسَنَة سے مراد ایسا نرم کلام ہے جس میں درشتی اور پیچیدگی نہ ہو۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی بہت اچھے عمدہ طریقہ سے ان سے مناظرہ کرو اور اس طرح بحث کرو کہ اس میں نفس کی تیزی اور شیطانی وسوسہ کو دخل نہ ہو پیچ دار اور غلبہ نفسانی کی خواہش نہ ہو بلکہ محض لوجہ اللہ ہو اور اللہ کا بول بالا کرنا مقصود ہو۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستہ سے گمراہ ہو اور وہی راہ حق پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

یعنی آپ کا فریضہ تو صرف تبلیغ اور دعوت ہے حصول ہدایت اور سزا و جزا کا کام اللہ کا ہے اس کی ذمہ داری آپ کو نہیں جو کوئی گمراہ ہو یا ہدایت یافتہ سب سے واقف اللہ ہے اور وہی ہر ایک کو جزا و سزا دینے والا ہے حاکم نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اُحد کے روز جب لوگ میدان جنگ سے واپس آ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کو نہ پایا ایک شخص نے کہا میں نے فلاں چٹان کے پاس ان کو دیکھا تھا وہ کہہ رہے تھے میں اللہ کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا شیر ہوں اے اللہ! میں تیرے سامنے اس بات سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں جس کو یہ لوگ (یعنی ابوسفیان وغیرہ) لائے ہیں اور ان لوگوں یعنی مسلمانوں نے جو شکست کھائی ہے ان کی طرف سے میں معذرت خواہ ہوں (اس شخص سے اطلاع پا کر) رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہؓ کی طرف آئے وہ آپ کی لاش کو دیکھ کر رو دیئے اور جب آپ کے کان ناک کٹے اور صورت بگڑی ہوئی پائی تو چیخ پڑے اور فرمایا

کھانے پینے اور مسکن کی تنگی۔ ضیق ان کی تنگی۔ ابو عبیدہ نے کہا ضَیْق ضَیِّق کا مخفف ہے جیسے مَیْت مَیِّت کا اور لَیْن
لَیِّن کا۔ ابن قتیبہ نے کہا ضیق صفت کا صیغہ ہو گا یعنی تنگ امر۔

إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۞ اللہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا
ہے جو (گناہوں سے) بچتے ہیں اور ان کے ساتھ ہوتا ہے جو نیک کردار ہوتے ہیں۔

اتقوا یعنی گناہوں سے پرہیز رکھتے ہیں محسنون یعنی نیک کردار ہیں۔ یا اتقوا سے مراد ہے وہ لوگ جو اللہ کے حکم کی تعظیم
کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور محسنون یعنی نیک کردار ہیں یا اتقوا سے مراد ہیں وہ لوگ جو اللہ کے حکم کی تعظیم کرتے
ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور محسنون سے مراد ہیں وہ لوگ جو مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں یا اتقوا سے مراد ہیں وہ
لوگ جو بدلہ لینے میں زیادتی کرنے سے بچتے ہیں اور محسنون سے مراد ہیں وہ لوگ جو دوسروں کو معاف کرتے ہیں۔

اللہ کے ساتھ ہونے سے مراد ہے اللہ کی ولایت اور حق مہربانی اور مدد و نصرت کا ساتھ ہونا یا معیت ذاتیہ مراد ہے جو بے
کیف ہے اس کی کوئی کیفیت نہ سمجھی جا سکتی ہے نہ بیان کی جا سکتی ہے۔

ابن سعد وغیرہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے جو حدیث بیان کی ہے جس کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے اسی حدیث میں ہے
کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنی قسم کا کفارہ دے دیا اور جو ارادہ کیا تھا اس سے باز رہے اور صبر کیا۔

ابن المنذر، طبرانی اور بیہقی نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی طرح حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے حدیث مذکورہ
بیان کی ہے اور شان نزول کے سلسلے میں ایک اور حدیث سورت کے آغاز میں ہم نے ابن اسحاق، ابن جریر اور عطاء کے حوالے سے
ذکر کر دی ہے۔

عبداللہ بن امام احمد نے زوائد المسند میں اور نسائی اور ابن المنذر اور ابن حبان اور ضیاء اور ترمذی نے بیان کیا ہے اور ترمذی
نے اس کو حسن قرار دیا ہے کہ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا اُحد کی جنگ میں ۶۴ انصار اور چھ مہاجر کام آئے۔ مہاجرین شہداء
میں حضرت حمزہؓ بھی شامل تھے ان سب کو کافروں نے مثلہ کیا تھا (سب شہیدوں کے ناک کان بھی کاٹ لئے تھے) انصار نے کہا
اگر ہم کو کسی روز ایسا موقع ہاتھ آ گیا تو ہم بھی ان کی حالت قابل دید بنا دیں گے (یعنی ہم بھی مثلہ کر دیں گے کہ جو لوگ ان کو دیکھیں
ان کو ان کی ذلیل و خستہ حالت دیکھ کر رحم آ جائے) کچھ مدت کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو اللہ نے آیت وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا
بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ نازل فرمائی۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے
فرمایا ہم بدلہ نہیں لیں گے صبر کریں گے۔ چار آدمیوں کے علاوہ باقی سب سے ہاتھ روک لو، کسی کو قتل نہ کرو)

بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت شہداء اُحد کے متعلق نازل ہوئی۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ مشرکوں نے اُحد کے
شہداء کے پیٹ چاک کئے اور بہت ہی برے طریقے سے لاشوں کے ناک کان کاٹے ہیں ہر شہید کو مثلہ کر دیا ہے صرف
حنظلہ بن ابو عامر راہب کو مثلہ نہیں کیا تھا کیونکہ حضرت حنظلہ کا باپ ابو عامر (جس کو رسول اللہ ﷺ نے راہب کے بجائے
فاسق فرمایا تھا) اس روز ابوسفیان کے ساتھ تھا اسی وجہ سے حنظلہ کو مثلہ کرنے سے انہوں نے چھوڑ دیا تھا تو کہا اگر اللہ نے ہم کو
ان پر غالب کر دیا تو جو حرکت انہوں نے کی ہے ہم اس سے بھی زیادہ کریں گے ایسا مثلہ کریں گے کہ کسی عرب نے کسی کو نہ کیا
ہو گا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے پاس کھڑے تھے مشرکوں نے آپ کے کان ناک اور آلات
مردانہ کاٹ لئے تھے پیٹ چاک کر دیا تھا ہندہ بنت عتبہ (زوجہ ابوسفیان) نے آپ کے جگر کا ایک ٹکڑا چبا ڈالا تھا اور اس کو نگلنے
کی فکر کی وہ پیٹ میں نہ رک سکا اور اس نے اگل دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا سنو! اگر وہ کھا لیتی تو آگ
میں کبھی داخل نہ ہوتی حمزہؓ کو اللہ نے یہ عزت عطا فرما دی ہے کہ ان کا کوئی حصہ دوزخ میں نہیں جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے
حضرت حمزہؓ کی جو یہ حالت دیکھی تو ایسا منظر آنکھوں کے سامنے آیا کہ اس سے زیادہ دل خراش منظر کبھی نہیں دیکھا تھا فرمایا ابو
عمارہ! آپ پر اللہ کی رحمت ہو مجھے معلوم ہے کہ آپ بڑے نیک کردار اور صلہ رحمی کرنے والے تھے اگر آپ کے بعد یہ

والوں کے رنجیدہ ہونے کا خیال نہ ہوتا تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی کہ آپ کو یونہی (بے گور و کفن) چھوڑ دوں تاکہ قیامت کے دن آپ کا حشر متعدد (درندوں اور پرندوں کے) گروہوں کے اندر سے ہو۔ خدا کی قسم اگر اللہ نے مجھے ان پر فتح عنایت کی تو آپ کی جگہ میں ان کے ستر آدمیوں کو ضرور بضرور مثلہ کروں گا۔ اس پر اللہ نے آیات مذکورہ نازل فرمائیں اور نزول آیات کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا ہم (انتقام نہیں لیں گے بلکہ) صبر کریں گے چنانچہ آپ اپنے ارادہ سے باز آگئے اور قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔

فائدہ: حضرت ابی بن کعب کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول حجۃ الوداع کے وقت ہوا حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابن عباسؓ اور عطاء بن یسارؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ احد کے موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ابن الحصار نے دونوں متضاد روایتوں میں ایک صورت جامعہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان آیات کا نزول اول مکہ میں پھر احد میں پھر فتح کے بعد یاد داشت کے طور پر ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور ضحاک نے فرمایا اس آیت کا حکم سورۂ برأت کے نزول سے پہلے تھا جب کہ حضور ﷺ کو پہلے آغاز قتال سے منع کیا گیا تھا اور لڑنے والوں سے لڑنے کا حکم دیا تھا لیکن اللہ نے اسلام کو غالب کر دیا اور سورۂ برأت نازل ہو گئی اور عمومی جہاد کا حکم دے دیا گیا تو یہ آیت منسوخ کر دی گئی۔ مکی، ثوری، سدی، مجاہد اور ابن سیرین کے نزدیک یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہوئی جن لوگوں نے ظلم کیا ہو ان کے ظلم کے مطابق انتقام لینے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے یہی اس کی شان نزول ہے ظالم نے جتنا ظلم کیا ہو اس سے زیادہ انتقام لینا جائز نہیں بقدر ظلم بدلہ لیا جا سکتا ہے اور معاف کر دینا بہتر ہے۔

مسئلہ: باتفاق علماء مثلہ کرنا ناجائز ہے ابن اسحاق نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (تقریر فرمانے کے لئے) جس مقام پر بھی کھڑے ہوئے جب تک اسی جگہ صدقہ (خیرات زکوٰۃ) دینے کا حکم نہیں دے دیا اور مثلہ کرنے کی ممانعت نہ کر دی وہاں سے نہ ہٹے۔

مثلہ کرنے کی ممانعت بکثرت احادیث میں آئی ہے۔

سورۂ نحل کی تفسیر ۳ رجب [illegible] کو ختم ہوئی۔ الحمدللہ کہ سورۂ نحل کی تفسیر کا ترجمہ ۱۰ رمضان المبارک [illegible] کو بعونہ تعالیٰ ختم ہوا

رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ

تمت